ائمہ مساجد کے لئے ایک بیش بہا تحفہ

تحفۃ الائمۃ

- ایک ایسی کتاب جس میں ائمہ مساجد کی صفات
- ائمہ کرام کے لئے بزرگان دین کے نصائح، آداب وعظ
- ائمہ کرام کی مسجد کی ذمہ داریاں، اتفاق کی اہمیت
- ائمہ کرام کی دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریاں، مقتدیوں کی تربیت

غرض ہر مسجد کے امام کو جن خوبیوں اور صفات سے آراستہ ہونا ضروری ہے
ان تمام امور کا ذکر بڑے دل نشین اور دل چسپ انداز سے کیا گیا ہے

تقریظ:

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب

مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی، صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر صاحب مدظلہم

شیخ الحدیث و مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

تالیف:

محمد حنیف عبد المجید

سابق استاذ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

بیت العلم ٹرسٹ

ائمۂ مساجد کے لئے ایک بیش بہا تحفہ

★ ایک ایسی کتاب جس میں ائمہ مساجد کی صفات
★ ائمہ کرام کے لئے بزرگان دین کے نصائح، آداب وعظ
★ ائمہ کرام کی مسجد کی ذمہ داریاں، اتفاق کی اہمیت
★ ائمہ کرام کی دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریاں، مقتدیوں کی تربیت

غرض ہر مسجد کے امام کو جن خوبیوں اور صفات سے آراستہ ہونا ضروری ہے ان تمام امور کا ذکر بڑے دل نشین اور دل چسپ انداز سے کیا گیا ہے

تقریظ:

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب

مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی و صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہم

شیخ الحدیث و مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

تالیف:

محمد حنیف عبدالمجید

سابق استاذ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

معاونین:

اختر علی، خلیل الرحمن

فاضلان وفاق المدارس العربیہ پاکستان

بیت العلم ٹرسٹ

G-30، اسٹوڈنٹ بازار، نزد مقدس مسجد،
اردو بازار، کراچی۔ فون: 2726509

تُحفۃ الائمۃ

11030809

اسٹاکسٹ

مکتبہ بیت العلم

قدا منزل نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی۔

فون: 0300-8948974, 0322-2583199

فیکس: +92-213-2726509

کتاب کا نام .... تحفۃ الائمۃ

مؤلف .... محمد حنیف عبدالمجید

تاریخ اشاعت .... رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ بمطابق اگست ۲۰۰۹ء

ناشر .... مکتبہ بیت العلم

ST-9E بلاک ۸، گلشن اقبال، کراچی

فون نمبر: +92-213-4976073 فیکس: +92-213-4976339

ویب سائٹ: www.mbi.com.pk ای میل: info@mbi.com.pk

ملنے کے دیگر پتے

- ☆ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور۔ فون: 0423-7224228
- ☆ مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار لاہور۔ فون: 0423-7228196
- ☆ مکتبہ امدادیہ، ٹی۔ بی روڈ، ملتان۔ فون: 061-4544965
- ☆ کتب خانہ رشیدیہ، رعبہ بازار، مدینہ کلاتھ مارکیٹ، راولپنڈی۔ فون: 051-5771798
- ☆ مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ۔ فون: 081-662263
- ☆ کتاب مرکز، فیئر روڈ، سکھر۔ فون: 071-5625850
- ☆ بیت القرآن، نزد ڈاکٹر ہارون والی گلی، چھوٹی گھنٹی، حیدرآباد۔ فون: 022-3640875

نوٹ: یہ کتاب اب آپ بیت العلم سے بذریعہ VP بھی منگوا سکتے ہیں۔

ضروری گزارش

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرات علماء کرام اور معزز قارئین کی خدمت میں نہایت ہی عاجزانہ گزارش ہے کہ الحمد للہ...... ہم نے اس کتاب میں تصحیح و تخریج کی پوری کوشش کی ہے، تاکہ ہر بات مستند اور باحوالہ ہو، پھر بھی اگر کہیں مضمون یا حوالہ جات میں کمی بیشی یا اغلاط وغیرہ نظر آئیں تو ازراہِ کرم ہمیں ضرور مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں وہ غلطی دور کی جائے۔ مزید اس کتاب کے متعلق کوئی اصلاحی تجویز ہو تو ہم نے آخر میں خط دیا ہے وہ ضرور بھیجیں۔

اس کتاب کی تصحیح اور کتابت پر الحمد للہ...... کافی محنت ہوئی ہے، اُمید ہے قدردان لوگ مسلمانوں کے لئے کی گئی اس محنت کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا کرتے رہیں گے۔

جزاکم اللہ خیرًا

آپ کی قیمتی آراء کے منتظر

احبابِ بیت العلم ٹرسٹ

منفرد علمی اور دینی تحفہ

"تحفۃ الائمۃ"

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

◎ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ تحفے میں بہترین چیز پیش کرے۔

◎ کیا آپ جانتے ہیں کہ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی طرف سے سب سے بہترین چیز کیا ہے؟

١ یاد رکھیے! ایک مسلمان کے لئے سب سے بہترین تحفہ "دینی علوم سے واقفیت ہے" اپنے دوستوں اور عزیزوں کو یہ کتاب ہدیے/تحفہ میں پیش کر کے ہم "تَهَادُوْا تَحَابُّوْا"[1] والی حدیث پر عمل کر سکتے ہیں، جس کا معنی ہے کہ: "تم ایک دوسرے کو ہدیہ لیا دیا کرو آپس میں محبت بڑھے گی۔"

٢ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر آپ محسوس کریں کہ یہ آپ کے گھر والوں ...... رشتہ داروں ...... دفتر کے ساتھیوں ...... کاروباری حلقوں ...... اور معاشرے کے دیگر افراد بشمول اسکول، کالج اور مدارس کے طلبہ کے لئے مفید ہے تو آپ کا انہیں یہ کتاب تحفے میں پیش کرنا آخرت میں سرمایہ کاری اور سماجی ذمہ داری کی ادائیگی کا حصہ ہوگا۔

٣ نیکی کے پھیلانے، علمِ دین اور کتابوں کی اشاعت کا ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔

لہٰذا اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔ محلے کی مسجد، لائبریری، کلینک، محلے کے اسکول اور مدرسے کی لائبریری تک پہنچا کر معاشرے کی

[1] موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب ماجاء فی المہاجرۃ: ۲: ۷۰۶، ۷۰۷

اصلاح میں معاون ومددگار بنئے۔

④ کتاب کو ہدیے/تحفہ میں دے کر آپ علمی دوست بن سکتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بنا سکتے ہیں، اس لئے کہ کتاب جہاں کہیں بھی رکھی جاتی ہے وہ لوگوں کو پڑھنے کی طرف دعوت دیتی ہے اور جب لوگ دینی، معاشرتی اور اخلاقی احکام و ہدایات سے باخبر ہوں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ باعمل بھی ہوں گے۔

⑤ اگر اللہ تعالیٰ نے گنجائش عطا کی ہو تو کم از کم دس کتابوں کو لے کر والدین اور اساتذہ کرام کے ایصالِ ثواب کے لئے وقف کر دیں، یا رشتہ داروں، دوستوں کو خوشی کے مواقع پر پیش کر کے دین اور دنیا کے فوائد اپنائیے۔

کتاب دے دینا ہمارا کام ہے، مطالعہ کی توفیق اور پھر ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، ہم اپنا کام پورا کرنے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرما کر مطلوبہ نتائج بھی ظاہر فرمائیں گے۔

درج ذیل سطور میں پہلے اپنا نام و پتہ پھر جنہیں ہدیہ دے رہے ہیں ان کا نام و پتہ لکھیں۔

ہدیہ مبارکہ

مِنْ From

....

....

اِلٰی To

....

....

فہرست مضامین

باب اوّل
ائمہ کرام کی صفات

باب دوم

ائمہ کرام کے لیے نصیحتیں

باب سوم

آدابِ وعظ

باب چہارم

ائمہ کرام کی مسجد کی ذمہ داریاں

باب پنجم

مقتدیوں کی تعلیم و تربیت

باب ششم

ائمہ کرام کی امامت کی ذمہ داریاں

باب ہفتم

اتفاق کی اہمیت

باب ہشتم

ائمہ کرام کی دعوت وتبلیغ کی ذمہ داریاں

الجامعة الفاروقية
JAMIA FAROOQIA

تقریظ

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم العالی
بانی وشیخ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی
وصدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى وَبَعْدُ

حضرت مولانا مفتی محمد حنیف صاحب زید معالیہ علمی، تدریسی، تربیتی اور تالیفی ذوق کے حامل قابل رشک اور لائق تقلید نوجوان عالم ہیں، ان کی خدمات کا مشاہدہ ان کی زیر نگرانی قائم اداروں میں کئی مرتبہ حاضری سے ہوا۔

بیت العلم ٹرسٹ نے خاصی تعداد میں مفید علمی و اصلاحی کتب شائع کی ہیں، اب مفتی صاحب نے "تحفۃ الائمہ" کے نام سے ۷۸۲ صفحات کی ایک بیش قیمت کتاب تالیف فرمائی ہے، یہ کتاب باقاعدہ حوالوں کے ساتھ اکابر و اسلاف کی تحریروں پر مشتمل ہے، یہ تحفہ صرف ائمہ مساجد ہی کے لیے مفید نہیں، ان شاء اللہ دوسرے علماء، طلبہ اور عام مسلمان بھی اس کے مطالعے سے مستفید ہوں گے، احقر کی دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس خدمت کو حسن قبول سے سرفراز فرمائیں اور اس کے نفع کو عام و تام اور حضرت مؤلف کے لیے صدقہ جاریہ بنائیں، آمین ثم آمین۔

سلیم اللہ خان

خادم جامعہ فاروقیہ کراچی

۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ / ۲۲ فروری ۲۰۰۶ء

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم" اما بعد!

الحمد للہ!...... راقم السطور کو حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دو تین اسفار میں ساتھ رہنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، حضرت کا جب بھی کراچی سے گزر ہوتا تو کچھ لمحات سعیدہ حضرت کے ساتھ گزارنے کی سعادت حاصل ہوتی۔

ان اسفار میں حضرت ائمہ کرام سے کئی مرتبہ والہانہ محبت کا اظہار فرماتے تھے، حضرت والا کے قلب مبارک میں ائمہ کی عقیدت وعظمت بھری ہوئی تھی اور آدمی کو جس سے زیادہ محبت ہوتی ہے، اس کو نصیحتیں بھی زیادہ وہی کرتا ہے، اس لیے حضرات ائمہ کرام کو کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی طور پر محبت وشفقت بھری نصیحتیں فرمایا کرتے تھے۔

بہت دنوں سے خواہش تھی کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ اور دوسرے اپنے اکابر سے جو نصائح سنی ہیں یا جو اکابر علماء نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں وہ اپنے دوسرے دوستوں تک بھی پہنچادی جائیں تو کئی لوگوں کو فائدہ ہوجائے گا اور بندہ اور بندہ کے ساتھیوں کے لیے صدقہ جاریہ ہوجائے گا۔

کام تو تقریباً شوال ۱۴۱۸ھ میں شروع کردیا تھا، لیکن پھر دوسرے عوارض کی بناء پر اس کو دیکھنے کی نوبت نہ آسکی۔

اس کے بعد بندہ کے استاذ مولانا موسیٰ بخش صاحب دامت برکاتہم العالیہ

(مہتمم مدرسہ صدیقیہ مستونگ بلوچستان) ایک مرتبہ مدرسہ تشریف لائے تو انہوں نے "تدریب الائمۃ و العلماء" پر زور دیا کہ یہ کام بھی ہونا چاہیے اور مولانا کے دلائل سن کر مزید دل میں کام مکمل کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔

۲ محرم ۱۴۲۳ھ کو مدرسہ عائشہ صدیقہ ایبٹ آباد میں اپنے دوست مولانا نذیر احمد صاحب کے پاس جانا ہوا، الحمد للہ وہاں فرصت کے ایام میں کچھ مواد کو جمع کرنے اور ترتیب دینے کا موقع ملا۔

بندے نے جن بزرگوں اور اسلاف کی کتابوں سے جو بات لی ہے اس کا حوالہ ذکر کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے اور حتی الامکان اصل مراجع سے حوالہ لینے کی کوشش کی ہے، تاکہ بات مستند اور مدلل ہو اور اخیر میں ان کتابوں کے نام بھی ذکر کردیے جن سے استفادہ کرکے یہ کتاب تیار کی گئی ہے، البتہ بعض مضامین کا ترجمہ عربی سے اردو میں کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، تاکہ اہل علم اصل مصدر وماخذ سے ہی استفادہ کرسکیں۔

اور پھر اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولوی خلیل الرحمن صاحب (فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی) اور مولوی اختر علی صاحب (سابق استاذ جامعہ فاروقیہ کراچی) کو جنہوں نے تصحیح وتخریج کے کاموں میں میرا ساتھ دیا اور ہر اس بھائی اور دوست کو جنہوں نے اس مبارک کام میں تعاون فرمایا۔

قارئین کرام سے نہایت ہی ادب سے عاجزانہ گزارش کی جاتی ہے کہ کتاب کا مطالعہ عمل کرنے اور ہدایت کی نیت سے کیا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس حسن نیت سے اللہ تعالیٰ عمل کی اور اس کو پھیلانے کی توفیق بھی نصیب فرمائیں گے۔

اسی طرح قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اپنی دعاؤں میں ان تمام بزرگوں اور اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کو یاد رکھیں جن کی کتابوں سے یا جن کے مواعظ سن کر یہ کتاب تیار کی گئی ہے، بندہ کے جمیع اساتذہ کرام اور خاص کر جامعۃ العلوم الاسلامیہ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے اساتذہ کرام کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں کہ بفضلِ الٰہی بندہ ان ہی اساتذہ کرام کی دعاؤں اور محنتوں سے پڑھنے لکھنے کے قابل ہوا اور اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکا، دوسروں کے لیے دعا سے فرشتے ہمیں دعا دیتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يَدْعُوْا لِأَخِيْهِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ إِلَّا قَالَ الْمَلَكُ: وَلَكَ بِمِثْلٍ." [1]

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو مسلمان اپنے بھائی کے پیٹھ پیچھے (غائبانہ) اس کے لیے دعا کرے تو ایک فرشتہ کہتا ہے تیرے لیے بھی ایسا ہی ہو۔"

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

اصلاح ودعا کا طالب

محمد حنیف عبدالمجید

عفا اللہ عنہ ولوالدیہ

شعبان ۱۴۲۶ھ ستمبر ۲۰۰۵ء

[1] مسلم، کتاب الذکر، باب فضل الدعاء للمسلمین بظہر الغیب: ۲/۳۵۱

باب اوّل

ائمہ کرام کی صفات

1 مکارمِ اخلاق:

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نائبین کو چاہیے کہ وہ معاف کرنے والے ہیں، لوگوں کی باتوں کو دل پر نہ لیں۔

اگر کوئی عام مقتدی یا کمیٹی کا کوئی رکن کسی غلطی پر معذرت کرے تو اس کی معذرت کو قبول کرنا چاہیے، چناں چہ اسی بات کی تاکید حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

اِقْبَلْ مَعَاذِيْرَ مَنْ يَأْتِيْكَ مُعْتَذِرًا
إِنْ بَرَّ عِنْدَكَ فِيْمَا قَالَ أَوْ فَجَرَا
لَقَدْ أَطَاعَكَ مَنْ يُرْضِيْكَ ظَاهِرُهُ
وَقَدْ أَجَلَّكَ مَنْ يَعْصِيْكَ مُسْتَتِرًا

ترجمہ: "معذرت کرنے والے کی معذرت کو قبول کرلے، چاہے تمہارے خیال میں وہ بھلا ہو یا برا ہو۔ ظاہر میں تجھے راضی رکھنے والا تیرا مطیع ہے اور جرم کرتے وقت تجھ سے گھبرانے والے کے دل میں تیرا احترام ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عذر خواہ کے اعذار کو قبول کرلینا چاہیے، اس نے صحیح غلط جو

بھی بات پیش کی ہو، مگر وہ جب تمہارے سامنے آیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہیں راضی کرنا چاہتا ہے اور جو آدمی تمہارے حکموں کی علی الاعلان حکم عدولی نہیں کرتا، چھپ کر نافرمانی کرتا ہے، گویا تمہارا خیال اس کے دل میں ہے اور وہ تمہارا اکرام کر رہا ہے، ورنہ بے ادب انسان تو سامنے ہی اختلاف کرتا ہے۔[1]

اسی طرح ایک اور موقع پر امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

[2] قِيلَ لِي قَدْ أَسَى عَلَيْكَ فُلَانٌ
وَمُقَامُ الْفَتَى عَلَى الذُّلِّ عَارٌ
قُلْتُ قَدْ جَاءَنِي وَأَحْدَثَ عُذْرًا
دِيَةُ الذَّنْبِ عِنْدَنَا الْإِعْتِذَارُ

ترجمہ: ”مجھ سے کہا گیا کہ فلاں آدمی نے آپ کی طرف عیب منسوب کیا اور شریف آدمی کا رسوائی برداشت کرلینا عار کی بات ہے۔ میں نے جواباً کہا کہ انہوں نے آکر معذرت پیش کردی اور ایسے گناہ کی دیت ہمارے نزدیک اعتذار ہی ہے۔“

تشریح: امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آکر کسی نے کہا: ”فلاں شخص آپ کی بدگوئی کرتا ہے اور آپ کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے اور آپ خاموش رہتے ہیں؟ اس طرح ذلت پر خاموش رہنا باہمت آدمی کا کام نہیں۔“ اس کے جواب میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اس شخص نے میرے پاس آکر اپنے قصور پر معذرت چاہی ہے اور ہمارے نزدیک گناہ کا کفارہ ”معافی مانگنا“ ہے۔“[2]

اسی طرح اپنے مقتدیوں، شاگردوں، ماتحتوں اور گھر والوں کو معاف کردیا کریں، تاکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مکمل اتباع نصیب ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

[1] دیوان الامام الشافعی، قافیۃ الراء، الاعتذار: ۱۵۲
[2] دیوان الامام الشافعی، قافیۃ الراء، دیۃ الذنب: ۱۴۵

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾[1]

ترجمہ: ”آپ درگزر کو اختیار کریں، نیک کام کی تعلیم دیں اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جائیں۔“

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ دوسرے معنی ”عفو“ کے ”معافی اور درگزر کرنے“ کے بھی آتے ہیں۔

علماء تفسیر کی ایک جماعت نے اسی جگہ یہی معنی مراد لے کر اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ آپ گناہ گاروں، خطاکاروں کے گناہ و قصور کو معاف کردیا کریں۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے آیت کا مطلب پوچھا، حضرت جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنے کے بعد فرمایا کہ اس آیت میں آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے:

”إِنَّ اللّٰهَ أَمَرَكَ أَنْ تَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَتُعْطِيَ مَنْ حَرَمَكَ وَتَصِلَ مَنْ قَطَعَكَ“

ترجمہ: ”جو شخص آپ پر ظلم کرے آپ اس کو معاف کردیں اور جو آپ کو کچھ نہ دے آپ اس پر بخشش کریں اور جو آپ سے تعلق قطع کرے آپ اس سے بھی ملا کریں۔“[2]

حضرت عبداللہ بن حکیم رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

”مَنْ يَعْمَلْ بِالْعَفْوِ فِيمَا يَظْهَرُ بِهِ تَأْتِيهِ الْعَافِيَةُ، وَمَنْ يُنْصِفِ النَّاسَ مِنْ نَفْسِهِ يُعْطَى الظَّفَرَ فِي أَمْرِهِ، وَالذُّلُّ فِي

[1] الاعراف: ۱۹۹
[2] تفسیر ابن کثیر: ۵۶۱/۲، الاعراف: ۱۹۹

الطَّاعَةِ أَقْرَبُ إِلَى الْبِرِّ مِنَ التَّعَزُّزِ بِالْمَعْصِيَةِ.“ [1]

ترجمہ: ”اپنے ساتھ پیش آنے والے معاملات میں جو آدمی عفو و درگزر سے کام لے گا اسے عافیت ملے گی اور جو اپنی ذات کے بارے میں لوگوں سے انصاف کرے گا اسے اپنے کام میں کامیابی ملے گی اور اطاعت میں ذلت برداشت کرنا گناہوں میں ظاہری عزت ملنے سے نیکی کے زیادہ قریب ہے۔“

غزوۂ احد میں جب حضور ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا گیا اور بڑی بے دردی سے ان کے اعضاء کاٹ کر لاش کی بے حرمتی کی گئی تو نبی کریم ﷺ نے لاش کو اس ہیئت میں دیکھ کر فرمایا کہ جن لوگوں نے حمزہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے میں ان کے ستر آدمیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں آپ کو بتلایا گیا کہ آپ کا یہ مقام نہیں، آپ کے شایانِ شان یہ ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیں۔

اس مضمون کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ان کو رسول اللہ ﷺ نے جو مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی وہ وہی تھی کہ جو شخص تم پر ظلم کرے اس کو معاف کر دو، جو تم سے قطع تعلق کر دے تم اس سے ملا کرو، جو تمہیں محروم کر دے تم اس کو عطا کیا کرو۔ [2]

لفظ «عفو» کے پہلے اور دوسرے معنی میں اگرچہ فرق ہے، لیکن حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ لوگوں کے اعمال و اخلاق میں سرسری اطاعت، فرماں برداری کو قبول فرمایا کریں، زیادہ تجسس اور تفتیش میں نہ پڑیں اور ان سے اعلیٰ معیار کی اطاعت کا مطالبہ نہ کریں اور ان کی خطاؤں اور قصور سے درگزر فرمائیں، ظلم کا

[1] الزهد لهناد، كتاب الزهد، باب العلم والعفو: ۶۰۲/۲، رقم: ۱۲۷۹
[2] مسند احمد: ۱۴۸/۴، رقم: ۱۶۸۸۳

انتقام نہ لیں۔ چناں چہ رسول کریم ﷺ کے اعمال و اخلاق ہمیشہ اسی سانچے میں ڈھلے رہے، جس کا پورا مظاہرہ اس وقت ہوا جب مکہ فتح ہو کر آپ کے جانی دشمن آپ کے قبضہ میں آئے تو آپ نے سب کو آزاد کر کے فرمادیا کہ تمہارے مظالم کا بدلہ لینا تو کیا ہم تمہیں پچھلے معاملات پر ملامت بھی نہیں کرتے۔

دوسرا جملہ اس ہدایت نامہ کا ﴿وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ ہے، ”عُرف“ بمعنی معروف ہر اچھے اور مستحسن کام کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے ساتھ برائی اور ظلم سے پیش آئیں آپ ان سے انتقام نہ لیں بلکہ معاف کر دیں، مگر ساتھ ہی ان کو نیک کام کی ہدایت بھی کرتے رہیں، گویا برائی کا بدلہ نیکی سے، ظلم کا بدلہ صرف انصاف (عفو و درگزر) ہی سے نہیں بلکہ احسان سے دیں۔

تیسرا جملہ ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جاہلوں سے آپ کنارہ کش ہو جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ ظلم کا انتقام چھوڑ کر آپ ان کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کریں اور نرمی کے ساتھ ان کو حق بات بتلائیں، مگر بہت سے جاہل ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس شریفانہ معاملہ سے متاثر نہیں ہوتے، اس کے باوجود جہالت اور سختی سے پیش آتے ہیں تو ایسے لوگوں کے ساتھ آپ کا معاملہ یہ ہونا چاہیے کہ ان کے دل خراش اور جاہلانہ کلام سے متاثر ہو کر ان ہی جیسی سخت گفتگو نہ کریں بلکہ ان سے کنارہ کش ہو جائیں۔

امام تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کنارہ کش ہونے کا بھی مطلب یہ ہے کہ ان کی برائی کا جواب برائی سے نہ دیں، یہ معنی نہیں کہ ”ان کو ہدایت کرنا چھوڑ دیں“ اس لیے کہ یہ وظیفۂ رسالت و نبوت کے شایانِ شان نہیں۔ [1]

صحیح بخاری میں اس جگہ ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانے میں

[1] تفسیر ابن کثیر: ۵۶۲/۲، الاعراف: ۱۹۹

عیینہ بن حصن مدینہ میں آیا اور اپنے بھتیجے حر بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مہمان ہوا، حضرت حر بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان اہل علم حضرات میں سے تھے، جو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس مشاورت میں شریک ہوا کرتے تھے۔ عیینہ نے اپنے بھتیجے حر بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: تم امیر المؤمنین کے مقرب ہو، میرے لیے ان سے ملاقات کا کوئی وقت لے لو۔ حر بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے درخواست کی کہ میرا چچا عیینہ آپ سے ملنا چاہتا ہے، آپ نے اجازت دے دی۔

مگر عیینہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس میں پہنچ کر نہایت غیر مہذب اور غلط گفتگو کی کہ نہ آپ ہمیں ہمارا حق دیتے ہیں نہ ہمارے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس پر غصہ آیا، تو حر بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾[1]

اور یہ شخص بھی جاہلین میں سے ہے۔ یہ آیت سنتے ہی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سارا غصہ ختم ہوگیا اور اس کو کچھ نہیں کہا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ عادت معروف و مشہور تھی کہ ”كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ“ یعنی کتاب اللہ کے احکام کے آگے گردن ڈالتے تھے۔[2]

یہ آیت مکارم اخلاق کی جامع آیت ہے۔ بعض علماء نے اس کا خلاصہ یہ بیان فرمایا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں:

1. محسن یعنی اچھے کام کرنے والے۔
2. بدکار ظالم۔

اس آیت نے دونوں طبقوں کے ساتھ اخلاق کریمانہ برتنے کی یہ ہدایت دی

[1] الاعراف: ۱۹۹ [2] بخاری التفسیر، باب خذ العفو وأمر بالعرف، رقم: ۴۶۴۲

ہے کہ نیک کام کرنے والوں سے ان کی ظاہری نیکی کو قبول کرلو، زیادہ تفتیش و تجسس میں نہ پڑو اور نیکی کے اعلیٰ معیار کا ان سے مطالبہ نہ کرو بلکہ جتنا وہ آسانی سے کر سکیں اس کو کافی سمجھو اور بدکاروں کے معاملے میں یہ ہدایت دی ہے کہ ان کو نیک کام سکھلاؤ اور نیکی کا راستہ بتلاؤ، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں اور اپنی گمراہی اور غلطی پر جمے رہیں اور جاہلانہ گفتگو سے پیش آئیں تو ان سے علیحدہ ہو جائیں اور ان کی جاہلانہ گفتگو کا جواب نہ دیں، اس طرز سے یہ امید ہے کہ ان کو کسی وقت ہوش آئے اور اپنی غلطی سے باز آجائیں۔[1]

عفو کی برکات میں سے ایک یہ ہے کہ مخالف موافق بن جایا کرتا ہے۔ اشتعال انگیز گفتگو، الزام، بہتان، غلط بیانی اور اپنی ہجو سن کر انسان اشتعال میں نہ آئے اور معاف کرے یقیناً اس سے شیطان کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ نزاع، جدال اور جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں اور اب وہ مخالف جو بندوق، تلوار اور ڈنڈوں سے حملہ کرنا چاہتا ہے سامنے والے کا معاف کرنا اس کو موم کردیتا ہے اور اس کا خادم بنادیتا ہے۔

عبداللہ اپنے بھائی المنذر خلف محمد کے بعد ۸۸۸ھ میں اندلس کا امیر بنا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اکثر لوگوں کو رہا کردیا، خصوصاً سیاسی قیدیوں پر بہت مہربانی کی، ان کی جائدادیں انہیں واپس کردیں۔

شیخ سلیمان بن البائد نے ایک مرتبہ امیر عبداللہ سے بغاوت کی تھی لیکن سلطان نے اپنی فطری فیاضی کے تقاضے سے اس کا قصور معاف کردیا۔ ۹۰۰ھ میں سلیمان نے امیر عبداللہ کی ایک ہجو لکھی جو سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس ہجو میں سلطان کو خچر اور وزرا کو خچربان بتایا گیا تھا۔

اب دیکھیے ایک راست باز، عادل اور شفیق حاکم نے اپنی ہجو لکھنے والے کے خلاف کیا فیصلہ سنایا۔ حکمران وقت نے سلیمان کو بلوایا اور اس سے کہا:

[1] معارف القرآن: ۴/ ۱۵۵ تا ۱۵۸، الاعراف: ۱۹۹

"سلیمان! امیری عنایات خراب زمین پر پڑیں اس لیے ضائع ہوگئیں۔ میں نہ خواست گار تعریف ہوں نہ ہجو کے قابل، کیوں کہ یہ دونوں باتیں میرے نزدیک یکساں ہیں۔ بغاوت بہت بڑا جرم ہے، لیکن میں نے تمہیں معاف کردیا۔ گو اس معافی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، لیکن میں انتقام پر درگزر کو ترجیح دیتا ہوں۔ میری ہجو کے اشعار میرے سامنے پڑھو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ایک شعر کے صلے میں ایک ایک ہزار روپیہ دوں گا۔ خچر تو پھر بھی ایک کارآمد جانور ہے۔ تو مجھ پر جس قدر بڑا الزام لگاتا میں اس قدر زیادہ اپنی عنایات کا بوجھ تم پر ڈالتا۔"

سلیمان امیر کے قدموں پر گر پڑا اور زار و قطار رو رو کر معافی مانگنے لگا۔ امیر نے اسے معاف کردیا اور پھر وہ تادمِ مرگ وفادار رہا۔[1]

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں کہ نوافل اور اذکار و اوراد سے قلب میں جو انوار پیدا ہوتے ہیں اس سے ایک روحانی طاقت پیدا ہوتی ہے، لیکن اس طاقت کا استعمال بارگاہِ خلوت حق میں نہیں ہے بل کہ ① اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنا ② بے جا غصہ کو ضبط کرنا ③ بدنظری سے آنکھوں کو محفوظ رکھنا ④ مخلوق کی خطاؤں کو معاف کرنا ⑤ شہوت اور غضب سے مغلوب نہ ہونا ⑥ کسی کو حقیر نہ سمجھنا ⑦ انتقام نہ لینا ⑧ اپنے کو مخلوق خدا کا خادم سمجھنا ⑨ مؤمن کا اکرام کرنا ⑩ اپنے کو بڑا نہ سمجھنا وغیرہ وغیرہ میں ہے، اگر خلوت میں ذاکر و شاغل ہے اور مخلوقِ خدا پر ظالم اور مغلوب الغضب ہے تو اس شخص نے روحانی طاقت کا صحیح استعمال نہیں کیا۔[2]

امام کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر مندرجہ ذیل تین صفات کو پیدا کرنے کی کوشش کرے اور ان کو اپنی میز پر لکھ کر رکھے تاکہ ہر وقت نظر پڑتی رہے اور دعا کرتا رہے کہ اے اللہ! مجھ میں اور تمام ائمہ کرام میں یہ صفات پیدا فرمادیں:

[1] سنہرے فیصلے: ۲۴۶ [2] ماخوذ از کشکول معرفت: ۱۵۵

❶ تَأْخِيرُ الْعُقُوبَةِ عِنْدَ الْغَضَبِ،

❷ وَتَعْجِيلُ مُكَافَاةِ الْمُحْسِنِ بِإِحْسَانِهِ،

❸ وَالْعَمَلُ بِالْأَنَاةِ فِيمَا يَحْدُثُ لَهُ، فَإِنَّ لَهُ فِي تَأْخِيرِ الْعُقُوبَةِ إِمْكَانَ الْعَفْوِ، وَفِي تَعْجِيلِ الْمُكَافَاةِ بِالْإِحْسَانِ: الْمُسَارَعَةُ إِلَى الطَّاعَةِ، وَفِي الْأَنَاةِ: إِنْفِسَاحُ الرَّأْيِ وَإِيضَاحُ الصَّوَابِ.[1]

❶ غصے کے وقت سزا دینے میں تاخیر کرنا۔

❷ اپنے محسن کے احسان کا بدلہ چکانے میں جلدی کرنا۔

❸ جو بھی حادثہ اور ناگواری کی صورت پیش آئے اس میں بردباری کا مظاہرہ کرنا۔

اس لیے کہ سزا کو مؤخر کرنے میں اس کے لیے معافی کا امکان ہوتا ہے اور اپنے محسن کے ساتھ جلد احسان کرنے میں اطاعت اور فرماں برداری کی طرف دوڑنا ہے اور بردباری میں حسنِ رائے اور ٹھیک بات کہنے کی وضاحت ہے۔"

امام عبدالوہاب شعرانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں: (ہم سے عہد لیا گیا ہے) کہ اس امتِ محمدیہ کے تمام آدمیوں کی خطاؤں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خاطر سے جن کے وہ بندے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی خاطر سے جن کی وہ امت ہیں معاف کردیا کریں اور (مؤاخذہ و انتقام کے خیال سے) درگزر کریں اور کسی سے اپنے کسی حق کا مطالبہ دونوں جہاں میں نہ کریں خواہ مالی حق ہو یا آبرو کا کیوں کہ مثل مشہور ہے۔

لِعَيْنٍ تُجَازِي أَلْفُ عَيْنٍ وَتُكْرَمُ

ترجَمَہ: "ایک آنکھ کی وجہ سے ہزار آنکھوں کا لحاظ کیا جاتا ہے۔"

[1] بهجة المجالس ۱/۳۳۸

(تو ہم کو بھی اللہ سبحانہ اور رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے امت محمدیہ کی خطاؤں کو معاف کر دینا چاہیے)۔

پس جس شخص نے اس امت کے کسی آدمی سے بھی مواخذہ کیا اس نے نہ تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کو پہچانا جن کے یہ بندے ہیں اور نہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت کو جانا جن کی یہ امت ہیں۔

اور عزیز من! یہ سمجھ لو کہ اس عہد پر عمل کرنا تم کو اس وقت تک آسان نہیں ہو سکتا جب تک تمہارے سامنے اپنے عیوب محض گمان اور اٹکل سے نہیں بلکہ یقین کے ساتھ منکشف اور ظاہر نہ ہو جائیں۔ اس وقت بے شک تم دل کھول کر اس کے لیے آمادہ ہو گے اور اس کی ضرورت سمجھو گے کہ ان گناہوں کے مٹانے اور پاک وصاف کرنے کی کوئی صورت ہونی چاہیے (اور وہ یہی ہے کہ تم دوسروں کی خطاؤں سے درگزر کرو اور ان کو اپنے حقوق معاف کر دو۔ امید ہے کہ حق تعالیٰ تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے اور اہل حقوق سے تمہاری خطائیں معاف کرا دیں گے)۔

اگر تمہارے کپڑے میں کوئی ظاہری ناپاکی لگی ہو اور کوئی شخص آ کر اسے دھو دے تو تم لامحالہ اس کی طرف جھکو گے (اسی طرح اگر تم کو گناہوں کی ناپاکی محسوس ہو جاوے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ دوسروں کو اپنے حقوق معاف کر دینے سے یہ ناپاکی دھل جائے گی تو تم ضرور اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ گے) پس اس عہد پر عمل کرنے والے کو سخت مجاہدہ کی ضرورت ہے یہاں تک کہ اس کو اپنے نفس کی برائیاں اس نجاست ظاہری کی طرح محسوس ہونے لگیں ورنہ وہ ضرور (دوسروں سے) مواخذہ کا طالب ہو گا اور درگزر کرنے پر آمادہ نہ ہو گا اور میں نے اپنے نفس کے ساتھ تقریباً تیس برس تک مجاہدہ کیا تب وہ کسی قدر اس پر آمادہ ہوا اور اس کے ساتھ یہ بھی مناسب ہے کہ جو شخص ہم سے کراہت رکھتا ہو اس کے ساتھ اپنے مرنے سے پہلے جلدی صلح کر لیں کیوں کہ ممکن ہے کہ وہ ہماری نسبت ہمارے مرنے کے بعد کچھ

کہے سنے اور اس وقت اس بات کا معاف کرنے والا کوئی ہو گا نہیں (تو یہ مسلمان ہماری ذات کی وجہ سے گناہ میں گرفتار رہے گا) تو اپنے مسلمان بھائیوں کے حال پر شفقت کر کے ایسا ضرور کرنا چاہیے۔ اور (یاد رکھو کہ) لوگ زیادہ تر دوسروں کی آبرو ریزی میں کسی ایسی بات یا ایسے فعل کے بہانہ سے مبتلا ہو جاتے ہیں جس کی خبر (افواہی طور پر) بلا تحقیق کے ان تک پہنچتی ہے تو اگر ہم ان سے مل کر بات صاف کر لیں گے اور اپنا عذر واقعی بیان کر دیں گے تو امید ہے کہ وہ اس سے باز آ جائیں گے چناں چہ خود مجھے ایک شخص کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا (کہ وہ شخص سنی سنائی باتوں کی وجہ سے مجھ سے بدگمانی اور بغض رکھتا تھا) اور اس نے مجھ سے خود کہا کہ واللہ! میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تم محض زندیق (اور بددین) ہو پھر میں نے اپنی حالت ظاہر کی اور بتلایا کہ میں اسلام اور اہل اسلام کا (دل سے) چاہنے والا (اور ان کا جان نثار) ہوں تب اس نے (اپنے خیال سے) توبہ کی اور بہت اچھی توبہ کی۔

والحمد للّٰہ علی ذلک۔

اگر کوئی تم کو ایذا دے تو تم اس کو کسی طرح کی کچھ ایذا مت دینا اگر چہ بدگمانی ہی کا درجہ ہو کیوں کہ کسی سے بدگمانی رکھنا بھی ایک درجہ کی ایذا ہے کہ اس شخص کے ساتھ دل کھلا ہوا نہیں رہتا اور اس کا اثر ملاقات کے وقت ضرور ظاہر ہو جاتا ہے، جس سے دوسرے کو ایذا ہوتی ہے تو اس سے بھی پرہیز کرنا چاہیے اور یہ مت کہنا کہ بدی کا بدلہ بدی ہے (تو میں بھی اس کو ایذا دے سکتا ہوں کیوں کہ) ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾[1] اور تم اس کے بعد کا حصہ بھی تو پڑھو اور دیکھو حق تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں ﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾[2] کہ جو معاف کر دے اور بات کو سنوار دے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے بدی کے انتقام کو بھی بدی سے تعبیر فرمایا ہے، جس میں بندہ کو عفو و مسامحت (کی خوبی) پر متنبہ

[1] الشوریٰ: ۴۰ [2] ایضاً

اس کو چاہیے کہ وہ کسی سے صورت بدی کے ساتھ بھی پیش نہ آئے (کیوں کہ انتقام صورت بدی سے خالی نہیں گو حقیقۃً بدی نہ ہو)

اور عزیز من! جو شخص اس عہد پر پوری طرح عامل رہے گا اس کے لیے ہمیں حق تعالیٰ سے امید ہے کہ قیامت کے دن سب اہل حقوق کو اس سے راضی کردیں گے اور جیسا برتاؤ اس نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندوں سے کیا ہے (کہ سب کو اپنے حقوق معاف کردیے) اس کے عوض میں (یہی برتاؤ اس کے ساتھ بھی ہوگا) کوئی شخص اپنے کسی حق کا اس سے مطالبہ نہ کرے گا۔[1]

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ میں اور بستی والوں میں فساد کی صورت پیدا ہوگئی۔ طلبہ مظلوم تھے اس لیے ان کو انتقام کی فکر تھی۔ جذبات اتنے مشتعل تھے کہ ان پر قابو پانا طاقت سے باہر تھا۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ کی صدارت میں اساتذہ اور طلبہ کا ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر حضرت (مولانا حسین احمد مدنی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ) نے تقریر فرمائی۔ واقفیت رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ حضرت صرف خطابت کی حیثیت سے ایسے ممتاز خطیب نہ تھے کہ صرف زورِ خطابت سے مجمع پر قابو پالیتے، لیکن قدرت نے جو روحانی طاقت دی تھی اس موقع پر اس کا ظہور ہوا۔ حضرت نے ایسے مؤثر انداز میں تقریر فرمائی کہ آج پندرہ سال کے بعد بھی اس کی آواز میرے سامعہ میں گونج رہی ہے۔

موضوعِ تقریر تھا "مظلوم بننا کتنا مفید ہے" اور انتقام اگرچہ حق ہو، لیکن اس حق کو چھوڑنا اللہ تعالیٰ کی کن کن رحمتوں کا ذریعہ بنتا ہے۔ میں نے دسیوں تقریریں حضرت کی سنی تھیں، لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ مشکل ترین وقت میں جہاں کہ لوگوں کے حوصلے ختم ہوچکے تھے ایسی مؤثر تقریر فرمائی کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے آسمان

[1] "ہم سے عہد لیا گیا" ترجمہ "الدر المنضود" ص: ۴۴۶، ۴۴۴

سے آگ پر پانی برس رہا ہے۔ ایک گھنٹہ کی تقریر میں سارے مشتعل جذبات ایسے سرد پڑ گئے کہ گویا ایک شیطانی طلسم تھا، فرشتوں کے ظہور سے ایک آن میں ٹوٹ گیا، ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔[1]

امرتسر کے جس کوچہ میں مسجد نور واقع تھی اس کوچہ میں مکانوں کی پشت لگتی تھی، ان تمام مکانوں کے پرنالے اسی کوچہ میں گرتے تھے۔ پرنالے بھی اتنے بڑے بڑے اور کھلے تھے کہ اوپر سے کوئی خورد سال بچہ اس میں گر پڑے تو آسانی کے ساتھ نیچے آجاوے۔ یہ مکانات سب کے سب تاجران چرم کے تھے جو بڑے امیر آدمی تھے، ان کی خادمائیں گھر کا تمام کوڑا کرکٹ اور غلاظت ان پرنالوں کے ذریعے نیچے پھینک دیتی تھیں۔

ایک مرتبہ حسب معمول حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدنی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ درس کے لیے مسجد نور آرہے تھے کہ ایک پرنالے سے گندا پانی گرا اور سب کا سب آپ کے اوپر گرا۔ تمام کپڑے خراب ہوگئے۔ مبارک شاہ حضرت والا کا خادم چوں کہ پٹھان تھا، اس لیے بہت پیچ پا ہوا۔ کہنے لگا: میں ابھی اوپر جاکر اس خادمہ کے جوتے لگواتا ہوں۔ حضرت والا نے فرمایا: خاموش رہو بالکل کچھ نہ کہنا۔ پھر حضرت والا نے اسی وقت غسل کیا، کپڑے بدلے، اپنے مشاغل پورے کیے اور معمول کے مطابق درس دیا۔ جب دھوبی کو گندے کپڑے دھونے کے لیے دیے تو دیگر خدام کو پتہ چلا کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔

ایک صاحب نے ان مکان والوں کو سارا واقعہ سنا کر متنبہ کیا اور ان پرنالوں کا ایسا بندوبست کیا کہ کسی نمازی پر گندی چھینٹ تک نہ پڑے۔

پھر ایک خادم نے پوچھا کہ آپ نے مبارک شاہ کو تنبیہ کرنے کی اجازت کیوں نہ دی تھی؟ فرمایا: یہ ہمارے پیغمبر ﷺ کی سنت ہے کہ آپ ﷺ پر بارہا

[1] مولانا حسین احمد مدنی واقعات وکرامات کی روشنی میں ص ۱۱۳، ۱۱۴

گند کوزہ ڈالا گیا اور آپ نے صبر اختیار فرمایا، حالاں کہ وہ فعل تو جان بوجھ کر کیا جاتا تھا جب کہ یہ بے خبری سے ہوا ہے اس لیے یہاں صبر ہی بہتر تھا۔

چوں کہ اس واقعہ کی خبر تاجران حرم کو ہو چکی تھی، اس لیے انہوں نے حضرت والا کے پاس آکر معافی مانگی اور معذرت چاہی اور ان میں سے کئی ایک تو حضرت والا کے برتاؤ سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ نہ صرف درس اور پنج وقتہ نماز کے لیے مسجد میں آنے لگے بل کہ اپنی ساری خرافات سے تائب ہو کر دل سے یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے۔[1]

۲ اطاعت:

حاکم وقت محمد بن سلیمان جب امام حماد رحمہ اللہ تعالیٰ سے ملنے آئے تو پوچھا: "کیا وجہ ہے کہ میں آپ کی طرف دیکھ نہیں سکتا، جب بھی میں آپ کو دیکھتا ہوں ایسا رعب چھا جاتا ہے کہ آنکھیں اٹھا نہیں سکتا؟"

امام حماد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"اَلْعَالِمُ إِذَا أَرَادَ بِعِلْمِهٖ وَجْهَ اللّٰهِ هَابَهُ كُلُّ شَيْءٍ، وَإِذَا أَرَادَ أَنْ يُكْثِرَ بِهِ الْكُنُوْزَ، هَابَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ."[2]

ترجمہ: "جب آدمی کا علم حاصل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی مقصود ہو تو پھر اس سے ہر چیز ڈرتی ہے، اور جب اس کا مقصود علم حاصل کرنے سے مال کی کثرت اور زیادتی ہو تو پھر وہ ہر چیز سے ڈرتا ہے۔"

چناں چہ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے:

"امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ مسجد میں بیٹھے تھے، اس اثناء میں خلیفہ

[1] احسن السوانح ص ۲۳۶، ۲۳۷ [2] بستان العارفین للإمام النووی ص ۵۹

متوکل کی طرف سے ایک آدمی آیا اور ان سے کہنے لگا: امیر المؤمنین کے گھر میں ایک لڑکی ہے، جس پر جن کا اثر ہے تو انہوں نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے کہ آپ اس کے لیے عافیت کی دعا کریں۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو لکڑی کے بنے ہوئے جوتے دے دیے اور اس سے فرمایا کہ یہ جوتے امیر المؤمنین کے گھر لے جاؤ اور اس لڑکی کے سرہانے بیٹھ کر جن سے کہو: "يَقُوْلُ لَكَ أَحْمَدُ أَيُّمَا أَحَبُّ إِلَيْكَ تَخْرُجُ مِنْ هٰذِهِ الْجَارِيَةِ أَوْ أَصْفَعُ الْآخَرَ بِهٰذِهِ النَّعْلِ ....." کہ تجھے احمد کہتا ہے دو چیزوں میں سے ایک چیز پسند کر لو، یا اس لڑکی کو تکلیف دینا چھوڑ دے اور نکل جاؤ ...... ورنہ دوسری صورت میں میرے جوتے کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تو وہ آدمی جوتے لے کر لڑکی کے پاس چلا گیا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر جن سے اسی طرح مخاطب ہوا جس طرح امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا، تو جن نے لڑکی کی زبان میں کہا: "اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ لَوْ أَمَرَنَا أَنْ لَا نُقِيْمَ فِي الْعِرَاقِ مَا أَقَمْنَا بِهٖ ...... إِنَّهُ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ أَطَاعَ اللّٰهَ أَطَاعَهُ كُلُّ شَيْءٍ" کہ میں احمد کی بات ماننا اور ان کی فرماں برداری کرتا ہوں۔ اگر وہ ہمیں حکم دیں کہ اس پورے عراق سے نکل جاؤ تو ہم عراق سے بھی نکل جائیں گے، اس لیے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو پھر ہر چیز اس کی اطاعت کرتی ہے۔ پھر اس نے اس لڑکی کو تکلیف دینا چھوڑ دیا اور نکل گیا۔ لڑکی ٹھیک ہو گئی اور اس کی شادی ہوئی ...... اولاد بھی ہوئی۔

جب امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا انتقال ہوا تو وہ جن پھر لوٹ کر لڑکی کو تکلیف دینے لگا۔ امیر المؤمنین متوکل نے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگردوں میں سے حضرت ابوبکر المروذی کو بلایا تو وہ وہی جوتے لے کر حاضر ہوا اور جن سے کہا:

"نکل جاؤ ورنہ میں تمہیں اس جوتے سے ماروں گا" تو جن نے کہا: "لا

أَخْرُجْ مِنْ هٰذِهِ الْجَارِيَةِ وَلَا أُطِيْعُكَ وَلَا أَقْبَلُ مِنْكَ ...... أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ أَطَاعَ اللّٰهَ فَأُمِرْنَا بِطَاعَتِهٖ"[1] "نہ میں تیری بات مانوں گا اور نہ میں نکلوں گا۔ جہاں تک احمد بن حنبل کی بات ماننے کا تعلق ہے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تو ہمیں بھی ان کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا۔"

اسی طرح امام ابن القیم رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

"وَشَاهَدْتُ شَيْخَنَا ابْنَ تَيْمِيَّةَ يُرْسِلُ إِلَى الْمَصْرُوْعِ مَنْ يُخَاطِبُ الرُّوْحَ الَّتِيْ فِيْهِ وَيَقُوْلُ: قَالَ لَكِ الشَّيْخُ: اُخْرُجِيْ، فَإِنَّ هٰذَا لَا يَحِلُّ لَكِ، فَيُفِيْقُ الْمَصْرُوْعُ، وَكَانَ يَقْرَأُ فِيْ أُذُنِ الْمَصْرُوْعِ: ﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾"[2]

ترجمہ: "میں نے اپنے شیخ امام ابن تیمیہ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کا یہ معمول دیکھا تھا کہ جس آدمی پر جنات کا اثر ہوتا تو شیخ اس کے پاس ایک آدمی کو بھیجتے جو اس بدروح کو مخاطب کر کے کہتا کہ تجھے شیخ کہتے ہیں نکل جاؤ یہ تمہارے لیے جائز نہیں ہے تو جنات سے متاثرہ آدمی ٹھیک ہو جاتا اور وہ جنات سے متاثرہ آدمی کے کان میں یہ آیت پڑھتا جس کا ترجمہ ہے: "کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم کو ہم نے فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹو گے"۔"

❸ قناعت:

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ سعدی رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی بہت ہی بڑے عارف گزرے ہیں، آپ نے فرمایا:

[1] طبقات الحنابلہ: ۱/۲۳۳، رقم: ۳۲۴
[2] المؤمنون: ۱۱۵، زاد المعاد ۴/۸۴

"دہ درویشے در گلیمے بخسپند و دو پادشاہ در اقلیمے نگنجند۔"

ترجمہ: "دس درویش ایک کمبل میں سما سکتے ہیں، مگر دو بادشاہ پورے ملک میں نہیں سما سکتے۔"

درویش سے پوچھیں تو کہے گا کہ یہ کمبل بہت بڑا ہے دس اور بھی آجائیں تو بھی اس میں سما جائیں گے، اور بادشاہ سے پوچھیں تو وہ کہے گا کہ یہ ملک تو بہت ہی چھوٹا ہے ایسی ہزاروں دنیا اور بھی پیدا ہو جائیں تو وہ بھی میرے لیے کم ہیں، معلوم ہوا کہ اصل بات لوگوں کی ہوس اور قناعت کی ہے۔ کسی میں ہوس ہو تو ہزاروں دنیا بھی اس کے لیے کم ہیں اور کسی میں قناعت ہے تو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد: "وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ"[1] کے مطابق وہ خود کو پوری دنیا سے زیادہ مال دار سمجھے گا بات تو اپنے اپنے ظرف کی ہے کہ کسے ضرورت سمجھتے ہیں کسے نہیں۔

زندگی کا معیار کیسا رکھنا چاہیے

حضرت مفتی رشید احمد رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی یہ بھی فرماتے ہیں:

"ضرورت پوری ہو جانے کے بعد اپنی زندگی کا معیار کیسے رکھے، اس کا قانون یہ ہے کہ اپنے مصارف (خرچہ جات) آمدن کے تحت رکھے، اس لیے کہ آمدن (یعنی تنخواہ وغیرہ) تو غیر اختیاری ہے اور مصارف پر ضابطہ رکھنا اپنے اختیار میں ہے ایسا نہ ہو کہ آمدن سے نہیں اور خرچ زیادہ کرنے لگے پھر کسی سے بھیک مانگنا پڑے یا قرض لینا پڑے۔ لہٰذا جتنی آمدن ہو اپنے مصارف کو اس کے نیچے رکھے، زندگی کا معیار اونچا کرنے کے لیے آمدن کی ہوس بڑھا کر کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہ کرے۔"[2]

[1] ترمذی: الزهد، باب من اتقى المحارم فهو اعبد الناس، رقم: ۲۳۰۵
[2] ملفوظات ۲/۲۱۱

انفاق فی سبیل اللہ سے الگ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے اور زندگی گزارنے میں اس کا لحاظ رکھے کہ کہیں دنیا کی ہوس پیدا نہ ہو جائے، آمدن بڑھ جانے سے ہوس ختم نہیں ہوتی بل کہ اور زیادہ بڑھتی ہے۔

ع إِنَّ الطَّعَامَ يُقَوِّيْ شَهْوَةَ النَّهِمِ

مشہور عرب شاعر متنبی نے کیا خوب کہا ہے:

[1] مَا قَضٰى أَحَدٌ مِنْهَا لُبَانَتَهٗ
وَلَنِ انْتَهٰى أَرَبٌ إِلَّا إِلٰى أَرَبٖ

ترجمہ: ”نہ کسی نے اس دنیا کی ساری خواہشوں کو حاصل کیا اور نہ ایسا ہے کہ اس کی ایک ضرورت پوری ہونے کے بعد دوسری ضرورت سامنے نہ آجائے۔“

یہ ہوس تو کہیں پوری ہوتی ہی نہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”لَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ“[2]

ترجمہ: ”ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی (یعنی اس کی خواہشیں کبھی دم نہیں توڑتیں سوائے قبر میں جانے کے بعد) اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے جو توبہ کرتا ہے۔“

الغرض آمدن ضرورت سے زیادہ ہو تو اس کے خرچ کرنے میں اس کا خیال رہے کہ ہوس بڑھتی نہ جائے ہوس پر لگام لگی رہے۔

پوری دنیا سے بڑا غنی بننے کا نسخہ عطا فرما دیا کہ:

”جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا اسی پر قناعت کرو تو دنیا میں سب سے بڑے

[1] دیوان المتنبی: ۲۸
[2] مسلم، الزکوۃ، باب کراھۃ الحرص علی الدنیا: ۱/ ۳۳۵

غنی بن جاؤ گے“ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت عطا فرمائیں۔[1]

چوں کہ قناعت کے باب میں مال داروں سے استغناء انتہائی ضروری ہے اس لیے اس بارے میں ایک وصیت اور اس سے متعلق کچھ واقعات بتا دوں۔

کوئی بھی ایسا دینی کام جس میں مال خرچ کرنے کی ضرورت ہو خواہ وہ مدرسہ ہو یا کوئی دوسرا دینی کام، اس کے کرنے والوں کو یہ بنیادی بات یاد رکھنا چاہیے کہ مال داروں میں سے کسی کو بھی رائے دینے کی اجازت نہ دی جائے۔ علماء و صلحاء کی رائے سے کام کریں، مال داروں میں سے جو تعاون کرنا چاہیں انہیں صاف صاف بتا دیں کہ اس کام میں آپ کی رائے نہیں چلے گی، اس لیے کہ کسی کام میں اسی شخص کی رائے معتبر ہوتی ہے جو اس فن کا ماہر ہو۔ جیسے دنیادار جن طریقوں سے مال کماتے ہیں اوّل تو کوئی مولوی اس سلسلے میں انہیں کوئی مشورہ دے گا نہیں کہ مال فلاں طریقے سے کماؤ اور کارخانہ فلاں طریقے سے چلاؤ، مولوی کو اس فن سے کیا تعلق، وہ اس فن کا ماہر نہیں، اس کے لیے اس فن میں مداخلت جائز ہی نہیں، بالفرض اگر کسی مولوی نے رائے دے ہی دی تو دنیادار اسے ہرگز قبول نہیں کریں گے، بل کہ مولوی کو پاگل اور بے وقوف سمجھیں گے اور کہیں گے کہ چلو مسجد یا مدرسے میں بیٹھو تمہیں کیا معلوم کہ پیسہ کیسے کمایا جاتا ہے؟

اسی طرح اگر کچھ مال دار مفت علاج کرنے کے لیے کوئی رفاہی ہسپتال بنانا چاہیں تو انہیں پیسے خرچ کرنے کا حق تو ہوگا لیکن یہ بات کہ اس ہسپتال میں کیا کیا چیزیں بنائی جائیں، کتنے اور کیسے کمرے تعمیر کیے جائیں، کہاں کہاں کیسی کیسی مشینیں لگائی جائیں؟

ان سب باتوں میں ڈاکٹروں کی رائے کا اعتبار ہوگا۔ اگر پیسہ لگانے والے یہ کہیں کہ ڈاکٹر کو تو بس بعد میں بیٹھ کر کام کرنا ہے پیسہ تو ہم خرچ کر رہے ہیں ڈاکٹر کو

[1] ترمذی، الزھد، باب من اتقی المحارم فھو اعبد الناس، رقم: ۲۳۰۵

رائے دینے کا کیا حق، ہم جیسے چاہیں ہسپتال بنائیں تو سوچیں کہ وہ کوئی ہسپتال بنائیں گے یا مرغی خانہ؟

پکھے کا پکھ بنادیں گے۔ مالداروں کا کام تو تجارتی مراکز بنانا ہے ہسپتال کے کمرے کتنے اور کس طریقے سے بنیں گے اس میں ڈاکٹروں کی رائے کا اعتبار ہے، مالداروں کو تو بس پیسہ خرچ کرنا چاہیے۔

یہ اصول شرعاً وعقلاً ہر اعتبار سے پوری دنیا میں مسلّم ہے کہ کسی کام میں اسی کی رائے معتبر ہوتی ہے جو اس کا جاننے والا ہو، تو جس طرح مال کمانے میں صرف مال داروں کی رائے کا اعتبار ہوگا دوسروں کو اس میں دخل دینا جائز نہیں، اسی طرح دینی امور میں ان ہی کی رائے معتبر ہوگی جن سے اللہ تعالیٰ دین کے کام لے رہے ہیں، کسی دوسرے کو اس میں دخل دینا جائز نہیں۔

جو لوگ جاہل ہونے کے ساتھ ساتھ مال دار بھی ہوتے ہیں انہیں دین داروں اور دینی کاموں پر اشکالات واعتراضات بہت ہوتے ہیں۔ ان کا ایک جواب پہلے کئی بار بتا چکا ہوں اب پھر لوٹاتا ہوں اسے خوب یاد رکھیں۔

ایک شخص نے کہا کہ آپ کے ہاں جو پہرہ لگا ہوا ہے اس سے لوگوں کو استفادہ میں بہت خلل ہو رہا ہے، یہ پہرہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم یہاں جو کام بھی کرتے ہیں وہ اپنے اس علم، عقل، تجربے اور استطاعت کے مطابق کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہے۔ ان چاروں چیزوں میں سے جتنی مقدار اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہے ہم اسی کے مطابق کام کر رہے ہیں اگر اللہ تعالیٰ آپ کا علم آپ کی عقل اور تجربہ واستطاعت ہمیں دے دیتے تو پھر ہم ویسے ہی کرتے جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔

یہ جواب خوب اچھی طرح یاد رکھیں اور جب بھی کوئی سیٹھ یا کوئی جاہل کسی قسم کا اشکال کرے کہ یہ کام تو ایسے نہیں ویسے ہونا چاہیے تو اس کو یہی جواب دیا کریں۔ یہ

بہت ہی عجیب کروڑوں سے زیادہ قیمتی جوہر ہے اس کو خوب یاد رکھیں خوب قدر کریں، انتہائی جامع جواب ہے۔ جب میں نے (یعنی مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے) اس شخص کو یہ کہا تو اس کی زبان پر ایسی مہر سکوت لگی اور وہ ایسا خاموش ہوا کہ اس کے بعد کچھ بولا ہی نہیں ورنہ یہ بات عام مشہور ہے اور دستور ہے کہ جو بحث کرنے لگتا ہے وہ خاموش تو کبھی ہوتا ہی نہیں۔[1]

اب دینی امور میں دخل اندازی کرنے والے دنیا داروں کو روکنے کی چند مثالیں سنئے۔

منبر محراب بن گئے

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ نے کچھ مال دار لوگوں کو دارالعلوم کورنگی کی شوریٰ کا رکن بنالیا تھا، ایک بار خود ہی مجھے (مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) قصہ بتاتے ہوئے فرمانے لگے کہ ایک بار وہ لوگ کچھ اعتراضات کرنے لگے تو میں نے کہا کہ میں نے تو آپ لوگوں کو منبر (یعنی ممبر) بنایا تھا کہ آپ کے سروں پر چڑھ کر بیٹھوں گا لیکن آپ تو محراب بننا چاہتے ہیں، آگے بڑھ کر امام بننا چاہتے ہیں اور مجھے پیچھے رکھنا چاہتے ہیں۔

اس قصے سے بھی پتہ چلا کہ مال داروں کو رکن بنانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر وہ مولوی کو پوچھتے بھی نہیں وہ یہی چاہتے ہیں کہ سب کچھ ہماری مرضی سے ہو، ذرا سا کوئی مالی تعاون کردے پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ بس اب تو جو کچھ بھی ہو میری مرضی کے مطابق ہونا چاہیے۔ تو جن لوگوں میں عقل ہوتی نہیں انہیں رکن کیوں بنایا جائے؟[2]

(۱۷) دعاؤں کا اہتمام:

حضرت مولانا احسان الحق صاحب دامت برکاتہم (مترجم حیاۃ الصحابہ) نے

[1] علماء کا مقام: ۱۹، ۲۲، ۲۵
[2] علماء کا مقام: ۲۸

ایک مرتبہ فرمایا: "میں مت گھڑی میں دیکھ کر دعا مانگو، شروع شروع میں مجاہدہ ہوگا، پھر ان شاء اللّٰہ تعالیٰ آسان ہوجائے گا۔

سوچنے کی بات ہے کہ ہم دوستوں اور گھر والوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کئی کئی گھنٹے باتوں میں گزار دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھوڑی سی دعا مانگتے ہی تھک جاتے ہیں، اس لیے کہ ہمیں مناجات کی لذت نہیں حاصل، اللہ تعالیٰ ہمیں مناجات کی لذت نصیب فرمائے۔ آمین"

ذیل میں ہم علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مناجات میں سے ایک دعا نقل کرتے ہیں ائمہ کرام کو چاہیے کہ اس دعا کو بھی اپنی انفرادی دعاؤں میں شامل فرمائیں:

"إِلٰهِي لَا تُعَذِّبْ لِسَانًا يُخْبِرُ عَنْكَ وَلَا عَيْنًا تَنْظُرُ إِلٰى عُلُوْمٍ تَدُلُّ عَلَيْكَ وَلَا قَدَمًا تَمْشِي فِي خِدْمَتِكَ وَلَا يَدًا تَكْتُبُ حَدِيْثَ رَسُوْلِكَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَبِعِزَّتِكَ لَا تُدْخِلْنِي النَّارَ فَقَدْ عَلِمَ أَهْلُهَا أَنِّي كُنْتُ أَذُبُّ عَنْ دِيْنِكَ. اَللّٰهُمَّ بَلِّغْنِي آمَالِي مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ وَأَطِلْ عُمْرِي لِأَبْلُغَ (مَا) أُحِبُّ مِنْ ذٰلِكَ."[1]

ترجمہ: "اے معبود برحق! ایسی زبان کو عذاب نہ دے جو تیرے احکامات (لوگوں کو) بتاتی ہے، اور نہ ایسی آنکھ کو عذاب دے جو ایسے علوم کو دیکھتی ہے جو تیرے وجود پر دلالت کرتے ہیں، اور نہ ایسے پیر کو عذاب دے جو تیرے دین کی خدمت میں چلتا ہے، اور نہ ایسے ہاتھ کو عذاب دے جو تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث لکھتا ہے، تجھے اپنی عزت کی قسم! مجھے جہنم میں داخل نہ فرما، کیوں کہ جہنمی جانتے ہیں کہ میں

[1] مناجات الصالحین: ۹۸

تیرے دین کا دفاع اور اس کی حمایت کرتا تھا۔ اے اللہ! میرے علم اور عمل کی آرزوؤں کو پورا فرما اور میری عمر کو دراز فرما، تاکہ میں اس چیز کو حاصل کرسکوں جس پر میں راضی ہوتا ہوں۔"

لہٰذا ائمہ کرام اس کے لیے ① الحزب الاعظم ② مستند مجموعہ وظائف ③ مناجات مقبول، یا ④ مناجات الصالحین کسی بھی قریبی دینی کتب خانے سے براہ راست منگوائیں یہ کتابیں اپنے پاس رکھیں، اور نفس پر مجاہدہ کرکے زبردستی نفس کو بٹھائیں اور ان کتابوں سے پڑھ کر دعا مانگیں، فجر کے بعد اشراق تک بیٹھیں اور مسنون اذکار جو فجر کے بعد وارد ہیں اس کا اہتمام فرمائیں۔

مذکورہ بالا کتابوں میں مسنون دعائیں شامل ہیں ان کو مانگنے سے اللہ تعالیٰ کا تعلق نصیب ہوگا، معرفت الٰہیہ حاصل ہوگی، کئی فتنوں اور پریشانیوں سے حفاظت ہوگی، اہل وعیال کی اصلاح بھی ہوگی اور ان کے اندر دین کی محبت بھی پیدا ہوگی۔ لیکن ان دعاؤں کو جب مانگیں تو پورے آداب وشرائط کو ملحوظ رکھ کر مانگیں کہ اس میں عاجزی وانکساری بھی ہو اور آہستگی بھی، کیوں کہ......

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سب کو دعا والے بنا کر گئے، یہ بھی نہیں کہ بزرگوں کے ہوتے ہوئے ہم کیا دعا مانگیں، سارے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہوتے ہوئے ایک تابعی رحمہ اللہ تعالیٰ دعا مانگتا ہے اور اس کی دعا پر سواری زندہ ہوتی ہے۔ یہ راستہ یوں نہیں دیا گیا، کہ بعض دعا والے بن جائیں، بعض شیطان بن جائیں، جب ان پر مصیبت آجائے تو وہ دعا والوں کے پاس چلے جائیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ راستہ دے کر نہیں گئے۔ نہ عالموں کو عوام پر چھوڑا، نہ حاکم کو محکوم پر، نہ محکوم کو حاکم پر چھوڑا ہے۔ تم ذرا تصور کرو اس زندگی کا کہ کوئی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی کی چیز پر نگاہ نہیں رکھتا، کوئی کسی سے کسی چیز کا لالچ نہیں

رکھتا، ہر ایک کی زندگی مستقل بن رہی ہے۔ چیزوں پر موقوف نہیں، ۲۴ گھنٹے کی
زندگی کو حضرت محمد ﷺ کے طریقوں پر گزار لو، ان کے طریقے اپنانے سے پیسہ
گھٹے تو گھٹنے دو، کیوں کہ پیسے کے راستے سے دعا قبول نہیں ہوگی، آپ ﷺ کے
راستے سے دعا قبول ہوگی تو صالح بن، تو ولی بن، تو دعا والا بن۔

قرآن وحدیث پر عمل کرو ولی بنو گے، اگر آج یہ قرآن وحدیث پر عمل کر لیں
ولی ہو جائیں گے۔ حضور ﷺ چشمہ ہیں ساری ولایتیں اسی سمندر سے پھوٹ
رہی ہیں، کوئی آدمی ایسا نہیں جو حضور ﷺ سے کٹ کر ولی بن گیا ہو۔ جو ولی بنا
ہے تو حضور ﷺ کے ساتھ بندھ کر ولی بنا ہے۔ تم خوشبودار پھول بن کر چمک
دار سورج بن کر، سخاوت کے ساتھ بہنے والا سمندر بن کر ان کے سامنے آؤ، (یہ
ساری دنیا والے) ہر چیز کو چھوڑ کر تمہاری طرف آ جائیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ
تو خود دین کے پھیلانے کی محنت کر کے دعا والا بن جا، دعا جتنی فکر سے تو اپنے لیے
مانگتا ہے، اتنی فکر سے دوسرا نہیں مانگ سکتا۔ دیکھو:

"اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْعَالِمَ" نہیں کہا۔

"اَمَّنْ يُّجِيْبُ الذَّاكِرَ" نہیں کہا۔

(بل کہ) "اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ" کہا کہ وہ بے قرار کی دعا قبول کرتا
ہے۔

تیرا ایک عمل تو یہی ہوگا کہ سیکھ دعائیں۔ دعا والا بن، خود اپنے لیے بھی دعا کر،
اور دوسروں کے لیے بھی دعا کر۔[1]

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾[2]

ترجمہ: "پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے، اللہ تعالیٰ ان لوگوں

[1] اصلاحی حسن: ۱/۲۹۰ [2] الاعراف: ۵۵

کو ناپسند کرتے ہیں، جو حد سے بڑھنے والے ہیں۔"

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

﴿تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ تضرع کے معنی "عجز وانکساری" اور "اظہار تذلل" کے ہیں
اور خفیۃ کے معنی پوشیدہ، چھپا ہوا جیسا کہ اردو زبان میں یہ لفظ اسی معنی میں بولا
جاتا ہے۔ ان دونوں لفظوں میں دعا ذکر کرنے کے لیے دو اہم آداب کا بیان ہے:

اول یہ کہ قبولیت دعا کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے
اپنے عجز، انکساری اور تذلل کا اظہار کر کے دعا کرے، اس کے بعد الفاظ بھی عجز و
انکساری کے مناسب ہوں، لب ولہجہ بھی تواضع وانکساری کا ہو، ہیئت دعا مانگنے کی بھی
ایسی ہی ہو، اس سے معلوم ہوا کہ آج کل عوام جس انداز سے دعا مانگتی ہے اول تو اس
کو "دعا مانگنا" ہی نہیں کہا جا سکتا، بل کہ "پڑھنا" کہنا چاہیے، کیوں کہ اکثر یہ بھی
معلوم نہیں ہوتا کہ ہم جو کلمات زبان سے بول رہے ہیں، ان کا مطلب کیا ہے۔

جیسا کہ آج کل عام مساجد میں اماموں کا معمول ہو گیا ہے کہ کچھ عربی زبان
کے کلمات دعائیہ انہیں یاد ہوتے ہیں، ختم نماز پر انہیں پڑھ دیتے ہیں۔ اکثر تو خود ان
اماموں کو بھی ان کلمات کا مطلب ومفہوم معلوم نہیں ہوتا اور اگر ان کو معلوم ہو تو کم از
کم ان پڑھ مقتدی تو اس سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں، وہ بے سمجھے بوجھے امام کے
پڑھے ہوئے کلمات کے پیچھے "آمین آمین" کہتے ہیں۔

اس سارے تماشے کا حاصل چند کلمات کا پڑھنا ہوتا ہے، دعا مانگنے کی جو
حقیقت ہے یہاں پائی ہی نہیں جاتی، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و
رحمت سے ان بے جان کلمات ہی کو قبول فرما کر قبولیت دعا کے آثار پیدا فرما دیں، مگر
اپنی طرف سے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دعا پڑھی نہیں جاتی بل کہ مانگی جاتی ہے، اس
کے لیے ضروری ہے کہ مانگنے کے ڈھنگ سے مانگی جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنے کلمات کے معنی بھی معلوم ہوں اور کچھ

کررہی کہہ رہا ہو تو اگر اس کے ساتھ عنوان اور لب و لہجہ اور ہیئت ظاہری تواضع و انکساری کی نہ ہو تو یہ دعا نرا ایک مطالبہ رہ جاتا ہے، جس کا کسی بندے کو کوئی حق نہیں۔

غرض پہلے لفظ میں "روحِ دعا" بتلا دی گئی کہ وہ عاجزی و انکساری اور اپنی ذلت و پستی کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت مانگنا ہے، دوسرے لفظ میں ایک دوسری ہدایت یہ دی گئی کہ دعا کا خفیہ اور آہستہ مانگنا افضل اور قرینِ قبول ہے، کیوں کہ باآوازِ بلند دعا مانگنے میں اول تو تواضع و انکساری باقی رہنا مشکل ہے، ثانیاً اس میں ریاء و شہرت کا بھی خطرہ ہے۔

ثالثاً اس کی صورتِ عمل ایسی ہے کہ گویا یہ شخص یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ "سمیع علیم" ہیں، ہمارے ظاہر و باطن کو یکساں جانتے ہیں، ہر بات خفیہ ہو یا جہر اس کو سنتے ہیں، اسی لیے غزوۂ خیبر کے موقع پر صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی آواز دعا میں بلند ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم کسی بہرے کو یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو جو اتنی بلند آواز سے کہتے ہو، بل کہ ایک سمیع و قریب تمہارا مخاطب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، (اس لیے آواز بلند کرنا فضول ہے[1]) خود اللہ جل شانہ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا ذکر ان الفاظ سے فرمایا ہے:

﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا﴾[2]

ترجمہ: "جب انہوں نے رب کو پکارا آہستہ آواز سے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو دعا کی یہ کیفیت پسند ہے کہ پست اور آہستہ آواز سے دعا مانگی جائے۔[3]

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "علانیہ اور جہراً دعا کرنے

---

[1] بخاری، المغازی، باب غزوۃ خیبر: ۲/۶۰۵

[2] مریم: ۳ [3] تفسیر ابن کثیر: ۸۲۸

میں اور آہستہ پست آواز سے دعا کرنے میں ستر درجہ فضیلت کا فرق ہے، سلف صالحین کی عادت یہ تھی کہ ذکر و دعا میں بڑا مجاہدہ کرتے اور اکثر اوقات مشغول رہتے تھے مگر کوئی ان کی آواز نہ سنتا تھا، بل کہ ان کی دعائیں صرف ان کے اور ان کے رب کے درمیان رہتی تھیں، ان میں بہت سے حضرات پورا قرآن حفظ کرتے اور تلاوت کرتے رہتے تھے، مگر کسی دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی، اور بہت سے حضرات بڑا علمِ دین حاصل کرتے، مگر لوگوں پر جتاتے نہ پھرتے تھے، بہت سے حضرات راتوں کو اپنے گھروں میں طویل طویل نمازیں ادا کرتے، مگر آنے والوں کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی" اور فرمایا: "ہم نے ایسے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ تمام عبادات جن کو وہ پوشیدہ کر کے ادا کر سکتے تھے، کبھی نہیں دیکھا گیا کہ اس کو ظاہر کر کے ادا کرتے ہوں، ان کی آوازیں دعاؤں میں نہایت پست ہوتی تھیں۔"[1]

ابن جریج رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دعا میں آواز بلند کرنا اور شور کرنا مکروہ ہے۔

امام ابوبکر جصاص حنفی رحمہ اللہ تعالیٰ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ دعا کا آہستہ مانگنا بہ نسبت اظہار کے افضل ہے۔

حضرت حسن بصری اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایسا ہی منقول ہے، اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ختم پر جو آمین کہی جاتی ہے اس کو بھی آہستہ کہنا افضل ہے، کیوں کہ آمین بھی ایک دعا ہے۔[2]

حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہمارے زمانے کے ائمہ مساجد کو اللہ تعالیٰ ہدایت فرما دیں کہ قرآن و سنت کی اس تلقین اور بزرگانِ سلف کی ہدایت کو یکسر چھوڑ بیٹھے، ہر نماز کے بعد دعا کی ایک مصنوعی سی کارروائی ہوتی ہے، بلند آواز سے کچھ کلمات پڑھے جاتے ہیں، جو آدابِ دعا کے خلاف ہونے کے علاوہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۵۲۲، الاعراف: ۵۵ [2] احکام القرآن ۳/۲۱۹، مریم: ۳

ان نمازیوں کی نماز میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں، جو مسبوق ہونے کی وجہ سے امام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی باقی ماندہ نماز پوری کر رہے ہیں۔ غلبہ رسوم نے اس کی برائی اور مفاسد کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔

کسی خاص موقع پر خاص دعا پوری جماعت سے کرانا مقصود ہو ایسے موقع پر ایک آدمی کسی قدر آواز سے دعا کے الفاظ کہے اور دوسرے آمین کہیں، اس کا مضائقہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دوسروں کی نماز و عبادات میں خلل کا موجب نہ بنیں، اور ایسا کرنے کی عادت نہ ڈالیں کہ عوام یہ سمجھنے لگیں کہ دعا کرنے کا طریقہ یہی ہے جیسا کہ آج کل عام طور سے ہو رہا ہے۔

یہ بیان اپنی حاجات کے لیے دعا مانگنے کا تھا۔ اگر دعا کے معنی اس جگہ ذکر و عبادت کے لیے جائیں تو اس میں بھی علماءِ سلف کی تحقیق یہی ہے کہ ذکرِ سر ذکر جہر سے افضل ہے۔ اور صوفیاءِ کرام میں مشائخ چشتیہ جو مبتدی کو ذکر جہر کی تلقین فرماتے ہیں، وہ اس شخص کے حال کی مناسبت سے بطور علاج کے ہے، تاکہ جہر کے ذریعہ کسل اور غفلت دور ہو جائے اور قلب میں ذکر اللہ کے ساتھ ایک لگاؤ پیدا ہو جائے، ورنہ فی نفسہٖ ذکر میں جہر کرنا، ان کے یہاں بھی مطلوب نہیں، گو جائز ہے، اور جواز اس کا بھی حدیث سے ثابت ہے، بشرطیکہ اس میں ریا و نمود نہ ہو۔

حضرت امام احمد بن حنبل رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے حضرت سعد بن مالک رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ، وَخَيْرُ الرِّزْقِ مَا يَكْفِي" [1]

تَرْجَمَہ: "یعنی بہترین ذکر خفی ہے، اور بہترین رزق وہ ہے جو انسان کے لیے کافی ہو جائے۔"

ہاں خاص خاص حالات اور اوقات میں جہر ہی مطلوب اور افضل ہے۔ ان

[1] مسند احمد: ۱/۱۷۲، رقم: ۱۴۸۰

اوقات و حالات کی تفصیل رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے واضح فرما دی ہے، مثلاً اذان و تکبیراتِ تشریق، حج میں تلبیہ بلند آواز سے کہنا وغیرہ، اسی لیے فقہاء رَحِمَہُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے فیصلہ اس باب میں یہ فرمایا ہے کہ جن خاص حالات اور مقامات میں رسول کریم ﷺ نے قولاً یا عملاً جہر کرنے کی تلقین فرمائی ہے وہاں تو جہر ہی کرنا چاہیے، اس کے علاوہ دوسرے حالات و مقامات میں ذکرِ خفی اولیٰ و انفع ہے۔ [1]

چوں کہ ائمہ حضرات کو اجتماعی دعا تو مانگنے کا موقع ملتا ہی رہتا ہے، اس لیے گزارش ہے انفرادی دعا مانگنے کا بھی خوب اہتمام ہونا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ دعا مانگنے سے اللہ تعالیٰ کا تعلق ملے گا، اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوگی اور اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا ہوگی۔

ہر امام کو چاہیے کہ اپنے پاس دعاؤں کی کتابوں کا ذخیرہ رکھے اور ان کتابوں سے خود بھی مانگتا رہے اور مقتدیوں کو بھی سکھاتا رہے۔ ہم یہاں چند کتابوں کے نام لکھتے ہیں، وہ اپنے پاس رکھیں۔

1. سلاح المؤمن في الدعاء والذكر. لأبي الفتح محمد بن محمد بن علي بن همام، ٧٤٥هـ مطبع ..... دار ابن كثير بيروت.
2. فضل الصلاة على النبي صلى الله عليه وآله وسلم، ..... للامام اسماعيل بن اسحاق القاضي ٢٨٢هـ مطبع ..... رمادى ..... السعوديه.
3. عمل اليوم والليلة ..... للحافظ ابي بكر احمد بن محمد الدينوري المعروف بابن السني المتوفى سنة ٣٦٤هـ مطبع مكتبه دار البيان دمشق.

اسی کتاب پر حضرت مفتی عاشق الٰہی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے تحقیق و تخریج احادیث کا کام کیا ہے اب وہ اس نام سے مل جاتی ہے۔

عمل اليوم والليلة ..... سلوك النبي صلى الله عليه وسلم مع

[1] معارف القرآن ۵۷۹/۴

ربه عزوجل و معاشرته مع العباد.

۴ حصن حصین ...... شرح مولانا عاشق الٰہی صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ

۵ پُرنور دعائیں ...... مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مطبع ...... ادارۃ المعارف۔

۶ ذریعة الوصول إلى جناب الرسول ...... مولانا محمد یوسف لدھیانوی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ ...... مکتبہ لدھیانوی کراچی۔

۷ مستند مجموعہ وظائف ...... اساتذہ مدرسہ بیت العلم ...... بیت العلم ٹرسٹ۔

۸ صبح وشام کی مسنون دعائیں ...... ابومحمد زمزمی ...... بیت العلم ٹرسٹ۔

۹ کتاب الدعاء ...... صاحبزادہ عبدالباسط ...... عالمی حلقۂ دروسِ قرآن و حدیث کراچی۔

۱۰ استغفار کی ستر دعائیں مع ستر درود شریف ...... مطبوعہ بیت العلم ٹرسٹ کراچی۔

ائمہ کرام ان کتابوں کا خوب مطالعہ فرمائیں اور اپنے رب سے خلوت میں مناجات کریں۔

حضرت عیسیٰ عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ نے ایک مرتبہ اپنے حواریوں سے فرمایا:

"يَا مَعْشَرَ الْحَوَارِيِّيْنَ! كَلِّمُوا اللهَ كَثِيْرًا، وَكَلِّمُوا النَّاسَ قَلِيْلًا" قَالُوْا: "كَيْفَ نُكَلِّمُ اللهَ كَثِيْرًا؟" قَالَ: "اِخْلُوْا بِمُنَاجَاتِهٖ، اِخْلُوْا بِدُعَائِهٖ." قِيْلَ لِمُحَمَّدِ بْنِ النَّضْرِ: "أَمَا تَسْتَوْحِشُ وَحْدَكَ؟" قَالَ: "كَيْفَ أَسْتَوْحِشُ وَهُوَ يَقُوْلُ أَنَا جَلِيْسُ مَنْ ذَكَرَنِيْ"

إِذَا قَوِيَ حَالُ الْمُحِبِّ وَمَعْرِفَتُهٗ لَمْ يَشْغَلْهُ عَنِ الذِّكْرِ بِالْقَلْبِ وَاللِّسَانِ شَاغِلٌ فَهُوَ بَيْنَ الْخَلْقِ بِجِسْمِهٖ وَقَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَحَلِّ الْأَعْلٰى كَمَا قَالَ عَلِيٌّ -رَضِيَ اللهُ عَنْهُ- فِيْ وَصْفِهِمْ: "صَحِبُوا الدُّنْيَا بِأَجْسَادٍ أَرْوَاحُهَا مُعَلَّقَةٌ بِالْمَلَإِ الْأَعْلٰى" وَفِيْ هٰذَا الْمَعْنٰى قِيْلَ:

جِسْمِيْ مَعِيْ غَيْرَ أَنَّ الرُّوْحَ عِنْدَكُمْ
فَالْجِسْمُ فِيْ غُرْبَةٍ وَالرُّوْحُ فِيْ وَطَنِيْ [1]

ترجمہ: "حضرت عیسیٰ عَلَیْهِ السَّلَامُ نے اپنے حواریوں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ بات کیا کرو اور لوگوں سے بہت کم بات کرو۔ تو حواریوں نے کہا کہ ہم کیسے اللہ تعالیٰ سے زیادہ بات کریں؟

حضرت عیسیٰ عَلَیْهِ السَّلَامُ نے فرمایا: "خلوت میں مناجات کرو اور اسی سے مانگو۔"

محمد بن نضر رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اکیلے میں وحشت نہیں ہوتی؟ انہوں نے فرمایا: "مجھے کیسے وحشت ہو سکتی ہے کہ میں اس کے ساتھ ہم نشین ہوں جو مجھے ہر وقت یاد رکھتا ہے۔"

جب مالکِ حقیقی سے محبت کا تعلق مضبوط ہوجاتا ہے تو قلب اور لسان کو اس کے ذکر کے سوا کسی اور کا ذکر بھاتا نہیں، پھر وہ انسان جسم کے اعتبار سے تو مخلوق کے ساتھ مشغول رہتا ہے اور دل اس شخص کا اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ کے ساتھ مشغول رہتا ہے، جیسا کہ سیدنا علی رَضِیَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُ نے فرمایا: "ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اجسام دنیا والوں کے ساتھ ہیں اور ان کی روحیں اوپر والے سے ملی ہوئی ہیں۔"

اسی بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے۔

"میرا جسم تو میرے ساتھ ہے، ہاں میری روح آپ کے پاس ہے، جسم تو سفر میں ہے اور روح وطنِ حقیقی (آخرت) کی فکر میں مشغول ہے۔"

اللہ تعالیٰ سے ذکر ودعا کے ذریعے اتنا تعلق پیدا ہوجائے کہ ہر کام کے آخر میں اور ہر کام کے شروع میں مقصود ومطلوب محض رضاء الٰہی بن جائے۔

۸ اتباعِ سنت:

ائمہ کرام کو چاہیے کہ ان کا ہر کام سنت کے مطابق ہو، کوئی کام خلاف شرع یا

[1] شرح الاسماء الحسنیٰ لابن قیم: ۱۹۵

خلافِ سنت نہ ہو، ورنہ مقتدی اس کو دلیل و حجت بنا کر پیش کریں گے کہ ہم جو کام کرتے ہیں، یہ تو ہمارے امام صاحب یا فلاں مولوی صاحب بھی کرتے ہیں لہٰذا ائمہ کرام کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں: حضرت ابن عطاء اللہ اسکندری کا ایک ملفوظ ہے۔ فرمایا: "جب تم رسول کریم ﷺ کی اتباع کرو گے تو اتنا ہی بھلائی کی طرف چلو گے اور جتنا اتباع سے دوری ہوگی، اتنی ہی ہلاکت ہوگی۔"

فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے نزدیک آج قبولیت کے دروازے بند ہیں، بجز اتباعِ نبی کریم ﷺ کے۔ اور آج کوئی نجات نہیں پاسکتا بغیر کامل اتباع کے۔"

فرمایا: "اللہ نے ساری نیکیاں ایک مکان میں جمع کردیں اور اس کی کنجی اتباعِ رسول اللہ ﷺ ہے۔"

فرمایا: "یقین کیجیے کہ عبادت کا جو طریقہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُمْ نے اختیار نہیں کیا وہ دیکھنے میں کتنا ہی دل کش اور بہتر نظر آئے، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک اچھا نہیں۔"

فرمایا: "سنت کے موافق نکاح میں نورانیت ضرور ہوتی ہے اور یہ بھی بات ہے کہ جتنی سہولت ہوتی ہے اتنی ہی نورانیت قلب میں ہوتی ہے؛ کیوں کہ جھگڑا بکھیڑا ہوتا نہیں۔ اس لیے انشراح رہتا ہے اور جہاں طوالت اور جھگڑے ہوتے ہیں وہاں ضرور قلب میں کدورت اور ظلمت ہوتی ہے۔"[1]

حضرت عثمان رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ کی سنت کی پیروی

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضرت عثمان رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ آں حضرت

[1] مجالس مفتی اعظم ۷۹، ۸۱، ۸۲، ۶۹، ۱۸۷

ﷺ کے ایلچی کی حیثیت سے مکہ مکرمہ پہنچے اور مکہ مکرمہ کے سرداروں سے ملنے کے لیے جانے لگے تو ان کا ازار طریق سنت کے مطابق ٹخنوں سے اوپر تھا۔ مکہ مکرمہ کے سرداروں کے عام رواج کے مطابق یہ طریقہ کسی سردار کے شایانِ شان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چناں چہ حضرت عثمان رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ کو ان کے چچازاد بھائی نے ٹوکا کہ آپ مکہ کے سرداروں کے پاس جارہے ہیں، وہ آپ کی اس وضع کو نہ جانے کیا سمجھیں گے، اس لیے اپنا ازار ٹخنوں سے نیچے کرلیجیے۔ لیکن حضرت عثمان رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ:

"هٰكَذَا إِزْرَةُ صَاحِبِنَا۔"[1]

ترجمہ: "ہمارے آقا (ﷺ) کا ازار اسی طرح ہوتا ہے۔"

صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُمْ کے اس طرح کے واقعات سے بلاشبہ ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ اہلِ علم کے سامنے اس قسم کے واقعات زیادہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن توجہ دراصل اس طرف دلانی ہے کہ اسلام نے دنیا کی تاریخ میں جو انقلاب برپا کیا وہ صرف اور صرف اللہ کے احکام کی پاس داری اور سنتِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات ہی سے کیا۔

علماء کو بہت سے جائز کام بھی چھوڑنے پڑتے ہیں

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں: میں اپنے دوستوں سے اور علماء وطلبہ سے یہی بات کہا کرتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو عوام کی طرح سمجھ کر یہ مت کہو کہ یہ کام جائز تھا، اس لیے ہم نے کرلیا۔ بل کہ علماء کو بہت سے جائز کاموں سے بھی اس لیے رکنا پڑتا ہے، تاکہ عوام گمراہ نہ ہوں، علماء کو بہت سے ایسے جائز کام چھوڑنے پڑتے ہیں جن میں خطرہ یہ ہو کہ عوام کو کوئی مغالطہ لگ جائے گا۔ ایسے

[1] مصنف ابن ابی شیبۃ، المغازی، غزوۃ الحدیبیۃ: ۸/۵۱۲

کاموں سے بھی علماء کو بچنا چاہیے، اس واسطے کہ تم اپنی ظاہری وضع قطع سے دعویٰ کر رہے ہو کہ ہم اللہ والے ہیں اور اللہ والوں کا جو طرز عمل ہے اہل علم کو اس کے خلاف نہیں کرنا چاہیے۔ چاہے وہ حقیقت میں جائز ہی ہو۔[1]

امام ابوشامہ نے اپنی کتاب "الباعث" میں لکھا ہے کہ:

عالم کو ایسا کام نہیں کرنا چاہیے، جس سے عوام کسی مخالف شریعت امر کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک کام پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا، جس کی ظاہری شکل سے جاہل عوام کے دھوکہ میں پڑنے کا اندیشہ تھا، چناں چہ "موطا امام مالک" میں حضرت نافع رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو احرام کی حالت میں رنگین کپڑا پہنے ہوئے دیکھا، تو پوچھا کہ طلحہ یہ کیا ہے؟

حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: "امیر المومنین! یہ مٹی سے رنگا ہوا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "لوگوں کے تم امام ہو، لوگ تمہاری اقتداء کریں گے، اگر کوئی جاہل اس کپڑے کو دیکھے گا تو ضرور یہ کہے گا کہ طلحہ احرام کی حالت میں رنگین کپڑا پہنے ہوئے تھے۔ اس لیے تم یہ رنگین کپڑے مت پہنو۔"[2]

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ایک ہی کام کا شرعی دلیلوں کی رو سے کرنا اور چھوڑنا دونوں بمقتضائے مصلحت مستحب ہوتا ہے۔ مسلمان کبھی مستحب کام کو اس لیے چھوڑ دیتا ہے کہ اس کے کرنے میں فساد کا اندیشہ ہوتا ہے، جس طرح نبی کریم ﷺ نے بناء ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام پر بیت اللہ کی تعمیر نہیں کی اور حضرت عائشہ

[1] مجالس مفتی اعظم: ۲۰۰

[2] موطا الامام مالک، الحج، باب لبس الثياب المصبغة في الاحرام: ۳۳۲

صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا:

"لَوْلَا أَنَّ قَوْمَكِ حَدِيثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ لَأَمَرْتُ بِالْبَيْتِ فَهُدِمَ فَأَدْخَلْتُ فِيهِ مَا أُخْرِجَ مِنْهُ وَأَلْزَقْتُهُ بِالْأَرْضِ وَجَعَلْتُ لَهُ بَابَيْنِ: بَابًا شَرْقِيًّا وَبَابًا غَرْبِيًّا."[1]

ترجمہ: "اگر تمہاری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی، تو میں کعبہ کے گرانے کا حکم دیتا اور اس میں وہ حصہ داخل کرتا جو اس میں سے نکال دیا گیا ہے اور اس کے دو دروازے بناکر زمین کے ساتھ برابر کرتا ایک دروازہ مشرق کی طرف ہوتا اور دوسرا دروازہ مغرب کی طرف۔"

یہاں پر نبی کریم ﷺ نے مصلحۃً لوگوں کو متنفر نہیں کیا اور افضل کام کو ترک کر دیا۔[2]

(۶) استغناء:

مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب "ملفوظات مولانا الیاس" میں لکھتے ہیں کہ مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر فرمایا:

"بعض اہل دین اور اصحاب علم کو استغناء کے باب میں بڑا سخت مغالطہ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ استغناء کا مقتضی یہ ہے کہ اغنیاء اور اہل ثروت سے مطلقاً ملا ہی نہ جائے اور ان کے اختلاط سے مکمل پرہیز کیا جائے، حالاں کہ استغناء کا منشاء صرف یہ ہے کہ ہم ان کی دولت کے حاجت مند بن کر ان کے پاس نہ جائیں اور طلب جاہ و مال کے لیے ان سے نہ ملیں، لیکن ان کی اصلاح کے لیے اور دینی مقاصد کے لیے ان سے ملنا اور اختلاط رکھنا ہرگز استغناء کے منافی نہیں، بل کہ یہ تو اپنے درجہ میں ضروری ہے، ہاں اس چیز سے بہت ہوشیار رہنا چاہیے کہ ان کے اس اختلاط سے

[1] النسائي، المناسك، باب بناء الكعبة: ۲/۳۳، ۳۴

[2] اصلاح المساجد: ۱۵، ۱۶

ہمارے اندر حب مال وحب جاہ اور دولت کی حرص پیدا نہ ہو جائے۔[1]

لہٰذا ہم سب کو چاہیے کہ ہم نیت کرلیں کہ حتی الامکان اپنی ذاتی ضروریات یا مسجد، مدرسہ کی اجتماعی ضرورت کا ذکر اللہ تعالیٰ کے غیر سے نہیں کریں گے، بل کہ ہر حال میں ہر ضرورت کو اللہ ہی کے سامنے پیش کریں گے، اساتذہ اور طلبہ سے کہیں گے روزہ رکھ کر، اعتکاف کرکے، صلاۃ الحاجت پڑھ کر دعا مانگو۔

اس بارے میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک استفتاء ''چندہ مانگنے کا مروجہ طریقہ'' کے جواب میں جو ارشاد فرمایا ہے ہم سب کو چاہیے کہ خوب توجہ اور زیادہ دھیان سے ان کے الفاظ پڑھ کر دعا مانگیں کہ اللہ تعالیٰ اس فقیہ العصر ولی کامل اور جید عالم باعمل کے قلم مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کو ہمارا حقیقی حال بنادے آمین۔

صِيَانَةُ الْعُلَمَاءِ عَنِ الذُّلِّ عِنْدَ الْأَغْنِيَاءِ

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اس دور میں دینی اقدار کے سقوط کا ایک نہایت ہی دردناک سانحہ یہ بھی ہے کہ دینی کاموں بالخصوص دینی مدارس کے لیے چندہ کرنے کا عام دستور یوں چل پڑا ہے کہ مدارس کے سفیر اہل ثروت کی دکانوں اور مکانوں پر جا جا کر خوشامد، تملق اور الحاح واصرار کے ساتھ دست سوال دراز کرتے ہیں، اہل ثروت ان کو ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں، بل کہ بسا اوقات ان کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرکے ان کی تذلیل کرتے ہیں، جو درحقیقت دین اسلام کی تذلیل ہے۔

یہ اتنا بڑا المیہ ہے کہ اس کے تصور سے بھی شرم سے آنکھیں جھک جاتی ہیں اور دل پر آرے چلنے لگتے ہیں، دین اور علماء دین کی اس تذلیل و توہین میں اہل مدارس

[1] ملفوظات مولانا الیاس: ۱۴

اور اہل ثروت دونوں برابر کے مجرم ہیں۔

اس رسالے میں ان دونوں طبقوں کے لیے صراط مستقیم کی ہدایت ہے، اللہ کرے کہ ایک عاجز (حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز کسی دل میں اتر جائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو فکر آخرت عطا فرمائیں آمین۔

چندہ مانگنے کا صحیح طریقہ

سوال: آج کل عام طور پر دینی مدارس میں یہ دستور ہوگیا ہے کہ چندہ کرنے کے لیے مستقل سفیر رکھے جاتے ہیں، جو مختلف لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں لوگوں کے مکانوں اور دکانوں پر پہنچتے ہیں، اور ان میں سے بیشتر کچھ نہ کچھ وصول کرنے کے لیے بے حد اصرار کرتے ہیں، بالخصوص ماہ رمضان میں دینی مدارس کے سفیروں کی ٹولیاں نظر آتی ہیں، جن کے خوف سے اکثر دکان دار پردہ میں چھپ کر بیٹھتے ہیں، کیا چندہ کرنے کا یہ طریقہ شرعاً درست ہے، حالاں کہ یہ ایک قسم کا جبر ہے؟

اَلْجَوَابُ بِاسْمِ مُلْهِمِ الصَّوَاب

مدارس دینیہ کے لیے آج کل چندہ کرنے کا جو طریقہ مروج ہے جس کی قدرے تفصیل سوال میں لکھی گئی ہیں یہ قطعاً ناجائز ہے، دینی کام کرنے والوں کو مستغنی رہنا چاہیے، استغناء اور دین کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے از خود جتنی رقم کا انتظام ہوجائے اسی قدر کام پر اکتفاء کریں اور اگر چندہ کرنا ہی ہے تو عام خطاب کی گنجائش ہے۔ خاص خطاب ہرگز جائز نہیں، بعض دفعہ عام خطاب بھی بحکم خطاب خاص ہوتا ہے، وہ اس صورت میں کہ عام مجلس میں کچھ خواص موجود ہوں، جو اس عام خطاب کے بعد کچھ رقم نہ دینے میں عار محسوس کرتے ہوں، تو یہ صورت بھی بحکم خطاب خاص ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ خطاب عام میں بھی زیادہ الحاح واظہار

احتیاج درست نہیں، بل کہ استغناء کے ساتھ اظہار مصرف پر اکتفاء کرنا چاہیے۔

آج کل ایک عام دستور یہ ہوگیا ہے کہ اہلِ خیر کو کسی بہانے سے کہیں جمع کرکے ان سے رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے، یہ طریقہ انفرادی طور پر کسی سے کچھ سوال کرنے کی بہ نسبت بھی زیادہ قبیح ہے۔ اس صورت میں مجمع میں رسوائی سے بچنے کے لیے بادلِ ناخواستہ چندہ دینا پڑتا ہے، جو بلاشبہ جبر ہے، اس لیے یہ طریقہ بالکل ناجائز اور حرام ہے۔

اگر کوئی شخص انفرادی طور پر کسی سے چندہ مانگتا ہے تو ان کے آپس میں تعلق کی تین قسمیں ہیں: ① وجاہت ② محبت ③ اجنبیت۔

اگر ایسے شخص کے پاس چندہ کرنے کے لیے گیا کہ جس پر اس کی وجاہت کا اثر ہے، خواہ وہ دینی مرتبہ کی وجہ سے ہو یا دنیوی مال ودولت یا منصب کی بنا پر، یہ صورت ناجائز ہے۔ اس لیے کہ اس میں چندہ دہندہ جانے والے کی وجاہت سے متاثر ہوکر بادلِ ناخواستہ رقم دیتا ہے جو حلال نہیں، چناں چہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ"

"کسی بھی شخص کا مال حلال نہیں، مگر اس کے دل کی خوشی کے ساتھ۔"[1]

اور اگر بغیر کسی خاص تعلق اور رابطہ کے چندہ کرنے جاتا ہے تو اس میں اپنی توہین ہے اور اس سے بھی بڑھ کر اسلام کی توہین ہے، اس لیے یہ بھی ناجائز ہے۔

باقی صرف محبت کا تعلق رہ گیا، اس کی دلیل یہ ہے کہ آپس میں اس قدر بے تکلفی ہو کہ جس سے چندہ طلب کیا گیا وہ اپنی کسی مصلحت کی بنا پر چندہ نہ دینا چاہے تو اسے انکار کرنے میں ذرا بھی تکلف اور ندامت نہ ہو اور اس کے انکار کرنے پر طلب کرنے والے کو ذرا بھی ناگواری نہ ہو، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا حضور اکرم ﷺ کے ساتھ اسی قسم کا تعلق محبت تھا، احادیث میں اس کی بہت سی مثالیں

[1] مسند احمد: ۵/۷۲، رقم: ۲۰۱۷۲

موجود ہیں۔ مثلاً:

"حضور اکرم ﷺ نے کسی صحابی کو کوئی مشورہ دیا انہوں نے قبول نہیں کیا"

نہ ان صحابی کو انکار کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس ہوئی اور نہ ہی حضور اکرم ﷺ کے لیے ان کا انکار ناگواری کا باعث بنا۔ غرض یہ کہ اس قسم کی بے تکلفی کا تعلق ہو تو چندہ کے لیے خطاب خاص بھی جائز ہے۔ مگر آج کل ایسا تعلق مفقود ہے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ آج کل خطاب خاص بہرحال ناجائز ہے۔

اہلِ مدارس کی اس بے راہ روی اور دروازوں پر خاک چھاننے کی بنیاد تین چیزوں پر ہے:

① کام شروع کرتے ہی اپنے ذہن میں لمبا چوڑا نقشہ مرتب کرلیتے ہیں کہ اتنے طلبہ کے طعام اور قیام کا انتظام کیا جائے گا، اتنے کمرے بنیں گے، اتنی درسگاہیں ہوں گی، اتنے اساتذہ ہوں گے، اتنا بڑا کتب خانہ ہوگا، حتیٰ کہ سنگِ بنیاد رکھنے سے قبل ہی دار العلوم اور جامعہ جیسے نام تجویز ہوجاتے ہیں، اب اتنے بڑے کام کے لیے سرمایہ موجود نہیں ہوتا تو اہلِ ثروت کے دروازوں پر بھیک مانگتے پھرتے ہیں اور دین کو ذلیل کرتے ہیں۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ ابتداءً مختصر سے کام کی بنیاد رکھی جائے، اس کے بعد جیسے جیسے اسباب پیدا ہوتے چلے جائیں کام کو اسی مقدار سے بڑھاتے جائیں، یعنی جتنی رقم اپنی اور دین کی عزت اور وقار کو باقی رکھتے ہوئے استغناء کے ساتھ حاصل ہوجائے صرف اسی قدر کام کا آغاز کیا جائے۔ آگے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو وہ آپ کے اس چھوٹے سے کام کو دار العلوم اور جامعہ بھی بنادیں گے، ورنہ ان کی مرضی کے مطابق جتنا کام بھی ہوسکے اسی کو غنیمت سمجھا جائے۔ اس کا ظاہراً چھوٹا سا وجود بھی عند اللہ بہت بڑا ہوگا۔

② مدرسہ کو ایسا مقصود بنالیا جاتا ہے کہ اس کی حفاظت وبقا پر دین کو قربان کردیا

جاتا ہے، حالاں کہ اصل مقصود دین ہے۔ مدارس حفاظت دین کا ذریعہ ہیں۔ پس ذریعہ کی حفاظت پر مقصود کو قربان کر دینا کتنا بڑا ظلم اور کیسی ناعاقبت اندیشی ہے۔ حدودِ شرع کے اندر اگر مدرسہ نہ چل سکے تو اسے بند کر دیا جائے، ہم اس کے مکلف نہیں۔

دیوبند کے ایک بااثر رئیس نے دار العلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن بننے کا مطالبہ کیا، حضرت گنگوہی قدس سرہ اسے اس لائق نہ سمجھتے تھے۔ حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے مشورۃً لکھا: "اس شخص کو رکن نہ بنانے میں اس سے فساد کا خطرہ ہے اور رکن بنانے میں کوئی خطرہ نہیں، کیوں کہ اکثریت ہماری ہے۔"

حضرت گنگوہی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے جواب تحریر فرمایا: "اگر عند اللہ مجھ سے یہ سوال ہوا کہ نالائق کو رکن کیوں بنایا؟ تو اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوگا اور رکن نہ بنانے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی ضرر ہو سکتا ہے کہ مدرسہ بند ہو جائے گا، میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا یہ جواب دے سکوں گا کہ میں نے تو آپ کے حکم کی تعمیل کی اس پر اگر مدرسہ بند ہو گیا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" حضرت گنگوہی قدس سرہ کے اس تقویٰ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رئیس صاحب مدرسے کے خلاف چیختے رہ گئے، مگر دار العلوم مسلسل حیرت انگیز ترقی پر گامزن رہا۔

۳ اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد کا فقدان، اگر اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد ہوتا اور "اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ"[1] کے مطابق اللہ تعالیٰ سے حسن ظن ہوتا تو اس کریم کے دروازے کو چھوڑ کر دنیا داروں کے دروازوں پر دھکے نہ کھاتے۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ غیب سے وہ معاملہ فرماتے کہ اہل ثروت ان کے دروازوں پر ناک رگڑتے۔ افسوس اور تعجب ہے کہ قرآن و حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں کی نظریں:

﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ﴾[2]

[1] بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ ویحذرکم اللہ نفسہ، رقم: ۷۴۰۵
[2] محمد: ۷

تَرْجَمَۃ: "اگر تم مدد کرو گے اللہ تعالیٰ (کے دین) کی، تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے پاؤں جما دے گا۔"

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾[1]

تَرْجَمَۃ: "اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو۔"

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ......﴾ ...... ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا﴾[2]

تَرْجَمَۃ: "اور جو کوئی بھروسہ رکھے اللہ تعالیٰ پر تو وہ اس کو کافی ہے...... اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ سے، کر دے وہ اس کے کام میں آسانی۔"

﴿وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً﴾[3]

تَرْجَمَۃ: "اور جو کوئی وطن چھوڑے اللہ کی راہ میں، پائے گا اس کے مقابلے میں جگہ بہت اور کشائش۔"

"وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ."[4]

تَرْجَمَۃ: "اور جو شخص پاک دامنی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پاک دامن بنا دیتے ہیں اور جو شخص استغناء اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو غنی کر دیتے ہیں۔"

جیسی نصوص پر کیوں نہیں پڑتیں اور اللہ و رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے یہ ارشادات ان

[1] الطلاق: ۲، ۳ [2] الطلاق: ۳، ۴ [3] النساء: ۱۰۰
[4] بخاری، الزکاۃ، باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی: ۱/۱۹۲، رقم: ۱۴۲۷

کے دلوں میں کیوں نہیں اترتے اور ان قطعی وعدوں پر ان کو یقین کیوں نہیں آتا اور اس دعا کی توفیق کیوں نہیں ہوتی:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِمَّنْ تَوَكَّلَ عَلَيْكَ فَكَفَيْتَهٗ وَاسْتَهْدَاكَ فَهَدَيْتَهٗ وَاسْتَنْصَرَكَ فَنَصَرْتَهٗ."[1]

ترجمہ: "اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے بنادے، جنہوں نے تجھ پر بھروسہ کیا تو تونے ان کو بے نیاز کردیا اور جنہوں نے تجھ سے ہدایت مانگی تو تونے ان کو ہدایت دے دی اور جنہوں نے تجھ سے مدد مانگی تو تونے ان کی مدد کردی۔"

مروجہ طور پر چندہ کرنے کے فسادات وقبائح اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن اور ان پر توکل واعتماد کی تعلیم پر حضرت تھانوی قدس سرہ کا ایک وعظ "تَأْسِيْسُ الْبُنْيَانِ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ" ہے۔ نیز حضرت قدس سرہ کا ایک رسالہ "اَلتَّوْرِيْعُ عَنْ فَسَادِ التَّوْزِيْعِ" بھی ہے جس میں چندہ کرنے کے مفاسد کے علاوہ رقوم چندہ کے مصارف کے مفاسد بھی بیان فرمائے ہیں، اہل مدارس (علماء وائمہ) پر لازم ہے کہ ان دونوں رسالوں کو حرزِ جان بنالیں اور ان کے مطالعے کا معمول ہمیشہ کے لیے جاری رکھیں۔

اپنے قول وعمل اور استغناء وخودداری سے اہل ثروت پر یہ حقیقت واضح کردیں کہ اللہ تعالیٰ کا دین تمہاری اعانت کا محتاج نہیں، بل کہ تم محتاج ہو اور تمہاری اپنی ضرورت ہے کہ تمہاری رقوم کسی دینی کام میں لگ جائیں، اس لیے اہل مدارس پر تمہارا کوئی احسان نہیں، بل کہ اہل مدارس کا تم پر احسان ہے کہ تمہاری رقوم کو صحیح مصرف پر لگانے کا انتظام کرتے ہیں۔

علم دین کا مقام تو بہت بلند ہے کسی عامی مسکین کو صدقہ دینے والے کے

[1] کنز العمال، الأول، الأذکار: ۲/۲۹۲، رقم: ۵۱۰۳

بارے میں "احیاء علوم الدین" میں مشہور محدث امام شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نقل فرمایا ہے کہ "جو شخص اپنے آپ کو ثواب کا اس سے زیادہ محتاج نہ سمجھے جتنا فقیر کو اپنے صدقے کا محتاج سمجھتا ہے اس نے اپنے صدقے کو ضائع کردیا اور وہ صدقہ اس کے منہ پر ماردیا جاتا ہے۔"[1] لہٰذا اہل ثروت کو اہل مدرسہ کا شکر گزار رہنا چاہیے کہ ان کی رقوم قبول کرکے ان کی حفاظت کرتے ہیں اور صحیح مصرف پر لگاتے ہیں۔

اہل ثروت کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے دین کی حفاظت کے لیے ان کے خزانوں کی ضرورت نہیں۔

﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝﴾[2]

ترجمہ: "یہی وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں ان پر خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ ادھر ادھر ہوجائیں اور آسمان وزمین کے کل خزانے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، لیکن یہ منافق بے سمجھ ہیں۔"

اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے کتراؤ گے تو اللہ تعالیٰ خدمتِ دین کا کام کسی اور سے لے لیں گے۔

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝﴾[3]

ترجمہ: "اور اگر تم روگرداں ہوجاؤ تو وہ تمہارے بدلے تمہارے سوا اور لوگوں کو لائے گا جو پھر تم جیسے نہ ہوں گے۔"

ان شاء اللہ تعالیٰ دین کا کام بند نہیں ہوگا اگر بظاہر کوئی مدرسہ بند بھی ہوگیا تو

[1] احیاء علوم الدین، کتاب اسرار الزکاۃ، الفصل الرابع فی صدقۃ التطوع وفضلها ۱/۲۱۸

[2] المنافقون: ۷ [3] محمد: ۳۸

درحقیقت وہ بند نہیں ہوا بل کہ اہل ثروت کی بے قدری اور ناشکری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ چشمہ کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا ہے اور ان لوگوں کی اصلاح کو کسی دوسری جگہ کے ساتھ وابستہ فرما دیا ہے، جیسے کوئی نادان بچہ یا کوئی دیوانہ پھونکوں سے چراغ بجھانا چاہے تو چراغ کو اٹھا کر کہیں دور رکھ دیا جاتا ہے، اب کسی کو روشنی کی ضرورت ہو تو چل کر چراغ کے پاس جائے، حکومت نے کسی علاقہ سے انتظامیہ کا دفتر یا ہسپتال اٹھا دیا تو یہ کام ختم نہیں کر دیا گیا، بل کہ وہاں کے باشندوں کی نالائقی کی وجہ سے ان سے قرب کی سہولت اٹھا کر ان کا انتظام یا علاج دور کسی مقام سے وابستہ کر دیا ہے۔

علماء کا اہل ثروت کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور زبان کھولنا تو در کنار کسی گوشۂ قلب میں بھی ان کی طرف میلان نہ پایا جائے، قلبی جھکاؤ کا بھی یہ اثر ہوتا ہے کہ ایسے علماء کی اہل ثروت کے قلوب میں عظمت باقی نہیں رہتی۔

دارالعلوم سے ایک منتہی طالب علم خواب کی تعبیر دریافت کرنے میرے (یعنی حضرت مفتی رشید احمد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے) پاس آئے، خواب میں دیکھا کہ امام محمد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی تشریف فرما ہیں، آپ کے سامنے ایک نہایت حسین نوجوان عورت جو سنگار کر کے مزین لباس میں بیٹھی ہوئی ہے اور وہ اپنے کو امام محمد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی بیوی ظاہر کر رہی ہے اور خوشامد کر رہی ہے کہ امام محمد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ایک نظر اس کی طرف دیکھیں مگر امام محمد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نہایت استغناء کے ساتھ کسی دینی کام میں مشغول ہیں۔

میں نے ان مولوی صاحب سے دریافت کیا:

"آپ کو تعلیم سے فراغت کے بعد معاش کی فکر ہو رہی ہے؟"

انہوں نے کہا: "اس فکر میں بعض دفعہ نیند نہیں آتی۔"

میں نے کہا: "بس اس خواب میں اسی مرض کا علاج بتایا گیا ہے، امام محمد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی جیسا علم حاصل کرو تو دنیا اپنی تمام تر زیب و زینت کے ساتھ تمہاری

ایک نظر کی خواہش مند ہوگی اور تم کہو گے کہ مجھے ضرورت نہیں" علماء اللہ تعالیٰ پر اعتماد بحال کر کے "أَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ"[1] اس کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے کا مشاہدہ کریں۔

عالمگیر رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے زیر نگیں ایک ریاست کا والی ہندو راجہ تھا وہ مر گیا، اس کا بیٹا نابالغ تھا، عالمگیر رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ اس لڑکے میں حکومت کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں اسے طلب کیا، اتفاقاً آپ اس وقت حوض کے کنارے پر تھے، مزاحاً لڑکے کو بازوؤں سے پکڑ کر حوض پر لٹکا کر فرمایا، چھوڑ دوں؟ لڑکے نے کہا کہ "جس کا ہاتھ بادشاہ کے ہاتھ میں ہو اسے ڈوبنے کا کیا خوف!"

ایک بچے کے بچے کو ایک مخلوق بادشاہ پر اتنا اعتماد، کاش! آج کے مسلمان کو مالک ارض و سماء پر اس جیسا اعتماد حاصل ہو جائے۔

ایک بہروپیہ کو زاہد کے روپ میں دیکھ کر عالمگیر رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے ایک ہزار اشرفی نذرانہ پیش کیا، مگر اس نے صرف اہل اللہ کی نقل اتارنے کی غرض سے اسے ٹھکرا دیا، کاش! کہ اہل ثروت کے دروازوں پر بھٹکنے والی نظریں اس بہروپیہ سے اہل اللہ کی نقل اتارنے ہی کا سبق حاصل کر لیں۔[2]

دل کی خوشی کے ساتھ چندہ لینا چاہیے

حکیم الامت حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی مدرسوں کے چندے اور انجمنوں کے چندے کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: "یہ چندے اس طرح وصول کرنا کہ دوسرا شخص دباؤ کے تحت چندہ دے دے، ایسا چندہ حلال نہیں۔ مثلاً آپ نے مجمع عام میں چندہ لینا شروع کر دیا، اس مجمع میں ایک آدمی شرما شرمی میں یہ سوچ کر چندہ

[1] ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب احاديث ابتليها بالفقر ا، رقم ٢٤٦٥
[2] احسن الفتاوی: ١/ ٤٣٧ تا ٤٤١

دے رہا ہے کہ اتنے سارے لوگ چندہ دے رہے ہیں اور میں چندہ نہ دوں تو میری ناک کٹ جائے گی اور دل کے اندر چندہ دینے کی خواہش نہیں تھی تو یہ چندہ خوش دلی کے بغیر دیا گیا۔ یہ "چندہ" لینے والے کے لیے حلال نہیں۔" اس موضوع پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس میں یہ احکام لکھے ہیں کہ کس حالت میں چندہ لینا جائز ہے اور کس حالت میں چندہ لینا جائز نہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک شخص کے محض دنبی مانگنے کو ظلم قرار دیا، حالاں کہ بظاہر کسی سے محض کوئی چیز مانگ لینا کوئی جرم نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صورت سوال کی تھی، لیکن جس قولی اور عملی دباؤ کے ساتھ یہ سوال کیا جاتا رہا اس کی موجودگی میں اس کی حیثیت غصب کی سی ہوگئی تھی۔

اس سے معلوم یہ ہوا کہ اگر کوئی آدمی کسی سے اس طرح کوئی چیز مانگے کہ مخاطب راضی ہو یا ناراض؛ لیکن اس کے پاس دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو اس طرح ہدیہ طلب کرنا بھی غصب میں داخل ہے۔

لہٰذا اگر مانگنے والا کوئی صاحب اقتدار یا ذی وجاہت ہو اور مخاطب اس کی شخصیت کے دباؤ کی وجہ سے انکار نہ کر سکتا ہو تو وہاں صورت چاہے ہدیہ طلب کرنے کی ہو، لیکن حقیقت میں وہ غصب ہی ہوتی ہے اور مانگنے والے کے لیے اس طرح حاصل کی ہوئی چیز کا استعمال جائز نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے بہت توجہ کرنے کا ہے، جو مدارس...... مکاتب...... مسجد...... یا انجمنوں...... اور جماعتوں...... کے لیے چندے وصول کرتے ہیں۔ صرف وہ چندہ حلال طیب ہے جو دینے والے نے اپنے مکمل اختیار اور خوش دلی کے ساتھ دیا ہو۔ اگر چندہ کرنے والوں نے اپنی شخصیت کا دباؤ ڈال کر یا بیک وقت آٹھ دس آدمیوں نے کسی ایک شخص کو زچ کر کے وصول کر لیا تو یہ صریح ناجائز فعل ہے۔ حدیث میں آں

حضرت ﷺ کا واضح ارشاد ہے:

"لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ." [1]

ترجمہ: "کسی بھی شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں۔"

دنیا کی طرف میلانِ قلبی سے بچنا چاہیے

دنیا میں کفار و فجار کی عیش و عشرت اور دولت و حشمت ہمیشہ ہی سے ہر شخص کے لیے سوال بنی رہی ہے کہ جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض اور ذلیل ہیں تو ان کے پاس یہ نعمتیں کیسی اور کیوں ہیں، اور اطاعت شعار مومنین کی غربت و افلاس کیوں؟

یہاں تک کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے عالی قدر بزرگ کو اس سوال نے متاثر کیا، جس وقت وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آپ کے خاص حجرہ میں داخل ہوئے، جس میں آپ ﷺ خلوت گزیں تھے اور یہ دیکھا کہ آپ ﷺ ایک موٹی موٹی تیلیوں کے بوریے پر لیٹے ہوئے ہیں، ان تیلیوں کے نشانات آپ ﷺ کے بدن مبارک پر پڑ گئے ہیں تو بے اختیار رو پڑے اور عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کسریٰ و قیصر اور ان کے امراء کیسی نعمتوں اور راحتوں میں ہیں اور آپ ساری مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے منتخب رسول اور محبوب ہیں اور آپ کی معیشت کا یہ حال ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے ابن خطاب! کیا تم اب تک شک و شبہ میں مبتلا ہو؟

یہ لوگ تو وہ ہیں جن کی لذات و محبوبات اللہ تعالیٰ نے اسی دنیا میں ان کو دے دی ہیں، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، وہاں عذاب ہی عذاب ہے" (اور مومنین

[1] مسند احمد: ۵/۷۲، رقم: ۲۰۱۷۲، معارف القرآن: ۷/۵۱۵، ص: ۲۴

کا معاملہ برعکس ہے) [1]

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ دنیا کی زینت اور راحت طلبی سے بالکل بے نیاز اور بے تعلق زندگی کو پسند فرماتے ہیں۔ باوجودیہ کہ آپ ﷺ کو پوری قدرت حاصل تھی کہ اپنے لیے بہتر سے بہتر راحت کا سامان جمع کرلیں۔

اور جب بھی دنیا کی دولت آپ کے پاس بغیر کسی محنت مشقت اور سعی وطلب کے آبھی جاتی تھی تو فوراً اللہ تعالیٰ کی راہ میں غرباء فقراء پر اس کو خرچ کر ڈالتے تھے اور اپنے واسطے کل کے لیے بھی کچھ باقی نہ چھوڑتے تھے۔ ابن حاتم نے بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"أَنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ مَا يَفْتَحُ اللّٰهُ لَكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا" [2]

ترجمہ: "مجھے تم لوگوں کے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ خوف اور خطرہ ہے وہ دولت وزینت دنیا ہے جو تم پر کھول دی جائے گی۔"

اور حضرت علامہ قشیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"مَنْ تَبَاعَدَ مِنَ الدُّنْيَا فَتَقَارَبَ إِلَى اللّٰهِ وَفِي بَعْضِ الْكُتُبِ أَنَّ أَهْوَنَ مَا أَصْنَعُ بِالْعَالِمِ إِذَا مَالَ إِلَى الدُّنْيَا فَأَسْلُبُهُ حَلَاوَةَ مُنَاجَاتِي" [3]

ترجمہ: "جس شخص نے دنیا سے دوری اور علیحدگی اختیار کی تو وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوا اور بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سب سے ہلکی مصیبت کسی عالم کی یہ ہے کہ وہ دنیا کی طرف مائل ہو تو پھر میں اس سے دعاؤں کی لذت چھین لیتا ہوں۔"

[1] بخاری: المظالم، باب الغرفة والعلية المشرفة --- رقم: ۲۴۶۷
[2] در منثور ۴/۳۱۳
[3] اسماء الحسنیٰ للقشیری: ۲۱۴

بادشاہوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے

سلطان محمد تغلق (متوفی ۷۵۲ھ) ہندوستان کا مشہور بادشاہ ہے، جو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی سطوت اور خون ریزی میں بہت مشہور ہے، ایک مرتبہ وہ شیخ قطب الدین منور رحمہ اللہ تعالیٰ کی رہائش گاہ کے قریب سے گزرا، حضرت قطب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی جگہ بیٹھے رہے اور اس کے استقبال کے لیے باہر نہیں نکلے، سلطان کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور اس نے بازپرس کے لیے حضرت قطب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اپنے دربار میں طلب کرلیا۔

حضرت دربار میں داخل ہوئے تو ملک کے تمام بڑے امراء، وزراء اور فوجی افسر بادشاہ کے سامنے مسلح ہوکر دورویہ (یعنی دونوں جانب قطار میں) کھڑے تھے۔ دربار کے رعب داب کا عالم یہ تھا کہ لوگوں کے کلیجے پگھلے جارہے تھے۔ حضرت قطب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے نوعمر صاحب زادے نورالدین رحمہ اللہ تعالیٰ بھی تھے، انہوں نے اس سے قبل کبھی بادشاہ کا دربار نہیں دیکھا تھا۔ ان پر یہ ہیبت ناک منظر دیکھ کر رعب طاری ہوگیا۔ حضرت قطب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیٹے کو مرعوب ہوتے دیکھا تو زور سے پکار کر کہا:

"اَلْعَظَمَةُ لِلّٰهِ" "عظمت تمام تر اللہ کے لیے ہے۔"

حضرت نورالدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جوں ہی اپنے والد کی یہ آواز میرے کانوں میں پڑی میں نے اپنے اندر ایک عجیب وغریب قوت محسوس کی، میرے دل سے دربار کی ساری ہیبت زائل ہوکر رہ گئی اور تمام حاضرین مجھے ایسے معلوم ہونے لگے جیسے وہ بھیڑ بکریوں کا کوئی ریوڑ ہو۔ [1]

سلطان ملک شاہ سلجوقی اپنے دارالسلطنت نیشاپور میں مقیم تھا۔ اس نے اپنی

[1] سیر الاولیاء، ص ۲۵۳ تا ۲۵۵

سلطنت کے مختلف شہروں کے دورے کا پروگرام بنایا۔ رمضان المبارک کے مقدس مہینے کا آخری عشرہ تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جیسے ہی رمضان ختم ہوگا وہ عید کے فوراً بعد دورے پر نکل جائے گا۔ رمضان المبارک کی ۲۹ ویں شب تھی۔ اس نے اپنے وزرا اور مصاحبوں کے ساتھ چاند دیکھنا شروع کیا۔ خوشامدی مصاحب موجود تھے، انہوں نے شور مچادیا کہ حضور چاند نکل آیا ہے۔ سلطان نے گو خود چاند نہیں دیکھا اور نہ کسی اور ذمہ دار نے دیکھا، لیکن بادشاہ کی مرضی اور اس کا خیال معلوم کرکے سب نے اس کو رویت ہلال کا یقین دلا دیا اور حکم ہوگیا کہ کل عید ہے۔

امام الحرمین ابوالمعالی جو مفتی اور رئیس القضاۃ تھے، ان کو خبر ہوئی تو انہوں نے منادی کو بلوایا اور کہا کہ ان الفاظ کے ساتھ منادی کرادو: "ابوالمعالی کہتا ہے: کل تک ماہ رمضان ہے۔ جو میرے فتوی پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ کل بھی روزہ رکھے۔"

رئیس القضاۃ کی اس منادی کو مخبریوں نے نہایت برے الفاظ میں سلطان تک پہنچایا؛ بل کہ یہاں تک کہا کہ ابوالمعالی کے خیالات سلطنت کے بارے میں اچھے نہیں ہیں اور عوام ان کے معتقد ہیں۔ اگر سلطان کے حکم کے مطابق کل عید نہ ہوئی تو بڑی توہین اور ذلت ہوگی۔ سلطان طبیعت کا برا نہیں تھا، اس لیے امام الحرمین کی منادی ناگوار گزرنے کے باوجود اس نے حکم دیا کہ ان کو عزت واحترام کے ساتھ میرے پاس لاؤ۔ فتنہ پردازوں نے پھر کہا کہ جو شخص سلطان کے حکم کی عزت نہ کرے، وہ قابل احترام نہیں ہے۔ سلطان نے کہا: جب تک میں براہ راست ان سے گفتگو اور حقائق معلوم نہ کرلوں ایسے رفیع القدر شخص کی عزت میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ قاضی صاحب کو جب شاہی پیغام پہنچا تو اس خیال سے کہ درباری لباس پہننے سے دیر نہ ہو جائے اور حاسدین اللہ جانے دربار میں کس پیرایے میں میری تاخیر بیان کریں، جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے اسی طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔ محل کے

دروازے پر دربان نے روکا کہ درباری لباس کے بغیر اندر جانا منع ہے۔ ادھر حاسدین نے سلطان کو اطلاع دی کہ امام الحرمین نے پہلے ہی حکم عدولی کی ہے، اب دوسری گستاخی یہ کی ہے کہ معمولی لباس پہن کر آگئے ہیں۔ سلطان کی طبیعت کچھ اور مکدر ہوگئی، مگر اندر آنے کا حکم دیا۔ رئیس القضاۃ جیسے ہی دربار میں آئے سلطان نے پوچھا: اس ہیئت کذائی سے آپ کیوں تشریف لائے ہیں اور درباری لباس کیوں نہیں پہنا؟

قاضی صاحب نے کہا: "اے سلطان! میں اس وقت جس لباس میں ہوں اسی سے نماز پڑھتا ہوں اور وہ شرعاً جائز ہوتی ہے۔ پس جب اللہ کے سامنے میں اسی طرح پیش ہوتا ہوں تو آپ کے سامنے آنے میں کیا قباحت؟ البتہ دستور کے مطابق میرا لباس درباری نہیں ہے اور اس کی وجہ گستاخی نہیں؛ بل کہ میں نے سوچا کہ ذرا سی دیر کی غفلت میں فرشتے میرا نام نافرمانوں کی فہرست میں نہ لکھ لیں اور مجھ سے بادشاہ اسلام کے حکم کی مخالفت سرزد نہ ہو جائے، اس لیے جلدی میں جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح چلا آیا۔"

سلطان نے کہا: "جب اسلام میں حاکم کی اطاعت اس قدر واجب ہے تو پھر ہمارے حکم کے خلاف منادی کرانے کے کیا معنی ہیں؟"

قاضی صاحب نے فرمایا: "جو امور حکم سلطانی پر موقوف ہیں، ان کی اطاعت ہم پر فرض ہے اور جو حکم فتوی کے متعلق ہے وہ بادشاہ ہو یا کوئی اور، اسے مجھ سے پوچھنا چاہیے کیوں کہ بحکم شریعت علما کا فتوی حکم شاہی کے برابر ہے۔"

جب سلطان نے امام صاحب کی یہ تقریر سنی تو اس کا غصہ جاتا رہا اور ان کی جرأت وصداقت سے بہت خوش ہوا اور اعلان کرا دیا کہ میرا حکم درحقیقت غلط تھا اور امام الحرمین ورئیس القضاۃ کا فیصلہ صحیح ہے۔

آج بھی اگر علمائے کرام بادشاہوں سے مرعوب نہ ہوں اور حق گوئی کو اپنا شعار

بنالیں تو حکمران ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور اسی طریقے پر عمل ہونے سے آسمان کے نیچے عدل وانصاف اور امن وامان قائم ہو سکتا ہے۔[1]

اپنی ضرورت صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنی چاہیے

مشہور ومعروف تابعی حضرت عطاء بن ابی رباح رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت طاؤس رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے مجھے ایک حکمران کے پاس جاتے ہوئے دیکھ لیا، تو آپ نے مجھے ارشاد فرمایا:

"یَا عَطَاءُ، إِیَّاكَ أَنْ تَرْفَعَ حَوَائِجَكَ إِلَىٰ مَنْ أَغْلَقَ فِي وَجْهِكَ بَابَهُ ...... وَأَقَامَ دُوْنَكَ حُجَّابَهُ ...... وَ إِنَّمَا اطْلُبْهَا مِمَّنْ أَشْرَعَ لَكَ أَبْوَابَهُ...... وَطَالَبَكَ بِأَنْ تَدْعُوَهُ ...... وَوَعَدَكَ بِالْإِجَابَةِ......"[2]

تَرْجَمَہ: "عطاء میری بات غور سے سنو: اپنی کوئی ضرورت ایسے شخص کے سامنے پیش نہ کرو جس نے اپنے دروازے بند کر رکھے ہوں، اپنے دروازوں پر دربانوں کو بٹھا رکھا ہو، بل کہ اپنی ہر ضرورت اس کے سامنے پیش کرو جس نے ہر دم اپنے دروازے اپنے بندوں کے لیے کھلے رکھے ہوئے ہیں...... وہ تم سے مطالبہ کرتا ہے کہ مجھ سے مانگو...... اور یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ میں اپنے بندوں کی دعا کو قبول کروں گا۔"

حضرت عطاء بن ابی رباح رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کی شکایت اپنے ایک دوست سے کر رہا تھا کہ اچانک قاضی شریح رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے مجھے دیکھا آپ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور

[1] نظام الملک طوسی ۱/۱۳۳، بحوالہ عمر سے فیصلے: ۲۶۰ تا ۲۶۲

[2] صور من حیاۃ التابعین: ۲۹۶

فرمایا:

"یَا ابْنَ أَخِي ...... إِیَّاكَ وَالشَّكْوَىٰ لِغَیْرِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ...... فَإِنَّ مَنْ تَشْكُوْ إِلَیْهِ لَا یَخْلُوْ أَنْ یَكُوْنَ صَدِیْقًا أَوْ عَدُوًّا...... فَأَمَّا الصَّدِیْقُ فَتَحْزُنُهُ...... وَأَمَّا الْعَدُوُّ فَیَشْمَتُ بِكَ...... ثُمَّ قَالَ: انْظُرْ إِلَىٰ عَیْنِي هٰذِهِ، وَأَشَارَ إِلَىٰ إِحْدَىٰ عَیْنَیْهِ، فَوَاللّٰهِ مَا أَبْصَرْتُ بِهَا شَخْصًا وَلَا طَرِیْقًا مُنْذُ خَمْسَ عَشْرَةَ سَنَةً...... وَلٰكِنِّيْ مَا أَخْبَرْتُ أَحَدًا بِذٰلِكَ إِلَّا أَنْتَ فِي هٰذِهِ السَّاعَةِ......"

تَرْجَمَہ: "اے بھتیجے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے پاس شکوہ شکایت کرنے سے بچو، جس کے پاس تم شکوہ کرو گے وہ تمہارا دوست ہوگا یا دشمن، دوست یہ شکوہ سن کر غمگین ہوگا اور دشمن خوش ہوگا اور مصیبتوں بلاؤں کو نہ دوست دور کر سکتا ہے، نہ دشمن، پھر ان کو شکایت کرنے کا کیا فائدہ؟"

پھر آپ نے اپنی ایک آنکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "میری اس آنکھ کی طرف دیکھو۔ اللہ کی قسم! میں نے گذشتہ پندرہ برس سے اس آنکھ سے نہ کوئی شخص دیکھا اور نہ راستہ، لیکن میں نے کسی کو (شکایۃً) بتایا تک نہیں صرف آج تجھے (محض سمجھانے کے لیے) بتا رہا ہوں۔"

(کہ بار بار ہر ایک سے پریشانیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہیے)۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کے نیک بندے حضرت یعقوب عَلَیْہِ السَّلَامُ کا یہ جملہ نہیں سنا؟

﴿إِنَّمَآ أَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ إِلَى اللّٰهِ﴾[1]

[1] یوسف: ۸۶

ترجمہ: "میں اپنا شکوہ وغم اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتا ہوں۔"

اور یہ بھی فرمایا کہ:

"فَاجْعَلِ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ مُشْتَكَاكَ، وَمُحْزِنَكَ عِنْدَ كُلِّ نَائِبَةٍ تَنُوبُكَ، فَإِنَّهُ أَكْرَمُ مَسْئُولٍ وَأَقْرَبُ مَدْعُوٍّ"

ترجمہ: "ہر مصیبت کے وقت اپنے حزن وملال اور غم واندوہ کا شکوہ اللہ تعالیٰ ہی کے دربار میں پیش کیا کرو۔"

وہی سوالیوں کی عزت رکھنے والا ہے اور بے کسوں کی التجائیں سننے والا ہے اور دعائیں مانگنے والوں کے قریب تر ہے۔

قاضی شریح رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک دن کسی شخص کو دوسرے سے کچھ مانگتے ہوئے دیکھا تو بڑے پیار سے نصیحت کی اور فرمایا:

"يَا ابْنَ أَخِي مَنْ سَأَلَ إِنْسَانًا حَاجَةً فَقَدْ عَرَضَ نَفْسَهُ عَلَى الرِّقِّ."

ترجمہ: "اے میرے بھتیجے! جو کسی انسان سے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے مانگے گویا اس نے اپنے آپ کو اس انسان کی غلامی کے سپرد کر دیا۔"

"فَإِنْ قَضَاهَا لَهُ الْمَسْئُولُ فَقَدِ اسْتَعْبَدَهُ بِهَا......"

ترجمہ: "اگر اس شخص نے جس سے مانگا تھا سوالی کی ضرورت کو پورا کر دیا تو اس نے گویا اسے اپنا (ذہنی) غلام بنا لیا۔"

"وَإِنْ رَدَّهُ عَنْهَا رَجَعَ كِلَاهُمَا ذَلِيلًا......"

"اور اگر اسے جواب دے دیا تو دونوں ذلیل وخوار ہو کر واپس لوٹے۔"

"هٰذَا بِذُلِّ الْبُخْلِ وَذَاكَ بِذُلِّ الرَّدِّ......"

ترجمہ: "ایک بخل کی ذلت کے ساتھ دوسرا ناکامی کی ذلت ورسوائی کے ساتھ......"

اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

"إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ." [1]

ترجمہ: "جب بھی تجھے کچھ مانگنا ہو اپنے اللہ سے مانگو اور جب بھی مدد طلب کرو تو اپنے اللہ سے مدد طلب کرو......"

"وَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ وَلَا عَوْنَ إِلَّا بِاللّٰهِ." [2]

ترجمہ: "خوب اچھی طرح یہ بات جان لو کہ برائی سے بچنے اور نیکی کرنے کی توفیق اور مدد دینے کا حقیقی اختیار اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے پاس نہیں۔"

علماء کی زندگی عوام سے ممتاز ہونی چاہیے

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"ہماری زندگی عوام کی زندگی سے ممتاز ہو، دیکھنے والا کھلی آنکھوں دیکھے کہ یہ دنیا کے طالب نہیں ہیں، ان کے یہاں مال ودولت معیار نہیں ہے۔ ہمارے کام زیادہ تر حسبۃً للہ ہوں، جیسا کہ ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے، جب تک ہمارے طبقۂ علماء میں یہ اخلاقی امتیاز نہ ہوگا، ایثار کا مادہ نہ ہوگا، ان کی شخصیت مؤثر اور قابل احترام نہیں ہوگی، دل ودماغ میں دین کا گہرا اثر ووقار نہیں ہوگا۔ علماء کا وقار اس سے نہیں بڑھے گا کہ یہ مدرسہ اتنا بڑا ہے، وہ مدرسہ اتنا بڑا ہے، وہاں اتنے طالب علم پڑھتے ہیں اور وہاں کے جلسے اتنے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس سے علماء کا وقار نہیں

[1] الترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب حدیث حنظلۃ، رقم: ۲۵۱۶

[2] صور من حیاۃ التابعین: ۲/۸۹ تا ۹۰

قائم ہوگا۔ علماء کا وقار قائم ہوتا ہے ذاتی نمونے سے، عوام جب دیکھتے ہیں کہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس پر جان دے دی جائے لیکن علماء اس کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے ہیں، اور اس کو خاطر میں نہیں لاتے، ہم نے سمجھا ہے کہ دولت سب سے بڑی چیز ہے، ان کے یہاں دولت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

جیسا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے نواب صاحب ڈھاکہ کو جواب دیا تھا۔ نواب صاحب نے کہلوایا: ''آپ مجھ سے مل لیں'' حضرت نے کہلوایا: ''نواب صاحب سے کہنا کہ آپ کے پاس جو چیز ''دولت'' ہے وہ میرے پاس بقدر ضرورت موجود ہے، لیکن میرے پاس جو چیز ہے وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو آنا چاہیے۔ مجھے آنے کی ضرورت نہیں۔''

شیخ سعید حلبی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ ایک بزرگ عالم تھے، ایک دن دمشق کی ایک مسجد میں سبق پڑھا رہے تھے، اس دن ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی (یہ واقعہ اگرچہ میرا منہ اس قابل نہیں کہ سنائے، لیکن واقعات کے بغیر کام نہیں چلتا، معمولی آدمی بھی اگر یہ واقعہ سنائے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے) ہاں تو شیخ سعید درس دے رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسجد میں جب درس دیا جاتا ہے تو پشت قبلہ کی طرف ہوتی ہے اور سامنے طالب علم ہوتے ہیں، تو سامنے سے جو آتا ہے، استاذ تو دیکھتا ہے طالب علم نہیں دیکھتے، ابراہیم پاشا جو محمد علی خدیو، بانی سلطنت خدیویہ کا فرزند تھا اور بڑا باجبروت حاکم و سپہ سالار تھا، جس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور جس سے لوگ کانپتے تھے۔

وہ دروازہ کی طرف سے مسجد میں داخل ہوا۔ حضرت کے پاؤں میں تکلیف تھی اس لیے دروازہ کی طرف پاؤں پھیلائے ہوئے تھے۔ جب وہ قریب آیا تو طالب علموں نے دیکھا کہ وہ ہے اور اس کے ساتھ حفاظتی دستہ بھی ہے، جلاد اور پہرہ دار بھی ہیں۔ طالب علم سمجھے کہ حضرت کو ہزار تکلیف ہو، پاؤں سمیٹ لیں گے، حاکم کا بھی

ادب ہوتا ہے، شیخ نے بالکل جنبش نہیں کی، پاؤں پھیلائے رہے۔ وہ سامنے آیا اور کھڑا ہو گیا۔ مؤرخ نے لکھا ہے کہ طالب علموں نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے کہ اب جلاد کو حکم ہوگا استاذ کا قابل احترام خون ہمارے کپڑوں پر نہ پڑے، وہ دیر تک کھڑا رہا۔

اس پر ایسا جلال طاری ہوا کہ کچھ بولا نہیں، سبق سنتا رہا اور پھر چلا گیا، بعد میں شیخ سعید حلبی کے لیے اشرفیوں کا ایک توڑا بھیجا۔ اہل اللہ کا اثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ سلام کہلوایا اور کہا یہ قبول فرمائیے، جو جملہ انہوں نے جواب میں کہا وہ جملہ سننے کے قابل ہے، میں تو کہتا ہوں کہ ایسے ایک جملے پر غزلوں کے دس دیوان قربان کیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا:

''اپنے ولی نعمت سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا'' ''اَلَّذِيْ يَمُدُّ رِجْلَهُ لَا يَمُدُّ يَدَهُ'' یہ جملہ اسی طرح نقل ہوا ہے اگر مجھے ہاتھ پھیلانے ہوتے تو میں اس وقت پاؤں نہ پھیلاتا پاؤں سمیٹ لیتا، لیکن یہ علامت ہے کہ میں ہاتھ پھیلانے والا نہیں تھا، جو پاؤں پھیلاتا ہے ہاتھ نہیں پھیلاتا ہے۔''

یہ جوہر علماء میں، دین کے خاصوں میں دسویں درجے میں، پچاسویں درجے میں کہیں ہونا چاہیے۔ اگر یہ جوہر نہیں ہے تو میں صاف کہتا ہوں کہ آپ کی ساری علمی قابلیت اور آپ کی ساری خطابت جس میں آپ ممتاز ہیں (سیاسی جماعتوں میں بھی ایسے خطیب ہوں گے) سب بے اثر ہے۔ جب تک کہ آپ کا عملی نمونہ نہ ہو، اہل اقتدار یہ نہ سمجھیں کہ علماء خریدے جا سکتے ہیں، علماء پیسے کے غلام اور دولت کے بندے نہیں ہیں، علماء ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے، علماء کی زندگی ہم سے زیادہ سادہ ہے، علماء ہم سے کم درجے کے مکانوں میں رہتے، کم درجے کا کھانا کھاتے ہیں، اس کا اظہار ہونا چاہیے، ہمارے اسلاف نے اس کا اظہار کیا ہے۔

میں اپنے اساتذہ ہی کے واقعات سناتا ہوں کہ میں مدرسہ قاسم العلوم لاہور میں پڑھتا تھا اور وہاں ہم لوگوں کے لیے کبھی کبھی پر تکلف کھانے پکتے تھے اور چوں کہ میرا قریبی تعلق تھا، مدرسے کے پیچھے حضرت مولانا احمد علی صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کا قیام تھا، ان کے صاحب زادے مولانا حبیب اللہ صاحب مرحوم سے میرا قریبی تعلق تھا، وہ ہمارے دوست تھے، مجھے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ آج وہاں فاقہ ہے اور یہاں پلاؤ پکا ہے، کیا مجال کہ چاول کی ایک کھیل وہاں پہنچ جائے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہماری جماعت سے دین کی خدمت کا جو کام لیا ہے، وہ ان ہی صفات کا نتیجہ ہے، زہد، ایثار، قربانی کا جذبہ، تواضع اور اپنے خلاف بات سن کر ضبط کر لینا، دوسرے کو اپنے سے بہتر اور فاضل سمجھنا۔ ہماری جماعت کا یہ شعار کبھی نہیں رہا ہے کہ "ہم چوں من دیگرے نیست" بل کہ ہم نے بڑے سے بڑوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مولانا مدنیؒ[1] سے جب کوئی بیعت کے لیے کہتا تو میں نے حضرت کو بعض اوقات یہ شعر پڑھتے سنا ہے۔

؎ نہ گلم نہ برگِ سبزم نہ درخت سایہ دارم
در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

نہ پھول ہوں، نہ گھاس نہ میں سبزہ ہوں، مجھے حیرت ہے کہ دہقان نے مجھے کس کام کے لیے پیدا کیا؟ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اپنے سے شرمندہ ہیں، یہی بڑے سے بڑے اولیاء اللہ کا شعار رہا ہے۔[2]

اہلِ ثروت سے استغناء کا نسخہ

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں: علماء دنیا داروں کو رکن نہ بنائیں اور ان کی کوئی رائے قبول نہ کریں، یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ

[1] شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ مراد ہے۔

[2] خطبات علی میاں: ۸۳/۱ تا ۸۶

اپنے اندر قناعت پیدا کریں اور حبِ دنیا کا علاج کریں، جس میں قناعت نہیں ہوتی، مالی قناعت بھی نہیں اور جاہ کی قناعت بھی نہیں وہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا ہے کہ عام لوگ تو کجا بڑے بڑے لوگ بھی اس کا بہت اعزاز و اکرام کریں اور اس کے پاس پیسہ بھی بہت رہے، ایسا شخص تو دنیا داروں سے کبھی بھی استغناء نہیں کر سکتا اسی لیے میں نے بیان کے شروع میں یہ شعر پڑھا تھا

؎ لَنَقْلُ الصَّخْرِ مِنْ قُلَلِ الْجِبَالِ
أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ مِنَنِ الرِّجَالِ

تَرجَمَہ: "پہاڑوں کی چوٹیوں سے پتھر ڈھو ڈھو کر گزر اوقات کروں یہ میرے لیے اس سے بہتر ہے کہ لوگوں کی منت سماجت کروں۔"

اہلِ ثروت سے استغناء اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اپنے مصارف کم سے کم رکھیں، کم سے کم مصارف رکھنے پر اپنے نفس کی تضمیر (یعنی قلیل پر اکتفاء کرنے کی مشق) کریں جیسے گھوڑوں کی تضمیر کرتے تھے تاکہ وہ تیز تیز بھاگیں اسی طرح اپنے نفس کی تضمیر کریں تاکہ اس کو قلیل پر اکتفاء کرنے کی عادت پڑے۔

حضرت نانوتوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کے اشعار ہیں ؎

آفریں تجھ پہ ہمت کوتاہ
طالبِ جاہ ہوں نہ طالبِ مال
مال اتنا کہ جس سے ہو خورد و نوش
جاہ یہ کہ خلق کا نہ ہوں پامال

مال تو اتنا بھی کافی ہے جس سے دو وقت چنے چبا کر گزارہ ہو جائے۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ کسی کو زیادہ دے دیں تو ٹھیک ہے ورنہ "اپنی احتیاج دنیا داروں کے سامنے پیش کرنے سے بہتر تو یہی ہے کہ انسان چنے چبانے پر گزارہ کر لے۔"

کتنی بڑی مشقت برداشت کرنی پڑے مگر کسی کے سامنے زبان اور ہاتھ نہ

کھلیں حتیٰ کہ زاویۂ قلب بھی غیر اللہ کی طرف مائل نہ ہو جو تعلق رہے اللہ تعالیٰ سے رہے، جو مانگیں اللہ تعالیٰ سے مانگیں، رسول اللہ ﷺ کے یہ ارشادات ہر وقت سامنے رہیں:

"وَإِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ." [1]

ترجمہ: "مانگو تو اللہ سے مانگو اور مدد طلب کرو تو اللہ سے کرو۔"

"وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ." [2]

ترجمہ: "اور جو غیر اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچنا چاہے گا اللہ اسے بچائے گا اور جو غیر اللہ سے مستغنی رہنا چاہے گا اللہ اسے مستغنی رکھے گا۔"

یہ اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں، اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھیں، جتنا زیادہ صبر کریں گے اور نفس کو قلیل پر اکتفا کرنے کی عادت ڈالیں گے اسی قدر یہ عادت، تمرین اور یہ مشق غیر اللہ سے مستغنی رہنے میں معین ثابت ہوگی۔

غیر اللہ سے استغناء کے بغیر کام میں اخلاص اور پورے طور پر للہیت پیدا نہیں ہوگی۔ مشقتیں اٹھانا پڑیں تو اس پر پریشان ہونے کے بجائے اور زیادہ خوش ہونا چاہیے کہ اللہ کی خاطر، اپنی آخرت بنانے کی خاطر یہ مشقتیں برداشت کر رہے ہیں، جب تک ایسی قناعت اور مشقت برداشت کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا غیر اللہ سے استغناء تو ہو ہی نہیں سکتا۔ [3]

یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ اگر کوئی عالم درس و تدریس یا دین کا کوئی کام اس لیے کرتا ہے کہ اگرچہ دنیوی دھندوں میں پیسہ زیادہ ملتا ہے، مگر وہ دھندے اسے مشکل

---

[1] ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب حدیث حنظلۃ، رقم: ۲۵۱۶

[2] بخاری، الزکوٰۃ، باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنیٰ: ۱/۱۹۲

[3] علماء کا مقام ص: ۳ تا ۳۶

لگتے ہیں کہ کون گدھے پر بوجھ اٹھائے، کون تجارتی اٹھائے، کون مزدوری کرے، گرمی بھی اور بوجھ بھی کون یہ سب چیزیں برداشت کرے۔

لہٰذا آسان سی صورت یہ ہے کہ کسی مدرسے میں داخلہ لے لیں، آرام سے بیٹھے رہیں گے، اچھا کھانا، پنکھوں کی ٹھنڈی ہوا، کولر کا ٹھنڈا پانی سب کچھ ملتا رہے گا مزے ہی مزے ہوں گے، محنت و مشقت سے بھی بچ جائیں گے۔

تو ایسا مولوی اللہ تعالیٰ کا بندہ نہیں، بل کہ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اسے "مولوی" کہا جائے، وہ تو پکا دنیا دار ہے۔ میں (یعنی مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ تعالیٰ) جن علماء کے بارے میں کہہ رہا ہوں کہ وہ متروک الدنیا نہیں تارک الدنیا ہوتے ہیں اس سے مراد وہ علماء ہیں، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ دنیا کے دوسرے کام کرنے میں منافع زیادہ ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے کام کے لیے پیدا فرمایا ہے، روکھی سوکھی کھا کر، آدھا پیٹ کھا کر گزارہ کر لیں گے، مگر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا کام کریں گے دنیا کا کوئی کام نہیں کریں گے۔ ایسے علماء کے بارے میں کہہ رہا ہوں کہ وہ متروک الدنیا نہیں ہوتے، تارک الدنیا ہوتے ہیں۔

دنیوی کام کرنے والوں کی تنخواہیں، بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً بھنگی جتنا کماتے ہیں بڑے بڑے علماء کی تنخواہیں اتنی زیادہ نہیں ہو سکتیں۔

جب میں دار العلوم کورنگی میں تھا تو ایک بار حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے علماء و طلبہ کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"دار العلوم میں کام کرنے والے بیل کی اجرت یہاں کے سب سے اونچے درجہ کے استاذ کے وظیفہ سے بھی زیادہ ہے۔" (اس زمانے میں دار العلوم میں جو زمین خالی پڑی ہوئی تھی اس میں سبزیاں وغیرہ کاشت کرنے کے لیے ایک کاشت کار رکھا ہوا تھا جو اس میں ہل چلاتا تھا) بیل چلانے والے کی بات تو الگ رہی بیل کی تنخواہ سب سے بڑے استاذ کے وظیفے سے بھی زیادہ تھی۔ اس ارشاد کے ذریعہ آپ اس طرف

متوجہ فرما رہے تھے کہ "اگر مولوی اپنی نیت صحیح نہیں کرتے اور اخلاص پیدا نہیں کرتے تو انہیں چاہیے کہ ہل چلانا شروع کر دیں یا بیل اور گدھے بن جائیں تو زیادہ کام دیں گے۔" علماء پر لازم ہے کہ یہ جو دنیوی دھندوں کو چھوڑ کر کم پر قناعت کر رہے ہیں اس میں اپنی نیت درست کریں، صبر سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے اپنے کام میں لگا رکھا ہے۔

شکر خدای کن کہ موفق شدی بخیر
زانعام و فضل او نہ معطل گزاشتت
منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

دار العلوم دیوبند کتنا بڑا ادارہ ہے، مگر اس میں صرف دار الحدیث میں پنکھے تھے، اس کے سوا کسی بھی درس گاہ میں پنکھے نہیں تھے۔ بڑے بڑے اساتذہ ایسے ہی پڑھاتے تھے۔ جب درس گاہوں میں پنکھے نہیں تھے تو اساتذہ کے گھروں میں کہاں ہوں گے۔

حضرت مولانا محمد اعزاز علی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کو دار العلوم کے احاطے میں دار العلوم کی طرف سے جو کمرا ملا ہوا تھا اس میں بجلی کا پنکھا نہیں تھا۔ میں وہاں حاضر ہوا کرتا تو ان کے پاس دستی پنکھا ہوتا اسی کو جھلتے رہتے اور ساتھ ہی ساتھ تصنیف، تالیف اور کتب بینی فرماتے رہتے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے فرمایا کہ جب وہ دار العلوم دیوبند میں استاذ تھے، استاذ بھی حدیث کے۔ میں نے طحاوی آپ ہی سے پڑھی ہے، استاذ حدیث بھی اور ساتھ ہی ساتھ مفتی اعظم، اتنا بڑا مقام، اس زمانے کی بات بتاتے ہیں کہ "جس مکان میں ہم رہتے تھے وہ اتنا تنگ اتنا چھوٹا تھا کہ کھانا پکانے کے لیے سوختے کی جو لکڑیاں استعمال ہوتی تھیں انہیں رکھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، وہ

لکڑیاں اپنی چارپائی کے نیچے رکھتے تھے۔"

تانا و تھانہ بھون میں بجلی نہیں تھی، نہ بلب تھے نہ پنکھے۔ حضرت حکیم الامت رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ روشنی کے لیے لالٹین جلا کر اور ہوا کے لیے ہاتھ میں پنکھا لے کر کام کرتے رہتے۔ جب زیادہ گرمی ہوتی تو کرتا اتار کر کام کرتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے کتنا بڑا کام لیا۔

جب تک غیر اللہ سے استغناء پیدا نہیں ہوگا اس وقت تک دین کے کام میں اخلاص و للہیت پیدا نہیں ہوگی۔[1]

امام ابو حازم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ بہت بڑے عالم، فقیہ اور مدینہ کے قاضی تھے، ان سے ایک مرتبہ وقت کے امیر المؤمنین سلیمان بن عبد الملک نے کہا:

"اِرْفَعْ إِلَيْنَا حَاجَتَكَ يَا أَبَا حَازِمٍ نَقْضِهَا لَكَ مَهْمَا كَانَتْ."

تَرْجَمَہ: "ابو حازم! اپنی کوئی ضرورت ہمیں بتاؤ ہم اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

حضرت ابو حازم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے جواب میں فرمایا:

"حَاجَتِي أَنْ تُنْقِذَنِي مِنَ النَّارِ، وَتُدْخِلَنِي الْجَنَّةَ."

تَرْجَمَہ: "میری ضرورت یہ ہے کہ آپ مجھے جہنم سے بچالیں اور جنت میں داخل کر دیں۔"[2]

ایک مرتبہ امیر المؤمنین نے حضرت ابو حازم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کے لیے دیناروں سے بھری ہوئی ایک تھیلی بھیجی اور ساتھ ہی یہ لکھ کر بھیجا:

"ابو حازم! یہ رقم آپ کے خرچہ کے لیے ہے آپ اس کو خرچ کیجیے میرے پاس آپ کے لیے اور بھی بہت سارا مال ہے بعد میں بھیجوں گا۔"

حضرت ابو حازم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے وہ تھیلی واپس بھیج دی اور ساتھ ہی یہ تحریر

---

[1] علماء کا مقام: ص ۴۴ تا ۴۶
[2] صور من حیاۃ التابعین: ۱۹۰

لکھ کر بھیجی، ہمیں چاہیے کہ اس کو بار بار پڑھیں اور اس پر غور کریں، فرمایا:

"يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! أَعُوذُ بِاللهِ أَنْ يَكُونَ سُؤَالُكَ إِيَّايَ هَزْلًا، وَرَدِّي عَلَيْكَ بَاطِلًا، فَوَاللهِ مَا أَرْضَى ذٰلِكَ -يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ- لَكَ...... فَكَيْفَ أَرْضَاهُ لِنَفْسِي؟

يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! إِنْ كَانَتْ هٰذِهِ الدَّنَانِيرُ لِقَاءَ حَدِيثِي الَّذِي حَدَّثْتُكَ بِهِ، فَالْمَيْتَةُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ فِي حَالِ الْإِضْطِرَارِ أَحَلُّ مِنْهَا......

وَإِنْ كَانَتْ حَقًّا لِي فِي بَيْتِ مَالِ الْمُسْلِمِينَ فَهَلْ سَوَّيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَ النَّاسِ جَمِيعًا فِي هٰذَا الْحَقِّ؟"[1]

ترجمہ: "امیر المؤمنین! میں اللہ کے حضور پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ آپ کے سوالات جو آپ نے مجھ سے کیے وہ مذاق بن جائیں اور میرا جواب دینا باطل اور بے کار ہو جائے، اے امیر المؤمنین! بخدا میں یہ مال تو آپ کے لیے پسند نہیں کرتا اپنے لیے کیسے پسند کر سکتا ہوں۔

امیر المؤمنین! اگر یہ دینار میری اس دینی گفتگو کے عوض دیے گئے ہیں جو میں نے آج آپ سے کی ہے، تو میں اضطراری حالت میں مردار اور خنزیر کا گوشت اس سے کہیں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ اور اگر آپ نے ویسے ہی بیت المال سے مجھے یہ دیا ہے تو جتنا مجھے دیا ہے اتنا دوسرے مسلمانوں کو بھی برابر برابر دیا جائے۔"

اب غیر اللہ سے استغناء کے بارے میں اکابر کے مزید قصے سنیے:

[1] صور من حیاۃ التابعین: ۱۹۲

استغناءِ اکابر کے (۱۱) قصے

❶ امیر عز الدین موسک وہ امیر ہیں جن کی دربانی کی وجہ سے علامہ ابن حاجب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے والد کا لقب (حاجب) مشہور ہوا۔ ایک مرتبہ انہوں نے قراءت کے مشہور امام علامہ شاطبی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کو اپنے پاس بلوانے کے لیے پیغام بھیجا۔ علامہ شاطبی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اس وقت اپنے شاگردوں کے حلقے میں تشریف فرما تھے، آپ نے اپنے ایک شاگرد سے کہا کہ امیر کے نام میری طرف سے جواب میں لکھ دو کہ:

"قُلْ لِلْأَمِيرِ مَقَالَةً بِنْ نَاصِحٍ فَطِنٍ نَبِيهٍ
إِنَّ الْفَقِيهَ إِذَا أَتَى أَبْوَابَكُمْ، لَا خَيْرَ فِيهِ."

ترجمہ: "امیر سے جا کر ایک بیدار مغز، ہوش مند اور خیر خواہ انسان کا یہ پیغام پہنچا دو کہ جب کوئی فقیہ تمہارے دروازوں پر جانے لگے تو اس میں کوئی بھلائی باقی نہیں رہتی۔"[1]

❷ حضرت امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سے گورنر عیسیٰ بن موسیٰ نے کہا:

"لِمَ لَا تَغْشَانَا يَا أَبَا حَنِيفَةَ فِيمَنْ يَغْشَانَا؟"

ترجمہ: "لوگ ہمارے پاس آتے ہیں آپ کیوں تشریف نہیں لاتے؟"

حضرت امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے جواب میں ارشاد فرمایا:

"لِأَنَّكَ إِنْ قَرَّبْتَنِي فَتَنْتَنِي، وَإِنْ أَبْعَدْتَنِي أَحْزَنْتَنِي، وَلَيْسَ عِنْدَكَ مَا أَرْجُوكَ لَهُ، وَلَيْسَ عِنْدِي مَا أَخَافُكَ عَلَيْهِ، وَإِنَّمَا يَغْشَاكَ مَنْ يَغْشَاكَ لِيَسْتَغْنِيَ بِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ، وَأَنَا غَنِيٌّ"

[1] التاج المکلل: ۹۸

بِمَنْ أَغْنَاكَ فَلِمَ أَغْشَاكَ فِيمَنْ يُغْشَاكَ؟"

تَرْجَمَہ: "اس لیے کہ اگر تو مجھے قریب کرے گا تو مجھے فتنے میں مبتلا کرے گا (یعنی میرے دین کو نقصان پہنچائے گا) اور جب مجھے خود سے دور کرے گا تو مجھے صدمہ ہوگا اور تیرے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں جس کی میں تجھ سے کوئی امید رکھوں اور میرے پاس بھی کوئی ایسی چیز نہیں جس پر تجھ سے ڈروں یا خوف کھاؤں، جو لوگ تیرے پاس آتے ہیں تو وہ تجھ سے غنا حاصل کرنے آتے ہیں کہ انہیں کسی اور سے مانگنا نہ پڑے اور مجھے اس اللہ تعالیٰ نے غنی کیا ہے، جس نے تجھے غنی کیا، تو میں تیرے پاس کیوں آؤں۔"

اور اسی طرح امام محمد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے بھی یہ روایت نقل کی ہے اور آخر میں یہ اضافہ ہے:

"كِسْرَةُ خُبْزٍ، وَقَعْبُ مَاءٍ، وَفَرْدُ ثَوْبٍ مَعَ السَّلَامَةِ خَيْرٌ مِّنَ الْعَيْشِ فِي نَعِيمٍ يَكُونُ فِي آخِرِهِ نَدَامَةٌ"

تَرْجَمَہ: "ایمان کی سلامتی کے ساتھ روٹی کا ٹکڑا اور پانی کا پیالہ اور بوسیدہ کپڑا اس عیش سے بہتر ہے، جس کے بعد ندامت ہو۔"[1]

❸ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ اپنے کسی استاذ یا شیخ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ کسی دکان پر کوئی چیز خریدنے گئے اور انہوں نے اس چیز کی قیمت پوچھی، دکان دار نے قیمت بتا دی۔ جس وقت قیمت ادا کرنے لگے تو اس وقت ایک اور صاحب وہاں پہنچ گئے جو ان کے جاننے والے تھے، وہ دکان دار ان کو نہیں جانتا تھا کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں۔ چناں چہ ان صاحب نے دکان دار سے کہا کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں، لہٰذا

[1] الجواهر المضية لابن أبي الوفا: ٤٢٣

ان کے ساتھ رعایت کریں۔ حضرت مولانا نے فرمایا:

"میں اپنے مولوی ہونے کی قیمت نہیں لینا چاہتا، اس چیز کی جو اصل قیمت ہے وہی مجھ سے لے لو، اس لیے کہ پہلے جو قیمت تم نے بتائی تھی، اس قیمت پر تم خوش دلی سے یہ چیز دینے کے لیے تیار تھے، اب اگر دوسرے آدمی کے کہنے سے تم نے رعایت کر دی اور دل اندر سے مطمئن نہیں ہے تو اس صورت میں وہ خوش دلی سے دینا نہیں ہوگا اور پھر میرے لیے اس چیز میں برکت نہیں ہوگی اور اس کا لینا بھی میرے لیے حلال نہیں ہوگا، لہٰذا جتنی قیمت تم نے لگائی ہے اتنی قیمت لے لو۔"

اس واقعہ سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ "یہ مولویت بیچنے کی چیز نہیں" کہ بازار میں اس کو بیچا جائے کہ لوگ اس کی وجہ سے اشیاء کی قیمت کم کر دیں۔

❹ آپ کے والد صاحب نے ایک کارخانے میں کچھ حصہ آپ کے نام کر دیا، آپ نے پوچھا: "واقعتاً یہ حصہ مجھے دے دیا ہے یا کسی مصلحت سے میرے نام کیا ہے؟" انہوں نے فرمایا...... "کیا تو مصلحت ہی سے تھا، مگر اب آپ کو ہبہ کر دیا۔" آپ نے کہا: "اس سے مجھ پر حج فرض ہو گیا، اسے بیچ کر حج کروں گا۔" والد صاحب نے فرمایا کہ...... "ابھی آپ کی بہنوں کی شادی وغیرہ کے مصارف سامنے ہیں، اس لیے حج کے لیے آئندہ سال جائیں۔" حضرت والد صاحب سے عرض کیا کہ...... "کیا آپ آئندہ سال تک میری حیات کی ضمانت لے سکتے ہیں؟"

انہوں نے فرمایا: "یہ تو نہیں ہو سکتا۔" تو حضرت نے فیصلہ سنا دیا کہ ابھی بیچ کر حج کے لیے جا رہا ہوں، بیچا اور تشریف لے گئے۔

"آپ کی تصانیف ہزاروں کی تعداد میں ہیں، لیکن آپ نے اپنی کسی تصنیف کا حق طبع محفوظ نہیں کیا، اگر صرف "بہشتی زیور" ہی کا حق طبع محفوظ کر لیتے تو کروڑوں کما تے۔"

❺ ایک بار ایک شخص بلا اجازت ریل گاڑی کا پورا ڈبہ آموں سے بھر کر لے آیا۔

حضرت نے فرمایا کہ پہلے اجازت کیوں نہیں لی؟

ہمارے ہاں اصول ہے کہ پہلے اجازت لی جائے تو ہم قبول کرتے ہیں ورنہ قبول نہیں کرتے، خلاف قانون کیوں لائے، جاؤ لے جاؤ یہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

وہ بہت پریشان ہوا کہ واپس لے جاتے ہیں تو پورا ابھرا ہوا یہ خراب ہو جائے گا۔

جب اس نے یہ بات عرض کی تو حضرت نے فرمایا کہ..... "اگر خراب ہوتا ہے تو ہو جائے، اس میں میرا کیا قصور ہے، ان کو خراب ہونے سے بچانا میرے ذمہ تو نہیں، تم نے ایسی حماقت کیوں کی؟"

پھر فرمایا: "اگرچہ اس کا تدارک اور اس کو خراب ہونے سے بچانے کی تدبیر بتانا میرے ذمہ نہیں پھر بھی تبرعاً آپ پر احسان کر کے بتا دیتا ہوں کہ اسے منڈی میں لے جائیں، بیچ کر پیسے پلے باندھیں اور جائیں۔"

بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ جو ہدایا اور پیسے قبول کرنے سے اتنا انکار کرتے ہیں یہ پیسہ لانے کا ذریعہ ہے، جو ہدایا لانے والوں کو ڈانٹتا ہے اور قبول کرنے سے انکار کرتا ہے لوگ اسے اور زیادہ دیتے ہیں، تو یہ زیادہ لانے کا طریقہ ہے۔ حکیم الامت تو واقعۃً حکیم الامت تھے فوراً جواب دیتے تھے۔

حضرت حکیم الامت کا سب سے بڑا کمال "علم کلام" میں مہارت تھی۔ آپ جیسا حاضر جواب صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جب ان لوگوں نے کہا:

"یہ جو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں یہ پیسے زیادہ لانے کی ایک تدبیر ہے۔"

تو آپ نے فوراً جواب دیا: "جب انہیں خبر بھی ہے کہ یہ پیسہ لانے کی تدبیر ہے تو اس کو خود اختیار کیوں نہیں کرتے؟ کیوں اہل ثروت کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں؟ ان کے دروازوں کی خاک کیوں چھانتے ہیں؟" کیسا جواب دیا۔

۹ آپ نے حضرت پھولپوری رحمہ اللہ تعالیٰ کو دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لیے منتخب فرما کر آپ سے تنخواہ کے بارے میں دریافت فرمایا تو حضرت

پھولپوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے عرض کیا کہ میں بلا معاوضہ پڑھاؤں گا، اور معاش کے لیے چنے کھانے کی ضرورت پیش آئی تو بھی اسی پر اکتفا کروں گا۔

۷ حضرت مفتی محمد حسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنا قصہ خود مجھ (یعنی مفتی رشید احمد رحمہ اللہ تعالیٰ) سے یوں بیان فرمایا کہ وہ ایک مدرسہ میں پڑھاتے تھے، تنخواہ بہت کم تھی اور اولاد بہت زیادہ۔

اس زمانے میں ایک مدرسہ سے دو سو (۲۰۰) روپے ماہانہ کی پیش کش آئی، آپ نے اپنے شیخ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں اپنی مشکلات لکھ کر دوسرے ادارہ میں جانے کی اجازت چاہی۔ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب میں یوں تنبیہ فرمائی:

"دو سو روپے مولوی کی جوتی کی خاک کے برابر بھی نہیں، جو کچھ مل رہا ہے اسی پر قناعت کر کے بیٹھے رہیں، اللہ تعالیٰ وسعت عطا فرمائیں گے۔"

حضرت مفتی محمد حسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے شیخ کی ہدایت پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے رزق کے دروازے کھول دیے۔ آخر میں نوابوں جیسی بل کہ نوابوں سے بھی بڑھ کر زندگی گزار رہے تھے۔

حضرت مفتی محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ مظاہر علوم سہارنپور میں پڑھاتے تھے۔ کسی مدرسہ سے بڑے منصب اور بڑی تنخواہ کی پیش کش آئی لیکن آپ نے انکار کر دیا۔

۸ حضرت ڈاکٹر عبدالحی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنا قصہ خود مجھے (یعنی مفتی رشید احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کو) بتایا کہ انہوں نے اپنے شیخ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں لکھا کہ آمدن بہت کم ہے اور عیال زیادہ، بہت پریشان ہوں، اعصاب جواب دے رہے ہیں۔

ایسے خط کے جواب کے بارے میں یہ توقعات قائم کی جاسکتی ہیں:

① حالات پڑھ کر بہت صدمہ ہوا۔

② دل سے دعا کرتا ہوں۔

③ وسعت رزق کا کوئی وظیفہ۔

④ خود مالی تعاون۔

⑤ کسی سے مالی تعاون کی سفارش۔

⑥ کہیں کوئی ملازمت وغیرہ دلوانا۔

شیخ نے جواب میں ان توقعات میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی کوئی ایک لفظ بھی نہ لکھا، صرف یہ تنبیہ تحریر فرمائی:

"افسوس کہ آپ نے پورا خط شکایت سے بھر دیا، شکر کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔"

ڈاکٹر صاحب نے شیخ سے قناعت اور صبر وشکر کا سبق لیا تو اللہ تعالیٰ نے رزق کی بارشیں برسادیں۔

برکت کے لیے یہ چند مثالیں بتادی ہیں ورنہ اکابر کے مقام استغنا کو پوری دنیا جانتی ہے اور ان کے واقعات بے شمار ہیں۔

؎ نہ لالچ دے سکیں ہرگز تجھے سکوں کی جھنکاریں
ترے دست توکل میں تھیں استغنا کی تلواریں

یہ ہیں ہمارے اکابر تارکین دنیا۔

⑨ جب عالمگیر رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی تخت نشینی ہوئی تو اس موقع پر ایک بہروپیا بھی وہاں انعام لینے پہنچ گیا۔ عالمگیر رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی بہت متورع تھے، سمجھتے تھے کہ یہ مصرف نہیں اس لیے اسے ٹالنے کے لیے فرمایا کہ اپنا کوئی کمال دکھاؤ تو انعام ملے گا، بہروپیا چلا گیا۔

عالمگیر رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا یہ معمول تھا کہ جب کسی جگہ جاتے تو وہاں کے علماء ومشائخ کی زیارت کے لیے ان کی خدمت میں حاضری دیتے، یہ خود بہت بڑے عالم تھے اور ان کے وزراء بھی عالم تھے۔

عالمگیر رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا جس طرف زیادہ سفر ہوتا تھا، اس بہروپیے نے اس علاقے میں جھونپڑی ڈالی اور بزرگ بن کر بیٹھ گیا۔ لوگوں میں اس کی بزرگی کی خوب شہرت ہوگئی۔ جب عالمگیر رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اس طرف تشریف لے گئے تو انہوں نے معلوم کروایا کہ اگر یہاں کوئی بزرگ ہیں تو وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ لوگوں نے بتایا کہ یہاں ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ عالمگیر رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اپنے وزیر کو بھیجا۔ جب وزیر نے جا کر ملاقات کی اور کچھ سلوک کی باتیں پوچھیں تو اس نے ایسے جواب دیے کہ وزیر صاحب بہت معتقد ہوگئے۔ یہ بہروپیے جب کوئی روپ دھارتے ہیں تو اس کے بارے میں کمال حاصل کرتے ہیں۔ اس شخص نے علم سلوک میں مہارت حاصل کی تھی، لیکن یہ مہارت اور کمال محض ظاہری ہوتا ہے باطن میں کچھ نہیں ہوتا۔

وزیر نے بادشاہ کو آ کر بتایا کہ وہ تو بہت بڑے ولی اللہ ہیں، بہت تعریف کی۔ بادشاہ بھی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور کچھ باتیں پوچھیں تو اس نے بہت زبردست جواب دیے، بادشاہ بھی بہت معتقد ہوگئے اور ایک ہزار اشرفیاں نذرانہ پیش کیں۔ بہروپیے نے ڈانٹ کر کہا کہ دنیا کے کتے! تو نے مجھے اپنے جیسا دنیا کا کتا سمجھا ہے، لے جاؤ یہ اشرفیاں اور بھاگو یہاں سے۔

اب تو بادشاہ اور زیادہ معتقد ہوگئے کہ یہ تو بہت بڑے زاہد معلوم ہوتے ہیں۔ بادشاہ واپس اپنی قیام گاہ میں آگئے پیچھے پیچھے یہ بہروپیا بھی پہنچ گیا، بادشاہ کو سلام کیا اور کہا کہ میں وہی بہروپیا ہوں جو آپ کی تخت نشینی کے موقع پر انعام مانگنے آیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ پہلے اپنا کمال دکھاؤ پھر انعام ملے گا۔ بادشاہ نے بہت تعجب

سے پوچھا کہ یہ بتاؤ میں نے تمہیں نذرانہ کے طور پر اتنی بڑی رقم دی تھی اور تمہاری حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد بھی میں وہ نذرانہ تم سے واپس نہ لیتا اتنا مال تم نے واپس کیوں کر دیا جب کہ اب تو میں تمہیں انعام میں بہت ہی تھوڑی سی رقم دوں گا جو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اس بہروپیے کا جواب سنیے!

کہنے لگا کہ ''میں اس وقت اہل اللہ کے روپ میں تھا، اگر اس وقت میں وہ نذرانہ رکھ لیتا تو اہل اللہ کی نقل صحیح نہ ہوتی میں نے ان کی نقل پوری طرح اتارنے کے لیے ایسا کیا۔''[1]

اس قصے میں بہت بڑی عبرت ہے کہ دنیا کے بندے نے اللہ والوں کی صرف نقل اتارنے کے لیے دنیا کو لات ماردی۔

یہ تمام قصے بتانے سے مقصد یہی ہے کہ آج کے علماء وطلبہ اکابر کے حالات کی روشنی میں کچھ اپنا جائزہ لیں، اپنی اصلاح کی فکر کریں اور اکابر کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔ آخرت کے لیے کی جانے والی کوشش بھی رائیگاں نہیں جاتی، اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کی دست گیری فرماتے ہیں۔ اس کے برعکس دنیائے مردار کی فکر میں جو لوگ لگ گئے انہیں سوائے خسارے کے کچھ حاصل نہ ہوا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مَنْ كَانَتِ الْآخِرَةُ هَمَّهُ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ وَجَمَعَ لَهُ شَمْلَهُ وَأَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ كَانَتِ الدُّنْيَا هَمَّهُ جَعَلَ اللّٰهُ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَفَرَّقَ عَلَيْهِ شَمْلَهُ وَلَمْ يَأْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا مَا قُدِّرَ لَهُ.''[2]

ترجمہ: ''جس نے آخرت کو مقصود بنالیا اللہ تعالیٰ اس کے دل میں غنا

[1] الافاضات الیومیۃ: ۳/۲۰۷

[2] ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب احادیث ابتلینا بالضراء ..... رقم: ۲۴۶۵

عطا فرمادیتے ہیں اور اس کی متفرق حاجات پوری فرمادیتے ہیں اور دنیا اس کے پاس ناک رگڑتی ہوئی آتی ہے اور جس نے دنیا کو مقصود بنایا اللہ تعالیٰ اس کو فقر وفاقہ سے خوف زدہ رکھتے ہیں اور اس کو متفرق حاجات میں مبتلا رکھتے ہیں پھر بھی اس کو دنیا اتنی ہی ملتی ہے جتنی اس کے لیے مقدر ہے۔''

اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائیں، اس میں برکت عطا فرمائیں، ہدایت کا ذریعہ بنائیں۔[1]

⑩ قاضی بکار بن قتیبہ رحمہ اللہ تعالیٰ مصر کے مشہور محدث اور فقیہ گزرے ہیں، امام ابوجعفر طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے استاذ ہیں اور انہوں نے شرح معانی الآثار میں متعدد حدیثیں آپ کی سند سے روایت کی ہیں۔ ان کے زمانے میں احمد بن طولون مصر کے حکمران تھے۔ اور وہ قاضی بکار رحمہ اللہ تعالیٰ سے درس حدیث لینے کے لیے خود ان کی مجلس میں پہنچ جاتے تھے۔ ان کا دربان پہلے مجلس کے قریب پہنچ کر لوگوں سے کہہ دیتا کہ: ''کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ اٹھے'' اس کے بعد ابن طولون چپکے سے آکر بیٹھ جاتے اور عام طلباء کی صف میں بیٹھ کر حدیث کا درس لیتے تھے۔ ایک زمانہ تک ابن طولون اور قاضی بکار رحمہ اللہ تعالیٰ کے تعلقات بہت خوش گوار رہے اور اس عرصہ میں احمد بن طولون قاضی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تنخواہ کے علاوہ ان کی خدمت میں سالانہ ایک ہزار دینار بطور ہدیہ پیش کیا کرتے تھے۔

اتفاق سے ایک سیاسی مسئلہ میں قاضی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد بن طولون کا اختلاف ہوگیا، ابن طولون چاہتے تھے کہ وہ اپنے ولی عہد کو معزول کرکے کسی اور کو ولی عہد بنائیں اور قاضی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے اس کی تصدیق کرائیں، قاضی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اسے درست نہ سمجھتے تھے، اس لیے انہوں

[1] علماء کا مقام ص ۷۵ تا ۸۲

نے انکار کر دیا، اس کی وجہ سے تعلقات کشیدہ ہو گئے، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ابن طولون نے قاضی صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کو قید کر دیا، اور یہ پیغام ان کے پاس بھیجا کہ جتنے دینار آپ کو بطور ہدیہ دیئے گئے ہیں، وہ سب واپس کیجیے۔

سالانہ ایک ہزار دینار دینے کا سلسلہ اٹھارہ سال سے جاری تھا، اس لیے مطالبہ یہ تھا کہ ۱۸ ہزار دینار فوراً واپس کیے جائیں۔ ابن طولون سمجھتے تھے کہ یہ مطالبہ قاضی صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کو زچ کر دے گا۔

لیکن جب پیغام ان کے پاس پہنچا تو قاضی صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کسی تردد کے بغیر اندر تشریف لے گئے اور گھر سے اٹھارہ تھیلیاں نکال لائے جن میں سے ہر ایک میں ایک ایک ہزار دینار تھے، یہ تھیلیاں ابن طولون کے پاس پہنچیں تو اس نے دیکھا کہ یہ بعینہٖ وہی تھیلیاں تھیں جو قاضی صاحب کے پاس بھیجی گئی تھیں اور ان کی مہریں تک نہیں ٹوٹی تھیں۔ ابن طولون یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ قاضی بکار رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ان میں سے ایک تھیلی بھی کھولی نہیں تھی، بلکہ اسے جوں کا توں محفوظ رکھ لیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ قاضی بکار رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اسی خیال سے انہیں استعمال نہیں کیا تھا کہ امیر سے بلاشبہ اس وقت تعلقات اچھے ہیں، لیکن کبھی اختلاف پیدا ہوا تو انہیں جوں کا توں لوٹایا جا سکے گا۔ ابن طولون قاضی بکار رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی یہ بلندیٔ کردار وذہانت وحکمت اور استغنا کی نرالی شان دیکھ کر شرم سے عرق عرق (پسینہ پسینہ) ہو گیا۔[1]

۱۱ علامہ ابن اثیر جذری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ ایرانی آتش پرستوں سے جہاد کرنے کے لیے قادسیہ پہنچے تو انہوں نے اپنے لشکر کے ایک افسر حضرت عاصم بن عمرو رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو کسی کام سے ''میان'' کے مقام پر بھیجا، یہ دشمن کے ملک میں ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔

---

[1] النجوم الزاهرة فی اخبار ملوك مصر و القاهرة ۳/ ۱۹ نقلاً عن تراشے: ۸۰

حضرت عاصم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی یہاں پہنچے تو رسد کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ اور ساتھیوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا۔ انہوں نے آس پاس تلاش شروع کی کہ شاید کوئی گائے بکری مل جائے مگر کافی جستجو کے باوجود کوئی جانور ہاتھ نہ آیا۔ اچانک انہیں بانس کے ایک چھپر کے پاس ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ انہوں نے اس سے جا کر پوچھا کہ

''کیا یہاں آس پاس کوئی گائے بکری مل جائے گی؟''

اس شخص نے کہا: ''مجھے معلوم نہیں۔'' حضرت عاصم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی ابھی واپس نہیں لوٹے تھے کہ چھپر کے اندر سے ایک آواز سنائی دی۔

''یہ خدا کا دشمن جھوٹ بولتا ہے، ہم یہاں موجود ہیں۔''

حضرت عاصم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی چھپر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں کئی گائے بیل کھڑے ہیں۔ مگر وہاں کوئی آدمی نہیں تھا اور یہ آواز ایک بیل کی تھی۔ حضرت عاصم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی وہاں سے گائے بیل لے کر آئے اور انہیں لشکر میں تقسیم کیا۔

یہ واقعہ کسی نے حجاج بن یوسف کو سنایا تو اسے یقین نہ آیا۔ اس نے جنگ قادسیہ کے شرکاء کے پاس پیغام بھیج کر اس کی تصدیق کرنی چاہی تو بہت سے حضرات نے گواہی دی کہ اس واقعے کے وقت ہم موجود تھے، حجاج نے ان سے پوچھا:

''اس زمانے میں اس واقعے کے بارے میں لوگوں کا تاثر کیا تھا؟''

انہوں نے کہا ''اس واقعے کو اس بات کی دلیل سمجھا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہے اور وہ ہمیں دشمن پر فتح عطا فرمائے گا۔''

''یہ بات اسی وقت ہو سکتی ہے جب لوگوں کی اکثریت متقی و پرہیزگار ہو'' حجاج نے کہا۔

''دلوں کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے'' انہوں نے کہا۔ ''لیکن اتنا ہم بھی

جانتے ہیں کہ دنیا سے اس قدر بے نیاز تو ہم نے ان کے بعد نہیں دیکھی۔[1]

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا درس پر معاوضہ نہ لینا

١٢ مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں بارہ سال تک ریڈیو پاکستان پر درس قرآن دیتا رہا اور میرے نزدیک اس پر معاوضہ لینا کوئی گناہ نہیں تھا، بہت سے اللہ کے بندے لیتے ہیں ویسے قرآن پر معاوضہ لینا کوئی گناہ نہیں۔ جائز ہے، مگر میں نے قصداً ضرورت مند ہونے کے باوجود نہیں لیا اور اگر لیتا تو بیس تیس ہزار روپیہ مجھے ملتا، لیکن میں نے صرف اس لیے نہیں لیا کہ اس لباس کا تقاضا نہیں تھا۔ ہم کوئی درس دیں اور اس پر معاوضہ لیں یا کوئی وعظ کہیں اس پر نذرانہ وصول کریں یہ اس وضع کے خلاف بات ہے۔ چاہے اپنی ذات میں وہ گناہ نہ ہو، مگر ہم نے چوں کہ یہ وضع اختیار کر کے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم اللہ والے ہیں، ہم دنیا کے طالب نہیں اس لیے لینا مناسب نہ تھا۔[2]

دنیا کو دین پر ترجیح نہ دینا

مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

آج کے اہل علم اور علماء بھی اسی میں داخل ہیں، اگرچہ وہ اس درجے کے نہ ہوں، مگر کم از کم جو لوگ اس علم میں لگے ہوئے ہوں اور جنہوں نے اپنے آپ کو دین کے لیے وقف کیا ہو۔ ان کی زندگی میں کم از کم یہ تو ہونا چاہیے کہ دنیا کو دین پر ترجیح نہ دیں۔ دنیا کے جمع کرنے کی فکر میں زیادہ نہ پڑیں اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی کو دے دیں تو اس کو نعمت سمجھ کر استعمال کرنا گناہ نہیں، لیکن دنیا کی فکر میں لگے رہنا اور

[1] الکامل لابن اثیر، ذکر ابتداء أمر القادسیۃ، السنۃ الرابعۃ عشر للہجرۃ: ۲/۴۲۱، ۴۲۲
[2] مجالس مفتی اعظم: ۲۰۰

اسی فکر میں لگے رہنا کہ پیسے بڑھ جائیں۔ یہ کام علماء کی شان کے خلاف ہے، علماء کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے اور علمی کام میں لگایا ہے ان کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے کام میں لگیں۔

پھر اللہ تعالیٰ غیب سے ان کو ایسا دیتا بھی ہے کہ دنیا ان کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے لیکن خود ان کو اس فکر میں لگے رہنا یہ ان کے اس دعوے کے خلاف ہے کہ یہ جو ہم نے اپنا لباس بنایا ہے۔ کرتا، پائجامہ، ٹوپی جو علماء کا لباس ہے یہ پہننے کے بعد ہمارے دل میں یہ طمع ہو کہ یہاں سے کچھ پیسے وصول کر لیں، وہاں سے کچھ پیسے وصول کر لیں، یہ کمائی یہاں سے کر لیں۔ یہ ہماری اس وضع کے خلاف ہے اس دعویٰ کے خلاف ہے درحقیقت اس بات کا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ والے ہیں اللہ کے طالب ہیں دنیا کے طالب نہیں۔

دنیا ہونا کوئی مضر نہیں، بشرطیکہ غیر معمولی کوششوں کے بغیر مل جائے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور غیر معمولی کوششوں میں لگنا یہ علماء کی شان کے خلاف ہے۔[1]

ائمہ کرام احتیاط کریں

سوال: ہماری مسجد میں امام صاحب آٹھ سال سے امامت کر رہے ہیں مقتدی ان سے خوش تھے، مگر ابھی ایک دو باتیں پیش آگئیں، جس کی وجہ سے بعض مقتدی ان کی اقتداء میں نماز پڑھنے سے کراہت کرتے ہیں۔

١ مسجد کا ایک اصول یہ ہے کہ مسجد کی دکان مسجد کے خدام کو کرایہ پر نہیں دی جاتی۔ امام صاحب نے ایک دکان دو یا تین سال ایک شخص کے نام سے لی اور مسجد کے ذمہ داروں کو نہیں بتایا۔ اس کے بعد مسجد والوں کو معلوم ہوا تو تحقیق کی۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا، جب اس شخص سے پوچھا گیا تو اس نے جو بات سچ تھی وہ بتلا

[1] مجالس مفتی اعظم: ۱۹۹، ۲۰۰

دی کہ دکان امام صاحب کی ہے، انہوں نے میرے نام سے لی ہے۔

❷ انہوں نے ایک مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا اور مسجد میں مدرسہ کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ ایک جگہ خریدنے کا بھی پروگرام تھا، مگر برائے مدرسہ جگہ نہ خرید سکے، جو چندہ ہوا وہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کی۔ ایک موقع پر مسجد کی کمیٹی کے سیکرٹری نے ان سے حساب طلب کیا تو چار پانچ ماہ تک ٹالتے رہے۔ سیکرٹری نے دوبارہ مطالبہ کیا تو ایک خط کے ذریعہ جواب دیا "یہ مدرسہ میرا ذاتی ہے، آپ کو اس کا حساب مانگنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" جس کی وجہ سے مسجد میں بڑا انتشار ہوا اور بعض مقتدی ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے کے لیے تیار نہیں، تو ان کی اقتداء میں نماز کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں مفتی عبدالرحیم لاج پوری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

الجواب: حدیث میں ہے "عَنْ أَبِیْ أُمَامَۃَ (رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ثَلَاثَۃٌ لَا تُجَاوِزُ صَلٰوتُہُمْ اٰذَانَہُمُ الْعَبْدُ الْاٰبِقُ حَتّٰی یَرْجِعَ، وَامْرَأَۃٌ بَاتَتْ وَزَوْجُہَا عَلَیْہَا سَاخِطٌ، وَإِمَامُ قَوْمٍ وَہُمْ لَہٗ کَارِہُوْنَ"[1]

تَرجَمہ: "رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین آدمیوں کی نماز ان کے کان سے بھی آگے تجاوز نہیں کرتی (یعنی قبول نہیں ہوتی) ① بھاگا ہوا غلام یہاں تک کہ واپس آجائے ② عورت اس حال میں رات گزارے کہ اس کا شوہر اس سے ناراض ہو ③ اور وہ امام کہ لوگ اس سے (کسی معقول وجہ سے) ناراض ہوں۔"

فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے۔ "وَلَوْ أَمَّ قَوْمًا وَہُمْ لَہٗ کَارِہُوْنَ إِنَّ

[1] ترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ماجاء فی من أمّ قومًا وھم لہ کارھون، رقم: ۳۶۰

الْکَرَاھَۃَ (لِفَسَادٍ فِیْہِ أَوْلِأَنَّہُمْ أَحَقُّ بِالْإِمَامَۃِ مِنْہُ کُرِہَ) لَہٗ ذٰلِکَ تَحْرِیْمًا لِحَدِیْثِ أَبِیْ دَاوٗدَ "لَا یَقْبَلُ اللّٰہُ صَلٰوۃَ مَنْ تَقَدَّمَ قَوْمًا وَہُمْ لَہٗ کَارِہُوْنَ" (وَإِنْ ہُوَ أَحَقُّ لَا) وَالْکَرَاہَۃُ عَلَیْہِمْ"[1]

تَرجَمہ: "اگر کوئی شخص امامت کرتا ہے اور نمازی اس سے کراہت کرتے ہیں (اسے پسند نہیں کرتے) تو اگر اس کراہیت اور ناگواری کا سبب یہ ہے کہ امام میں کوئی خرابی ہے یا یہ لوگ امامت کے اس سے زیادہ مستحق ہیں وہ ان سے کم درجہ رکھتا ہے تو اس کو امامت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

چناں چہ ابوداؤد شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں فرماتے جو امامت کرے اور لوگ اس سے کراہیت کرتے ہوں[2] "اور اگر واقعہ یہ ہے کہ امام ہی سب سے زیادہ امامت کا حق دار ہے، (عالم و فاضل اور متقی ہے) اور لوگ اس سے کراہیت کرتے ہیں تو اس کراہیت کا وبال نمازیوں پر ہوگا۔[3]

صورت مسئولہ میں بعض مقتدی امام سے ناراض ہیں۔ ان کی اقتداء میں نماز پڑھنے سے کراہیت کرتے ہیں۔ سوال سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی ناراضگی بلاوجہ نہیں ہے۔ انہوں نے جھوٹ بولا اور غلط معاملہ کیا اور عرصہ تک اس غلط چیز کو چلاتے رہے، اور مسجد میں مدرسہ کے نام سے چندہ کیا اور بعد میں اس چندہ کا حساب نہیں دیا اور یہ کہنا کہ یہ "میرا ذاتی معاملہ ہے" آپ کو حساب مانگنے کا کوئی حق نہیں ہے، یہ قابل قبول نہیں ہے۔ چندہ مدرسہ کے نام سے کیا گیا ہے اس لیے امانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا حساب بالکل صاف رکھنا چاہیے تھا۔ حساب نہ رکھنا اس سے لوگوں کو یقیناً چندہ کرنے والے کے متعلق خیانت کا خیال پیدا ہوگا اور مصلیوں (یعنی

[1] درمختار مع شامی باب الامۃ ۱/۵۵۹

[2] ابوداؤد، الصلوۃ، باب الرجل یؤم القوم وھم لہ کارھون، رقم: ۵۹۳

[3] فتاویٰ رحیمیہ ۱/۱۶۵

نمازیوں) میں انتشار ہوگا۔

لہٰذا ایسے شخص کو امامت جیسے اہم منصب پر قائم رکھنا موجبِ فتنہ ہو سکتا ہے۔ امامت بہت عظیم منصب ہے۔ ایسا شخص اس اہم منصب کے قابل نہیں۔ امامت کرانا ان کے لیے مکروہ تحریمی ہے، لہٰذا ان کو از خود مستعفی ہو جانا چاہیے۔

امامت کتنا عظیم منصب ہے اور امام کو کتنا محتاط ہونا چاہیے اس کا اندازہ اس حدیث سے لگائیے۔

ابوداؤد شریف میں ہے:

"إِنَّ رَجُلًا أَمَّ قَوْمًا فَبَصَقَ فِي الْقِبْلَةِ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ فَرَغَ: (لَا يُصَلِّيْ لَكُمْ) فَأَرَادَ بَعْدَ ذٰلِكَ أَنْ يُصَلِّيَ لَهُمْ فَمَنَعُوْهُ وَأَخْبَرُوْهُ بِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "نَعَمْ" وَحَسِبْتُ أَنَّهُ قَالَ: "إِنَّكَ اٰذَيْتَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ."[1]

ترجمہ: "ایک شخص نے کچھ لوگوں کی امامت کی۔ اسے تھوک آیا تو قبلہ کی جانب تھوک دیا۔ آں حضرت ﷺ دیکھ رہے تھے۔ جب نماز سے فارغ ہوگئے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے والوں سے آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "یہ شخص آئندہ تمہاری امامت نہ کرے۔" اس کے بعد اس شخص نے نماز پڑھانے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے اسے روک دیا اور بتادیا کہ حضور ﷺ نے اس کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے۔ یہ شخص حضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس واقعہ کا تذکرہ کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہاں میں نے کہا تھا۔" راوی بیان کرتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں

[1] ابوداؤد، الصلوة، باب کراهیة البزاق فی المسجد: ۱/۶۸

آپ نے یہ بھی فرمایا: "تم نے اللہ کو اور اس کے رسول کو اذیت پہنچائی تھی۔"[1]

سترِ عیوب

امام کو اس صفت میں بھی امتیازی درجہ حاصل ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالے، جس طرح اسلاف مسلمانوں کو شرمندگی سے بچانے کے لیے قربانیاں دیتے تھے اور خود اپنے اوپر سہہ لیتے تھے، تاکہ مسلمان بھائی کو شرمندگی نہ اٹھانی پڑے، ہمیں بھی چاہیے کہ اس صفت سے بھی وافر حصہ اپنائیں اور اس حدیث مبارک میں جو فضیلت بیان کی گئی ہے اس کو حاصل کرنے والے بنیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ وَسَّعَ عَلٰى مَكْرُوْبٍ كُرْبَةً فِي الدُّنْيَا وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ كُرْبَةً فِي الْآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ عَوْرَةَ مُسْلِمٍ فِي الدُّنْيَا سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ فِي الْآخِرَةِ، وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْمَرْءِ مَا كَانَ الْمَرْءُ فِي عَوْنِ أَخِيْهِ."[2]

ترجمہ: "جو شخص دنیا میں کسی پریشان حال کی پریشانی کو دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی پریشانی دور فرمائیں گے اور جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کے عیب پر پردہ ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کے عیب پر پردہ ڈالیں گے۔ جب تک آدمی اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے رہتے ہیں۔"

ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"يُبْصِرُ أَحَدُكُمُ الْقَذَاةَ فِي عَيْنِ أَخِيْهِ وَيَنْسَى الْجِذْعَ فِي عَيْنِهِ."[3]

[1] فتاوی رحیمیہ: ۱/۱۶۴ تا ۱۶۵
[2] مسند احمد: ۲/۲۷۴، الرقم: ۷۶۴۴
[3] حلیۃ الاولیاء: ۴/۱۰۴، الرقم: ۴۶۴۹

ترجمہ: ”آدمی کو اپنے بھائی کی آنکھ کا ایک تنکا بھی نظر آ جاتا ہے، لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر تک بھی اسے نظر نہیں آتا۔“

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے معمولی سے معمولی عیوب نظر آ جاتے ہیں اور اپنے بڑے بڑے عیوب پر نظر نہیں جاتی۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

”مَنْ غَسَّلَ مَيِّتًا فَكَتَمَ عَلَيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ أَرْبَعِيْنَ كَبِيْرَةً، وَمَنْ حَفَرَ لِأَخِيْهِ قَبْرًا حَتّٰى يُجِنَّهُ فَكَأَنَّمَا أَسْكَنَهُ مَسْكَنًا حَتّٰى يُبْعَثَ.“ [1]

ترجمہ: ”جو شخص میت کو غسل دیتا ہے اور (اگر کوئی عیب پائے تو) اس کو چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے چالیس بڑے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ اور جو اپنے بھائی (کی میت) کے لیے قبر کھودتا ہے اور اس کو اس میں دفن کرتا ہے تو گویا اس نے (قیامت کے دن) دوبارہ زندہ اٹھائے جانے تک اس کو ایک مکان میں ٹھہرا دیا یعنی اس کو اس قدر اجر ملتا ہے جتنا کہ اس شخص کے لیے قیامت تک مکان دینے کا اجر ملتا۔“

امام ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ نقل کرتے ہیں کہ امام کسائی اور امام یزیدی رحمہما اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ ہارون رشید کے یہاں جمع ہوگئے، دونوں علم قراءت کے امام ہیں، نماز کا وقت آیا تو امام کسائی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھائی۔ سورہ ”قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ“ پڑھنی شروع کی، تو بھول گئے، نماز کے بعد امام یزیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا: ”مقام عبرت ہے کہ کوفہ کے قاری کو ”قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ“ ہی میں بند لگ گیا۔“

بات آئی گئی ہوگئی، پھر اتفاق سے ایک دن امام یزیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نماز

[1] مجمع الزوائد: الجنائز، باب تجهيز الميت وغسله: ۳/۸۶، رقم: ۴۰۶۸

پڑھانے کھڑے ہوئے تو سورہ فاتحہ ہی بھول گئے، سلام پھیرنے کے بعد انہیں اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو یہ شعر پڑھا۔

احْفَظْ لِسَانَكَ لَا تَقُوْلُ فَتُبْتَلٰى
إِنَّ الْبَلَاءَ مُوَكَّلٌ بِالْمَنْطِقِ

ترجمہ: ”اپنی زبان کو روکے رکھو دوسرے کے عیوب سے ورنہ خود ان میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس لیے کہ بلاء اور مصیبت بولنے پر آتی ہے۔“

یعنی دوسروں کے عیوب دیکھنے سے بچتے رہو، کسی کی کمی کوتاہی نظر آنے پر اس کو مجلس میں رسوا کرنے سے بچتے رہو، ورنہ یاد رکھو کہ تم بھی اس طرح کے عیوب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

ذیل میں ہم ”مناجات الصالحين“ میں سے ایک دعا نقل کرتے ہیں جس میں عیب جوئی سے حفاظت بھی مانگی گئی ہے ائمہ حضرات اس کو تہجد، اشراق و چاشت اور اوابین کے نوافل کے بعد مانگیں۔

اللّٰهُمَّ يَا جَامِعَ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيْهِ اجْمَعْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الصِّدْقِ وَالنِّيَّةِ وَالْإِخْلَاصِ وَالْخُشُوْعِ وَالْهَيْبَةِ وَالْحَيَاءِ وَالْمُرَاقَبَةِ وَالنُّوْرِ وَالْيَقِيْنِ وَالْعِلْمِ وَالْمَعْرِفَةِ وَالْحِفْظِ وَالْعِصْمَةِ وَالنَّشَاطِ وَالْقُوَّةِ وَالسِّتْرِ وَالْمَغْفِرَةِ وَالْفَصَاحَةِ وَالْبَيَانِ وَالْفَهْمِ فِي الْقُرْآنِ، وَخُصَّنَا مِنْكَ بِالْمَحَبَّةِ وَالْاِصْطِفَائِيَّةِ وَالتَّخْصِيْصِ وَالتَّوْلِيَةِ، وَكُنْ لَنَا سَمْعًا وَبَصَرًا وَلِسَانًا وَقَلْبًا وَيَدًا وَمُؤَيِّدًا، وَآتِنَا الْعِلْمَ اللَّدُنِّيَّ وَالْعَمَلَ الصَّالِحَ، وَالرِّزْقَ الْهَنِيَّ الَّذِيْ لَا حِجَابَ بِهِ، فِي الدُّنْيَا وَلَا حِسَابَ وَلَا سُؤَالَ، وَلَا عِقَابَ عَلَيْهِ فِي الْآخِرَةِ، عَلٰى بِسَاطِ عِلْمِ التَّوْحِيْدِ وَالشَّرْعِ، سَالِمِيْنَ مِنَ الْهَوٰى، وَالشَّهْوَةِ وَالطَّمَعِ، وَأَدْخِلْنَا مُدْخَلَ صِدْقٍ

[1] معرفة القراء الكبار للذهبي: ۱/۱۰۷

وَأَخْرِجْنَا مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا"[1]

تکبر انسان کو فہمِ سلیم اور علومِ الٰہیہ سے محروم کر دیتا ہے

ویسے تو ہر مسلمان کو چاہیے کہ تکبر سے بچنے کی کوشش کرے، خصوصاً ائمہ حضرات کو اس بری اور گندی بیماری سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ مفتی محمود حسن صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اپنے وعظ "مذمتِ کبر" میں فرماتے ہیں:

حضرت امام مالک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

"اَلْعِلْمُ نُوْرٌ يَّجْعَلُهُ اللّٰهُ حَيْثُ يَشَاءُ وَلَيْسَ بِكَثْرَةِ الرِّوَايَةِ."[2]

تَرْجَمَہ: "علم نور ہے جہاں سے اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں دے دیتے ہیں، علم کثرتِ روایت کا نام نہیں۔"

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں:

"لَيْسَ الْعِلْمُ بِكَثْرَةِ الرِّوَايَةِ إِنَّمَا الْعِلْمُ نُوْرٌ يُقْذَفُ فِي الْقَلْبِ."[3]

تَرْجَمَہ: "علم کثرتِ روایت کا نام نہیں (بل کہ) علم تو نور ہے جو دل میں ڈال دیا جاتا ہے۔"

جب قلب میں نور رکھا جاتا ہے اور قلب روشن ہوتا ہے تو سب سے پہلے تو قلب ہی کو دیکھے گا، قلب نظر آئے گا۔ جیسے کہ ایک اندھیرا کمرہ ہے، تہ خانہ ہے۔ کچھ پتہ نہیں اس میں کیا ہے؟

[1] مناجات الصالحین: ۱۹۰

[2] احیاء علوم الدین، کتاب العلم، الباب الثانی فی العلم المحمود والمذموم ...... ۴۵/۱ وحلیۃ الأولیاء: ۳۴۸/۶، رقم: ۸۸۶۷

[3] احیاء علوم الدین، کتاب العلم، الباب الخامس فی آداب المتعلم والمعلم: ۷۵/۱

اس میں آپ نے ایک گیس جلا دیا، ایک بلب جلا دیا، اب نظر آتا ہے کہ ادھر تو سانپ جا رہا ہے ادھر تو بچھو جا رہا ہے۔ یہ کاٹنے والا ہے یہ ڈسنے والا ہے، تو سب سے پہلے تو اس نور سے قلب کے اندر کی چیزیں نظر آنی چاہئیں کہ قلب کا کیا حال ہے؟ قلب کے اندر حسد ہے، قلب کے اندر بخل ہے، قلب کے اندر ریاکاری ہے، قلب کے اندر دوسروں کو اذیت پہنچاتا ہے، قلب کے اندر چوری کرتا ہے اور کیا کیا چیزیں قلب کے اندر ہیں؟

لہٰذا علم کی روشنی میں سب سے پہلے آدمی کو اپنا جہل محسوس ہونا چاہیے کہ میں کتنا جاہل ہوں۔ یہ علم کا صحیح فائدہ ہے کہ اس کو اپنے جہل کا ادراک ہو۔ حضرت شیخ الہند رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے ملفوظات کا مجموعہ "اَلْقَوْلُ الْجَلِيْلُ" میں یہ منقول ہے کہ حضرت شیخ الہند رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرمایا کرتے تھے "کہ ہمیں تو سب کچھ پڑھ کر پتہ چل گیا کہ ہم جاہل ہیں" دیوبند میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی طلبہ کو "جاہلین جاہلین" کہہ کر خطاب کیا کرتے تھے اور جب ان کی بخاری ختم ہوگئی تو اس روز فرمایا کہ آج سے تم لوگ "جاہلین" ہوگئے۔

اور وہ علم ہی کیا ہے جو انسان کے اپنے عیوب نہ بتائے۔

علم کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ آدمی کو اپنے عیوب وذنوب کا پتہ چل جائے۔ آنکھیں کھل جائیں کہ میرے اندر کیا کیا عیب ہیں کیا...... کیا گندگیاں ہیں...... جو حق تعالیٰ کی ناخوشنودی کا باعث ہیں یہ ہے علم کا فائدہ۔ اور اگر آدمی علم کے ذریعہ سے دوسروں ہی کے عیوب وذنوب کو تلاش کرنے لگ جائے تو یہ اہلِ علم کے لیے تباہ کرنے والی چیز ہے...... برباد کرنے والی چیز ہے...... جن لوگوں کو چسکا پڑ جاتا ہے دوسروں پر تنقید وتبصرہ کرنے کا تو پھر ہر ایک کے اندر عیب نکالتے رہتے ہیں اور ساری زندگی ان کی ایسی گزرتی ہے کہ اپنے کسی عیب پر ان کو کبھی توجہ نہیں ہوتی کہ (اپنے) آپ میں کیا کیا عیب ہیں؟

حالاں کہ علم اپنے عیوب کو تلاش کرنے کے لیے، اپنے ذنوب کو دیکھنے کے لیے، اپنی اصلاح کے لیے دیا گیا ہے، آدمی کو اپنا عیب معلوم نہ ہو تو کیا علم ہے۔[1]

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

اہلِ علم حضرات کو خاص طور سے تکبر سے بچنے کی ضرورت ہے، ورنہ ان کی جتنی محنت ہے پڑھنے کی پڑھانے کی وہ ساری کی ساری برباد ہو جائے گی۔ حق تعالیٰ جن حضرات کو اپنا علم عطا فرماتے ہیں اگر اس علم کے ساتھ اپنا فضل بھی عطا فرما دیں، جو کہ اس علم کی حفاظت کرے کہ وہ شیطان کے آلۂ کار نہ بن جائیں تو ان کا حال دوسرا ہوتا ہے۔

حضرت امام محمد رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی کو کسی نے خواب میں انتقال کے بعد دیکھا، پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا؟

فرمایا کہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چپکے سے میرے کان میں کہا گیا کہ اے محمد! اگر تم کو عذاب دینا ہوتا تو اپنا علم تمہارے سینے میں محفوظ نہ کرتا۔ بس کچھ پوچھ گچھ نہیں ہوئی۔ کہنے لگے کہ آپ کا انتقال کس حال میں ہوا؟

فرمایا کہ کیا کہوں "بَابُ الْمُکَاتِبِ" کا ایک مسئلہ سوچ رہا تھا مجھے پتہ بھی نہیں چلا اور جان نکل گئی۔

کسی نے حضرت امام شافعی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی کو خواب میں دیکھا، ان سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا؟

فرمایا کہ عرش کی داہنی جانب مجھے سونے کی کرسی پر بٹھا کر سچے موتی مجھ پر نثار کیے گئے۔ امام محمد رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی نے پوچھا کہ امام ابو یوسف رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی کہاں ہیں؟ فرمایا کہ اس کے اوپر ہیں۔ امام ابو حنیفہ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی کہاں ہیں؟ فرمایا کہ وہ فوق الفوق ہیں۔

[1] خطباتِ محمودیہ: ۱/۹۵، ۹۶

جن حضرات کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے، علم کے ساتھ اپنا فضل بھی عطا فرمایا ہے۔ اس فضل نے احاطہ کر لیا ایسی چیزوں پر کہ شیطان کو رخنہ اندازی کا موقع نہ ملے تو وہ "نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ" ہیں۔ ان کی زندگی کا کیا کہنا! اور جہاں یہ چیز ہوتی ہے نہ وہاں بہت پریشانی ہوتی ہے اور فضل ملتا تو ہے خدا کی طرف سے، لیکن کب ملتا ہے؟ یہ اس وقت ملتا ہے، جب آدمی اپنے کو چھوٹا سمجھے...... اپنے آپ کو حقیر سمجھے...... ذلیل سمجھے......

اپنے مبدا پر غور کرے کہ میں کس چیز سے پیدا ہوا، کتنی ناپاکی نجاست میرے اندر لگی ہوئی ہے، کتنی خرابیوں میں مبتلا ہوں اور پھر بیمار ہوں۔ مرنے کے بعد قبر میں کیڑے مکوڑے کھائیں گے، بدن پھٹے گا، پیپ نکلے گی، خون نکلے گا۔ تمام اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، اور حسین چہرہ نہ جانے کیسا بن جائے گا، بدن کی طاقت کیسی ہو جائے گی۔ ان چیزوں پر آدمی غور کرے تو تکبر پیدا نہیں ہوتا اور حق تعالیٰ کا فضل شاملِ حال رہتا ہے، علم صحیح سمجھ میں آتا ہے اور اس علم میں ایسی برکت ہوتی ہے کہ ایک ایک آدمی لاکھوں کا استاذ، لاکھوں کے دلوں کو روشن کرنے والا بن جاتا ہے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین[1]

حضرت حسن بصری رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

"إِنَّمَا الْفَقِيْهُ الزَّاهِدُ فِي الدُّنْيَا الرَّاغِبُ فِي الْآخِرَةِ، الْبَصِيْرُ فِي أَمْرِ دِيْنِهِ، الْمُدَاوِمُ عَلٰى عِبَادَةِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ"[2]

تَرْجَمَۃ: "فقیہ وہ ہے جو دنیا سے بے رغبت ہو، آخرت کی طرف راغب ہو، اپنے دین کے معاملے میں بصیرت رکھنے والا ہو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت پر مداومت کرنے والا ہو۔"

[1] خطباتِ محمودیہ: ۱/۱۰۰، ۱۰۱

[2] نضرة النعیم (مادہ الفقہ): ۸/۳۱۵۱

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں: ''اہلِ علم میں استغناء ہونا چاہیے، ''عرضِ حاجت'' میں ذلت ہے، پھٹے پرانے کپڑوں میں موٹا جھوٹا کھانے میں ذلت نہیں۔ اور استغناء میں دین کا اعزاز ہے اگر یہ نیت ہو تو ثواب بھی ہوگا۔ دنیاداروں کے پاس نہ جائے۔ غریب کے پاس جانے میں ذلت نہیں۔''[1]

مشہور ومعروف تابعی حضرت ابو حازم رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے ایک مرتبہ خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''یَا أَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ! إِنَّ الَّذِیْنَ مَضَوْا قَبْلَنَا مِنَ الْأُمَمِ الْخَالِیَۃِ ظَلُّوْا فِيْ خَیْرٍ وَّعَافِیَۃٍ مَا دَامَ أُمَرَاؤُھُمْ یَأْتُوْنَ عُلَمَاءَ ھُمْ رَغْبَۃً فِیْمَا عِنْدَھُمْ.''

تَرجَمَہ: ''امیر المؤمنین! وہ لوگ جو ہم سے پہلے گزرے ہیں، وہ اس وقت صحیح راستے پر بھلائی اور عافیت کے ساتھ تھے جب تک ان کے حکمران علماء کے پاس علم، عمل اور تقویٰ حاصل کرنے کے لیے دلی شوق ورغبت کے ساتھ حاضر ہوتے رہے۔''

پھر ایسے بے وقوف اور لالچی لوگ آئے جنھوں نے علم حاصل کیا اور حکمرانوں کے درباروں میں دنیوی فوائد حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس پہنچے کہ ان سے اس گھٹیا دنیا میں سے کچھ علم کے بدلے حاصل کرلیں۔

''فَاسْتَغْنَتِ الْأُمَرَاءُ عَنِ الْعُلَمَاءِ......

فَتَعِسُوْا، وَنُکِسُوْا، وَسَقَطُوْا مِنْ عَیْنِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ،

وَلَوْ أَنَّ الْعُلَمَاءَ زَھِدُوْا فِیْمَا عِنْدَ الْأُمَرَاءِ، لَرَغِبَ الْأُمَرَاءُ فِيْ عِلْمِھِمْ...... وَلٰکِنَّھُمْ رَغِبُوْا فِیْمَا عِنْدَ الْأُمَرَاءِ، فَزَھِدُوْا فِیْھِمْ

[1] مجالس مفتی اعظم: ۹۷

...... وَھَانُوْا عَلَیْھِمْ''[1]

تَرجَمَہ: ''اس طرح حکمران علماء سے بےزار ہوگئے ایسے بعض علماء ذلیل وخوار ہوئے اور وہ بیک وقت حکمرانوں اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ سے گر گئے۔

اگر علماء حکمرانوں سے بےنیاز رہتے تو یقیناً حکمران ان کے علم وتقویٰ کی طرف مائل ہوتے۔ لیکن بعض علماء نے حکمرانوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا، جس سے وہ ان کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہو گئے۔''

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں رزین رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا یہ قول مجھے بہت پسند ہے۔

''نہایت اچھا ہے وہ فقیہ آدمی کہ جب اس کی طرف احتیاج ظاہر کی جائے تو نفع پہنچائے اور اگر بےپروائی برتی جائے تو اپنے آپ کو یکسو کرلے۔''[2]

ہمیں بھی چاہیے کہ لوگ ہمیں اہلِ علم، ائمہ اور مقتدیٰ سمجھتے ہیں ہم اس گمان کی رعایت رکھتے ہوئے اپنے اسلاف کی ظاہری نقل کامل کرلیں تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ ہمارا باطن بھی معرفت کے انوار سے منور فرما دے گا اور حقیقی معنوں میں ہمیں اپنی تمام مخلوق سے بےنیاز کردے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

[1] صور من حیاۃ التابعین: ۱۹۰، ۱۹۱ احوال سلمۃ بن دینار

فائدہ: الحمد للہ! ''صور من حیاۃ التابعین'' کا ترجمہ مکمل انداز میں ''تابعین کے واقعات'' کے نام سے آگیا ہے، جو طلبہ وطالبات کے لیے بہت ہی مفید ہے، ہر قاری سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا خود بھی مطالعہ فرمائے اور تعاونوا علی البر والتقوی کے تحت اپنے حلقہ احباب اور رشتہ داروں میں بھی تعارف کروانے کی کوشش فرمائے۔ ۱۲

[2] مجالس مفتی اعظم: ۹۷

﴿سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ [1]

ترجمہ: ”جلدی میں پھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق۔“

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ”اور تکبر کرنے والوں یعنی بڑے بننے والوں کو اپنی آیتوں سے پھیر دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے آیاتِ الٰہیہ کے سمجھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق سلب ہوجاتی ہے، اور آیاتِ الٰہیہ بھی اس جگہ عام مراد ہوسکتی ہیں جن میں آیاتِ منزلہ تورات وانجیل کی یا قرآن کریم کی بھی داخل ہیں، اور آیاتِ تکوینیہ جو تمام زمین وآسمان اور ان کی مخلوقات میں پھیلی ہوئی ہیں۔

اس لیے خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہوا کہ تکبر یعنی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور افضل سمجھنا کہ میں ہی سب سے بڑا عالم اور سب سے زیادہ جاننے والا ہوں اور اپنی غلط بات یا غلط مسئلے پر ڈٹے رہنا باوجود اس کے کہ وہ جانتا ہو کہ میرا بتایا ہوا مسئلہ غلط ہے، لیکن اس کو شرم کے مارے نہ چھوڑنا ایسی مذموم اور منحوس خصلت ہے کہ جو شخص اس میں مبتلا ہوتا ہے اس کی عقل وفہم سلیم نہیں، اسی لیے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے سمجھنے سے محروم ہوجاتا ہے نہ اس کو قرآنی آیات صحیح سمجھنے کی توفیق باقی رہتی ہے اور نہ آیاتِ قدرت میں غور وفکر کرکے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے میں اس کا ذہن چلتا ہے۔“ [2]

عبید اللہ بن حسن عنبری رحمہ اللہ تعالیٰ دوسری صدی ہجری کے اکابر علماء میں سے ہیں، وہ بصرہ کے قاضی بھی رہے، یہ اور ان کے شاگرد عبد الرحمن بن مہدی رحمہ اللہ تعالیٰ ایک جنازہ میں شریک ہوئے، اس دوران لوگوں نے حضرت عبید اللہ

[1] اعراف: ۱۴۶ [2] معارف القرآن ۴/۶۶، ۶۷

رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اس کا جواب درست نہیں دیا، شاگرد نے کہا:

”حضرت! شاید آپ سے غلطی ہوگئی، صحیح جواب یہ ہونا چاہیے۔“

بڑے علماء اپنی غلطی کی اصلاح سے نہیں شرماتے اور وہ بڑے ہوتے بھی اسی لیے ہیں، بڑا ہونا یہ نہیں کہ غلطی معلوم ہونے کے بعد بھی اسی پر ڈٹا رہا جائے، یہ بڑائی نہیں، ہٹ دھرمی کہلاتی ہے، حضرت عبید اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: صحیح مسئلہ کیا ہے؟ شاگرد نے بتادیا اپنے شاگرد کے صحیح جواب سننے کے بعد بہت ہی کار آمد جملہ ارشاد فرمایا:

فرمایا: ”آپ چھوٹے ہیں لیکن بات آپ ہی کی درست ہے، میں بھی آپ ہی کے جواب کی طرف رجوع کرتا ہوں اس لیے کہ باطل میں ”سر“ اور ”رئیس“ بننے سے مجھے حق میں ”دم“ اور ”تابع“ بننا زیادہ محبوب ہے۔“ [1]

تفسیر روح البیان میں ہے کہ ”تکبر اور نخوت ایک ایسی بری خصلت ہے جو علوم ربانیہ کے لیے حجاب بن جاتی ہے کیوں کہ علوم ربانیہ صرف اس کی رحمت سے حاصل ہوتے ہیں اور رحمتِ خداوندی تواضع سے متوجہ ہوتی ہے یہی تواضع ہمارے اکابر میں موجود تھی جب ہی تو اللہ نے ان کو فہم سلیم اور علوم الٰہیہ سے نوازا تھا۔“

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ جب حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ آخری حج سے تشریف لا رہے تھے تو ہم لوگ اسٹیشن پر شرفِ زیارت کے لیے گئے۔ حضرت کے متوسلین میں سے ایک صاحب زادہ محمد عارف ضلع جھنگ ”دیوبند“ تک ساتھ گئے۔ ان کا بیان ہے کہ ٹرین میں ایک ہندو جنٹلمین بھی تھا، جس کو ضرورتِ فراغت لاحق ہوئی، وہ رفع حاجت کے لیے گیا اور الٹے پاؤں بادلِ ناخواستہ واپس ہوا۔

[1] حلیۃ الاولیاء ۹/۶، رقم: ۱۲۸۵۵

حضرت مولانا مدنی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ سمجھ گئے۔ فوراً چند سگریٹ کی ڈبیاں اِدھر اُدھر سے اکٹھی کیں، لوٹا لے کر بیت الخلاء میں گئے اور اچھی طرح صاف کر کے ہمارے دوست سے فرمانے لگے کہ ''جایئے بیت الخلاء بالکل صاف ہے'' نوجوان نے کہا ''مولانا، میں نے دیکھا ہے، بیت الخلاء بالکل بھرا ہوا ہے'' قصہ مختصر، وہ اٹھا اور جا کر دیکھا تو بیت الخلاء بالکل صاف تھا، بہت متاثر ہوا اور بھرپور عقیدت کے ساتھ عرض کرنے لگا ''یہ حضور کی بندہ نوازی ہے جو مجھ سے باہر ہے۔''

اس واقعہ کو دیکھ کر خواجہ نظام الدین تونسوی مرحوم نے ایک ساتھی سے پوچھا کہ ''یہ کھدر پوش کون ہے؟'' جواب ملا کہ ''یہ مولانا حسین احمد مدنی ہیں'' تو خواجہ صاحب مرحوم بے اختیار ہو کر حضرت مدنی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کے پاؤں سے لپٹ گئے اور رونے لگے، حضرت نے جلدی سے پاؤں چھڑائے اور پوچھا، کیا بات ہے؟''

تو خواجہ صاحب نے کہا ''سیاسی اختلاف کی وجہ سے میں نے آپ کے خلاف فتوے دیئے اور برا بھلا کہا، آج آپ کے اس اعلیٰ کردار کو دیکھ کر تائب نہ ہوتا تو شاید سیدھا جہنم میں جاتا'' حضرت مدنی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے فرمایا ''میرے بھائی! میں نے تو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی سنت پر عمل کیا ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے ایک یہودی مہمان نے بستر پر پاخانہ کر دیا تھا، صبح جلدی اٹھ کر چلا گیا جب اپنی بھولی ہوئی تلوار لینے آیا تو دیکھا حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بنفس نفیس اپنے دست مبارک سے بستر کو دھو رہے ہیں، یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔''[1]

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ سے روایت ہے کہ یوپی میں ایک جگہ میری تقریر تھی، رات کو تین بجے تقریر سے فارغ ہو کر لیٹ گیا، ابھی میں نیم غنودگی کی حالت میں تھا کہ مجھ کو محسوس ہوا کوئی میرے پاؤں دبا رہا ہے، میں نے کہا کہ لوگ اس طرح دباتے رہتے ہیں، کوئی مخلص ہوگا، مگر اس کے ساتھ معلوم ہو رہا تھا

[1] ماہنامہ الرشید، مدنی و اقبال نمبر: ۱۷۲

کہ یہ مٹھی تو عجیب قسم کی ہے، باوجود راحت کے نیند رخصت ہوتی جا رہی تھی، سر اٹھایا تو دیکھا حضرت شیخ الاسلام مدنی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ ہیں، فوراً پھڑک کر چارپائی سے اتر پڑا اور ندامت سے عرض کیا:

''حضرت! کیا ہم نے اپنے لیے جہنم کا خود سامان پہلے سے کم کر رکھا ہے کہ آپ بھی ہم کو دھکا دے رہے ہیں'' شیخ نے جواباً فرمایا:

''آپ نے دیر تک تقریر کی تھی، آرام کی ضرورت تھی اور آپ کی عادت بھی تھی اور مجھ کو سعادت کی ضرورت، ساتھ ہی نماز کا وقت قریب تھا، میں نے خیال کیا آپ کی نماز نہ چلی جائے تو بتایئے حضرت میں نے کیا غلطی کی ہے۔''[1]

مولانا رومی نے کیا خوب فرمایا

ہر کجا مشکل جواب آنجا رود ہر کجا پستی است آب آنجا رود

تَرجَمَۂ: ''جواب ہر مشکل سوال ہی کا طلب کیا جاتا ہے اور پانی ہمیشہ نشیب ہی کی طرف بہتا ہے۔''[2]

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ تکبر سے بچنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ اپنی تعریف لوگوں سے ہرگز نہ سنے اگر کوئی شاگرد، مقتدی، عقیدت مند تعریف کریں کہ امام صاحب ..... آپ تو ماشاء اللہ ..... آپ کا بیان تو ماشاء اللہ ..... آپ کے درس کا تو کیا ہی کہنا ..... تو فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔ اور سمجھائیں کہ مخلوق کی تعریف کے بجائے خالق جَلَّ جَلَالُہٗ کی تعریف کریں، درس کا مقصد ہی یہی تھا کہ مخلوق کا تاثر ہمارے دلوں سے نکل جائے، دل اللہ تعالیٰ سے متاثر ہوں۔ اور دوسرا تعریف کرنے کا نقصان یہ ہے کہ نظر لگ جاتی ہے، حاسدین پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہر جگہ خالق ربّ العزت کی تعریف کی جائے کہ اسی کا نام ''اَلْحَمِیْد'' ہے۔

اور دل میں اپنے آپ کو خطاب کر کے کہے ..... یہ بے چارا دھوکہ میں آ گیا ہے

[1] [illegible]: ۱۳۶
[2] کلید مثنوی: ۱۱/ ۲۳۵، دفتر سوم

...... اللہ کریم جلّ جلالہٗ کا کرم ہے کہ اس نے مجھ پر ستاری والا معاملہ کیا ہوا ہے اگر وہ میرے عیوب، گناہ کھول دیں تو کوئی میرے پاس نہ بیٹھے ...... شیخ عبداللہ بن حسین الموجان اپنی کتاب "تحاسد العلماء" میں فرماتے ہیں:

"علماء راسخین شیطان کی ادنیٰ مشابہت وپیروی سے بھی جان چھڑاتے ہیں، شیطان انہیں اس طرح بہکاتا ہے۔ صدقے جاؤں آپ پر میں نے تو آپ جیسا پاک طینت عالم نہیں دیکھا۔ (حضرت کی تعریف میں قلابے ملائے جاتا ہے ان میں ایسے مرید بھی ملتے ہیں جو دراصل شیطان کی مدد کرتے ہیں) اس سے اگر دل میں بڑائی پیدا ہوگئی تو ہلاک ہوگیا اور اگر اس سے خود کو بچالیا تو مامون ہوگیا۔"[1]

حضرت ہلال بن اساف رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی فرماتے ہیں کہ میں حضرت ربیع بن خثیم رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ حضرت! مجھے نصیحت فرمادیجیے۔

انہوں نے فرمایا:

"لَا يَغُرَّنَّكَ يَا هِلَالُ! كَثْرَةُ ثَنَاءِ النَّاسِ عَلَيْكَ، فَإِنَّ النَّاسَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِنْكَ إِلَّا ظَاهِرَكَ."

تَرجَمۂ: "اے ہلال! تمہیں لوگوں کی تعریف اپنے بارے میں دھوکہ نہ دے کہ (لوگ تمہاری خوب تعریف کریں اور تم اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھنے لگ جاؤ) اس لیے کہ لوگ تو صرف تمہارے ظاہر کو ہی جانتے ہیں۔"[2]

حضرت سری سقطی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی باغ میں داخل ہو جائے جہاں پر بہت سارے درخت ہوں اور ان درختوں میں بہت سارے پرندے بیٹھے ہوئے ہوں اور ہر پرندہ اپنی اپنی زبان میں اس شخص سے مخاطب ہوکر

---

[1] تحاسد العلماء، تلبيس إبليس على الدعاة وطلاب العلم: ص ۱۹۲

[2] تابعین کے واقعات: ۱/۱۰۶

کہے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا وَلِيَّ اللّٰهِ" اور یہ سن کر وہ مطمئن ہو جائے (تو اس کی ہلاکت شروع ہوگئی) اور وہ اس مخلوق کے ہاتھ میں قیدی بن گیا۔"[1]

عالم عارف کو دھوکہ میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ میں تو اب پہنچ گیا یا میرا مقام اونچا ہوگیا بلکہ ہمیشہ حسن خاتمہ کی فکر کرتے رہنا چاہیے اور نفس کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے اگر اعمال کی پابندی ہے، گناہوں سے بچنے کا اہتمام ہے تو چاہے کوئی کرامت بھی نظر نہ آئے لیکن شکر کرے۔

اور اللہ نہ کرے اگر گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہیں اور بہت سی کرامات بھی نظر آتی ہیں تو وہ شیطان کا دھوکہ ہے اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

یہ بات ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ لوگوں کی نظریں علماء پر ہوتی ہے وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ اتنی بزرگ ہستیاں ہیں کہ نہ وہ غلطیاں کرتے ہیں نہ ہی کوئی لغزش حالاں کہ یہ علماء، ائمہ کرام بھی انسان ہیں ان سے بھی غلطیاں اور لغزشیں ہوسکتی ہیں اور ہو بھی رہی ہیں اور انہیں بھی اپنی اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے، خاص کر اگر انہیں اپنے پیچھے یا جاہلوں کی مجلس میسر آجائے اور خود ان کا کسی شیخ صالح سے اصلاحی تعلق بھی نہ ہو تو وہ ایک عالم اور ایک امام کو دوسرے امام سے لڑواتے ہیں وہ اس طرح کہ ایک امام کے پاس آکر کہتے ہیں کہ۔

فلاں حضرت آں جناب کے متعلق اس طرح گستاخی کر رہے تھے، اور وہاں دوسرے امام کے پاس جاکر کہتے ہیں کہ اس امام نے اپنی مجلس میں آپ کے متعلق یہ باتیں کی ہیں۔

لہٰذا اگر یہ دونوں عالم غیبت اور بدگمانی سے بچنے والے نہیں ہوتے تو ابلیس کے اس جال میں پھنس جاتے اور آپس میں حسد و عجب، اور دوسری روحانی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

---

[1] حلیۃ الاولیاء، طبقات اھل المشرق: ۱۰/۱۲۱، رقم: ۱۴۷۰۵

ماہرین علماء نے تلبیساتِ ابلیس کو مختصراً اس طرح بتایا ہے کہ ابلیس کبھی علماء کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ جیسا ذی علم تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں میں اپنے سب جاننے والوں میں آپ کو سب سے زیادہ صاحبِ علم سمجھتا ہوں۔

شیطان کی یہ بات اگر اس عالم کے دل میں گھر کر جاتی ہے تو وہ تکبر و عجب کی وجہ سے ہلاکت تک پہنچ جاتا ہے۔

یا پھر شیطان دو اماموں کو اس طرح لڑواتا ہے کہ

"ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کو پہاڑ بنا کر دکھاتا ہے۔ اور اپنے مسلک اور مشرب کے خلاف ذرہ برابر کوئی بات صادر ہوتی ہے تو آپس میں یہ کہتے ہیں کہ اس کا فرقہ الگ ہے یہ صوفی ہے، یا سلفی ہے یا تبلیغی ہے وغیرہ وغیرہ، اللہ ہمیں ان چیزوں سے محفوظ رکھے اور معاف فرمائے۔"[1]

غیبت، کینہ اور بدگمانی

اگر ہم ائمہ چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد اور ہمارے شاگردوں سے دین کا کام لیا جائے تو ہمیں بدگمانی اور غیبت سے بہت ہی زیادہ بچنا ہوگا۔

خصوصاً اپنے ساتھیوں کی جو کہ علماء ہوں یا ائمہ مساجد یا مدرسین ہوں۔

امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی غیبت کے بارے میں فرماتے ہیں:

اَلْغِيْبَةُ إِذَا كَانَتْ فِيْ أَهْلِ الْعِلْمِ وَحَمَلَةِ الْقُرْآنِ الْكَرِيْمِ فَهِيَ كَبِيْرَةٌ[2]

تَرْجَمَہ: "یعنی غیبت کرنے کی صفت جب اہلِ علم اور حاملینِ قرآن میں موجود ہو (ویسے تو یہ ہر آدمی کے حق میں گناہ کبیرہ ہے لیکن) ان کے حق میں بہت ہی بڑا گناہ ہے۔"

[1] تحاسد العلماء، تلبيس إبليس على الدعاة وطلاب العلم: ص ١٦٤

[2] مغني المحتاج: ٤/٤٢٧

سفیان بن حسین کہتے ہیں کہ میں ایاس بن معاویہ کے پاس تھا ان کے پاس ایک شخص بیٹھے ہوئے تھے اب میں اٹھنا چاہ رہا تھا مگر ڈر لگتا تھا میں چلا جاؤں تو یہ شخص میرے خلاف ایاس کے کان نہ بھرے۔ جب وہ اٹھ گیا تو میں نے اس کے خلاف کچھ باتیں ایاس سے کہیں۔ ایاس نے مجھے کہا: خاموش ہو جاؤ اور پھر مجھ سے پوچھا:

"أَغَزَوْتَ الدَّيْلَمَ؟" قُلْتُ: "لَا" قَالَ: "فَغَزَوْتَ الرُّوْمَ؟" قُلْتُ: "لَا" قَالَ: "فَغَزَوْتَ الْهِنْدَ؟" قُلْتُ: "لَا" قَالَ: "فَسَلِمَ مِنْكَ الدَّيْلَمُ، اَلسِّنْدُ، وَالْهِنْدُ، وَالرُّوْمُ، وَلَيْسَ يَسْلَمُ مِنْكَ أَخُوْكَ هٰذَا" قَالَ: "فَمَا عُدْتُ إِلٰى ذٰلِكَ بَعْدُ"[1]

تَرْجَمَہ: "آپ نے رومیوں کے ساتھ جہاد کیا؟" کہنے لگا "نہیں" پوچھا "سندھ اور ہند کے جہاد میں شریک ہوئے؟" کہا "نہیں" فرمانے لگے "روم، سندھ اور ہند کے کفار تو آپ سے محفوظ رہے لیکن بے چارہ اپنا ایک مسلمان بھائی آپ سے نہ بچ سکا، اور زبان کی تلوار اس پر چلا دی، سفیان کہتے ہیں مجھ پر ان کے اس جملے کا اس قدر اثر ہوا کہ زندگی بھر پھر کسی کی غیبت نہیں کی۔"

غیبت چاہے کسی کی بھی ہو بہت ہی بری اور گندی بات ہے، لیکن علماء کی غیبت، اور پھر دوسرے مکتبِ فکر کے سارے علماء کی جی بھر کر غیبت، اور پھر مسجد میں بیٹھ کر، یہ "ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" ہیں۔

حضرت مفتی زین العابدین رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ایک موقع پر فرمایا: "ایک ہے فردِ واحد کی غیبت اور ایک ہے بہت سارے لوگوں کی غیبت، مثلاً کراچی کے فلاں طبقے کے لوگ ایسے ہیں...... افریقی لوگوں میں یہ عیب ہوتا ہے...... اب

[1] ساہ مأخوذه تنبيه الغافلين: ص ١٨٨، الغيبة رقم: ٢٠٠

پورے کراچی پورے افریقہ کے لوگوں کی اجتماعی غیبت کرکے اجتماعی گناہ حاصل کر لیے۔"

ہم ائمہ کی دوستی علماء ہی سے ہوتی ہے اور ان کی کسی بات سے دل دُکھنے پر ان حضرات کی دانستہ و نادانستہ غیبت ہو جاتی ہے، لہٰذا اس سے خوب بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آخرت کے خوف سے تو بچنا ہی چاہیے، دنیا کے لیے بھی یہ مراقبہ کرنا چاہیے کہ جو علماء پر اعتراض کرتا ہے علماء کی غیبت کرتا ہے علماء کی بے ادبی کرتا ہے۔ عموماً اس کی اولاد سے آگے دین کا کام نہیں لیا جاتا۔ یہ بہت خوف اور ڈر کی بات ہے۔

اپنی اولاد ہی کی حفاظت کی خاطر تکلفاً کوشش فرمائیں کہ کسی بھی مکتبِ فکر کے علماء کی غیبت نہ ہو۔

وَقَدْ نَقَلَ الْإِمَامُ النَّوَوِيُّ عَنِ الْحَافِظِ ابْنِ عَسَاكِرَ أَنَّهُ قَالَ: اِعْلَمْ يَا أَخِيْ، وَفَّقَنَا اللّٰهُ وَإِيَّاكَ لِمَرْضَاتِهِ، وَجَعَلَنَا مِمَّنْ يَخْشَاهُ وَيَتَّقِيْهِ حَقَّ تُقَاتِهِ، أَنَّ لُحُوْمَ الْعُلَمَاءِ مَسْمُوْمَةٌ، وَعَادَةُ اللّٰهِ فِيْ هَتْكِ أَسْتَارِ مُنْتَقِصِيْهِمْ مَعْلُوْمَةٌ، وَأَنَّ مَنْ أَطْلَقَ لِسَانَهُ فِي الْعُلَمَاءِ بِالثَّلْبِ أَيْ بِالْعَيْبِ وَالْاِنْتِقَاصِ اِبْتَلَاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى قَبْلَ مَوْتِهِ بِمَوْتِ الْقَلْبِ.[1]

ترجمہ: "امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے:

"اے میرے بھائی! جان لو اللہ تعالیٰ آپ کو اور مجھے اپنی رضا حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے جو اللہ تعالیٰ سے ایسے ڈرتے ہیں جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے، کہ علماء کا گوشت زہر آلود ہے اللہ کی عادت (عذاب دینے کی) ان کی پردہ دری اور عیب نمائی میں معلوم ہے، تو جس نے اپنی

[1] التبیان فی آداب حملۃ القرآن: ۲۱

زبان کو علماء کی عیب جوئی اور عیب نمائی میں استعمال کیا اللہ تعالیٰ اس کو مرنے سے پہلے دل کی موت (یعنی ذلت کی موت) مارے گا۔"

جس طرح غیبت بڑا گناہ ہے اسی طرح کینہ رکھنا بھی بہت سخت گناہ ہے اور بسا اوقات یہ کینہ (بغض) بھی غیبت کا سبب بنتا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

"يَطَّلِعُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ إِلٰى خَلْقِهِ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ، فَيَغْفِرُ لِعِبَادِهِ إِلَّا لِاثْنَيْنِ: مُشَاحِنٍ أَوْ قَاتِلِ نَفْسٍ."[1]

ترجمہ: "شعبان کی پندرہویں میں اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے بارے میں اطلاع دی جاتی ہے اس وقت اللہ تعالیٰ ہر ایک مؤمن کی مغفرت فرما دیتے ہیں سوائے کینہ رکھنے والے اور کسی کو (ناحق) قتل کرنے والے کے۔"

علماء سے کینہ رکھنا، علماء کی غیبت کرنا، علماء سے بدگمانی کرنا، علماء کی بے ادبی کرنا، یہ بہت گندے اور برے افعال ہیں، اہلِ علم سے بدگمانی کی نحوست کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا موسیٰ خان روحانی بازی رحمہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس دور کے جلیل القدر علماء اور بزرگ و قد آور شخصیات میں سے تھے، ان کے صاحبزادے نے ان کی زندگی کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ:

"ایک مرتبہ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ بمع اہل وعیال حج کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ حج کے بعد چند روز مدینہ منورہ میں قیام فرمایا، مولانا سعید احمد خان رحمہ اللہ تعالیٰ (جو کہ تبلیغی جماعت کے بڑے بزرگوں میں سے تھے) کو جب آپ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپ کی بمع اہل خانہ اپنی مدینہ منورہ والی رہائش گاہ

[1] مسند احمد: ۲/۱۷۶، رقم: ۶۶۰۴

میں دعوت کی، دعوت کے دوران والد محترم رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی، مولانا سعید احمد خان رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک شخص (جو کہ مدینہ منورہ ہی کا رہائشی تھا) آیا، اس نے جب مولانا محمد موسیٰ خان روحانی بازی رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کو اس مجلس میں تشریف فرما دیکھا تو انہیں سلام کر کے مؤدبانہ انداز میں ان کے قریب بیٹھ گیا اور عرض کیا:

"حضرت میں آپ سے معافی مانگنے کے لیے حاضر ہوا ہوں، آپ مجھے معاف فرمادیں"

والد ماجد رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے فرمایا:

"بھائی کیا ہوا، میں تو آپ کو جانتا ہی نہیں، نہ کبھی آپ سے ملاقات ہوئی ہے تو کس بات پر معاف کردوں؟"

وہ شخص پھر کہنے لگا: "بس حضرت آپ مجھے معاف کردیں۔"

حضرت شیخ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے فرمایا: "کوئی وجہ بتلاؤ تو سہی؟"

وہ شخص کہنے لگا "جب تک آپ معاف نہیں فرمائیں گے، میں بتلا نہیں سکتا"

تو والد صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں فرمایا:

"اچھا، بھئی معاف کیا، اب بتلاؤ کیا بات ہے؟"

وہ کہنے لگا "حضرت میری رہائش مدینہ منورہ میں ہی ہے، میں اپنے رفقاء اور ساتھیوں سے اکثر آپ کا نام اور آپ کے علم وفضل کے واقعات سنتا رہتا تھا، چناں چہ میرے دل میں آپ کی زیارت وملاقات کا شوق پیدا ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تمنا بڑھتی گئی، مگر کبھی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔

اتفاق سے چند دن قبل آپ مسجد نبوی میں نوافل میں مشغول تھے کہ میرے ایک ساتھی نے مجھے اشارے سے بتلایا کہ "یہ ہیں مولانا محمد موسیٰ خان صاحب، جن کے بارے میں تم اکثر پوچھتے رہتے ہو" میں نے چوں کہ اس سے پہلے آپ کو دیکھا نہیں تھا، اس لیے میرے ذہن میں آپ کے بارے میں ایک تصور قائم تھا کہ پھٹا پرانا لباس ہوگا، دنیا کا کچھ پتہ نہیں ہوگا، لیکن جب میں نے نوافل پڑھتے ہوئے آپ کا حلیہ اور وجاہت دیکھی تو میرے ذہن میں جو پھٹے پرانے لباس کا تصور تھا، وہ ٹوٹ گیا اور دل میں آپ کے بارے میں کچھ بدگمانی پیدا ہوگئی۔

چناں چہ میں آپ سے ملے بغیر ہی واپس لوٹ گیا۔ اسی رات کو خواب میں مجھے نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی زیارت ہوئی، کیا دیکھتا ہوں کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انتہائی غصے میں ہیں، میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ! مجھ سے ایسی کیا غلطی ہوگئی کہ آپ ناراض دکھائی دے رہے ہیں؟"

نبی اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: "تم میرے موسیٰ کے بارے میں بدگمانی کرتے ہو، فوراً میرے مدینے سے نکل جاؤ۔" میں خوف سے کانپ گیا، فوراً معافی چاہی، فرمایا "جب تک ہمارا موسیٰ معاف نہیں کرے گا میں بھی معاف نہیں کروں گا۔"

یہ خواب دیکھنے کے بعد میں بیدار ہوگیا اور اس دن سے میں مسلسل آپ کو تلاش کر رہا ہوں مگر آپ کی جائے قیام کا پتہ نہیں لگا سکا۔ آج آپ سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی تو معافی مانگنے کے لیے حاضر ہوگیا ہوں۔ حضرت شیخ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے جب یہ واقعہ سنا تو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔"[۱]

"حسد" ایک باطنی بیماری ہے

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے ظاہری اعمال میں بعض چیزیں فرض وواجب قرار دی ہیں، اور بعض چیزیں گناہ قرار دی ہیں، اسی طریقے سے ہمارے باطنی اعمال میں بہت سے اعمال فرض ہیں، اور بہت سے اعمال گناہ اور حرام ہیں۔ ان سے بچنا اور اجتناب کرنا بھی اتنا ہی

[۱] کتابوں کی درس گاہ میں: ۱۵۹، بحوالہ ترغیب المسلمین: ۲

ضروری ہے جتنا ظاہر کے کبیرہ گناہوں سے بچنا ضروری ہے۔

حسد کی لازمی خاصیت یہ ہے کہ یہ حسد انسان کو غیبت، عیب جوئی، چغل خوری اور بے شمار گناہوں پر آمادہ کرتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود حسد کرنے والے کی نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں منتقل ہو جاتی ہیں اس لیے کہ جب تم اس کی غیبت کروگے اور اس کے لیے بددعا کروگے تو تمہاری نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں چلی جائیں گی، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم جتنا حسد کر رہے ہو، اپنی نیکیوں کے پیکٹ تیار کرکے اس کے پاس بھیج رہے ہو تو اس کا تو فائدہ ہو رہا ہے، اب اگر ساری عمر حسد کرنے والا حسد کرے گا تو وہ اپنی ساری نیکیاں گنوا دے گا اور اس کے نامۂ اعمال میں ڈال دے گا۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ، أَوْ قَالَ: الْعُشْبَ" [1]

ترجمہ: "حسد سے بچو، اس لیے کہ یہ حسد انسان کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جیسے آگ لکڑی کو یا سوکھی گھاس کو کھا جاتی ہے۔"

راوی کو شک ہے کہ آپ نے "لکڑی" کا لفظ بیان فرمایا تھا یا "سوکھی گھاس" کا لفظ فرمایا تھا یعنی جس طرح آگ سوکھی لکڑی کو یا سوکھی گھاس کو لگ جائے تو وہ اس کو بھسم کر ڈالتی ہے، ختم کر دیتی ہے، اس طرح اگر کسی شخص میں حسد کی بیماری ہو تو وہ اس کی نیکیوں کو کھا جاتی ہے۔

حسد کی آگ سلگتی رہتی ہے

ایک آگ تو وہ ہوتی ہے جو بہت بڑی ہوتی ہے۔ جو منٹوں میں سب کچھ جلا کر

[1] ابو داود، الأدب، باب في الحسد، رقم: ۴۹۰۳

ختم کر دیتی ہے۔ اور ایک آگ وہ ہوتی ہے جو ہلکے ہلکے سلگتی رہتی ہے۔ اگر وہ آگ کسی کو لگائی جائے تو وہ آگ ایک دم سے اس کو جلا کر ختم نہیں کرے گی، بل کہ وہ آہستہ آہستہ سلگتی رہے گی، اور تھوڑا تھوڑا کر کے اس کو کھاتی رہے گی۔ حتی کہ وہ ساری لکڑی ختم ہو کر راکھ بن جائے گی ـــــ اسی طرح حسد ایک ایسی بیماری اور ایک ایسی آگ ہے، جو رفتہ رفتہ سلگتی چلی جاتی ہے اور انسان کی نیکیوں کو فنا کر ڈالتی ہے اور انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ میری نیکیاں ختم ہو رہی ہیں۔ اس لیے حضور اقدس ﷺ نے حسد سے بچنے کی تاکید فرمائی۔

حسد سے بچنا فرض ہے

لیکن اگر ہم اپنے معاشرے اور ماحول پر نظر دوڑا کر دیکھیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ حسد کی بیماری معاشرے کے اندر چھائی ہوئی ہے، اور بہت کم اللہ کے بندے ایسے ہیں جو اس بیماری سے بچے ہوئے ہیں، اور اس سے پاک ہیں۔ ورنہ کسی نہ کسی درجے میں حسد کا دل میں گزر ہو جاتا ہے، اور اس سے بچنا فرض ہے۔ اس سے بچے بغیر گزارا نہیں، لیکن ہمارا اس طرف دھیان اور خیال بھی نہیں جاتا کہ ہم اس بیماری کے اندر مبتلا ہیں، اس لیے اس سے بچنے کے لیے بہت اہتمام کی ضرورت ہے۔[1]

اسی طرح حضور ﷺ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

لَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ [2]

ترجمہ: "آپس میں بغض مت رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، نہ ہی ایک دوسرے سے قطع تعلق کرو۔ اور آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔ اور کسی مسلمان کے لیے یہ بات حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرلے۔"

[1] اصلاحی خطبات ۵/ ۶۳ تا ۶۵

[2] البخاري، الأدب، باب ما ينهى عن التحاسد والتدابر ۲/ ۸۹۶

حسد کے اسباب

شیخ عبداللہ بن حسین الموجان اپنی کتاب "تحاسد العلماء" میں حسد کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

جب بیماری کا پتہ چلتا ہے تو اس کا علاج آسان ہوتا ہے جب سبب کا پتہ چلتا ہے تو تریاق سے اس کا مداوا ممکن ہوتا ہے۔ علماء کے باہم حسد کے کئی اسباب ہیں جن میں اہم یہ ہیں:

❶ تَنَافُسُ الْأَقْرَانِ............ ہم عصروں میں فخر و مسابقت،

❷ وَالْهَوَى وَالْغَرَضُ وَحُبُّ الدُّنْيَا نفسانی خواہش، خود غرضی اور دنیا کی محبت،

❸ وَالْاِخْتِلَافُ الْمَذْهَبِيُّ الْفِقْهِيُّ مسلک و مشرب کا اختلاف،

❹ وَالْاِخْتِلَافُ فِي الْعَقِيدَةِ..... عقیدے کا اختلاف۔[1]

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

حسد کی بنیاد ہے حب دنیا اور حب جاہ، یعنی دنیا کی محبت، اور جاہ کی محبت، اس لیے حسد کا علاج یہ ہے کہ آدمی اپنے دل سے دنیا اور جاہ کی محبت نکالنے کی فکر کرے، اس لیے کہ تمام بیماریوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے، اور اس دنیا کی محبت کو دل سے نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ یہ دنیا کتنے دن کی ہے، کسی بھی وقت آنکھ بند ہو جائے گی۔ انسان کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

دنیا کی لذتیں، دنیا کی نعمتیں، اس کی دولتیں، اس کی شہرت، اس کی عزت، اور اس کی ناپائیداری پر انسان غور کرے، اور یہ سوچے کہ کسی بھی وقت آنکھ بند ہو جائے گی تو سارا قصہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھر انسان کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔[2]

---

[1] تحاسد العلماء، الفصل الثاني: ۱۹۵

[2] اصلاحی خطبات: ۵/ ۱۰۸

شیخ عبداللہ بن حسین الموجان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"جب لوگ کسی جگہ، بازار، مدرسہ یا کسی مسجد کے پڑوس میں ایک ساتھ رہتے ہوں، اور مختلف اغراض لیے ایک ساتھ کام کرتے ہوں تو پھر یہ لوگ آپس میں ضد، نفرت اور بغض کرنے لگتے ہیں اور پھر اس سے حسد کے باقی اسباب بھی جنم لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے آپ دیکھتے ہیں کہ عالم، عالم کے ساتھ حسد کرتا ہے نہ کہ عابد کے ساتھ، اور عابد عابد کے ساتھ حسد کرتا ہے نہ کہ عالم کے ساتھ، اور تاجر تاجر کے ساتھ حسد کرتا ہے۔ بل کہ موچی موچی کے ساتھ حسد کرتا ہے اور کپڑا فروش کے ساتھ حسد نہیں کرتا۔

(معلوم ہوا کہ) ان کے باہم حسد کرنے کی وجہ ایک جیسے پیشہ اختیار کرنے کے سوا اور کوئی نہیں ہے اسی لیے (ہر) آدمی دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اپنے سگے بھائی اور چچا زاد بھائی سے زیادہ حسد کرتا ہے، اور عورت اپنی ساس، نند اور جیٹھانی کے بہ نسبت اپنی سوکن سے زیادہ حسد کرتی ہے۔ موچی کے کپڑا فروش کے ساتھ حسد نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کا کام اور رخ الگ الگ ہے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے کام میں مداخلت کرکے نہیں لڑتے۔

جب کہ اس کے برخلاف ایک صاحب دولت کپڑا فروش کے کام میں دوسرا کپڑا فروش مداخلت کرکے رکاوٹ ڈالتا ہے۔ اسی وجہ سے غیر تربیت یافتہ علماء بھی باہم حسد کرتے ہیں کہ عالم چاہتا ہے اس کا ایک علمی مقام ہو، جس میں اس کے ساتھ کوئی بحث نہ کر سکے، اس کے علاوہ کسی اور سے کوئی بات نقل نہ کی جائے اور نہ اس کے سوا کسی اور سے فتویٰ لیا جائے، لوگوں کا رجوع اسی کی طرف ہو۔ جب (یہ دیکھتا ہے کہ) لوگ کسی اور عالم کے ساتھ بیٹھتے ہیں، اس طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس سے فتویٰ لیتے ہیں، تو یہ اس کے لیے جھگڑا اور حسد کا سبب بنتا ہے (کہ اس سے فتوے کیوں پوچھے جا رہے ہیں) اور پھر یہیں سے علماء آپس میں حسد کرنے لگتے

ہیں۔"[1]

حسد سے بچنے کا نسخہ

اللہ تعالیٰ کی معرفت جس قدر بڑھتی جائے گی اسی قدر دل حسد، کینہ اور بغض سے پاک ہوگا چناں چہ شیخ عبداللہ بن حسین الموجان رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی عظمت اور آسمان و زمین اس کی شہنشاہیت میں غور و فکر ہی تمام لذتوں کا خلاصہ ہے۔ جب یہ بات دل میں بیٹھ جائے گی تو اس کی قدرت و جلال سے دل بھر جائے گا تو دل میں حسد کے لیے جگہ نہیں بچے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس پر حسد کر رہا ہے، وہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہی ہے یہ خیال دل میں آتے ہی بجائے اس کے کہ وہ اس بندۂ خدا سے حسد کرے، اس سے اور موانست پیدا ہو جائے گی۔

مزید برآں یہ کہ قدرت الٰہی میں غور و فکر میں جو ثمرہ ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے کہ بندہ بچشم خود جنت کے باغات اور اس کی نہروں کا مشاہدہ کرے۔ کیوں کہ عارف کی جنت و نعمت اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حصول ہے (جب معرفت حاصل ہو جائے گی پھر اسے کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ کیوں کہ معرفت ہمیشہ رہتی ہے)۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنے علم کی ترقی کے ساتھ اسے ترقی دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا پھل ہے جس کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین باہم حاسد نہیں ہوتے۔ بل کہ وہ تو ایسے ہوتے ہیں جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ﴾[2]

ترجمہ: اور نکال دی ہم نے ان کے سینوں سے خفگی، بھائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے آمنے سامنے۔"

شیخ موجان صاحب آگے فرماتے ہیں:

[1] محاسد العلماء، المبحث الأول "تنافس الأقران"، ص ۱۹۷ [2] الحجر: ۴۷

"یہ تو ان کی دنیاوی زندگی کی حالت ہے۔ پس کیا گمان کیا جائے گا ان پر آخرت میں کہ جب ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حائل پردہ ہٹ جائے گا اور وہ لوگ اپنے محبوب کا دیدار کر لیں۔

اس وقت تو نہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جنت میں لوگ ایک دوسرے سے کسی نئی بات پر حسد کریں گے اور نہ یہ کہ جو دنیا میں ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے تو وہ جنت میں آ کر یہاں بھی حسد کریں گے، اس لیے کہ جنت میں نہ تو کوئی تنگ نظری اور کم ظرفی ہوگی اور نہ کوئی مزاحمت۔

اور یہاں تک تو وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی ہو اور دنیا میں ایک دوسرے سے مزاحمت نہ کی ہو۔ معلوم ہوا کہ جنت (عِلِّيِّين) میں جانے والے لوگ نہ تو دنیا میں باہم حسد کرتے ہیں اور نہ جنت میں حسد کریں گے، بل کہ حسد کرنا تو "عِلِّيِّين" (جنت) کی وسعت سے دور اور "سِجِّين" (دوزخ) کی تنگی کی طرف جانے والے لوگوں کی صفات میں سے ہے اسی لیے تو شیطان مردود کو اس صفت سے متصف کیا گیا اور حسد کو اس کی صفات میں سے قرار دے دیا گیا۔

چناں چہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا اس مرتبہ کے دیے جانے پر، جو آدم علیہ السلام کے ساتھ خاص کیا گیا (یعنی زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بننا) جب شیطان سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا کہا گیا تو اس نے تکبر و انکار کیا اور سرکش و نافرمان ہوا۔"

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ حسد اس مقصود کے حاصل کرنے میں کیا جاتا ہے جو سب لوگوں کو نہ دیا گیا ہو (بل کہ بعض کو دیا گیا ہو) یہی وجہ ہے کہ آپ نے لوگوں کو آسمان کی خوب صورتی کی طرف نظر دوڑانے میں باہم حسد کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا

(اس لیے کہ آسمان کی خوبصورتی سب کے لیے ہے)۔[1]

محسودین کے حق میں دعا کرنا

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

"بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب دل میں دوسرے کی نعمت دیکھ کر حسد اور جلن پیدا ہو تو اس کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے اس کے حق میں دعا کرے کہ یا اللہ! یہ نعمت جو آپ نے اس کو عطا فرمائی ہے، اور زیادہ عطا فرما اور جس وقت وہ یہ دعا کرے گا۔ اس وقت دل پر آرے چلیں گے اور یہ دعا کرنا دل پر بہت شاق اور گراں گزرے گا لیکن زبردستی یہ دعا کرے کہ یا اللہ! اس کو اور ترقی عطا فرما، اس کی نعمت میں اور برکت عطا فرما اور ساتھ ساتھ اپنے حق میں بھی دعا کرے کہ یا اللہ! میرے دل میں اس کی نعمت کی وجہ سے جو کڑھن اور جلن پیدا ہو رہی ہے اپنے فضل اور رحمت سے اس کو ختم فرما، خلاصہ یہ ہے کہ یہ تین کام کرے:

1. اپنے دل میں جو کڑھن پیدا ہو رہی ہے، اور اس کی نعمت کے زوال کا جو خیال آرہا ہے، اس کو دل سے برا سمجھے۔
2. اس کے حق میں دعائے خیر کرے۔
3. اپنے حق میں دعا کرے کہ یا اللہ! میرے دل سے اس کو ختم فرما، ان تین کاموں کے کرنے کے بعد بھی اگر دل میں غیر اختیاری طور پر جو خیال آرہا ہے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر مواخذہ نہیں ہوگا ان شاء اللہ، اگر دل میں خیال تو آرہا ہے، لیکن اس خیال کو برا نہیں سمجھتا ہے، اور نہ اس کے تدارک کی فکر کرتا ہے، نہ اس کی تلافی کرتا ہے تو اس صورت میں وہ گناہ سے خالی نہیں۔[2]

[1] تحاسد العلماء، المبحث الأول "تنافس الأقران"، ص ۱۹۹ تا ۲۰۰

[2] اصلاحی خطبات: ۵/۸۲، ۸۳

اسی طرح بزرگوں نے لکھا ہے کہ حاسدین کے حق میں بھی دعا کی جائے چنانچہ ان سے یہ دعا منقول ہے:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَاسِدِيْنَ فَإِنَّهُمْ لِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الضِّيْقِ لَا يَحْتَمِلُوْنَ رُؤْيَةَ النِّعَمِ الَّتِيْ عَلَيْنَا دُوْنَهُمْ وَلَوِ اتَّسَعَتْ نُفُوْسُهُمْ لَمْ يَقَعُوْا فِيْ حَسَدِنَا."[1]

ترجمہ: "اے اللہ! ہمارے حاسدین کی مغفرت فرما جو تنگ نظری کی بنا پر ہمیں نعمتوں میں نہیں دیکھ سکتے اگر ان کے دل وسیع ہوتے تو وہ ہم سے حسد نہ کرتے۔"

حسد سے بچنے پر انصار کی تعریف

اللہ تعالیٰ نے انصار کی تعریف یوں فرمائی ہے:

﴿وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾[2]

"أَيْ حَسَدًا وَغَيْظًا مِمَّا أُوْتِيَ الْمُهَاجِرُوْنَ، وَفِيْمَا أُوْتُوْهُ قَوْلَانِ: أَحَدُهُمَا: مَالُ الْفَيْءِ، وَالثَّانِيْ: اَلْفَضْلُ وَالتَّقَدُّمُ."[3]

ترجمہ: "وہ اپنے سینوں میں کوئی غرض (حسد) نہیں رکھتے جو کچھ ان (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے، بل کہ اپنے اوپر (انہیں) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ اس کے زیادہ محتاج ہیں۔" (یعنی اپنے مہاجر بھائیوں کو جو کچھ دیتے ہیں)۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرات مفسرین نے فرمایا ہے:

"(اللہ تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا کہ) وہ اپنے سینوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے یعنی جو کچھ مہاجروں کو دیا جاتا ہے۔ اس پر دلوں میں حسد اور غصہ نہیں رکھتے۔"

[1] مناجات الصالحین: ۲۲۹

[2] الحشر: ۹

[3] زاد المسیر: ۸/۲۳، الحشر: ۹

﴿مِّمَّآ اُوْتُوْا﴾ میں دو قول ہیں: حضرت حسن بصری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا قول ہے: ''مال فئی میں جو زائد مقدار انہیں دیا جاتا تھا اس میں حسد نہیں کرتے تھے۔'' اور امام ماوردی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے فرمایا: ''فضیلت اور تقدم میں جو مال اور مرتبہ ان کو دیا جاتا تو اس پر حسد نہیں کرتے تھے۔'' اور حسد تو ان چیزوں میں ہوتا ہی ہے۔''

یہود کی اللہ تعالیٰ نے اس بات پر مذمت کی ہے کہ وہ مسلمانوں سے حسد کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں سے حسد کرنے کی بناء پر یہود کی (مذموم) صفت بیان کی ہے۔ چناں چہ فرمایا:

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ﴾[1]

اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾[2]

تَرْجَمَہ: ''ان اہل کتاب (یہود) کے اکثر لوگ باوجود حق واضح ہو جانے کے محض حسد (و بغض) کی بناء پر تمہیں بھی ایمان سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔''

''یا یہ (یہود) لوگوں سے حسد کرتے ہیں، اس پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے۔''

امام مقتدیوں کو کینہ (حقد) کے نقصانات بتلائے

جب شعبان کی تیرہویں رات ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی مغفرت فرماتا ہے اور کافروں کو مہلت دیتا ہے اور کینہ رو کو چھوڑ دیتا ہے ان کے کینہ روی میں، یہاں تک کہ وہ خود ہی کینہ کو چھوڑ دے۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے کہ ''(بندے کے) اعمال ہر ہفتے کے پیر اور جمعرات والے

[1] البقرۃ: ۱۰۹ [2] النساء: ۵٤

دن اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ (اس دن) ہر مومن بندے کی مغفرت کر دی جاتی ہے مگر جب دو شخصوں کے درمیان کینہ ہو (ان کے لیے) کہا جاتا ہے انہیں چھوڑ دو یہاں تک کہ یہ ٹھیک ہو جائیں۔''[1] طبرانی کی روایت میں ہے کہ بندے کے اعمال پیر اور جمعرات کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرما دیتے ہیں مگر کینہ رو اور رشتہ توڑنے والے کی مغفرت نہیں فرماتے۔[2]

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور ان سب کی مغفرت کر دی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتے مگر کینہ رو کی مغفرت نہیں کی جاتی۔ اور کہا جاتا ہے انہیں رہنے دو یہاں تک کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔''[3]

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے کہ ''اعمال جمعہ اور جمعرات کو پیش کیے جاتے ہیں ان دنوں ہر اس بندے کی مغفرت کر دی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ مگر دو شخصوں کی مغفرت نہیں کی جاتی اور کہہ دیا جاتا ہے۔ انہیں پیچھے کر دو یہاں تک کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔''[4]

امام طبرانی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی روایت کرتے ہیں کہ ''(بنی آدم کے) اعمال ہر پیر اور جمعرات کو پیش کیے جاتے ہیں۔ رحم طلب کرنے والے پر رحم کیا جاتا ہے اور مغفرت طلب کرنے والے کی مغفرت کر دی جاتی ہے مگر کینہ رو کو اس کے کینے میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔''[5]

[1] مسلم، البر والصلة، باب النهي عن الشحناء: ۲/۳۱۷
[2] مجمع الزوائد، الأدب، باب ماجاء في الشحناء: ۸/۷۸، رقم: ۱۲۹۶٤
[3] مسلم، البر والصلة، باب النهي عن الشحناء: ۲/۳۱۷
[4] موطا امام مالك، باب ماجاء في المهاجرة: ۷۰۷
[5] الترغيب والترهيب، الأدب، باب الترهيب من التهاجر: ۳/۳۰۷

اسی طرح حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ رب العزت پندرھویں شعبان کی رات کو دنیاوی آسمان پر نازل ہوتے ہیں۔ اور تمام مسلمانوں کی مغفرت فرماتے ہیں۔ مگر مشرک اور جس کے دل میں کینہ ہو اس کی مغفرت نہیں فرماتے۔[1]

امام مقتدیوں کو سمجھائے کہ کافر کو بھی دھوکہ دینا گناہ ہے

کوفہ کے ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک لشکر بھیجا تھا۔ اس کے امیر کو یہ خط لکھا:

"مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارے کچھ ساتھی بھی موٹے تازے کافر کا پیچھا کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ کافر دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ جاتا ہے اور خود کو محفوظ کر لیتا ہے تو پھر اس سے تمہارا ساتھی (فارسی میں) کہتا ہے "مترس" یعنی مت ڈرو (یہ کہہ کر اسے امان دے دیتا ہے وہ کافر خود کو اس مسلمان کے حوالے کر دیتا ہے) پھر یہ مسلمان اس کافر کو پکڑ کر قتل کر دیتا ہے (یہ قتل دھوکہ دے کر کیا ہے) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! آئندہ اگر مجھے کسی کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے ایسا کیا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔"[2]

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کسی نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کسی مشرک کو امان دے دی اور وہ مشرک اس وجہ سے اس مسلمان کے پاس آ گیا اور پھر مسلمان نے اسے قتل کر دیا تو (یوں دھوکے سے قتل کرنے پر) میں اس مسلمان کو ضرور قتل کروں گا۔[3]

[1] الترغیب والترهیب، الأدب، باب الترهیب من التهاجر: ۳/۳۰۷

[2] موطا للإمام مالك، باب ماجاء في الوفاء بالأمان: ٤٦٦

[3] كنز العمال، الثاني، الجهاد الأمان: ٤/۲۰۹، رقم: ۱۱۴۵

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے "تستر" (شہر) کا محاصرہ کیا (آخر محاصرہ اور جنگ سے تنگ آ کر تستر کے حاکم) ہرمزان نے اپنے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلہ پر اترنا قبول کیا۔ میں اس کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب ہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچے تو آپ نے اس سے فرمایا: "کہو کیا کہتے ہو؟"

اس نے کہا: "زندہ رہنے والے کی طرح بات کروں" یا "مر جانے والے کی طرح؟"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "لَا بَأْسَ" یعنی تم اپنے بارے میں مت ڈرو۔ ہرمزان نے کہا اے قوم عرب! جب تک اللہ تعالیٰ خود تمہارے ساتھ نہ تھے بلکہ اللہ نے معاملہ ہمارے اور تمہارے درمیان چھوڑ رکھا تھا اس وقت تک تو ہم تمہیں اپنا غلام بناتے تھے، تمہیں قتل کرتے تھے اور تم سے سارا مال چھین لیا کرتے تھے لیکن جب سے اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہو گئے ہیں اس وقت سے ہم میں تم سے مقابلہ کی بھی طاقت باقی نہیں رہی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (مجھ سے) پوچھا: "(اے انس!) تم کیا کہتے ہو؟"

میں نے کہا: "اے امیر المومنین! میں اپنے پیچھے بڑی تعداد میں دشمن اور ان کا بڑا دبدبہ چھوڑ کر آیا ہوں۔ اگر آپ اسے قتل کر دیں گے تو پھر اس کی قوم اپنی زندگی سے ناامید ہو کر مسلمانوں سے لڑنے میں اور زیادہ زور لگائے گی (اس لیے آپ اس کو قتل نہ کریں)" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "میں براء بن مالک اور مجزاۃ بن ثور رضی اللہ تعالیٰ عنہما (جیسے بہادر صحابہ) کے قاتل کو کیسے زندہ چھوڑ دوں؟"

میں نے کہا: "آپ اسے قتل نہیں کر سکتے کیوں کہ آپ اس سے "لَا بَأْسَ" "تم مت ڈرو اور بات کرو کہہ چکے ہیں (اور لا بأس کہنے سے جان کی امان مل جاتی

ہے۔ لہٰذا آپ تو اسے امان دے چکے ہیں)۔"

حضرت عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا: "معلوم ہوتا ہے تم نے اس سے کوئی رشوت لی ہے اور اس سے کوئی مفاد حاصل کیا ہے؟"

حضرت انس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے عرض کیا: "اللہ کی قسم! میں نے اس سے نہ رشوت لی ہے اور نہ کوئی مفاد (میں تو ایک حق بات کہہ رہا ہوں)" حضرت عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا: "تم اپنے اس دعویٰ ("لَا بَأْسَ" کہنے سے کافر کو امان مل جاتی ہے) کی تصدیق کرنے والا کوئی اور گواہ اپنے علاوہ لاؤ ورنہ میں تم سے ہی سزا کی ابتداء کروں گا۔" چناں چہ میں گیا، مجھے حضرت زبیر بن عوام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ ملے، میں ان کو لے کر آیا انہوں نے میری بات کی تصدیق کی، جس پر حضرت عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے اس کے لیے بیت المال میں سے وظیفہ مقرر کیا۔[1]

لہٰذا ہم ائمہ کو چاہیے کہ اپنے مقتدیوں کو سمجھائیں کہ جب دھوکہ کافر اور مشرک کو دینا گناہ ہے تو کسی مسلمان کو دھوکہ دینا کتنا بڑا گناہ ہوگا۔

ہمیں اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے فرمایا:

"علم کا سب سے پہلا اور اہم تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کا احتساب کرے، اپنے فرائض اور اپنی کوتاہیوں کو سمجھے اور ان کی ادائیگی کی فکر کرنے لگے، لیکن اگر اس کے بجائے وہ اپنے علم سے دوسروں ہی کے اعمال کا احتساب اور ان کی کوتاہیوں کے شمار کا کام لیتا ہے تو پھر یہ علمی کبر وغرور ہے جو اہلِ علم کے لیے بڑا مہلک ہے۔

؎ کار خود کن کار بیگانہ مکن"[2]

[1] کنز العمال، الجهاد، الأمان، الثاني: ۴/۲۰۸، رقم: ۱۱۴۴۳

[2] ملفوظات مولانا الیاس: ۱۷

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں کہ "مولانا الیاس رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے آخری وقت تک (تبلیغی جماعت کے بارے میں) اپنی طرف سے اطمینان نہیں کیا اور نفس کے محاسبہ اور نگرانی سے غافل نہیں ہوئے، بل کہ جس قدر لوگوں کا رجوع بڑھتا رہا اپنی طرف سے زیادہ غیر مطمئن اور خائف ہوتے گئے اور احتسابِ نفس کا کام بڑھاتے رہے۔ بعض اوقات اہلِ حق اور اہلِ بصیرت کو بڑی الحاح سے اس طرف متوجہ فرماتے کہ وہ آپ پر نظر رکھیں اور اگر کہیں عجب وکبر کا شائبہ نظر آئے تو متنبہ کریں۔"[1]

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کو وفات کے بعد حضرت جعفر خلدی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کیا معاملہ ہوا؟ انہوں نے جو جواب دیا، اس میں ہم ائمہ کرام کی جماعت کے لیے بڑی فکر کی بات ہے، رو رو کر اللہ تعالیٰ سے یہ نعمت مانگنے کی ضرورت ہے اور اپنے کمرہ میں یہ نصیحت ... لکھ کر رکھنے کی ضرورت ہے فرمایا:

"طَاحَتْ تِلْكَ الْإِشَارَاتُ، وَغَابَتْ تِلْكَ الْعِبَارَاتُ، وَفَنِيَتْ تِلْكَ الْعُلُوْمُ، وَنَفِدَتْ تِلْكَ الرُّسُوْمُ، وَمَا نَفَعَنَا إِلَّا رَكَعَاتٌ كُنَّا نَرْكَعُهَا فِي الْأَسْحَارِ"

تَرْجَمَہ: "وہ اشارے مٹ گئے، وہ عبارتیں غائب ہوگئیں، وہ علوم فنا ہوگئے اور وہ نقوش ختم ہوگئے، ہمیں تو صرف ان چند رکعتوں نے فائدہ دیا جو ہم سحری کے وقت پڑھا کرتے تھے۔"[2]

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں اگر کسی کو اپنے علم پر ناز ہو تو سن لے۔ حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے برابر تو کسی کو علم عطا نہیں ہوا حق تعالیٰ آپ کو ارشاد فرماتے ہیں:

[1] مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت: ۲۱۲

[2] تراشے: ص ۲۹

﴿وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا﴾[1]

یعنی اگر ہم چاہیں تو آپ کو دیے ہوئے علوم وفقہ سلب کرلیں پھر آپ کا کوئی کارساز بھی نہیں ہوسکتا۔

دیکھیے کتنا ہولناک خطاب ہے۔ آپ ڈر گئے ہوں گے اس لیے آگے فرمایا ﴿إِلَّا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ﴾[2] بس رحمتِ خداوندی ہی ساتھ دے سکتی ہے اور کوئی ساتھ نہیں دے سکتا۔

اگلے کلمات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو بڑی خشیت ہوگئی تھی اس لیے آگے جملہ بڑھایا۔

﴿إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا﴾[3] چوں کہ حق تعالیٰ کا فضل آپ کے شاملِ حال ہے، اس لیے بالفعل رحمت آپ کی دست گیر ہے۔ آپ کسی طرح کا اضطراب نہ کریں۔ ایسا ہوگا نہیں۔ محض اظہارِ قدرت اور تصحیحِ عقیدۂ امت کے لیے ایسا فرمایا ہے جب حضور اکرم ﷺ کے ساتھ یہ گفتگو "تا دیگراں چہ رسد۔" علم پر ناز کرنا حماقت ہے عرفاں پہ کیا ناز ہو ان میں سے کوئی چیز مکتسب نہیں سب عطائے حق ہے۔ ان کو اپنی چیز سمجھنا کبر ہے اور کبر بہت سی گندگیوں کی جڑ ہے۔ غصہ اسی سے پیدا ہوتا ہے۔

مہلب وزیر کے بیٹے کو حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ تعالیٰ نے تکبر سے چلتا ہوا دیکھ کر ٹوکا تو مہلب کے بیٹے نے کہا:

"هَلْ عَرَفْتَ مَنْ أَنَا؟"

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "نَعَمْ أَوَّلُكَ نُطْفَةٌ

[1] الاسراء: ۸۶ [2] الاسراء: ۸۷ [3] الاسراء: ۸۷

قَذِرَةٌ ...... وَآخِرُكَ جِيفَةٌ قَذِرَةٌ ...... وَأَنْتَ بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ"[1]

جو ہر وقت ہر مجلس میں غلاظت اٹھائے پھرتا ہوا گر کسی طرح اس کا اظہار ہوتا رہتا تو ساری شیخی کرکری ہوجاتی کبھی گندہ دہنی اور کوڑھ کے ذریعہ مشاہدہ کرادیتے ہیں تاکہ ان کو دیکھ کر رحمتِ خداوندی یاد آجائے۔[2]

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾[3]

ترجمہ: "اور اسی طرح ہم نے آپ کے پاس وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے۔ آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا چیز ہے۔ لیکن ہم نے اس (قرآن) کو نور بنادیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم ہدایت کرتے ہیں بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ راہِ راست ہی کی ہدایت کر رہے ہیں۔"

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کمالات سب کے سب موہوب (عطا کردہ) ہیں۔ جس کو ہبہ کمالات پر قدرت ہے۔ اس کو سلبِ کمالات پر بھی قدرت ہے۔ تو کسی کو بھی اپنے اعمال پر ناز نہ (ہونا) چاہیے۔[4]

امام کی لوگوں کے ساتھ بے تکلفی نقصان دہ ہے

ہر طبقے کے اندر جب بھی حد سے زیادہ تعلقات ہوجاتے ہیں تو اکثر ایسے تعلقات حقارت ومنافرت پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں اس لیے ہر ایک کو

[1] المستطرف فی کل فن مستظرف الباب السابع والعشرون: ۲۸۴/۱
[2] مجالس مفتی اعظم ۷۳ [3] الشوریٰ: ۵۲ [4] تفسیر ماجدی: ۹۷۷/۲

چاہیے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس قدر بے تکلف نہ ہو جائے کہ طرفین کو اس سے نقصان اٹھانا پڑے۔

امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا ایک حکیمانہ قول ہے:

"اَلْاِنْقِبَاضُ عَنِ النَّاسِ مَكْسَبَةٌ لِلْعَدَاوَةِ، وَالْاِنْبِسَاطُ اِلَيْهِمْ مَجْلَبَةٌ لِقُرَنَاءِ السُّوْءِ، فَكُنْ بَيْنَ الْمُنْقَبِضِ وَالْمُنْبَسِطِ"[1]

ترجمہ: "لوگوں کے ساتھ ترش روئی سے پیش آنا لوگوں کو دشمن بنا لیتا ہے، اور بہت زیادہ خندہ پیشانی برے ہم نشینوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، لہٰذا ترش روئی اور بہت زیادہ خندہ پیشانی کے درمیان معتدل راہ اختیار کرو۔"

ہر امام کو چاہیے کہ وہ اس قول کو ہمیشہ یاد رکھے اور اپنے مقتدیوں اور دوستوں اور شاگردوں کو اس کی نصیحت کرتا رہے، اس قول پر عمل ہم سب کے لیے بہت ہی مفید رہے گا اور ہم کو حدِ اعتدال کے اندر قائم رکھے گا۔

حضرت احنف بن قیس رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے مجھ سے فرمایا۔

"اے احنف! جو آدمی زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے، جو مذاق زیادہ کرتا ہے لوگ اسے ہلکا اور بے حیثیت سمجھتے ہیں، جو باتیں زیادہ کرتا ہے اس کی لغزشیں زیادہ ہو جاتی ہیں، جس کی لغزشیں زیادہ ہو جاتی ہیں اس کی حیا کم ہو جاتی ہے اور جس کی حیا کم ہو جاتی ہے اس کی پرہیز گاری کم ہو جاتی ہے اور جس کی پرہیز گاری کم ہو جاتی ہے اس کا دل مُردہ ہو جاتا ہے۔"[2]

[1] حلیۃ الاولیاء: ۹/۱۳۰، رقم: ۱۳۳۶۱

[2] حیاۃ الصحابۃ (عربی) مواعظ عمر بن الخطاب: ۴/۲۶۸

ائمہ کرام کسی بھی عالم اور مسلک کی تحقیر نہ فرمائیں

ائمہ کرام کو چاہیے کہ کسی بھی عالم اور مسلک کی تحقیر نہ فرمائیں، کیوں کہ عالم اور مسلک کی تحقیر میں نفع کم اور نقصان بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح اگر کسی اہلِ علم پر اشکال ہو تو وہ اشکال بصورتِ سوال ہو، یا اگر کسی تحقیق طلب مسئلے میں اختلاف ہو تو بھی وہ اہلِ علم کے درمیان ہی رہے۔

عوام کو ہرگز ہرگز اس کا علم نہ ہونے پائے کہ ہمارے امام صاحب کو فلاں عالم سے اختلاف ہے۔

ائمہ کرام علماء کی مجالس میں عموماً اور عوام الناس کی مجالس میں خصوصاً علماء کی لغزشوں کے ذکر کرنے سے بہت ہی زیادہ اجتناب اور پرہیز کریں، کسی طرح زبان پر کوئی ایسا حرف نہ لائیں، جس سے سننے والے کو کسی عالم کے درجہ میں کمی کا شعور ہو۔ اور جب ایک عالم دوسرے عالم کی برائی، عیب جوئی یا غیبت کر رہا ہے تو وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے، کیوں کہ یہ بھی تو اسی لباس میں ملبوس ہے جس میں وہ ملبوس ہے اور پھر اس میں سب سے بڑی جو خرابی ہے وہ یہ ہے کہ عوام الناس کو علماء کی غیبت اور عیب جوئی کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اسی طرح ہر قسم کے تعصب سے چاہے وہ اقوال کے اعتبار سے ہو یا کہنے والوں کے اعتبار سے ہو بہت ہی زیادہ ڈرنا چاہیے اور بہت ہی احتیاط کرنی چاہیے، کیوں کہ تعصب آدمی کو اوپر سے نیچے گرا دیا کرتا ہے یعنی پھر آدمی دین کی مدد یا اعلاءِ کلمۃ اللہ کی فکر کرنے کے بجائے مناظرہ و مباحثہ سے اپنی بات کو اونچا کر رہا ہوتا ہے یا جس امام اور بزرگ کی بات وہ صحیح سمجھتا ہے بس اسی کو حرفِ آخر سمجھ کر دوسروں کو ذلیل کرتا ہے، اس طرح دوسروں کی غیبتیں اور جذبۂ انتقام اس کو کبیرہ گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے، اخلاص (اصلاحِ خلق) اور رضاءِ الٰہی کا جذبہ ختم ہو کر اس کی جگہ

اس میں نفس پرستی آجاتی ہے، اور اپنی بات چاہے کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو اس کو درست کرنے کی فکر میں اس کے علم کا اصل نور بھی زائل ہو جاتا ہے اور حقد و کینہ کا دروازہ کھل جاتا اور آخر میں دو فریقوں میں ایسا جھگڑا کرا دیتا ہے جو دین و دنیا دونوں کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔

لہٰذا عمومی مجمع میں یا منبر رسول پر کسی طرح بھی یہ بات مناسب نہیں ہے کہ کسی عالم کی شان میں نازیبا الفاظ ذکر کیے جائیں یا کسی بھی مسلک کے خلاف بات کی جائے چہ جائے کہ وہ مسلک اہل حق لوگوں کا ہو یا اہل حق کی تائید اس میں شامل ہو، پھر تو ہرگز عوام کے مجمع میں یہ بات نہ ہو۔

اسی طرح کسی بھی عالم کا عیب عوام کے مجمع میں ذکر نہ کیا جائے، اگر آپ اس عالم میں کوئی کمی پاتے ہیں تو اس کو تنہائی میں بتائیں، اگر بالمشافہ بات کرنے میں کسی قسم کی عار ہو تو تحریراً ان کو مطلع فرما دیں کہ بندہ کی رائے یہ ہے کہ آں جناب اس میں غور فرمالیں۔ اگر اس کے باوجود بھی وہ اپنی رائے پر مصر ہوں تو چھوڑ دیجیے۔

ہاں عوام کے سامنے آپ اپنی رائے لانا چاہتے ہیں یا آپ کو خطرہ ہے کہ یہ دین کا ایسا بنیادی اور اہم مسئلہ ہے، جس میں اگر لوگوں نے ان کی اتباع کر لی تو ان کے دین کے لیے خطرہ ہے اور آپ اس مقام پر ہیں کہ لوگ آپ کی بات مانتے ہیں تو آپ رد بھی کرنا چاہیں تو اپنے اہل علم ساتھیوں سے مشورہ کر لیں کہ بندہ نے یوں رد لکھنے کا ارادہ کیا ہے یا بیان میں کہنے کا ارادہ ہے۔

کہیں یہ کہنا اور لکھنا، حسد، حقد، تعصب، اور عجب کی بنا پر تو نہیں ہے؟

اس تحریر کے انداز سے یا بیان میں کبر و عجب تو محسوس نہیں ہو رہا؟

اس لکھنے سے وہ سامنے والے شخص ہدایت پر آجائیں گے، یا اللہ نہ کرے ضد پر آکر فتنہ مزید تو نہیں پھیلے گا؟

مشورہ و استخارہ کے بعد اس پر قلم و زبان چلائیں، اکابر علماء نے اس میں بہت ہی

احتیاط فرمائی ہے اور جن علماء کرام سے احتیاط نہیں ہوتی تو اس کے نتائج تاریخ اسلام میں بہت برے اور افسوس ناک واقع ہوئے ہیں۔

یہاں مثال کے طور پر کچھ واقعات نقل کیے جاتے ہیں ان علماء کرام وائمہ عظام رحمہم اللہ تعالیٰ کے جنہوں نے علماء کے آپس کے اختلافات کو اہل علم کے درمیان ہی محدود رکھا، اور اگر اہل علم کو ادب، محبت کی زبان سے خطاب فرما کر اپنی رائے ان پر واضح فرما دی اور پھر بھی مخاطب نے رجوع نہ کیا اور مسئلہ مستحب و غیر مستحب کا بھی نہیں تھا بلکہ اصول و عقائد یا حلال و حرام کا تھا تو بھی اپنی رائے عوام پر واضح فرما دی۔

شیخ عبد اللہ بن حسین الموجان کتاب "تحاسد العلماء" میں لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے اہل علم کی تحقیر کی، اور عوام کے درمیان اپنے اختلافات کو کھل کر سامنے لائے اور جس کا منشاء حقد و حسد، و تعصب مع البغض تھا یہ حقیقت میں علماء نہیں تھے جس طرح بعض اہل علم پر بعض لوگوں نے برے القابات سے رد لکھا ہے"

چناں چہ شیخ نے اس کی افسوس ناک تفصیل لکھ کر فرمایا:

"اگر یہ حضرات علماء کے منہج پر کام کرتے تو جن اہل علم سے ان کو اختلاف تھا ان کو اپنا موقف بتانے کے بعد اس پر دلائل پیش کرتے، ان کے نظریہ کے خلاف دلائل سے سمجھاتے، اور نرم و میٹھی زبان استعمال فرماتے تو وہ ضرور سوچنے پر مجبور ہو جاتے، جیسے کہ حجاز مقدس اور بلاد عربیہ کے عالم اور مفتی مملکت نے کیسے پیارے اور میٹھے انداز سے اپنے نظریہ کے خلاف شیخ البانی پر رد لکھا ہے، فرمایا:

"أَخُونَا الْعَلَّامَةُ الْأَلْبَانِيُّ أَخْطَأَ فِيْ هٰذِهِ الْمَسْأَلَةِ بِدَلِيْلِ كَذَا وَكَذَا"

ترجمہ: "ہمارے بھائی علامہ البانی سے اس مسئلہ میں فلاں فلاں دلیل کی وجہ سے غلطی واقع ہوگئی۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"لَعَلَّ أَخَانَا الشَّيْخَ الْأَلْبَانِيَّ أَنْ يُرَاجِعَ الْمَسْأَلَةَ"

تَرجَمَہ: "ہمارے بھائی شیخ البانی سے درخواست ہے کہ وہ اس مسئلہ پر دوبارہ نظرِ ثانی فرمالیں (تو مہربانی ہوگی)۔"[1]

ائمہ کرام کی جماعت کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہیے کہ اہلِ علم کو اگر مجبوراً کسی اہلِ علم پر رد کرنا ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہرگز ہرگز عوام کے سامنے نہ ہو، اور آپس میں بھی جب اکٹھے ہوں تو حسد و کبر اور تعصب اور بغض کے جراثیم اس میں شامل نہ ہوں، ورنہ نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق ہو جائے گا۔

اکابر علماءِ کرام جن سے اللہ تعالیٰ نے کام لیا ان کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ وہ حضرات اپنے مخالف کی بھی تحقیر نہیں فرماتے تھے، تحقیر و تصغیر تو بہت دور کی بات ہے، ان کا ادب و احترام، اکرام و اعزاز کے الفاظ سے ان کو یاد فرماتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب نجدی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی شروع میں بعض رمی اہلِ علم نے بہت زیادہ مخالفت کی، لیکن شیخ ہمیشہ ان کے ساتھ نرمی و مہربانی، خیر خواہی سے پیش آتے رہے۔

عبداللہ بن محمد بن عبداللطیف نے جو "احساء" کے علماء میں سے تھے شیخ عبدالوہاب نجدی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے خلاف ایک رسالہ لکھا تھا جس کا نام تھا "سيف الجهاد لمدعى الاجتهاد" لیکن شیخ نے اس کا جواب کس قدر نرمی سے دیا، فرماتے ہیں:

"فَإِنِّي أُحِبُّكَ وَقَدْ دَعَوْتُ لَكَ فِي صَلَاتِي، وَأَتَمَنَّى مِنْ قَبْلِ هٰذِهِ الْمَكَاتِيبِ أَنْ يَهْدِيَكَ اللّٰهُ لِدِينِهِ الْقَيِّمِ، وَمَا أَحْسَنَكَ

[1] محاسن العلماء: ۱۲۸

لَوْ تَكُوْنُ فِي آخِرِ هٰذَا الزَّمَانِ فَارُوْقًا لِدِيْنِ اللّٰهِ."

تَرجَمَہ: "میں تم سے محبت کرتا ہوں، اور آپ کے لیے نمازوں کے بعد دعا کرتا ہوں، اور میری تمنا ہے کہ آپ غور سے میری دعوت کا مطالعہ فرمائیں تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی فرمائے۔ کتنا ہی اچھا ہو جائے کہ آپ اس زمانے کے فاروق بن جائیں اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے آپ کے ذریعہ صحیح دین جو بدعت و شرک سے پاک ہو امت تک پہنچ جائے۔"[2]

اسی طرح عبداللہ بن عیسیٰ ان دونوں باپ بیٹوں سے شیخ عبدالوہاب نجدی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کو بہت تکالیف پہنچیں، لیکن شیخ نے انہیں کتنے پیارے انداز سے خطاب فرمایا، فرماتے ہیں:

"إِنِّي أَدْعُوْ لَكَ فِي سُجُوْدِي، وَأَنْتَ وَأَبُوْكَ أَجَلُّ النَّاسِ إِلَيَّ وَأَحَبُّهُمْ عِنْدِي......"

"وَمَعَ ذٰلِكَ فَقَدْ عَانَى الشَّيْخُ الْإِمَامُ مِنَ الشَّيْخِ عَبْدِالْوَهَّابِ وَأَبِيْهِ مُعَانَاةً شَدِيْدَةً، وَأَصَابَهُ مِنْهُمَا هَمٌّ وَغَمٌّ كَمَا هُوَ مَذْكُوْرٌ فِي بَعْضِ رَسَائِلِهِ."[3]

تَرجَمَہ: "میں آپ کے لیے ہر نماز کے بعد دعا کرتا ہوں آپ اور آپ کے والد صاحب میرے لیے بڑے مرتبے کے مالک ہیں اور مجھے بہت محبوب ہیں...... باوجود اس کے کہ شیخ امام کو شیخ عبدالوہاب اور اس کے والد سے بہت سخت تکالیف اور غم و درد پہنچا جیسا کہ بعض رسائل میں

[2] محاسن العلماء مجلد القرآن، الثامن عشر، محمد بن عبدالوهاب: ص۳۵۸ والدر السنية: ۳۲/۱

[3] مجموعه مؤلفات الشيخ: ۹۸۰/۵

مذکور ہے۔"

واقعتاً یہ وہ لوگ تھے جو انبیاء علیہم السلام کے وارث تھے، ہر چیز میں ان کو وراثت ملی اور ﴿حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾[1]

(جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں، ایمان داروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں) سے بھی وراثت ملی۔

کافر کو بھی کافر کہنا مکروہ ہے

حضرت محمد پالن حقانی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب "شریعت یا جہالت[2]" میں لکھتے ہیں کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾[3]

ترجمہ: "جو کافر اپنے کفر میں ہی مر جائیں ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔"

جو لوگ کفر کریں اور توبہ نصیب نہ ہو اور کفر ہی کی حالت میں مر جائیں ان پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ یہ لعنت ان پر چپک جاتی ہے اور قیامت تک ساتھ رہتی ہے اور پھر دوزخ کی آگ میں لے جائے گی اور عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رہے گی، نہ تو عذاب میں کمی ہوگی اور نہ اس سے پناہ ملے گی، بلکہ ہمیشہ کے لیے سخت عذاب ہوتے رہیں گے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن کافر کو ٹھہرایا جائے

[1] التوبۃ: ۱۲۸

[2] یہ کتاب ایک پُر اثر مواعظ کا مجموعہ ہے جو افادۂ عامہ کے لیے اب بیت العلم ٹرسٹ نے خوب صورت انداز میں تحقیق کے ساتھ شائع کی ہے۔

[3] البقرۃ: ۱۶۱

گا۔ پھر اس پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے گا پھر فرشتے پھر تمام لوگ لعنت کریں گے۔[1]

کافروں پر لعنت بھیجنے کے مسئلے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے، مگر کسی متعین (زندہ) کافر کا نام لے کر لعنت بھیجنے کے بارے میں علماء کرام کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ جائز نہیں، اس لیے کہ اس کے مرنے کی خبر کسی کو نہیں (کہ مسلمان ہو کر مرے گا یا کافر ہو کر مرے گا)۔[2]

اگر کسی کافر، یا فاسق کو گراں ہو تو اس کو مشرک کہنا مکروہ ہے۔[3]

مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی ہے۔

ہمارے حنفی مسلک میں کافر کو بھی "اے کافر" کہنا منع ہے تو پھر ایک مسلمان کو کافر کہنا اور لوگوں سے کہلوانا کیسے جائز ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾[4]

ترجمہ: "جن لوگوں کو یہ مشرک اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں (یا پوجتے ہیں) ان کو برا نہ کہنا کہ یہ بھی کہیں اللہ تعالیٰ کو بے سمجھے بوجھے برا نہ کہہ بیٹھیں۔"

سُبْحَانَ اللّٰهِ! اللہ تعالیٰ کی مصلحت کو کوئی کیا سمجھ سکتا ہے خود خداوند کریم ان کو برا کہنے سے منع فرما رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مدمقابل پوجے جا رہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ بتائی کہ تم لوگ ان کو برا نہ کہو اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی تعصب میں

[1] تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳۷، البقرۃ: ۱۶۲

[2] تفسیر ابن کثیر: ص ۱۳۷، البقرۃ: ۱۶۱

[3] عین الهداية، كتاب الكراهية، فصل متعلق اهل الذمة: ۴/ ۳۱۲

[4] الانعام: ۱۰۹

اگر (مَعَاذَ اللّٰہِ) کہیں اللہ تعالیٰ کو برا نہ کہہ بیٹھیں۔

دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر تم انہیں برا نہ کہو گے تو ممکن ہے کہ وہ تمہاری بات سنیں اور ان کی ہدایت کا کوئی ذریعہ بن جائے اور جب بات نہیں سنیں گے تو ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم رہ جائیں گے تو گویا ان کی گمراہی کی دلیل خود ہم ہی بنے، جب بتوں کو برا کہنا منع ہے تو کسی مسلمان کو ''کافر کہنا'' اور کہلوانا کہاں کی ایمان داری ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ''احد'' کے دن فرمایا: ''الٰہی! ابوسفیان پر لعنت بھیج۔ الٰہی! حارث بن ہشام پر لعنت بھیج۔ الٰہی! صفوان بن امیہ پر لعنت بھیج[1]

یہ بات جنگ احد کے دن کی ہے۔ اس روز حضور ﷺ کو چوٹ بھی لگ گئی تھی، دانت مبارک بھی شہید ہوگیا تھا۔ اس وقت ان تین آدمیوں کا نام لے کر حضور ﷺ نے لعنت کی تو اسی وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾[2]

ترجمہ: ''اے پیغمبر! تمہارے اختیار میں کچھ نہیں اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کرلے، چاہے تو عذاب دے کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔''

حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے لعنت کرنے سے روک دیا۔

قرآن شریف کے سترہویں (۱۷) پارہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝﴾[3]

ترجمہ: ''اور ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کو سارے عالم کے

[1] ترمذی، ابواب التفسیر: ۲/۱۲۹، آل عمران: ۱۲۸

[2] آل عمران: ۱۲۸ [3] الانبیاء: ۱۰۷

لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

یعنی اے میرے حبیب آپ تو سارے جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں آپ کو زیبا نہیں کہ کسی پر لعنت بھیجیں، کیوں کہ اگر میں چاہوں تو ان کی توبہ قبول کروں اور چاہوں تو عذاب دوں، کیوں کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں، ظلم کر رہے ہیں، ہاتوں کا سامنا کرتے ہیں لڑتے ہیں اور آپ کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔

ترمذی میں ہے کہ جن جن لوگوں پر حضور ﷺ نے نام لے لے کر لعنت فرمائی تھی، وہ سب کے سب مسلمان ہوگئے اور ان کا اسلام اچھا ہوا یعنی پکے مسلمان اور مؤمن ہوکر دنیا سے رحلت فرمائی[1]

یہ تینوں شخص مشرک تھے اور مشرکین مکہ کے سردار تھے، دین کے دشمن تھے، حق پرستوں سے لڑ رہے تھے، باطل پرستوں کا ساتھ دے رہے تھے، جنگ احد میں حضور ﷺ کا دانت مبارک شہید ہوگیا تھا، اس کے علاوہ اور بھی زخم لگے ہوئے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیتیں نازل فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کو لعنت کرنے سے روک دیا تو پھر ہماری اور آپ کی کیا ہستی ہے کہ ایک دوسرے کو دنیاوی جھگڑوں کی وجہ سے مذہب کو آڑ بنا کر کافر کہتے پھریں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ایسی باتوں سے رک جائیں اور توبہ کرلیں۔

قرآن کریم کے چھبیسویں (۲۶) پارہ، سورۃ الحجرات کے دوسرے رکوع، آیت ۱۱ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: ''اے ایمان والو! کوئی جماعت دوسری جماعت سے تمسخر اپن نہ کرے، ممکن ہے کہ (جس پر ہنستے ہیں) وہ ان (ہنسنے والوں) سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتر ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیے، کیا خبر

[1] ترمذی، التفسیر: ۲/۱۲۹، آل عمران: ۱۲۸

گروہ ان سے بہتر ہوں، نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو، اور نہ ایک دوسرے
کو برے لقب سے پکارو، ایمان کے بعد گناہ کرنا بری بات ہے اور جو
توبہ نہ کریں وہی لوگ ظالم ہیں۔"

حضور نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ لعنت کرنے سے روک دینے کے بعد اب ایمان والوں کی طرف مخاطب ہو کر تاکید فرما رہا ہے کہ مردوں کو مردوں پر نہیں ہنسنا چاہیے کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ جن پر ہنسا جا رہا ہے وہ ہنسنے والوں سے اللہ کے نزدیک اچھے ہوں اور عورتیں دوسری عورتوں پر بھی نہ ہنسیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہنسنے والی عورتوں سے وہ عورتیں اچھی ہوں، جن پر ہنسا جا رہا ہے۔ اور نہ کسی کے اوپر کسی کو نائل لگاؤ اور نہ کسی کو برے نام سے بلاؤ۔ کیوں کہ ایمان لانے کے بعد یہ باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔ اپنے محبوب ﷺ کو بھی ہم نے لعنت کرنے سے روک دیا اور آپ حضرات ہمارے محبوب ﷺ پر ایمان لا چکے ہیں، اس لیے آپ کو بھی زیب نہیں دیتا کہ کسی دوسرے پر لعن طعن کریں یا برے القاب سے پکاریں اور اگر اس ہدایت کو نہیں مانو گے تو پھر تمہاری گنتی ظالموں میں ہوگی ایمان داروں میں نہیں۔ ایمان داری تو اس وقت مانی جائے گی، جب ہماری ہدایت کو مان لو۔

ایک دوسرے کو طعنہ دینے سے اور نائل لگانے سے منع فرمایا ہے، اس لیے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم جن کو غلط سمجھ رہے ہیں، وہ صحیح طریقے پر ہوتے ہیں اور غلط سمجھنے والے خود ہی غلطی پر ہوتے ہیں اور ان کو پتہ تک نہیں ہوتا۔

اے میرے عزیز دوست! اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت دے، جس کو چاہے گمراہ کرے، ہم کو کچھ بھی اختیار نہیں ہے۔ اگر ہم خود حق پر ہیں تو ہمارا کام ہے دوسروں کو نصیحت کرنا۔ بے چارے غریب ان پڑھ اور بھولے بھالے مسلمان کو آپس میں لڑانا، گالیاں دینا اور دوسروں سے دلوانا یہ ہمارا کام نہیں ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے

فرمایا: "تمام آدمیوں میں سب سے زیادہ نفرت اور عداوت اللہ تعالیٰ کو اس آدمی
سے ہے جو بڑا جھگڑالو ہو۔"[1]

شیخ محمد یاسین حقانی صاحب فرماتے ہیں: میرے دوستو! جھگڑا بند کر دو۔ یہ ہندوستان میں بعض لوگوں کی طرف سے کفر بازی کے فتووں کے مشین گن چل رہے ہیں وہ تو کچھ بھی نہیں ہے، بل کہ اصل بات ان لوگوں کی نفسانیت ہے اور پیٹ بھرائی کے دھندے ہیں۔

"اگر کسی یہودی یا مجوسی سے کہا کہ "اے کافر" تو گناہ گار ہوگا اگر اس پر
(اس کا کہنا) گراں گزرے۔"[2]

میرے عزیز دوست! "کافر" کا لفظ ایسا برا ہے کہ اگر "کافر" کو بھی "اے کافر" کہہ کر بلایا جائے تو یقیناً اسے بھی برا معلوم ہوگا۔ اس لیے کسی "کافر" کو بھی "کافر" کہنا مکروہ ہے کیوں کہ کسی بھی انسان کے مرتے دم کی خبر تو اللہ ہی کو ہے کہ وہ ایمان پر مرا ہے یا کفر پر مرا ہے۔

یہ ساری آیات شریفہ، احادیث مبارکہ اور معتبر کتابوں کے فتوے آپ کے سامنے ہیں، اب آپ خود ہی انصاف سے فیصلہ کریں کہ ایک مسلمان کو کافر کہنا اور لوگوں سے جبراً کسی کو کافر کہلوانا اور جو کافر نہ کہے اس کو بھی کافر سمجھنا کس قدر جہالت ہے۔[3]

اکابرین کا معاندین سے سلوک

حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودیوں کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے تو یہودیوں نے ان کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کیے، انہیں گالیاں دیں اور برا

---

[1] تفسیر مظہری، التفسیر: ۲/۱۲۷، البقرۃ: ۱۹۷
[2] فتاویٰ عالمگیری: ۲/۳۱۴، کراہیت کا بیان
[3] شرح فقہ اکبر، بحث فی الجہالت: ۱۴۳، ۱۳۱

بھلا کہا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے بارے میں کلمۂ خیر کہا اور انہیں دعائیں دیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی نے کہا: حضرت! عجیب بات ہے، آپ ان کو دعائیں دے رہے ہیں اور ان کے بارے میں کلمۂ خیر کہہ رہے ہیں، حالاں کہ وہ آپ پر گالیوں کی بوچھاڑ کر رہے ہیں؟

فرمایا: "کُلُّ وَاحِدٍ یُنْفِقُ مِمَّا عِنْدَهٗ"

ترجمہ: "ہر شخص وہی خرچ کرتا ہے اور منہ سے وہی نکالتا ہے، جو اس کے پاس ہوتا ہے۔"[1]

حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ تعالیٰ اپنی بردباری اور حوصلے میں نہایت مشہور تھے، ان کو کبھی غصہ نہیں آیا، عربوں میں ان کی یہ صفت مشہور و معروف تھی۔ ایک دن ان کے کچھ دوست اکٹھے ہوئے اور ان میں شرط لگ گئی کہ حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ تعالیٰ کو لازماً غصہ دلایا جائے۔ انہوں نے ایک نوجوان کو تیار کیا، وہ حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ تعالیٰ کے گھر گیا۔

حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: کیسے آئے ہو؟

نوجوان کہنے لگا: میں ایک کام سے آیا ہوں۔

حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ تعالیٰ: بتاؤ کیا کام ہے؟

نوجوان: دراصل میں تمہاری ماں سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا میں شادی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔

حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنا سر اٹھایا اور نہایت اطمینان سے فرمایا: "تمہارا حسب و نسب نہایت معزز اور بہترین ہے اور ہمیں تمہارے ساتھ سسرالی رشتہ جوڑنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ میری والدہ کی عمر

[1] منتشر اوراق، ص ۳۷

بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ وہ اب کم و بیش ستر سال کی ہے اور تم ایک خوب صورت نوجوان ہو۔ تمہیں تو ایک ایسی عورت چاہیے جو تمہاری ہم عمر ہو، محبت کرنے اور کروانے والی ہو، تمہارے بچوں کی ماں بن سکے اور تمہاری نسل بڑھ جائے گی۔

پھر نوجوان سے کہا: جن لوگوں نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے ان کو بتا دو کہ تم مجھے مشتعل نہیں کر سکے۔"[1]

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ ایک روز ظہر کی نماز کے بعد گھر تشریف لے گئے۔ بالا خانے پر آپ کا گھر تھا۔ جا کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ (آپ اندازہ کیجیے جو شخص ساری رات کا جاگا ہو اور سارا دن مصروف رہا ہو اس وقت اس کی کیا کیفیت ہوگی؟ ایسے میں کوئی آجائے تو کتنا ناگوار ہوتا ہے کہ یہ شخص بے وقت آگیا لیکن) امام صاحب اٹھے، زینے سے نیچے اترے، دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک صاحب کھڑے ہیں۔ امام صاحب نے اس سے پوچھا: "کیسے آنا ہوا؟؟" اس نے کہا: "ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے۔" دیکھیے اوّل تو امام صاحب جب مسائل بتانے کے لیے بیٹھے تھے وہاں آکر تو مسئلہ پوچھا نہیں، اب بے وقت پریشان کرنے کے لیے آگئے، لیکن امام صاحب نے اس کو کچھ نہیں کہا، بل کہ فرمایا: "اچھا بھائی! کیا مسئلہ معلوم کرنا ہے؟" اس نے کہا: "میں کیا بتاؤں جب میں آرہا تھا تو اس وقت مجھے یاد تھا کہ کیا مسئلہ معلوم کرنا ہے، لیکن اب میں بھول گیا، یاد نہیں رہا کہ کیا مسئلہ پوچھنا تھا؟" امام صاحب نے فرمایا: "اچھا جب یاد آجائے تو پوچھ لینا۔" آپ نے اس کو برا بھلا نہیں کہا، نہ اس کو ڈانٹا ڈپٹا، بل کہ خاموشی سے واپس اوپر چلے گئے۔

ابھی جا کر بستر پر لیٹے ہی تھے کہ دوبارہ دروازہ پر دستک ہوئی، آپ پھر اٹھ کر نیچے تشریف لائے اور دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہی شخص کھڑا ہے۔ آپ نے پوچھا:

[1] منتشر اوراق ۵۵

"کیا بات ہے؟" اس نے کہا: "ابھی تک تو یاد تھا مگر جب آپ آدھی سیڑھی پر تھے تو میں وہ مسئلہ بھول گیا۔" اگر ایک عام آدمی ہوتا تو اس وقت اس کے اشتعال کا کیا عالم ہوتا؟ مگر امام صاحب اپنے نفس کو مٹا چکے تھے۔ امام صاحب نے فرمایا: "اچھا بھائی! جب یاد آجائے تو پوچھ لینا۔" یہ کہہ کر آپ واپس چلے گئے اور جا کر بستر پر لیٹ گئے۔

ابھی لیٹے ہی تھے کہ تیسری مرتبہ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ آپ نیچے تشریف لائے، دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہی شخص کھڑا ہے۔ اس نے کہا: "حضرت وہ مسئلہ یاد آ گیا۔" امام صاحب نے پوچھا: "کیا مسئلہ ہے؟" اس نے کہا: "یہ مسئلہ معلوم کرنا ہے کہ انسان کی نجاست (پاخانہ) کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے یا میٹھا ہوتا ہے؟" (العیاذ باللہ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے) اگر دوسرا کوئی آدمی ہوتا اور وہ اب تک ضبط بھی کر رہا ہوتا تو اب اس سوال کے بعد تو اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جاتا، لیکن امام صاحب نے بہت اطمینان سے جواب دیا کہ: "اگر انسان کی نجاست تازہ ہو تو اس میں کچھ مٹھاس ہوتی ہے اور اگر سوکھ جائے تو کڑواہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔" پھر وہ شخص کہنے لگا: "کیا آپ نے چکھ کر دیکھا ہے؟" (العیاذ باللہ) حضرت امام ابوحنیفہ رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی نے فرمایا: "ہر چیز کا علم چکھ کر حاصل نہیں کیا جاتا، بلکہ بعض چیزوں کا علم عقل سے بھی حاصل کیا جاتا ہے اور عقل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تازہ نجاست پر مکھی بیٹھتی ہے خشک پر نہیں بیٹھتی، اس سے پتہ چلا کہ دونوں میں فرق ہے ورنہ مکھی دونوں پر بیٹھتی۔"

جب امام صاحب نے یہ جواب دے دیا تو اس شخص نے کہا: "امام صاحب! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں، مجھے معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو بہت ستایا لیکن آج آپ نے مجھے ہرا دیا۔" امام صاحب نے فرمایا: "میں نے کیسے ہرا دیا؟" اس شخص نے کہا: "ایک دوست سے میری بحث ہو رہی تھی، میرا کہنا تھا کہ حضرت

سفیان ثوری علماء میں سب سے زیادہ بردبار ہیں اور وہ غصہ نہ کرنے والے بزرگ ہیں اور میرے دوست کا یہ کہنا تھا کہ سب سے بردبار اور غصہ نہ کرنے والے بزرگ امام ابوحنیفہ ہیں اور ہم دونوں کے درمیان بحث ہو گئی اور اب ہم نے جانچنے کے لیے یہ طریقہ سوچا تھا کہ میں اس وقت آپ کے گھر پر آؤں جو آپ کے آرام کا وقت ہوتا ہے اور اس طرح دو تین مرتبہ آپ کو اوپر نیچے دوڑاؤں اور پھر آپ سے ایسا سوال کروں اور یہ دیکھوں کہ آپ غصہ ہوتے ہیں یا نہیں؟ میں نے کہا کہ اگر غصہ ہو گئے تو میں جیت جاؤں گا اور اگر غصہ نہ ہوئے تو تم جیت گئے، لیکن آج آپ نے مجھے ہرا دیا اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس روئے زمین پر ایسا حلیم انسان جس کو غصہ چھو کر بھی نہ گزرا ہو آپ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔"

اس سے اندازہ لگائیے کہ آپ کا کیا مقام تھا...... اس پر ملائکہ کو رشک نہ آئے تو کس پر آئے...... انہوں نے اپنے نفس کو بالکل ہی مٹا دیا تھا۔[1]

کسی بدنصیب نے غیظ و غضب اور شدت بغض و عداوت میں آکر حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی کو طمانچہ مارا تو حضرت امام اعظم رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی نے حد درجہ تلطف و انکساری سے فرمایا: "بھائی! ...... میں بھی تمہیں طمانچہ مار سکتا ہوں لیکن مارتا نہیں ...... میں خلیفہ سے تمہاری شکایت کر سکتا ہوں لیکن نہیں کرتا ...... سحر گاہی کے وقت تیرے ظلم سے اللہ تعالٰی کے آگے فریاد کر سکتا ہوں ...... لیکن نہیں کرتا ...... اور قیامت کے روز تمہارے ساتھ خصومت اور مقدمہ کر کے انصاف حاصل کر سکتا ہوں مگر یہ بھی نہیں کرتا بلکہ اگر مجھے قیامت کے روز رستگاری (نجات) حاصل ہوئی اور میری سفارش قبول ہوئی تو تیرے بغیر جنت میں قدم بھی نہ رکھوں گا۔"[2]

[1] اصلاحی خطبات: ۸/۲۷۶، ۲۷۷

[2] سیرت النعمان: ۱۲۹، بحوالہ عہد رسالت کی روشن مثالیں: ۳۹

حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب مدظلہ "ندائے منبر ومحراب" میں حکیم
الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ذکر فرماتے ہیں:
"میں نے مولانا تھانوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا کہ مولانا احمد رضا خان
صاحب مرحوم سے بہت چیزوں میں اختلاف رکھتے ہیں، قیام، عرس، میلاد وغیرہ
مسائل میں اختلاف رہا، مگر جب مجلس میں ذکر آیا تو فرماتے: "مولانا احمد رضا خان
صاحب" (یعنی ادب سے نام لیتے)۔

ایک مرتبہ مجلس میں بیٹھنے والے ایک شخص نے کہیں بغیر "مولانا" کے احمد رضا
کہہ دیا، حضرت نے ڈانٹا اور خفا ہو کر فرمایا کہ عالم تو ہیں، اگرچہ اختلاف رائے ہے
تم منصب کی بے احترامی کرتے ہو، یہ کس طرح جائز ہے۔ رائے کا اختلاف اور چیز
ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کو خطا پر سمجھتے ہیں اور صحیح نہیں سمجھتے، مگر ان کی توہین اور
بے ادبی کرنے کا کیا مطلب؟"

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "مولانا" نہ کہنے پر برا مانا، حالاں کہ
حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مقابل جو "مولانا" تھے وہ انتہائی
گستاخی کیا کرتے تھے، مگر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ اہل علم میں سے تھے اور
تو نام بھی کسی کا آتا تو ادب ضروری سمجھتے تھے، چاہے بالکل معاند ہی کیوں نہ ہو، گو
ادب کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔

میں نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ سنا
کہ دہلی کا قیام تھا، حضرت کے خدام میں سے چند مخصوص تلامذہ ساتھ تھے۔ حضرت
شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے دوسرے شاگرد مولانا احمد حسن
امروہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، حاجی امیر شاہ خاں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی
بھی وہاں موجود تھے، مولانا احمد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مجمع
میں بیٹھ کر فرمایا کہ "بھئی" لال کنویں کی مسجد کے جو امام ہیں، ان کی قرأت بہت

اچھی ہے، کل صبح کی نماز ان کے پیچھے پڑھیں تو شیخ الہند صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
نے غصے میں آ کر فرمایا کہ تمہیں شرم نہیں آتی، بے غیرت، وہ ہمارے حضرت کی تکفیر
کرتا ہے، ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے، اور بڑا سخت لہجہ اختیار کیا۔ یہ جملے
حضرت نانوتوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے کان میں پہنچے، اگلے دن حضرت
نانوتوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ان سب شاگردوں کو لے کر اسی مسجد میں صبح کی
نماز پڑھنے کی خاطر پہنچے، اس امام کے پیچھے جا کر نماز پڑھی، سلام پھیرا...... تو پوچھا
کون ہیں؟

معلوم ہوا کہ یہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں اور وہ ان
کے شاگرد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ محدث امروہی ان کے
تلامذہ ہیں۔

امام کو سخت حیرت ہوئی کہ میں رات دن انہیں کافر کہتا ہوں اور یہ نماز کے لیے
میرے پیچھے آ گئے، امام نے خود بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا: حضرت! میں آپ کی تکفیر کرتا
تھا، میں آج شرمندہ ہوں، آپ نے میرے پیچھے نماز پڑھی، حالاں کہ میں آپ کو کافر
کہتا رہا۔ حضرت نے فرمایا: کوئی بات نہیں، میرے دل میں آپ کے اس جذبے کی
قدر ہے اور زیادہ عزت دل میں بڑھ گئی ہے، کیوں؟

اس واسطے کہ آپ کو جو روایت پہنچی کہ میں توہین رسول کرتا ہوں، تو آپ کی
غیرت ایمانی کا یہی تقاضا تھا۔ ہاں البتہ شکایت اس کی ہے کہ روایت کی تحقیق کرنی
چاہیے تھی، اگر بہر حال تکفیر کی بنیاد توہین رسول ہے، اور توہین رسول جو مسلمان کرے
کی تکفیر واجب ہوگی، دائرۂ اسلام سے خارج ہوگا، تو فرمایا کہ میرے دل میں آپ کی
غیرت ایمانی کی قدر ہے۔

ہاں شکایت اس لیے ہے کہ ایک بار تحقیق کر لیتے کہ خبر صحیح ہے یا غلط، تو میں یہ
عرض کرنے آیا ہوں کہ یہ خبر غلط ہے اور میں خود اس شخص کو دائرۂ اسلام سے خارج

سمجھتا ہوں جو ادنیٰ درجہ میں بھی نبی ﷺ کی توہین کرے۔ اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ کے ہاتھ پر ابھی اسلام قبول کرتا ہوں۔

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

اب امام ان کے قدموں پر گر پڑا۔

تو بات صرف یہ تھی کہ ان حضرات کے دلوں میں "تواضع للہ" اور "ادب مع اللہ" اس درجہ رچا ہوا تھا کہ نفسانیت کا شائبہ نہ رہا تھا۔ استہزاء اور تمسخر تو بجائے خود ہے اپنے معاندوں کی بھی بے قدری نہیں کرتے تھے بل کہ صحیح محمل پر اتار کر کہتے ہیں کہ جو ہمیں کافر کہتے ہیں، یہ ان کی قوت ایمانی کی دلیل ہے۔ البتہ یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ واقع میں ہم توہین رسول کرتے ہیں؟

ہم مَعَاذَ اللّٰہ دشمنانِ رسول ہیں یا دوستانِ رسول ہیں؟ اس کی تحقیق ان کو واجب تھی، بلا تحقیق حکم نہیں لگانا چاہیے۔

تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور تادب دین کی بنیاد ہے۔ جس کو عارف رومی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے ؎

از خدا خواہیم توفیق ادب
بے ادب محروم گشت از فضل رب

حق تعالیٰ شانہ کے ہاں اس کا کوئی مقام نہیں، جو گستاخ اور بے ادب ہے۔[1]

مولانا حاجی محمد شریف "اصلاح دل" میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں لاہور میں حضرت مفتی (محمد حسن) صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، عصر کی اذان ہوئی اور تمام حضرات اٹھ گئے، مجھے عصر کے بعد فیصل آباد جانا تھا، مصافحہ کے لیے آگے بڑھا، سلام کیا اور عرض کیا نماز کے بعد مجھے جانا ہے۔ اس پر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لے لیا اور دیر تک

[1] خطبات منبر و محراب: ۱/۸۱ تا ۱۸۱

دباتے رہے اور فرمایا:

دیکھو! میرے ایک سوال کا جواب دو، تم حضرت (یعنی حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ) کی خدمت میں بہت رہے ہو۔ یہ لوگ جو حضرت والا کی مخالفت کرتے ہیں، کیا حضرت کی زبان مبارک سے بھی تم نے ان کے متعلق کوئی بات سنی؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے حضرت کی زبان مبارک سے ان کی کبھی بھی برائی نہیں سنی، بل کہ ایک مرتبہ کسی صاحب کے سوال پر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: دیکھنا یہ چاہیے کہ یہ لوگ جو میری مخالفت کرتے ہیں اس مخالفت سے ان کا منشاء کیا ہے؟ اگر منشاء حب رسول ہے تو میں ان کو معذور نہیں بل کہ ماجور سمجھتا ہوں۔ یہ میری مخالفت کی وجہ سے ان کو اجر ملے گا۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: اور میں تو حضرت کی خدمت میں بہت زیادہ رہا ہوں مجھے ایک واقعہ بھی یاد نہیں کہ حضرت نے ان کو برائی سے یاد کیا ہو۔[1]

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

"اکابر دیو بند کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے مخالف مسلک والوں سے بھی بداخلاقی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ نہ ان کی تردید میں دل آزار اسلوب کو پسند کرتے تھے اور نہ طعن آمیز القاب سے یاد کرنا پسند کرتے تھے، بل کہ جہاں تک ہو سکتا بداخلاقی کا جواب خوش خلقی سے دیتے اور مخالفین کی دینی ہمدردی و خیر خواہی کو پیش نظر رکھتے تھے۔"

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خادم خاص حضرت امیر شاہ خان صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولانا نانوتوی صاحب خورجہ تشریف لائے اور وہاں ایک مجلس میں مولوی فضل رسول بدایونی کا تذکرہ چل گیا (چوں کہ وہ مخالف مسلک کے تھے اس لیے) میری زبان سے (طنز کے طور پر) بجائے فضل

[1] "اصلاح دل": ۲۵۱

رسول ''فضل رسول'' نکل گیا، مولانا نے ناخوش ہو کر فرمایا کہ ''لوگ ان کو کیا کہتے ہیں؟''

میں نے کہا: ''فضل رسول'' آپ نے فرمایا: ''تم فضل رسول کیوں کہتے ہو؟'' حضرت تھانوی رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ حضرات تھے جو ﴿لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾[1] کے پورے عامل تھے، حتیٰ کہ مخالفین کے معاملہ میں بھی۔''[2]

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے جب درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو شرک و بدعات کے خلاف خاص طور پر لوگوں کو خبردار فرماتے۔ ان دنوں بعض رسائل میں بھی ان کے مضامین شائع ہوئے۔

ان ہی دنوں ایک مولوی صاحب بدعات کو رواج دے رہے تھے۔ انہوں نے حضرت گنگوہی رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کے خلاف طرح طرح کے الزامات عائد کرنا شروع کیے۔ اشتہارات اور رسائل میں انتہائی بدزبانی اختیار کی۔ یہ رسائل حضرت گنگوہی رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی تک بھی آتے تھے۔ آپ مولانا محمد یحییٰ صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی سے ان کو مکمل سنتے، اس لیے کہ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ خط و کتابت کا تمام کام بھی آپ کے خاص مرید مولانا محمد یحییٰ صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی ہی انجام دیتے تھے۔

ان رسائل میں انتہائی بدزبانی ہوتی تھی۔ ان کا سنانا آسان کام نہیں تھا۔ کچھ دن تک تو سناتے رہے، پھر ہمت جواب دے گئی اور سنانے سے پرہیز شروع کر دیا۔ چند دن جب اس حالت میں گزرے تو حضرت گنگوہی رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے ان سے پوچھا:

''یحییٰ! کیا ہمارے دوست نے ہمیں یاد کرنا چھوڑ دیا، بہت دنوں سے کوئی

[1] الحجرات: ۱۱ [2] ارواح ثلاثہ: ۱۷۰

رسالہ میرے خلاف نہیں آیا؟''

اس پر مولانا نے بتایا: ''حضرت! رسائل تو کئی آئے، لیکن ان میں گالیوں اور بہتانوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، میں نے سوچا سن کر بلاوجہ آپ کی طبیعت پریشان ہوگی اس لیے نہیں سنائے۔''

اللہ کے اس ولی نے جواب میں فرمایا:

''نہیں! ایسا نہ کرو، ضرور سنایا کرو، میں ان سب کو اس نظر سے سنتا ہوں کہ جو باتیں میرے عیب کی وہ کہتے ہیں، ان میں کوئی بات اگر سچی ہو تو میں اپنی اصلاح کر لوں۔''[1]

اللہ اکبر! یہ ہے حق پرستوں کا شیوہ کہ مخالفین بل کہ دشمنوں کی باتیں بھی ان کی دشنام طرازیوں سے قطع نظر اس نیت سے سنی جائیں کہ اگر اس سے اپنی کوئی غلطی معلوم ہو تو اس سے رجوع کر لیا جائے۔

مولانا محمود رام پوری صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فرماتے تھے: ''ایک مرتبہ میں اور ایک ہندو تحصیل دیوبند میں کسی کام کو گئے، میں حضرت شیخ الہند کے ہاں مہمان ہوا اور وہ ہندو بھی اپنے بھائیوں کے گھر کھانا کھا کر میرے پاس آگیا کہ میں بھی یہاں ہی رہوں گا، اس کو ایک چارپائی دے دی گئی۔ جب ہم سب سو گئے تو رات کو میں نے دیکھا کہ مولانا (حضرت شیخ الہند) اٹھے، میں لیٹا رہا اور دیکھتا رہا کہ اگر کوئی مشقت کا کام کریں گے تو میں امداد کروں گا ورنہ خواہ مخواہ اپنے جاگنے کا اظہار کر کے کیوں پریشان کروں۔

میں نے دیکھا کہ مولانا اس ہندو کی طرف بڑھے اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کے پیر دبانے شروع کیے۔ وہ خراٹے لے کر خوب سوتا رہا۔ مولانا محمود صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کہتے ہیں کہ میں اٹھا اور عرض کیا: ''حضرت! آپ تکلیف نہ کریں

[1] ارواح ثلاثہ: ۲۱۱

میں دبا دوں گا۔" مولانا نے فرمایا: "تم جا کر سو، یہ میرا مہمان ہے، میں ہی اس کی خدمت انجام دوں گا۔" مجبوراً میں چپ رہ گیا اور مولانا اس ہندو کے پاؤں دباتے رہے۔"[1]

مولانا احمد حسن صاحب مدرس کانپور نے "ابطال امکان کذب" میں ایک مبسوط رسالہ تحریر کر کے شائع کیا جس میں حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى اور ان کے ہم عقیدہ حضرات کو فرقہ ضالہ مزداریہ میں (جو معتزلہ ہی سے ایک گروہ ہے) داخل کر دیا اور اس پر تقریظ لکھنے والوں نے تو اکابرین کی نسبت زبان درازی کی انتہا کر دی۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى کو یہ رسالہ دیکھ کر طیش تو بہت آیا، لیکن علم وتقویٰ کا مقام بلند ملاحظہ فرمائیے کہ غیظ وغضب کے جذبات کو پی کر ارشاد فرمایا:

"ان گستاخ لوگوں کو برا کہنے سے تو اکابر کا انتقام پورا نہیں لیا جا سکتا اور ان کے اکابر کی نسبت کچھ کہہ کر اگر دل ٹھنڈا کیا جائے تو وہ لوگ معذور بے قصور ہیں۔"[2]

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی اپنی کتاب "اکابر دیوبند کیا تھے" میں لکھتے ہیں کہ مشہور عالم دین بزرگ سے بعض سیاسی مسائل میں حضرت میاں صاحب (حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى) کو شدید اختلاف تھا جس کا اظہار ہمیشہ برملا فرماتے رہے، لیکن اس کے باوجود ان کی شان میں اگر کسی سے کبھی کوئی نامناسب کلمہ نکل بھی جاتا تو بڑی سختی کے ساتھ منع فرماتے۔ اختلاف بھی، "إِخْتِلَافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ" کی تشریح پر تھا۔ اختلاف کی حدود سے سر مو تجاوز ان کی فطرت ہی نہیں تھی۔

ان ہی مختلف الخیال بزرگ نے ایک مرتبہ امساکِ باراں کی شدت دیکھ کر

[1] ارواح ثلاثہ: ۲۸۵
[2] حیات شیخ الہند: ۱۸۳

نمازِ استسقاء پڑھنے کا اعلان کیا۔ میاں صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى کو غالباً کشف کے ذریعہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان ایام میں بارش نہیں ہوگی، لیکن اس کے باوجود والد صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى سے فرمایا: "میاں! بارش تو ہوتی نہیں، البتہ نماز کا ثواب حاصل کرنے کے لیے چلنا ضروری ہے۔"

چناں چہ والد صاحب نے ان کی معیت میں نمازِ استسقاء ادا کی۔ بارش کو نہ ہونا تھا نہ ہوئی۔ ان بزرگ نے دوسرے روز کے لیے بھی نماز کا اعلان فرما دیا تو اس دن بھی وہی پہلے دن والی بات فرما کر نماز ادا کرنے پہنچ گئے اور بغیر بارش ہوئے واپس آ گئے۔ تیسرے روز کے لیے پھر نماز کا اعلان ہوا تو میاں صاحب تیسرے دن بھی نماز کے لیے میدان میں پہنچ گئے اور خود ان بزرگ سے کہا: "اگر آپ اجازت دیں تو آج نماز میں پڑھا دوں۔"

ہر شخص حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ میاں صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى تو کبھی پنج وقتہ نماز لوگوں کے اصرار پر بھی نہیں پڑھاتے، آج انہوں نے خود نماز پڑھانے کی پیشکش کیسے کی؟

بہرکیف نمازِ استسقاء میاں صاحب کی امامت میں شروع ہوئی۔ میاں صاحب کے عقیدت مندوں کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ آج بارش ضرور ہو جائے گی۔ شاید میاں صاحب نے کشف کے ذریعہ معلوم کر کے یہ تبدیلی کی ہوگی، لیکن آج بھی دھوپ اسی شدت کے ساتھ چمکتی رہی اور بادل کا دور دور بھی نام و نشان نہیں تھا۔ مجبور ہو کر پورا مجمع شکستہ دل اور مغموم واپس ہوا۔

والد صاحب نے اس خلافِ عادت عمل پر استفسار کیا: "آپ تو کبھی نماز پنج گانہ میں بھی امامت نہیں فرماتے آج یہ کیا ماجرا تھا؟"

تو فرمایا: "میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ جو عالم دین دو روز سے نماز پڑھا رہے ہیں لوگوں کو ان پر بدگمانی نہ ہو، میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں؛ کیوں

کہ مجھے اندازہ تھا کہ بارش اس وقت ہونا مقدر میں نہیں۔ کسی عالم یا مقدس ہستی و
اس میں کیا قصور ہے۔ اب اگر بدنامی ہوئی ہے تو تنہا ایک عالم کی نہ ہو۔"[1]

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے مواعظ سے امت کو
جو بے مثال نفع پہنچا وہ محتاج بیان نہیں۔ حضرت کے مواعظ کا فیض آج تک جاری
ہے اور جن حضرات نے ان کا مطالعہ کیا ہو وہ جانتے ہیں کہ یہ مواعظ دین کی ہر
ضروریات پر حاوی ہیں اور اصلاح و تربیت کے لیے بے نظیر تاثیر رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ جون پور میں آپ کا ایک وعظ ہونا تھا۔ وہاں بریلوی حضرات کا بڑا
مجمع تھا، آپ کے پاس ایک بے ہودہ خط پہنچا جس میں دو چار باتیں کہی گئی تھیں۔
ایک تو یہ کہ "تم جولاہے ہو"، دوسرے یہ کہ "جاہل ہو"، تیسرے یہ کہ "کافر ہو" اور
چوتھے یہ کہ "سنبھل کر بیان کرنا"۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے وعظ شروع کرنے سے پہلے مجمع سے
خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قسم کا ایک خط میرے پاس آیا ہے، پھر وہ خط سب
کے سامنے پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ "یہ جو لکھا ہے کہ "تم جولاہے ہو" تو اگر میں جولاہا
ہوں بھی تو اس میں حرج ہی کیا ہے میں یہاں کوئی رشتہ ناتا کرنے تو نہیں آیا، احکام
الٰہی سنانے کے لیے حاضر ہوا ہوں سو اس کو قومیت سے کیا علاقہ؟

دوسرے یہ چیز اختیاری بھی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جس کو جس قوم میں چاہا
پیدا فرما دیا، سب قومیں اللہ ہی کی بنی ہوئی ہیں اور سب اچھی ہیں اگر اعمال و اخلاق
اچھے ہوں۔ یہ تو مسئلہ کی تحقیق تھی۔ رہی واقعہ کی تحقیق سو مسئلہ کی تحقیق کے بعد واقعہ
کی تحقیق کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی، لیکن پھر بھی اگر کسی کو تحقیق واقعہ کا شوق ہی ہو
تو میں آپ کو اپنے وطن کے علماء کے نام اور پتے لکھوائے دیتا ہوں ان سے تحقیق کر
لیجیے معلوم ہو جائے گا میں "جولاہا ہوں یا کس قوم کا؟" اور اگر مجھ پر اطمینان ہو تو میں

[1] اکابر دیوبند کیا تھے: ۵۷، ۵۸

مطلع کرتا ہوں کہ میں جولاہا نہیں ہوں۔ رہا "جاہل ہونا" اس کا البتہ میں اقرار کرتا
ہوں کہ میں "جاہل ہوں کہ اجہل ہوں" لیکن جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا ہے اور
کتابوں میں دیکھا ہے اس کو نقل کرتا ہوں، اگر کسی کو کسی بات کے غلط ہونے کا شبہ ہو
اس پر عمل نہ کرے اور "کافر ہونے" کو جو لکھا تو اس میں زیادہ قیل و قال کی حاجت
نہیں، میں آپ صاحبوں کے سامنے پڑھتا ہوں:

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

اگر میں نعوذ باللہ کافر تھا تو لیجیے اب نہیں رہا۔ آخر میں "سنبھل کر بیان
کرنے" کی دھمکی دی گئی ہے، اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ وعظ گوئی کوئی میرا پیشہ
نہیں ہے، جب کوئی بہت اصرار کرتا ہے تو جیسا کچھ مجھے بیان کرنا آتا ہے بیان کر
دیتا ہوں، اگر آپ صاحبان نہ چاہیں گے تو میں ہرگز بیان نہ کروں گا۔ رہا سنبھل کر
بیان کرنا تو اس کے متعلق صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ میری عادت خود ہی
چھیڑ چھاڑ کی نہیں ہے۔ قصداً کبھی کوئی ایسی بات نہیں کرتا، جس میں کسی گروہ کی دل
آزاری ہو یا فساد پیدا ہو، لیکن اگر اصول شرعیہ کی تحقیق کے ضمن میں کسی ایسے مسئلہ کی
ذکر کی ضرورت ہی پیش آ جاتی ہے جس کا رسوم بدعیہ سے تعلق ہے تو پھر میں رکتا بھی
نہیں، اس لیے کہ یہ دین میں صریح خیانت ہے۔

سب باتیں سننے کے بعد اب بیان کے متعلق جو آپ صاحبوں کی رائے ہو اس
سے مطلع کر دیجیے! اگر اس وقت کوئی بات کسی کے خلاف طبع بیان کرنے لگوں تو فوراً
مجھ کو روک دیا جائے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی ادنیٰ شخص بھی مجھے روکے گا تو میں
اپنے بیان کو فوراً منقطع کر دوں گا اور بیٹھ جاؤں گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ وہی صاحب روک
دیں جنھوں نے یہ خط بھیجا ہے، اگر خود کہتے ہوئے انھیں شرم آئے یا ہمت نہ ہو تو
پیچھے سے کسی اور ہی کو سکھا پڑھا دیں ان کی طرف سے وہ مجھے روک دیں۔ یہ سن کر
ایک معقول مولوی صاحب جو بدعتی خیال کے تھے اور جن کا وہاں بہت اثر تھا، کھڑے

کر بولے ''یہ خط لکھنے والا کوئی حرام زادہ ہے، آپ وعظ کہیے! آپ کیسے فاروقی ہیں؟''

حضرت نے فرمایا:

میں ایسی جگہ کا ''فاروقی ہوں'' جہاں کے ''فاروقیوں'' کو یہاں کے لوگ ''جولاہے'' سمجھتے ہیں۔

جب سارا مجمع خط لکھنے والے کو برا بھلا کہنے لگا، خاص طور سے وہ مولوی صاحب فحش فحش گالیاں دینے لگے تو حضرت والا نے روکا کہ گالیاں نہ دیجیے، مسجد کا تو احترام کیجیے۔ پھر حضرت والا کا وعظ ہوا اور بڑے زور شور کا وعظ ہوا، اتفاق سے دورانِ وعظ میں بلاقصد، کسی علمی تحقیق کے ضمن میں کچھ رسوم وبدعات کا ذکر چھڑ گیا پھر تو حضرت والا نے بلاخوف لومۃ لائم خوب ہی رد کیا، لوگوں کو یہ اختیار دے چکے تھے کہ وہ چاہیں تو وعظ روک دیں، لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی۔

وہ معقولی مولوی صاحب شروع شروع میں تو بہت تحسین کرتے رہے اور بار بار سُبْحَانَ اللّٰہ ...... سُبْحَانَ اللّٰہ...... کے نعرے بلند کرتے رہے، کیوں کہ اس وقت تصوف کے رنگ پر بیان ہو رہا تھا، لیکن جب ردِ بدعات پر بیان ہونے لگا تو پھر چپ ہوگئے، مگر بیٹھے سنتے رہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل تھا، کیوں کہ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ایسے کٹر اور سخت ہیں کہ جہاں کسی واعظ نے کوئی بات خلافِ طبع کی انہوں نے وہیں پکڑ کر منبر سے اتار دیا، لیکن اس وقت انہوں نے دم نہیں مارا، چپکے بیٹھے سنتے رہے، لیکن جب وعظ ختم ہوا اور مجمع رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہوگیا تو اس وقت ان مولوی صاحب نے حضرت والا سے کہا کہ ان مسائل کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر ایک دوسرے ذی اثر مولوی صاحب (جو خود بدعتی خیال کے تھے) بڑھے اور جواب دینا چاہا، لیکن حضرت والا نے انہیں روک دیا کہ خطاب مجھ سے ہے آپ جواب نہ دیں مجھے عرض کرنے دیں، پھر حضرت والا نے ان معقولی

مولوی صاحب سے فرمایا کہ آپ نے یہ بات پہلے مجھ سے نہ فرمائی، ورنہ میں احتیاط کرتا، میں نے تو جو بیان کیا ضروری ہی سمجھ کر کیا، مگر اب کیا ہو سکتا ہے اب تو بیان ہو چکا ہے، ہاں ایک صورت اب بھی ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ ابھی تو مجمع موجود ہے آپ پکار کر کہہ دیجیے کہ صاحبو! اس بیان کی کوئی ضرورت نہ تھی، پھر میں آپ کی تکذیب نہ کروں گا اور آپ ہی کی بات اخیر بات رہے گی۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور مولوی صاحب وہاں سے رخصت ہوگئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد سب لوگ ان کو برا بھلا کہنے لگے، جب بہت شور و غل ہوا تو حضرت والا نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ:

''صاحب ایک پردیسی کی وجہ سے آپ مقامی علماء کو ہرگز نہ چھوڑیں، میں آج مچھلی شہر جا رہا ہوں، اب آپ صاحبان یہ کریں اور میں ان صاحب کو بالخصوص خطاب کرتا ہوں کہ جنہوں نے خط بھیجا ہے، وہ میرے بیان کا رد کرا دیں پھر دونوں راہیں سب کے سامنے ہوں گی جو جس کو چاہے اختیار کرے، فساد کی ہرگز ضرورت نہیں۔''

پھر ان دوسرے مولوی صاحب نے جو بدعتی خیال کے ہونے کے باوجود حمایت کے لیے آگے بڑھے تھے، کھڑے ہو کر فرمایا کہ:

''صاحبو آپ جانتے ہیں کہ میں مولودیہ بھی ہوں، قیامیہ بھی ہوں، مگر انصاف اور حق یہ ہے کہ جو تحقیق آج مولوی صاحب نے بیان فرمائی ہے، صحیح وہی ہے۔''[1]

ایک شخص نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کی کسی کتاب کے جواب میں ایک مقالہ لکھا۔ اور اس مقالے میں حضرت شیخ الہند رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ۔ حضرت والا کے ایک مخلص

[1] اشرف السوانح: ۱/ ۶۸ تا ۷۲

معتقد تھے، انہوں نے اس کے جواب میں فارسی میں دو شعر کہے، وہ اشعار ادبی اعتبار سے آج کل کے طنز کے مذاق کے لحاظ سے بہت اعلیٰ درجے کے اشعار تھے وہ اشعار یہ تھے۔

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دروغے را جزا باشد دروغے

ترجمہ: "اگر تم نے مجھے کافر کہا تو مجھے کوئی غم نہیں ہے، کیوں کہ جھوٹ کا چراغ کبھی جلا نہیں کرتا۔ تم نے مجھے کافر کہا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں، اس لیے کہ جھوٹ کا بدلہ جھوٹ ہی ہو سکتا ہے ——— یعنی تم نے مجھے کافر کہہ کر جھوٹ بولا، اس کے جواب میں میں تمہیں مسلمان کہہ کر جھوٹ بول رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ درحقیقت تم مسلمان نہیں ہو۔"

اگر یہ جواب کسی ادیب اور ذوق رکھنے والے شاعر کو سنایا جائے تو وہ اس پر خوب داد دے گا۔ اور اس کو پسند کرے گا۔ اس لیے کہ چبھتا ہوا جواب ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں یہ کہہ دیا کہ میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں؛ لیکن دوسرے مصرعے نے اس بات کو بالکل الٹ دیا۔ یعنی جھوٹ کا بدلہ تو جھوٹ ہی ہوتا ہے تم نے مجھے کافر کہہ کر جھوٹ بولا میں تمہیں مسلمان کہہ کر جھوٹ بولتا ہوں۔

بہر حال یہ اشعار لکھ کر حضرت کے جو معتقد تھے وہ حضرت والا کی خدمت میں لائے، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ اشعار سنے تو فرمایا کہ تم نے اشعار تو بہت غضب کے کہے اور بڑا چبھتا ہوا جواب دے دیا؛ لیکن میاں! تم نے پلیٹ کر اس کو کافر کہہ تو دیا جب کہ ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے کہ دوسروں کو کافر کہیں، چناں چہ وہ اشعار نہیں بھیجے۔

پھر حضرت والا نے خود ان اشعار کی اصلاح فرمائی اور ایک شعر کا اضافہ اس طرح فرمایا:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دہم شکر بجائے تلخ دوغے
اگر تو مومنی فبہا والا
دروغے را جزا باشد دروغے

ترجمہ: "اگر تم نے مجھے کافر کہا ہے تو مجھے اس کا کوئی غم نہیں ہے، اس لیے کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا۔ اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں، اور کڑوی دوا کے مقابلے میں تمہیں شکر کھلاتا ہوں۔ اگر تم مومن ہو تو بہت اچھا ہے، اور اگر نہیں ہو تو پھر جھوٹ کی جزا جھوٹ ہی ہوتی ہے۔"

اب دیکھیے! وہ مخالف جو آپ پر کفر کا فتویٰ لگا رہا ہے، جہنمی ہونے کا فتویٰ لگا رہا ہے، اس کے خلاف بھی طنز کا ایسا فقرہ کہنا بھی پسند نہیں فرمایا جو حد سے نکلا ہوا تھا، اس لیے کہ یہ طنز تو یہاں دنیا میں رہ جائے گا، لیکن جو لفظ زبان سے نکل رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ریکارڈ ہو رہا ہے، قیامت کے روز اس کے بارے میں جواب دینا ہوگا کہ فلاں کے حق میں یہ لفظ کس طرح استعمال کیا تھا؟ لہٰذا طنز کا یہ طریقہ جو حدود سے نکل جائے کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے۔[1]

اکابرین کے یہ چند واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں اس قسم کے واقعات کا احاطہ مقصود نہیں، لیکن مذکورہ چند واقعات اکابرین کے حسن و جمال کی ایک جھلک دکھانے کے لیے امید ہے کافی ہوں گے۔

[1] اصلاحی خطبات: ۱۱۶/۸ تا ۱۱۸

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں:

"مسلک حق کے دین کے پیشواؤں، اماموں پر اعتراض یا ان کی گستاخی کرنا بہت ہی بری چیز ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے: دین کے کام سے محروم کرنے والی چیز دوسروں پر اعتراض کرنا ہے۔ اور علماء کرام، بزرگ اور مسلک حق کے اکابرین کی تذلیل اور گستاخی کرنی ہے۔

اختلاف رائے اگر اہل اللہ اور علماء میں ہو جائے تو مضائقہ نہیں، لیکن بے ادبی یا تذلیل کسی حالت میں جائز نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ بہر حال عالم دین ہے، جس سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں، مگر اس کا مقام و منصب بطور نائب رسول کے ہے، اس کی عظمت واجب ہوگی۔

ہم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی فقہ پر عمل کرتے ہیں، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پچاسیوں مسئلوں میں ان سے اختلاف کرتے ہیں، مگر ادنیٰ درجے کی بے ادبی قلب میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی نہیں آتی اور جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ واجب التعظیم ہیں ویسے ہی امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی۔ دونوں ماہ تاب و آفتاب ہیں، دونوں سے نور اور برکت حاصل ہو رہی ہے، کسی طرح جائز نہیں کہ ادنیٰ درجہ کی گستاخی دل میں آ جائے۔

گستاخی جہالت کی علامت ہے

گستاخی و استہزاء کرنا جہالت کی بھی علامت ہے، حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب قوم کو نصیحت کی اور فرمایا کہ فلاں مقتول زندہ ہو جائے گا اگر بقرہ (گائے) کو ذبح کر کے اس کا گوشت میت سے ملا دیا جائے تو بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ ﴿اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ [1] کیا آپ مذاق کرتے ہیں، اس بات میں کیا تعلق ہے کہ

گوشت کو مردے سے ملا دیا جائے؟

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ [1] "میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں شامل ہو جاؤں" یعنی دل لگی، تمسخر جاہلوں کا کام ہے، علماء کو مناسب نہیں کہ تمسخر کریں، اس لیے کہ یہ ادب کے خلاف ہے، تو ایک ہے رائے کا اختلاف اور کسی عالم سے مسلک کا اختلاف اور ایک ہے بے ادبی، بے ادبی کسی حالت میں جائز نہیں، اختلاف جائز ہے۔" [2]

لہٰذا ہر حال میں نرم خوئی اور خوش اخلاقی اختیار کرنی چاہیے کہ اس سے مخالفین کی عداوت محبت میں تبدیل ہو سکتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً﴾ [3]

ترجمہ: "کیا عجب کہ عن قریب ہی اللہ تعالیٰ تم میں اور تمہارے دشمنوں میں محبت پیدا کر دے۔"

بہر حال دعوۃ الی اللہ کے منصب اور درجۂ امامت پر فائز ہونے والوں کو بہت زیادہ صبر و استقلال اور حسن خلق کی ضرورت ہے۔

ہماری زبان سے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے

ہم اس بات کی کوشش کریں کہ ہماری زبان سے کسی کو تکلیف نہ ہو۔

انسان کی اخلاقی زندگی کے جن پہلوؤں سے اس کے ابنائے جنس کا سب سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے اور جن کے اثرات اور نتائج بھی بہت دور رس ہوتے ہیں ان میں سے اس کی زبان کی شیرینی یا تلخی اور نرمی یا سختی بھی ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ اپنے متبعین و متعلقین کو شیریں گفتاری اور خوش کلامی کی بڑی تاکید فرماتے

[1] البقرۃ: ۶۷ [2] علمائے منبر و محراب: ۱/۱۷۸ [3] الممتحنۃ: ۷

اور بدزبانی اور سخت کلامی سے شدت کے ساتھ منع فرماتے تھے، یہاں تک کہ
بات کے جواب میں بھی بری بات کہنے کو آپ پسند نہیں فرماتے تھے۔

چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ کچھ یہودی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بجائے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ"
کے "اَلسَّامُ عَلَیْكَ" کہا جس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو موت آئے، حضرت عائشہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے (اس کے جواب میں) کہا: "بَلْ عَلَیْکُمُ
السَّامُ وَاللَّعْنَةُ" کہ تم ہی کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب میرا یہ جواب سنا تو) ارشاد فرمایا:

"يَا عَائِشَةُ، إِنَّ اللّٰهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهِ"

اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والے ہیں اور تمام امور میں نرمی کو پسند
فرماتے ہیں میں نے کہا: آپ نے نہیں سنا جو کچھ انہوں نے کہا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے کہا ہے: "وَعَلَيْكُمْ" (یعنی میں نے ان ہی
پر ان کا جملہ لوٹایا ہے)۔[1]

گویا آپ نے ان یہودیوں کی ایسی سخت گستاخی کے جواب میں بھی سختی کو پسند
نہیں فرمایا، اور نرمی ہی کے اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ:

"لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيءِ"[2]

---

[1] بخاری، استتابة المرتدين، باب إذا عرض الذمي أو غيره بسب النبي صلى الله عليه وسلم ...... رقم: ۶۹۲۷

[2] ترمذی، البر والصلة، باب ماجاء في اللعنة، رقم: ۱۹۷۷

ترجمہ: "مومن بندہ نہ زبان سے حملہ کرنے والا ہوتا ہے، نہ لعنت
کرنے والا، نہ بدگو، اور نہ گالی بکنے والا۔"

مطلب یہ ہے کہ مومن کا مقام یہ ہے اور اس کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ اس کی
زبان سے لعن طعن اور گالی گلوچ نہ نکلے، اور ایک روایت میں اختلاف ونزاع کے
وقت گالیاں بکنے کو منافق کی نشانی بتلایا گیا ہے۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

"اے اللہ کے رسول! اعمال میں کون سا عمل زیادہ بہتر ہے" فرمایا: "اَلصَّلٰوةُ
عَلٰى مِيقَاتِهَا" "نماز کو اپنے وقت پر پڑھنا" میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے
رسول اس کے بعد" فرمایا: (اس کے بعد) "أَنْ يَسْلَمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِكَ"
"تمہاری زبان کے شر سے لوگ محفوظ رہیں۔"[2]

طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ ثوبان سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا: "طُوْبٰى لِمَنْ مَلَكَ لِسَانَهُ، وَوَسِعَهُ بَيْتُهُ، وَبَكٰى عَلٰى خَطِيْئَتِهِ"
سعادت مند ہے وہ شخص جس نے اپنی زبان پر قابو پالیا اور اس کا گھر اس کے لیے
وسیع ہوگیا (یعنی وہ شخص بلا ضرورت اپنے گھر سے نہیں نکلتا) اور اپنے گناہوں پر روتا
رہا۔[3]

ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ الصلاۃ والسلام کا گزر راستے میں بیٹھے ہوئے
خنزیر پر سے ہوا، آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے خنزیر سے فرمایا "اِنْفُذْ بِسَلَامٍ" سلامتی
کے ساتھ نکلنے کا راستہ دے، تو آپ سے کہا گیا کہ خنزیر سے اس طرح بات کرتے

---

[1] ماخوذ معارف الحدیث: ۲۳۷/۶

[2] الترغیب والترهیب، البر والصلة، الترغیب فی الصمت ......: ۳۳۵/۳

[3] الترغیب والترهیب، البر والصلة، الترغیب فی العزلة لمن لا یأمن علی نفسه: ۲۹۷/۲

ہیں، حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "إِنِّي أَخَافُ أَنْ أُعَوِّدَ لِسَانِي النُّطْقَ بِالسُّوءِ" "میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اپنی زبان کو بری بات کی عادی بنا لوں۔"[1]

مسلم بطین کہتے ہیں کہ ربیع بن خثیم کے پاس ان کی بیٹی آئی اور کہنے لگی:

"يَا أَبَتَاهُ أَذْهَبُ أَلْعَبُ؟" "ابا جان! وہ مسخرہ، مذاق چلا گیا؟"

ربیع بن خثیم نے فرمایا: "اے میری بیٹی! "اِذْهَبِي فَقُولِي خَيْرًا" جاؤ اور بھلی بات کہا کرو۔"[2]

لہٰذا ائمہ حضرات کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان کو صرف خیر میں استعمال کریں اور جب بھی بات کریں بھلی بات ہی کریں۔ اپنے علماء کی مجلس میں عموماً اور عوام الناس اور مقتدیوں کی مجلس میں خصوصاً کوئی بری بات یا کسی کی غیبت یا خلاف بات ہرگز نہ کریں کہ آپ راہنمائے امت ہیں ورنہ یہی لوگ اس کو جواز کی دلیل بنائیں گے۔

ائمہ کرام کو ہجری تاریخ کا اہتمام کرنا چاہیے

علماء کرام کی جماعت کو چاہیے کہ حتی الامکان اسلامی تاریخ استعمال کریں۔ حتیٰ کہ کوئی پوچھتا ہے آپ کس سال میں فارغ ہوئے تو اسلامی سنہ ہجری کے اعتبار سے بتلائے۔ اسی طرح یومیہ اسلامی تاریخ کا علم ہو کہ آج اسلامی تاریخ کیا ہے؟ مقتدیوں کو بھی یہ سمجھائیں، اور خود بھی اس پر عمل کر لیں کہ اپنی تلاوت کے معمول کو چاند کی تاریخ سے جوڑ دے، کہ پہلی تاریخ کو "الٓمّٓ" سے شروع کرے اور آخری تاریخ پارہ "عَمَّ" پر ختم کرے، یہ تو کم از کم حق ہے قرآن مجید کا۔

کوئی پوچھے آج کیا تاریخ ہے؟ تو جس پارے کی آج تلاوت کی ہے وہ وہ تاریخ

[1] موطا للامام مالك، كتاب الجامع، باب ما يكره من الكلام ص ٧٣١

[2] حلية الأولياء، الطبقة الأولى من التابعين ٢/١٣٥، رقم ١٧١٩

بتلائے۔ اس طرح کم از کم ہر ماہ ایک قرآن مجید کے ختم ہونے کا ثواب بھی حاصل ہوگا اور قرآن مجید کی تلاوت سے جو انوارات حاصل ہوتے ہیں ان سے بھی بندہ محروم نہیں ہوگا اور اسلامی تاریخ کی بھی حفاظت ہوگی۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سورۂ بقرہ کی آیت ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ﴾[1] کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ اپنے روز مرہ کے مکاتبات و مخاطبات میں ہر چند کہ شمسی حساب کرنا شرعاً ناجائز تو نہیں ہے، لیکن غور کرنے سے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بوجہ خلاف ہونے وضع صحابہ و سلف صالحین کے خلاف اولیٰ ضرور ہے۔ نیز چوں کہ مدار احکام شرعیہ کا حساب قمری پر ہے۔ اس لیے اس کا محفوظ و منضبط رکھنا یقیناً فرض علی الکفایہ ہے، اور سہل طریق انضباط کا یہ ہے کہ روز مرہ اسی کا استعمال رکھا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ فرض کفایہ عبادت ہے اور عبادت کی حفاظت کرنا یقیناً ایک درجہ میں عبادت ہے۔ پس حساب قمری کا استعمال اس درجہ میں مطلوب شرعی ٹھہرا۔ پس مسلمان سے بہت بعید ہے کہ ایک جانب ایک امر مطلوب شرعی ہو دوسری جانب دوسرا امر کسی درجہ میں مزاحم اس شرعی کا ہو، پھر مطلوب کو بلا ضرورت اس کے مزاحم کو اختیار کرے، خصوصاً اس طور پر کہ اس مطلوب سے کوئی خاص تعلق اور دلچسپی بھی نہ رہے، اور غیر مطلوب کو رائج قرار دینے لگے۔"[2]

اسلامی تاریخ کی اہمیت

ہر نیا ہجری سال عالم انسانیت کے لیے ایک پیغامِ فکر و عمل لے کر آتا ہے، یہ اپنے ساتھ انسانی زندگی کے اہم انقلاب کی یاد لے کر آتا ہے، جس کا تعلق ہجرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

[1] الآية ١٩٠

[2] بيان القرآن ١/١٠٨، البقرة ١٩٠

نیز ہجرت کے نام سے دین کے لیے قربانی والی سوچ کی بنیاد پڑتی ہے۔ جب کہ ولادت باسعادت پر خوشی کا جذبہ اور وصالِ اقدس ﷺ پر غم کا غلبہ ہو۔ بے شک فطری امور ہیں، مگر ڈر تھا کہ افراط اور تفریط کی وجہ سے ولادت کی خوشی کے نام پر کہیں لہو ولعب میں مشغولی یا وفات کے موضوع سے کہیں عملی سستی اور کم ہمتی طاری نہ ہو جائے۔ اس کے بجائے واقعہ ہجرت سے سال کی ابتدا خود بخود دین کے لیے کچھ کر گزرنے کی سوچ کی بنیاد ڈالتی ہے۔

سالِ ہجری اور ہجرت النبی ﷺ میں عالم انسانیت کے لیے پیغامِ امن و اخوت ہے، حق کی سربلندی اور باطل کی ناکامی کا مژدہ بھی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و رحمت کا یقین اور ناامیدی کی نفی ہے، اس میں پرعزم اور مسلسل جد وجہد کا داعیہ اور عملی تربیت بھی ہے۔

سیرت النبی ﷺ کے اس اہم واقعہ کو ہم خود سمجھیں اور اس کے پیغام کو عام کریں۔ لہٰذا اسلامی تقویم کو ہم خاطر خواہ مقام دیں۔ انگریزی تقویم کا بلا ضرورت شدیدہ استعمال ہمارے لیے باعث عار ہے اور ہجری تقویم باعث افتخار ہے۔ لہٰذا ہجری تقویم کا بھی بچوں کو عادی بنائیں۔

تاکہ ہر سال مسلمان بچوں کو یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے ہمیں بھی ہجرت کرنا ہے اور دنیا کے کونے کونے میں اس دین کی دعوت لے کر پہنچنا ہے، کیوں کہ دنیا میں بسنے والے جتنے انسان ہیں، ان کو صحیح دین کی طرف لانا اور جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کرنا، ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے ہمیں گھر چھوڑ کر راحت و آرام کی قربانی دے کر اللہ تعالیٰ کے راستے میں دور سے دور تک جانا ہوگا جس طرح قرن اول کے مسلمانوں نے مکہ و مدینہ جیسے مقدس مقامات کو چھوڑ کر اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے ہجرت کی۔[1]

---

[1] مثالی استاد: ۲/۲۰۳، ۲۰۳، بیت العلم ٹرسٹ

سالِ ہجری کی ابتدا سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں ہجرت النبی ﷺ کے ۱۶ سال بعد ہوئی۔ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ خلافت ۱۳ تا ۲۳ ہجری رہا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں اسلامی حکومت کی حدود وسیع ہو کر تقریباً ۲۲ لاکھ مربع میل تک پھیل گئیں تو حکم ناموں اور دستاویزات پر تاریخ لکھنے کی حاجت ہوئی۔ لہٰذا ضرورت ہوا کہ تاریخ کی یادداشت کا طریقہ متعین کیا جائے۔ اس غرض سے سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک جماعت بنا دی۔ یہ نہایت اہم اور فیصلہ کن مرحلہ تھا، اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے تحریک آزادی ہند کے ایک راہنما مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ تعالیٰ کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرنا بہت موزوں ہوگا، وہ لکھتے ہیں:

"قومی زندگی کے بنیادی مقومات میں سے ایک نہایت ہی اہم شے زمانہ اور تاریخ ہے، جو قوم اپنا قومی سن نہیں رکھتی وہ گویا اپنی بنیادی اینٹ نہیں رکھتی۔ قوم کا سن اس کی پیدائش اور ظہور کی تاریخ ہوتا ہے، یہ اس کی قومی زندگی کی روایات کو قائم رکھتا ہے۔ ہر طرح کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں، لیکن یہ نہیں مٹ سکتی، کیوں کہ سورج کے طلوع و غروب اور چاند کی غیر متغیر گردش سے اس کا دامن بندھ جاتا ہے اور دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے، یہ ممکن نہ تھا کہ قومی زندگی کا ایک اہم معاملہ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سامنے آتا اور ان کا دماغ فلاں فیصلہ کر لیتا۔

ضروری نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے اس احساس کی کوئی وجہ تعلیل بھی کی ہو۔ تاریخ تعبیر و تعلیل سے نہیں بل کہ فعل صحیح سے پیدا ہوتے ہیں، وہ باوجود غیر قوموں کی بعض طرح کی علمی و تمدنی جائز چیزیں قبول کر لینے کے ساتھ ساتھ ان کا سن بھی قبول کر سکتے تھے، خود بخود ان کا فیصلہ یہی ہوا کہ قومی سن الگ اور ایسا ہونا چاہیے جس کی بنیاد اپنی ہی تاریخ کے کسی واقعے سے ہو۔

انہوں نے اپنے دفتروں کے ایرانیوں اور رومیوں کے حساب و کتاب کے
قواعد تو قبول کر لیے لیکن وہ سن اور تاریخ لینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس لیے کہ سن تو
زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ یہ اینٹ
اور اپنے ہی ہاتھوں سے رکھی جائے۔

انہوں نے ایسا ہی کیا، ان کے سامنے جو تجاویز غیر مسلم معاشرے کے واسطے
سے آئیں، انہیں مسترد کر دیا گیا اور جو تجاویز غیر اسلامی معاشرے سے متعلق تھیں،
غور کرنے کے لیے باقی رکھی گئیں، وہ یہ تھیں کہ مسلمانوں کے سن کا آغاز یا نبی
ولادت نبی اکرم ﷺ یا نزول وحی کی ابتدا، یا ہجرت النبی ﷺ، یا بدر کی
فتح مکہ، حجۃ الوداع کا اجتماع یا وفات النبی ﷺ کے دن سے کی جائے۔"

چناں چہ امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غور و فکر اور مشورے
کے بعد فرمایا: "ہجرت نبی اکرم ﷺ کو ہی اسلامی سن کا آغاز قرار دیا جائے
کیوں کہ اسلامی تاریخ کے لیے یہ سب سے عظیم، اہم اور یادگار عمل واقعہ ہے۔"
حقیقۃً ہجرت کے بعد اسلام کا ایک مرکز قائم ہوا اور دین اسلام دنیا میں پھیلنا شروع
ہوا اور ہدایت کے حقائق ابھرے اور اسلامی معاشرہ عملی طور پر وجود میں آیا۔[1]

حضرت مولانا ابو الکلام آزاد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے "مقالات سیرت"
میں ہجری تاریخ کے بارے میں بہت پیارا مضمون لکھا ہے۔ افادہ عامہ کی غرض سے
اس کے کچھ اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

"جب یہ سوال سامنے آیا کہ اسلامی سن کی ابتدا کس واقعے سے کی جائے تو
انہیں کسی ایسے واقعہ کی جستجو ہوئی جو امت کے قیام و اقبال کا اصلی سرچشمہ ہو۔ آں
حضرت ﷺ کی پیدائش کا واقعہ یقیناً سب سے بڑا واقعہ تھا، لیکن اس کے
میں شخصیت سامنے آتی تھی، شخصیت کا عمل سامنے نہیں آتا تھا۔ بعثت کا واقعہ بھی

[1] خلاصہ اقتباس الفاروق ص ۳۰۶، ۳۰۷

سب سے بڑا واقعہ تھا، لیکن وہ معاملہ کی ابتدا تھی، انتہا و تکمیل نہ تھی۔ بدر کی جنگ اور
مکہ کی فتح عظیم واقعات تھے، لیکن وہ اسلام کی فتح و اقبال کی بنیاد نہ تھے۔ کسی دوسری
بنیاد کے نتائج و ثمرات تھے۔ یہ تمام واقعات ان کے سامنے آئے، لیکن ان میں سے
کسی پر بھی طبیعتیں مطمئن نہ ہو سکیں۔

بالآخر ہجرت کا واقعہ سامنے آگیا تو سب کے دلوں نے قبول کر لیا، کیوں کہ
انہیں یاد آگیا، اسلام کے ظہور و عروج کا مبدأ حقیقی اسی واقعہ میں پوشیدہ ہے اور اس
لیے یہی واقعہ ہے جسے اسلامی تاریخ کا مبدأ بننا چاہیے۔

ابو ہلال عسکری نے "الاوائل" میں اور مقریزی نے "تاریخ" میں حضرت
سعید بن مسیب رحمۃ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ واقعہ ہجرت سے سن شروع
کرنے کی رائے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دی تھی، وہ کہتے ہیں:

"جَمَعَ عُمَرُ النَّاسَ فَسَأَلَهُمْ: "مِنْ أَيِّ يَوْمٍ يُكْتَبُ التَّارِيخُ؟"
فَقَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ -رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ-: "مِنْ
يَوْمِ هَاجَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَتَرَكَ مَكَّةَ" فَفَعَلَهُ عُمَرُ."[1]

ترجمہ: "جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم
سے مشورہ کیا کہ کس دن سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے؟ تو
حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اس دن سے جس دن آں حضرت
ﷺ نے ہجرت کی اور مکہ سے مدینہ آئے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
نے ایسا ہی کیا۔"

یعقوبی نے بھی اسے من جملہ ان امور کے قرار دیا ہے، جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
کی رائے سے انجام پائے۔[2]

[1] کشف ... الاوائل ۲/۲۰۶
[2] مقالات سیرت: باب ۲۹ ہجرت اور سنہ ہجری کا آغاز: ۱۹۹

حضرت عمر اور اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مسلمانوں کا قومی سن قرار دینے کے
لیے قدرتی طور پر جو چیزیں سامنے کی تھیں، وہ اسلام کا ظہور تھا۔ واقعی اسلام کی
پیدائش تھی۔ نزول وحی کی ابتدا تھی۔ بدر کی تاریخی فتح تھی۔ مکہ کا داعیانہ اور [illegible]
داخلہ تھا۔ حجۃ الوداع کا اجتماع تھا جو اسلام کی ظاہری اور معنوی تکمیل و فتح کا آخری
اعلان تھا؛ لیکن ان تمام واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی اختیار نہیں کیا گیا۔ ہجرت
مدینہ کی طرف نظر گئی جو نہ تو کسی پیدائش کا جشن ہے، نہ کسی ظہور کی شوکت، نہ کسی جنگ
کی فتح ہے، نہ کسی غلبہ و تسلط کا شادیانہ، بل کہ اس زمانے کی یاد تازہ کرتا ہے جب
آغاز اسلام کی بے سروسامانیاں اور ناکامیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ داعی اسلام
کے لیے اپنے وطن میں زندگی بسر کرنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ بے چارگی اور مظلومیت
کی انتہا تھی کہ اپنا وطن، اپنا گھر، اپنے عزیز و اقارب، اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر، صرف
ایک رفیق غم گسار کے ساتھ رات کی تاریکی میں وہ سپرد دشت غربت ہوا تھا۔

تاریخ عالم کا یہ عظیم واقعہ جس کی یاد سال کے اس اختتام و آغاز میں پوشیدہ ہے
ہجرت نبوی کا واقعہ ہے، کیوں کہ پہلی محرم سے نیا اسلامی سال شروع ہوتا ہے اور اس
کی بنیاد واقعۂ ہجرت پر رکھی گئی ہے۔ ہر سال جب ۳۰ ذی الحجہ کا دن ختم ہوتا ہے اور
پہلی محرم کا چاند طلوع ہوتا ہے تو وہ اس عظیم واقعے کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ کر دیا
جاتا ہے۔ یہ فی الحقیقت اس واقعے کی ایک جاری و قائم یادگار ہے۔

یہ دنیا کی تمام قوموں کی یادگاروں کی طرح قوت کی کامرانیوں کی یادگار نہیں،
بل کہ کمزوری کی فتح مندیوں کی یادگار ہے، یہ اسباب و وسائل کی فراوانیوں کی یادگار
نہیں، بے سروسامانیوں کی کامیابیوں کی یادگار ہے، یہ طاقت اور حکومت کے جاہ و
جلال کی یادگار نہیں، محکومی و بے چارگی و استقلال کی یادگار ہے، تم نے بدر کی جنگی فتح
اور مکہ کے مسلح داخلہ کی شان و شوکت ہمیشہ یاد رکھی ہے، لیکن تم نے مدینہ کی جانب
ہتھیار فتح فراموش کر دی، حالاں کہ تاریخ اسلام کی ساری آنے والی فتح مندیاں اس

و لیکن فتح میں ایک بیج کی طرح پوشیدہ تھیں۔

تاریخ کا یہ مبدا، دنیا کی تمام تاریخوں اور یادگاروں کے خلاف تھا۔ صرف
خلاف ہی نہ تھا، بل کہ صریح الٹا تھا۔ دنیا کی تمام قومیں فتح و اقبال سے اپنی تاریخ
شروع کرتی ہیں، انہوں نے بے چارگی اور درماندگی سے اپنی تاریخ شروع کی۔ دنیا
کی تمام قوموں نے چاہا اپنے ظہور کی سب سے بڑی فتح یاد رکھیں، انہوں نے چاہا
اپنی تاریخ ظہور کی سب سے بڑی بے سروسامانی یاد رکھیں۔ دنیا کی تمام قوموں کا
فیصلہ یہ ہے کہ ان کی قومی تاریخ اس وقت سے شروع ہو، جب ان کی تاریخ کا سب
سے بڑا انسان پیدا ہوا اور اس نے جنگ و قتال کے میدانوں میں فتح حاصل کی، لیکن
حضرات صحابہ کرام کا فیصلہ یہ تھا کہ قومی تاریخ کی ابتدا اس دن سے ہو جب سب
سے بڑے انسان کی نہیں، بل کہ سب سے بڑے عمل کی پیدائش ہوئی اور جنگ کے
میدانوں میں نہیں، بل کہ صبر و استقامت کے میدانوں میں فتح حاصل ہوئی۔ دنیا کی
تمام قوموں کا یقین یہ تھا کہ ان کی طاقت و شوکت کی بنیاد اس وقت پڑی جب انہوں
نے ملکوں اور سلطنتوں پر قبضہ کر لیا، جب کہ صحابہ کا یقین تھا کہ طاقت و شوکت کا
دروازہ اس دن کھلا، جب ملکوں پر انہوں نے قبضہ نہیں کیا؛ بل کہ اپنا ملک و وطن بھی
ترک کر دیا۔ بلاشبہ ان کی یہ سمجھ دنیا کی ساری قوموں سے الگ تھی؛ لیکن اس سمجھ کے
عین مطابق تھی جو اسلام کی تربیت نے ان کے اندر پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنی اجتماعی
زندگی کی تعمیر، قوموں کی تقلید سے نہیں، بل کہ اسلام کی روح فکر و عمل سے کرنا چاہتے
تھے۔

مصیبت یہ ہے کہ دنیا معنی سے زیادہ لفظ کی، اور روح سے زیادہ جسم کی پرستار
ہے۔ وہ پھل ڈھونڈتی ہے، لیکن تخم کی جستجو نہیں کرتی۔ وہ منارہ و محراب کی بلندیاں
اور خوش نمائیاں دیکھتی ہے، لیکن زیر زمین بنیادوں کے لیے نگاہ نہیں رکھتی۔ صحابہ
کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جب پیدائش و بعثت کے واقعات عظیمہ ترک کر کے ہجرت

کا واقعہ انتخاب کیا تو ان کی نظر بھی پیدائش، ظہور، فتح و اقبال، اور جشن و کامرانی پر تھی۔ وہ چھوٹا کامی کے طلب گار نہ تھے۔ البتہ وہ فتح و اقبال کی صورت اور رنگ و روپ نہیں دیکھتے تھے۔ حقیقت اور تخم و اساس پر نظر رکھتے تھے۔ ان پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ اسلام کی پیدائش و ظہور اور فتح و اقبال کی اصلی بنیاد ان واقعات میں نہیں ہے جو بظاہر نظر آتے ہیں، ہجرت مدینہ اور اس کے اعمال و حقائق میں ہے۔ اس لیے جو اہمیت دنیا کی نگاہیں پیدائش، بعثت، بدر اور فتح مکہ کو دیتی تھیں، وہ ان کی نظروں میں ہجرت مدینہ کو حاصل تھی۔

ہجرتِ مدینہ کی حقیقت

واقعہ ہجرت کیا تھا؟ وہ ایک ہی واقعہ نہ تھا، بے شمار اعمال و وقائع کا مجموعہ تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی حقیقت پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عہدوں میں منقسم ہے۔

ایک عہد مکہ کی زندگی اور اعمال کا ہے۔

دوسرا مدینہ کے قیام اور اعمال کا۔

پہلا عہد تو آں حضرت ﷺ کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا غار حرا کے اعتکاف سے ہوتی ہے اور تکمیل غار ثور پر۔

دوسرا عہد ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر۔

دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور و اقبال کا اصلی دور، دوسرا دور تھا، کیوں کہ اسی دور میں اسلام کی پہلی فتح ہوئی اور ظاہری طاقت و حشمت کا سر و سامان شروع ہوا۔ بدر کی جنگی فتح ہتھیاروں کی پہلی فتح تھی۔ مکہ کی فتح، عرب کی فتح کا اعلان عام تھی، لیکن خود اسلام کی نظروں میں اس کی زندگی کا اصلی دور، دوسرا دور نہیں، پہلا تھا۔

دور رکھتا تھا کہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں دوسرے میں نہیں پہلے دور میں استوار ہوئی ہیں۔ بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا، لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے، ان کی طاقتیں کس میدان میں تیار ہوئی تھیں؟ بلاشبہ مکہ کی فتح، عرب کی فیصلہ کن فتح تھی، لیکن اگر مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کی فتح کی راہ کیونکر کھلتی؟ پس دوسرے دور میں جسم کتنا ہی طاقتور ہو گیا ہو، لیکن اس کی روح پہلے ہی دور میں ڈھونڈنی چاہیے۔

پہلا دور تخم تھا، دوسرا اس کے برگ و بار تھے۔ پہلا دور بنیاد تھی، دوسرا استون و محراب تھا۔ پہلا نشو و نما کا عہد تھا، دوسرا ظہور و ابھار کا۔ پہلا معنی و حقیقت تھا، دوسرا صورت و اظہار۔ پہلا روح تھا، دوسرا جسم۔ پہلے نے پیدا کیا، درست کیا اور مستعد کر دیا، دوسرے نے قدم اٹھایا، آگے بڑھایا اور فتح و تسخیر کا اعلان کر دیا۔ دوسرے کا ظہور کتنا ہی شان دار ہو لیکن اولین بنیاد و استعداد کی عظمت پہلے ہی کو حاصل ہے۔

ظہور اسلام کی تمام فتح مندیوں اور کامرانیوں کا مبدا یہی دور تھا، نہ کہ مدنی زندگی کا دوسرا دور۔ بلاشبہ دنیا کی ظاہر بین نگاہوں میں یہ مصیبتوں کا دور اور بے چارگیوں اور درماندگیوں کا تسلسل تھا، لیکن بباطن امت مسلمہ کی ہر آنے والی فتح مندی انہی مصیبتوں اور کلفتوں کے اندر نشو و نما پا رہی تھی۔ یہی مصیبتیں تھیں جو "جماعت" کے ذہن و اخلاق کے لیے تعلیم و تربیت کا مدرسہ اور تزکیہ نفوس و ارواح کی امتحان گاہ تھیں۔ بدر کے فتح مند انہی کے اندر سبق لے رہے تھے۔ فتح مکہ کے کامران انہی کے اندر بن اور ڈھل رہے تھے۔ انتہا یہی نہیں بلکہ یرموک اور قادسیہ کی پیدائش بھی انہی کی آزمائشوں اور خود فروشیوں میں ہو رہی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس جہاد کو تو صرف جہاد کہا جو مدنی زندگی میں اسلحہ جنگ سے کرنا پڑا تھا، لیکن نفس و اخلاق کے تزکیہ و تربیت کا جو جہاد اس سے پہلے دور میں ہو رہا تھا اسے "جہاد کبیر" سے تعبیر کیا۔ کیوں کہ فی الحقیقت بڑا جہاد یہی

جہاد تھا:

﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾ [1]

ترجمہ: "پس آپ کافروں کا کہنا نہ مانیں اور قرآن کریم کے ذریعے ان سے پوری طاقت سے بڑا جہاد کریں۔"

بالاتفاق سورۂ فرقان مکی ہے۔ مکی زندگی میں جس بڑے جہاد کا حکم دیا گیا ظاہر ہے کہ وہ قتال کا جہاد نہ تھا، صبر واستقامت اور عزم وثبات کا جہاد تھا اور ان ہی اوصاف میں جماعت کی داخلی استعداد کی اصلی بنیادیں تھیں۔

مدینہ کی فتح

پھر یہ حقیقت کس درجہ واضح ہو جاتی ہے۔ جب اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ظہور اسلام کی تمام فتح مندیوں میں سب سے پہلی فتح مدینہ کی فتح تھی اور اس کی تکمیل ہجرت ہی کے واقعہ سے ہوئی تھی۔ مدینہ کے ساتھ "فتح" کا لفظ سن کر تعجب ہوگا، کیوں کہ تم صرف اسی فتح کے شناسا ہو جو جنگ کے میدانوں میں حاصل کی جاتی ہے، لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ میدان جنگ کی فتح سے بڑھ کر دلوں کی آبادیوں اور روحوں کی اقلیموں کی فتح ہے اور اسی فتح سے میدان جنگ کی فتح مندیاں بھی حاصل ہوتی ہیں۔

عین اس وقت جب کہ اسلام کا داعی اپنے وطن اور اہل وطن کی شقاوتوں سے مایوس ہو گیا تھا، باشندگان یثرب کی ایک جماعت پہنچتی ہے اور رات کی تاریکی میں پوشیدہ ہو کر اپنی روح کا ایمان اور دل کی اطاعت پیش کرتی ہے۔ اس وقت دنیوی جاہ وجلال کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ سیف وسنان کی ہیبت وجبروت کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سرتا سر غربت اولی کی بے سروسامانیاں اور عہد مصائب دشمن کی

[1] الفرقان: ۵۲

درماندگیاں ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ یثرب کی پوری آبادی اس کے سامنے جھک جاتی ہے اور ایمان کے ایسے جوش اور عشق واطاعت کی ایسی خود فروشیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے تیار ہو جاتی ہے، جو تاریخ عالم کے کسی بڑے سے بڑے فاتح اور بادشاہ کو بھی میسر نہ آئی ہوگی۔

دلوں اور روحوں کی اس فتح وتسخیر سے بڑھ کر اور کون سی فتح ہو سکتی تھی؟ لیکن یہ فتح کیوں کر ہوئی؟ دور ہجرت کے آلام ومحن میں اس کا آغاز ہوا اور ہجرت نے اس فتح کی تکمیل کر دی۔

واقعہ ہجرت اور فتح ونصرت الٰہی

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے واقعہ ہجرت کا ذکر اس طریقہ پر کیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بے سروسامانی وغربت کے اس عمل ہی میں فتح ونصرت الٰہی کی سب سے بڑی معنویت پوشیدہ تھی۔

﴿ ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [1]

ترجمہ: "غار کے دو ساتھیوں میں سے جب ایک نے دوسرے سے کہا: غم ورنج نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اور اس کی مشیت وحکمت ہمارے لیے فتح ونصرت کی راہ باز کرنے والی ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تسکین وطمانیت اس پر اتار دی اور فتح ونصرت کے ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنہیں دنیا کی ظاہر بین اور حقیقت ناآشنا

[1] التوبۃ: ۴۰

آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان سرکشوں کی بات جو انکار کرتے تھے ہمیشہ کے لیے پست ہوگئی اور کلمۂ حق کو سربلندی اور کامیابی حاصل ہوئی۔"

یہ آیت "سورۂ براۃ" کی ہے۔ "سورۂ براۃ" بالاتفاق اس وقت نازل ہوئی جب اسلام کی ظاہری فتح مندیاں تکمیل تک پہنچ چکی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تمام فتح مندیوں کے بعد بھی اس کی ضرورت باقی تھی کہ واقعۂ ہجرت کی معنوی فتح مندی یاد دلائی جائے۔[1]

اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہوا کہ اسلامی تاریخ کو یاد رکھنا ضروری ہے، اس کے ساتھ انگریزی تاریخ یاد رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، مگر صرف انگریزی تاریخ پر اکتفا نہ کیا جائے کہ اسلامی تاریخ معلوم ہی نہ ہو، چناں چہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ قرآن مجید کی اس آیت ﴿وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا﴾[2] کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

قرآن کریم کے اس ارشاد نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ سالوں اور مہینوں کا حساب شمسی بھی ہوسکتا ہے اور قمری بھی، دونوں ہی اللہ جل شانہ کے انعامات ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ عام ان پڑھ دنیا کی سہولت اور ان کو حساب کتاب کی الجھن سے بچانے کے لیے اسلامی احکام میں قمری سن و سال استعمال کیے گئے اور چوں کہ اسلامی تاریخ اور اسلامی احکام سب کا مدار قمری حساب پر ہے، اس لیے امت پر فرض ہے کہ وہ اس حساب کو قائم اور باقی رکھے، دوسرے حسابات شمسی وغیرہ اگر کسی ضرورت سے اختیار کیے جائیں تو کوئی گناہ نہیں، لیکن قمری حساب کو بالکل نظر انداز اور محو کر دینا گناہ عظیم ہے، جس سے انسان کو یہ بھی خبر نہ رہے کہ رمضان کب آیا۔

[1] خلاصہ از: رسول رحمت: ۲۰۶ تا ۲۱۷ [2] الأنعام: ۹۶

اور ذی الحجہ اور محرم کب؟[1]

دوسری جگہ حضرت مفتی صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں:

اور چوں کہ احکام اسلام میں ہر جگہ ہر موقع پر اس کی رعایت رکھی گئی ہے کہ ان کی ادائیگی ہر شخص کے لیے آسان ہو خواہ وہ کوئی لکھا پڑھا آدمی ہو یا ان پڑھ، شہری ہو یا دیہاتی، اسی لیے عموماً احکام اسلامیہ میں قمری سن اور مہینہ اور تاریخوں کا اعتبار کیا گیا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عدت وغیرہ اسلامی فرائض واحکام میں قمری حساب ہی رکھا گیا ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ شمسی حساب رکھنا یا استعمال کرنا ناجائز ہے بلکہ اس کا اختیار ہے کہ کوئی شخص نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور عدت کے معاملہ میں تو قمری حساب شریعت کے مطابق استعمال کرے مگر اپنے کاروبار، تجارت وغیرہ میں شمسی استعمال کرے، شرط یہ ہے کہ مجموعی طور پر مسلمانوں میں قمری حساب جاری رہے تاکہ رمضان اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے رہیں، ایسا نہ ہو کہ اسے جنوری، فروری وغیرہ کے سوا کوئی مہینے ہی معلوم نہ ہوں، فقہاء نے قمری حساب باقی رکھنے کو مسلمان کے ذمہ فرض کفایہ قرار دیا ہے۔[2]

لہٰذا ائمہ کرام اسلامی تاریخ کو رواج دینے اور اس کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کریں، جمعہ کے وعظ میں اور درس کے موقع پر اس کی اہمیت واضح کریں، تاکہ مسلمان اسلامی تاریخ کو رواج دیں، ورنہ کم از کم خود تو ضرور اس کا اہتمام کریں، تاکہ سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا ہو جائے۔

[1] معارف القرآن: ۳/۴۰۲، ۴۰۳

[2] معارف القرآن: ۴/۵۰۶، ۵۰۷، یونس: ۵

باب دوم

ائمہ کرام کے لیے نصیحتیں

حضرت کنانہ عدوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک خط منقول ہے جو ہم سب کے لیے بہت ہی مفید ہے، ائمہ کرام کو چاہیے کہ اس کو دو رکعت صلوٰۃ الحاجت پڑھ کر دعا کرکے مطالعہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور نفسانی خواہشات کی اتباع سے حفاظت فرمائے، آمین۔

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یہ خط اللہ کے بندے عمر کی طرف سے عبداللہ بن قیس (ابو موسیٰ اشعری) اور ان کے ساتھ جتنے حافظ قرآن ہیں ان سب کے نام ہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ! اَمَّا بَعْدُ!

یہ قرآن تمہارے لیے باعث اجر، سبب شرف و عزت اور (آخرت میں کام آنے والا) ذخیرہ ہے، اس لیے تم اس کے پیچھے چلو (اپنی خواہشات کو قربان کرکے اس پر عمل کرو) قرآن تمہارے پیچھے نہ چلے (یعنی قرآن کو اپنی خواہشات کے تابع نہ بناؤ) کیوں کہ قرآن جس کے پیچھے چلے گا تو قرآن اسے گدی کے بل گرا دے گا۔ پھر اسے آگ میں پھینک دے گا اور جو قرآن کے پیچھے چلے گا قرآن اسے جنت الفردوس میں لے جائے گا۔

تم اس بات کی پوری کوشش کرو کہ قرآن تمہارا سفارشی بنے اور تم سے جھگڑا نہ کرے کیوں کہ قرآن جس کی سفارش کرے گا، وہ آگ میں داخل نہیں ہوگا اور جس ... جان لو کہ قرآن ہدایت کا سرچشمہ اور علم کی رونق ہے اور یہ رحمٰن کے پاس سے آنے

والی سب سے آخری کتاب ہے۔ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اندھی آنکھوں کو، بہرے کانوں کو اور پردے میں پڑے ہوئے دلوں کو کھول دیتے ہیں اور جان لو کہ بندہ جب رات کو کھڑا ہوتا ہے اور مسواک کرکے وضو کرتا ہے پھر تکبیر کہہ کر (نماز میں) قرآن پڑھتا ہے تو فرشتہ اس کے منہ پر اپنا منہ رکھ کر کہتا ہے اور پڑھو اور پڑھو۔ تم خود پاکیزہ ہو اور قرآن تمہارے لیے پاکیزہ ہے، اور اگر وہ وضو کرے لیکن مسواک نہ کرے تو فرشتہ اس کی حفاظت کرتا ہے اور اسی حد تک محدود رہتا ہے اس سے آگے کچھ نہیں کرتا۔

غور سے سنو! نماز کے ساتھ قرآن کا پڑھنا محفوظ خزانہ اور اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ بہترین عمل ہے، لہٰذا جتنا ہو سکے زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھو۔ نماز نور ہے اور زکوٰۃ دلیل ہے اور صبر روشن اور چمک دار عمل ہے اور روزہ ڈھال ہے اور قرآن تمہارے لیے حجت ہوگا یا تمہارے خلاف، لہٰذا قرآن کا اکرام کرو اور اس کی توہین نہ کرو کیوں کہ جو قرآن کا اکرام کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کا اکرام کرے گا اور جو اس کی توہین کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی توہین کرے گا اور جان لو کہ جو قرآن پڑھے گا اور اسے یاد کرے گا اور اس پر عمل کرے گا اور جو اس میں ہے اس کی اتباع کرے گا تو اس کی دعا اللہ کے ہاں قبول ہوگی۔ اگر اللہ چاہے گا تو اس کی دعا دنیا میں پوری کردے گا ورنہ وہ دعا آخرت میں اس کے لیے ذخیرہ ہوگی اور جان لو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ان لوگوں کے لیے بہتر اور ہمیشہ رہنے والا ہے، جو ایمان والے اور اپنے رب پر توکل کرنے والے ہیں۔[1]

حضرت کنانہ رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن کے حافظوں کو جمع کیا۔ ان کی تعداد تقریباً تین سو تھی۔ پھر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن کی عظمت بیان کی، اور فرمایا:

[1] کنز العمال، الاول، الاذکار: ۲/۱۲۴، رقم: ۴۰۲۶

"یہ قرآن تمہارے لیے باعثِ اجر ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے لیے بوجھ اور وبال بن جائے، لہٰذا تم قرآن کا اتباع کرو (اپنی خواہشات کو قربان کرکے اس پر عمل کرو) قرآن کو اپنے تابع نہ کرو کیوں کہ جو قرآن کے تابع ہوگا اسے قرآن جنت کے باغوں میں لے جائے گا اور جو قرآن کو اپنے تابع کرے گا تو قرآن اسے گدی کے بل گرا کر آگ میں پھینک دے گا۔"[1]

مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب کی نصیحتیں

حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہ العالی (استاذ حدیث جامعہ دار العلوم کراچی) نے ایک مرتبہ قرآن کریم اور دینی کتب کے اساتذہ کرام کو انتہائی مفید نصیحتیں کیں، چناں چہ خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا:

"برادران عزیز! ہم اور آپ ایک کشتی میں سوار ہیں اور دین کی خدمت کے لیے اللہ جل شانہٗ نے ہمیں قبول فرمایا ہے، یا یوں کہہ لیجیے کہ ہم نے دین کی خدمت کی لائن کو اپنے لیے منتخب کیا ہے اللہ جل شانہٗ ان تمام خدمات کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازے۔ ہم اور آپ اس دین کی خدمت، اللہ جل شانہٗ کی رضا حاصل کرنے کے لیے انجام دے رہے ہیں۔ اگر ہماری نیتوں میں کچھ کھوٹ ہے تو اللہ جل شانہٗ اس کھوٹ کو دور فرمادیں، اللہ جل شانہٗ ہمیں اخلاص عطا فرمادیں، صدق عطا فرمادیں اور اپنی رضا کے مطابق کام کرنے کی توفیق عطا فرمادیں۔

زندگی کے مختلف شعبے ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنا جائز بھی ہے، کوئی آدمی بڑھئی بن جاتا ہے، کوئی آدمی لوہار بن جاتا ہے، کوئی انجینئر بن جاتا ہے، کوئی زراعت کا پیشہ اختیار کرتا ہے اور کوئی مزدوری کا پیشہ اختیار کرتا ہے۔ یعنی مختلف کام ہیں جو اس دنیا میں کیے جاتے ہیں اور یہ سب کام جائز بھی ہیں، ان کاموں کے ذریعہ بھی آدمی اللہ جل شانہٗ تک پہنچ سکتا ہے۔

[1] حلیة الأولیاء، ذکر الصحابة من المهاجرین: ۱/۳۲۳، رقم: ۸۵۶

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب نور اللہ مرقدہ اور دیگر اکابر علماء دیو بند کے زمانے میں ایک صاحب تھے، غالباً ان کا نام بابا عبد اللہ شاہ تھا اور وہ گھسیارے تھے، گھاس کاٹا کرتے تھے اور گھاس کاٹ کر بازار میں بیچا کرتے تھے، اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ اتنی گھاس کاٹ لیا کرتے جس سے روزانہ ایک آنہ آمدنی ہوجایا کرے اور انہوں نے پھر ایک آنہ کے حصے متعین کیے ہوئے تھے، ایک پیسہ اللہ کے راستے میں خرچ کردیتے تھے، ایک پیسہ جمع کرلیتے تھے اور دو پیسے اپنے اور اپنے گھر والوں پر خرچ کردیتے تھے، اور جو ایک پیسہ جمع کر لیتے تھے جمع کرنے کے بعد جب کچھ رقم جمع ہوجاتی تو بڑے علماء کو کھانے پہ بلا لیا کرتے تھے، سیدھا سادہ کھانا بلکہ سادہ چاول پکا کے ان کو کھلا دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ فرماتے ہیں کہ ہمیں ان کی دعوت کا انتظار لگا رہتا تھا کہ کب وہ ہماری دعوت کریں اور فرماتے تھے کہ جب ہم ان کا کھانا کھالیتے تھے تو چالیس دن تک ہمیں اپنی طبیعت میں اس کا اثر محسوس ہوتا تھا، اللہ جل شانہٗ کی عبادات کی طرف رغبت ہوتی تھی، نیکیوں کی طرف توجہ ہوتی تھی گناہ اور وساوس سے حفاظت رہتی تھی۔

اب بتایئے کہ گھاس بیچ کر پیسے کمائے گئے، اس سے علماء کی دعوت کی گئی مگر مقصد حلال رزق تھا، مقصد اللہ جل شانہٗ کی رضا تھی۔ اس لیے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ جو کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نور اللہ مرقدہ کے بھی استاذ ہیں فرماتے ہیں: اس دعوت میں وہ نور تھا کہ چالیس دن ہمارے اوپر انوار کی ایک عجیب کیفیت رہتی تھی۔

اور اس کے مقابلہ میں یہ بھی فرمایا کہ ایک مرتبہ ہم نے ایک رئیس کی دعوت قبول کرلی اور اس کے ہاں جاکر کھانا کھالیا، رئیس ایسا تھا جس کا پیسہ کچھ مشکوک تھا جس کا بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ اس کا پیسہ صحیح نہیں ہے تو جب ہم نے اس کی دعوت

کھالی اس کے بعد چالیس دن تک ہماری عجیب کیفیت رہی۔ دل یوں چاہتا تھا کہ کوئی عورت مل جائے اس کے ساتھ بدکاری کریں، وہ تو اللہ جل شانہ نے ہماری حفاظت فرمائی کہ نوبت نہیں آئی، ورنہ طبیعت میں اس کا شدید تقاضا پیدا ہو گیا تھا۔

تو بات یہ ہے کہ صدق کے ساتھ آدمی کوئی بھی پیشہ اختیار کرلے چاہے چاہے گھاس کاٹے اور پیسے کمالے اس میں برکت ہوسکتی ہے، آپ کاشت کاری کریں تو بھی برکت والی چیز ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ تاجر سچا ہو، امانت دار ہو تو انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔[1]

آپ حضرات نے تمام پیشوں کو چھوڑ کر صرف ایک ذریعہ اختیار کیا، وہ ہے خدمتِ دین، خدمتِ قرآن کا اور خدمتِ علمِ دین کا ذریعہ۔ اب اس کے ذریعے بھی اللہ جل شانہٗ ہمیں رزقِ حلال عطا فرماتے ہیں، چناں چہ اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ ہم اور آپ کے کچھ تنگی ترشی کے ساتھ ہی سہی مگر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عافیت کے ساتھ اس میں گزارہ کرلیتے ہیں۔

اب پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم دوسرا پیشہ اختیار کرتے جس میں مالی منفعت زیادہ ہو، وہ بھی جائز ہوتا اور پیسے بھی زیادہ ملتے، لیکن ہم نے اس کو چھوڑا اور خدمتِ دین کی طرف آئے۔ کیوں آئے؟

یہ سوچ کر کہ اللہ جل شانہ نے اس کے وہ فضائل رکھے ہیں جو ان پیشوں کے اندر نہیں ہیں، چناں چہ گھاس کاٹنے میں یا زراعت میں یا تجارت میں یا ملازمت یا انجینئر بننے میں یا ترکھان یا لوہار بننے میں وہ فضائل نہیں ہیں جو قرآن مجید کی خدمت کرنے میں ہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ"[2] "تم میں سے بہتر وہ ہے جو

---

[1] ترمذی، البیوع، باب ماجاء فی التجار: ۱/۲۲۹

[2] ابوداود، الصلوٰۃ، باب فی ثواب قراءۃ القرآن: ۱/۲۰۵

قرآن سیکھے اور سکھائے۔"

جب ہم ایک مقصد کے تحت یہاں آئے ہیں تو اس مقصد کا ہمارے ذہنوں میں رہنا ضروری ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مقصد ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے یا پیچھے چلا جاتا ہے۔ جب آپ نے یہ لائن اختیار کی، اس وقت یہ سوچ کر اختیار کی تھی کہ ہم قرآن مجید کی خدمت کریں گے، لیکن کچھ عرصہ بعد آہستہ آہستہ دوسری چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً فلاں کو تنخواہ زیادہ مل رہی ہے مجھے کم مل رہی ہے، فلاں کو محنت کم کرنی پڑتی ہے مجھے محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے، فلاں کو فلاں آرام ہے مجھے فلاں آرام نہیں ہے۔

یعنی جو اصل مقصد تھا قرآن کریم کی خدمت کا وہ آہستہ آہستہ پیچھے چلا جاتا ہے اور دنیا کا منافع اور دنیوی چیزیں سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ خدانخواستہ ایسی کوئی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ہمارا مقصد قرآن کی خدمت نہ رہے بلکہ پیسہ کمانا مقصود ہو جائے، سہولتیں حاصل کرنا مقصود بن جائے، حالاں کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ یہ آپ حضرات کی زندگی کے مقاصد نہیں تھے۔ جب آپ نے خدمتِ دین کی لائن اختیار کی تو یہ مقاصد آپ کے سامنے نہیں تھے۔ محض اللہ کی رضا، اور قرآن کی خدمت کا کام کر رہے ہوں تو اس دین کے کام میں مختلف باتیں پیش آتی ہیں۔ منتظمین کی طرف سے بھی تکلیفیں پیش آتی ہیں اور ساتھیوں کی طرف سے بھی تکلیفیں پیش آتی ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ان باتوں میں اُلجھ کر ان ہی کو سوچتا رہتا ہے اور اپنے اصل مقصد کو بھول جاتا ہے، لہٰذا آپ حضرات سے گزارش یہ ہے کہ اپنے مقصد کو وقتاً فوقتاً تازہ کرتے رہنا چاہیے، جب اس طرح کی باتیں پیش آئیں، ناگواری کے حالات پیش آئیں، تکلیفیں پیش آئیں، سوچیں کہ دیکھو بھئی! ہم دوسری طرف بھی جاسکتے تھے اور اب بھی اگر چاہیں تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں دوسرے کام بھی کر

سکتے ہیں۔ اگر دوسروں کے ہاتھ پاؤں ہیں تو ہمارے بھی ہاتھ پاؤں ہیں اور
محنت کر سکتے ہیں تو ہم بھی محنت کر سکتے ہیں، لیکن ہم جو یہاں لگے ہوئے ہیں
کے چکر میں تھوڑے ہی لگے ہوئے ہیں، ہم تو ایک مقصد لے کر آئے تھے اگر
اللہ جل شانہٗ اس مقصد کو پورا فرما دیں تو پھر زندگی کارآمد ہے۔

تو اس مقصد کا استحضار ہوتا رہنا چاہیے اور چوں کہ میں خود اس میں رہ
ہوں۔ میں آپ سے زیادہ اس لائن میں رہا ہوں اَلْحَمْدُ لِلّٰہ میری عمر گزر گئی
میں تجربے کی بنا پر یہ بات کہہ رہا ہوں کہ جب آدمی یہ کام کرتا ہے اور طرح طرح
کی چیزیں سامنے آتی ہیں تو آدمی آہستہ آہستہ اپنے مقصد کو بھولتا چلا جاتا ہے۔
اس کے پاس تو اتنے لڑکے ہیں، میرے پاس اتنے لڑکے نہیں، اس کو تو یہ دیا
تو یہ نہیں دیا، اسے چائے پلاتا ہے مجھے چائے نہیں پلاتا۔ یہ اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں
جن کی کوئی حیثیت ہماری زندگی میں پہلے نہیں تھی، مقصد میں نہیں تھی، وہ آہستہ
آہستہ دل و دماغ میں سما جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ پڑھا رہے
ہوتے ہیں اس سے ہٹ کر توجہ دوسرے کاموں میں لگ جاتی ہے۔ پھر وہ مقصد
ہمارے سامنے نہیں رہتا، ایسی صورت میں خدانخواستہ ہماری عمر ضائع ہو سکتی ہے
اس میں ہماری دینی محنت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔

اپنے تجربے کی روشنی میں ایک گزارش یہ ہے کہ اپنے مقصد کو ہمیشہ سامنے رکھا
جائے اور اس مقصد کو وقتاً فوقتاً تازہ کیا جائے۔ اور یہ بھی عرض کر دوں کہ آپ کو اس
راستے میں طرح طرح کی تکلیفیں پیش آئیں گی اور ضرور آئیں گی کیوں اس لیے کہ
انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھی تکلیفیں پیش آتی تھیں۔ ہم تقریروں میں لوگوں کو
جتاتے ہیں کہ دیکھو انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو کتنی تکلیفیں پیش آئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم
کے اوپر پتھر برسائے گئے، آپ کو شاعر کہا گیا، آپ کو مجنون کہا گیا، آپ کے دندان
مبارک شہید کیے گئے اور آپ کے سر مبارک سے خون بہا۔

لیکن جب خود ہمارے اوپر یہ تکلیفیں آتی ہیں تو بڑے ناراض ہوتے ہیں کہ
بھئی ہمیں کیوں تکلیف پیش آ رہی ہے، ہم تو اللہ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ تو جب
تکلیفیں پیش آئیں تو اس میں اپنے مقصد کو یاد رکھیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ کر
اپنے عظیم مقاصد کو فراموش نہ کریں۔

رزق کو حلال طیب کیا جائے

دوسری گزارش یہ ہے کہ جب اللہ جل شانہٗ نے ہمارے لیے اس کام کو رزقِ
حلال کا ذریعہ بنایا ہے اور ہم نے دوسرے پیشے اختیار نہیں کیے، یہی پیشہ اختیار کیا
ہے اور اسی کے ذریعے ہمیں رزقِ حلال بھی مل رہا ہے تو ضرورت ہے کہ رزقِ حلال
کو حلال طیب (و پاکیزہ) کیا جائے۔

جیسا کہ میں نے آپ کو ابھی مثال دی اس گھاس کاٹنے والے کی کہ شیخ
الحدیث بھی اس کی دعوت کا انتظار کیا کرتے تھے، کیوں کہ اللہ جل شانہٗ نے ان کے
پیسوں میں برکت رکھی تھی، ان کے پیسے کے اندر انوار تھے۔ تو ہم جو ملازمت کر
رہے ہیں اور جو تنخواہ ہمیں اس ملازمت کی وجہ سے مل رہی ہے اگر ہم اس کو حلال کر
کے کھائیں تو نا معلوم اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمارا کیا مقام ہو۔

مثلاً: میں اپنی مثال دیتا ہوں کہ میرے ذمے جو ڈیوٹی ہے پوری پوری انجام
دوں اور صحیح وقت پر حاضر ہو کر اپنی تنخواہ کو حلال کروں۔ میرے پیسے کے اندر بھی
برکت ہو سکتی ہے، اللہ جل شانہٗ اس پیسے کے اندر انوار پیدا فرما دیں گے۔ اور اگر
خدانخواستہ میں نے اس وقت کو ضائع کر دیا، یہاں بیٹھ کر میں اخبار پڑھتا رہا، اپنے
منصب پر بیٹھ کر مدرسے کا فریضہ انجام دینا چاہیے تھا لیکن میں ذاتی کام کرتا رہا، اس کا
نتیجہ یہ ہوگا کہ میری تنخواہ میں وہ انوار پیدا نہیں ہوں گے جن کا ہونا ضروری تھا۔

آپ حضرات سے گزارش یہ ہے کہ اپنی تنخواہ کو حلال سے حلال تر کرنے کی

کوشش فرمائیں۔ ہماری آپ کی تنخواہ کا حال یہ ہے کہ سات آٹھ گھنٹے مسلسل محنت کریں تب جا کر حلال ہوتی ہے، لیکن کیا کریں دنیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ﴾[1]

ترجمہ: ”ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا۔“

تو اس راہ میں مشقتیں آتی ہیں، ان مشقتوں کو آدمی برداشت کرتا رہے تو اللہ جل شانہ کی طرف سے وعدہ ہے:

﴿إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾[2]

ترجمہ: ”بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔“

پھر اللہ جل شانہ آسانی کے دروازے کھول دیتے ہیں تو تنخواہ حلال کرنے کا بہت ضروری ہے۔ بنیادی بات یہ ہوگی کہ وقتاً فوقتاً اپنے مقصد کو یاد کرتے رہیں کہ ہم اس خدمتِ قرآن کی لائن میں کیوں آئے ہیں......؟

کیا مقصد پیسہ کمانا تھا......؟

کیا ساتھیوں سے لڑنا تھا......؟

کیا مقصد تھا ہماری زندگی میں......؟

ایسا تو نہیں کہ مقصد کے خلاف کچھ باتوں میں الجھ گئے ہوں جو بڑی حقیر باتیں ہیں، چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں اور ہمارے اونچے مقصد کے بہت خلاف ہیں، اگر ایسا ہے تو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو چھوڑ کر اپنے اصلی مقصد کی طرف لوٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ماتحتوں کے ساتھ شفقت

تیسری گزارش یہ ہے کہ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے میں نے خود سنا کہ اللہ جل شانہٗ نے ﴿الرَّحْمَٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ﴾[3] میں رحمٰن

[1] البلد: ۴ [2] الانشراح: ۶ [3] الرحمٰن: ۱

کا لفظ اختیار فرمایا۔ اس میں اشارہ ہے کہ قرآن کریم پڑھانے والے کو بڑا ہی مہربان ہونا چاہیے۔ ”اَللّٰہُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ“ نہیں فرمایا ”اَلْمُنْتَقِمُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ“ نہیں فرمایا بلکہ رحمت کا صیغہ استعمال فرمایا، وہ بھی مبالغہ کا صیغہ استعمال فرمایا کہ بڑا مہربان ہے وہ جس نے قرآن سکھایا، اس میں اشارہ ہے کہ قرآن کریم سکھانے کے لیے بڑی نرمی بڑے تحمل اور بڑی بردباری کی ضرورت ہے، جتنا آپ اپنے طالب علموں کے لیے نرم ہوں گے، جتنا شفقت کا معاملہ ان کے ساتھ کریں گے، اتنی ہی اللہ جل شانہٗ کی رحمت آپ کی طرف متوجہ ہوگی۔

جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”اِرْحَمْ مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكَ مَنْ فِي السَّمَاءِ“[1]

ترجمہ: ”تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا“ (تم اپنے ماتحتوں پر رحم کرو اوپر والا تم پر رحم کرے گا)۔

یہ تیسری گزارش ہوگی کہ اپنے بچوں کے ساتھ، اپنے ماتحتوں کے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آئیں۔ شفقت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اصول کو چھوڑ دیا جائے۔ اصول کی تو پابندی ان سے کروانی ہوگی کہ ”بیٹے! آپ نے فلاں کام لازماً کرنا ہے“ ”بیٹے! فلاں وقت پڑھنا ضروری ہے فلاں وقت یہ پارہ سنانا ضروری ہے۔“ یہ اصولی بات ہے لیکن لہجے میں شفقت اور نرمی ہو اور معاملے میں ان کے ساتھ نرمی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے دل آپ کی طرف کھنچیں گے اور وہ سمجھیں گے یہ ہمارے باپ سے بھی زیادہ مہربان ہیں۔ تو شفقت کی وجہ سے ان کے لیے بھی قرآن مجید کا یاد کرنا آسان ہوگا اور آپ کے لیے بھی پڑھانا آسان ہوگا۔ اللہ جل شانہٗ کی رحمت بھی آپ کی طرف متوجہ ہوگی اور پھر وہ ساری عمر آپ کو یاد کریں گے کہ

[1] مستدرک للحاکم، کتاب التوبۃ والإنابۃ: ۴/۲۷۹، رقم: ۷۷۱۲

بیت العلم ٹرسٹ

ہمارے استاذ نے ہمیں بڑی نرمی اور شفقت کے ساتھ پڑھایا تھا۔

اور جو مارنے والے استاذ ہیں، بہت زیادہ سختی کرنے والے استاذ ہیں، ایک تو وہ عنداللہ بھی گناہ گار ہوتے ہیں۔ اگر آپ کی مار کی وجہ سے بچے کے جسم پر نشان پڑ گئے تو بھی گناہ گار ہوں گے، چہرے پر ماریں گے تو بھی گناہ گار ہوں گے، اس سے بچے کے دل میں نفرت پیدا ہو جائے گی، صرف بچوں کے دل میں ہی نہیں بلکہ بچوں کے ماں باپ کے دل میں بھی نفرت پیدا ہو جائے گی اور بعض مرتبہ وہ لوگ بددعائیں دے دیتے ہیں، خاص طور پر بچے کی ماں ایسی بددعا دے دیتی ہے کہ پڑھانے والے کا ستیا ناس ہو جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے "اتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ" [1] "مظلوم کی بددعا سے بچو۔" [2]

اور یہ بھی یاد رکھو کہ ہمارا کام پڑھانے کی پوری کوشش کرنا ہے، باقی رہا ان کا پڑھ جانا یہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔ ہم ڈنڈا لے کر ان کا سر نہیں پھاڑ سکتے، اس کی اجازت نہیں ہے، ہمیں صرف سمجھانے کا حکم ہے۔ بچوں کو پڑھانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، اگر نہیں پڑھ رہا تو والدین سے کہہ دیا جائے کہ اس کو اور کسی لائن میں لگا دیا جائے۔ لیکن شفقت کو نہ چھوڑو، شفقت کا اختیار کرنا بہت ضروری ہے۔ آپ شفقت کا معاملہ کر کے تو دیکھیے! شفقت کے معاملے میں آدمی کو خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے بڑے خون کے گھونٹ پیے، انبیاء کرام علیہم السلام کو مجنوں کہا جاتا تھا، پتھر برسائے جاتے تھے، طرح طرح کی تکلیفیں آپ کو دی جاتی تھیں۔

حق تعالیٰ جل شانہٗ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ

[1] البخاری، ابواب المظالم والقصاص، باب الاتقاء والحذر من دعوة المظلوم ۳۳۱/۱
[2] ظلم سے بچنے اور بچانے کے لیے بیت العلم ٹرسٹ کی شائع کردہ کتاب "مظلوم کی آہ۔۔۔" کا ضرور مطالعہ کریں اس موضوع پر یہ ایک بہترین کتاب ہے۔

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [1]

"آپ صبر کیجیے جیسا کہ آپ سے پہلے پیغمبروں نے صبر کیا۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں کچھ مال تقسیم فرمایا، انصار میں سے ایک شخص نے کہا: اللہ کی قسم! محمد نے اس تقسیم میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو اس بات کی خبر دے دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا لیکن پھر آپ خاموش ہو گئے اور فرمایا: "اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے ان کو مجھ سے زیادہ تکلیفیں پہنچائی گئیں، لیکن انہوں نے صبر کیا (میں بھی صبر کرتا ہوں)۔" [2]

تو بھئی اس راستے کے اندر خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں، خون کے گھونٹ پی کر بھی شفقت اور رحمت کا معاملہ فرمائیں گے تو میں آپ کو اس بات کا سو فیصد یقین دلاتا ہوں کہ اللہ جل شانہٗ کی بے پناہ رحمتیں آپ پر برسیں گی اور آپ کی دنیا و آخرت ان شاء اللہ سنور جائے گی۔ [3]

مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کی نصیحتیں

حضرت مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ العالی (استاذ حدیث جامعہ فاروقیہ) فرماتے ہیں:

مسجد کا امام، مسجد سے تعلق رکھنے والے عام لوگوں اور اہل محلہ کا دینی پیشوا اور مربی ہوتا ہے۔ اس کی ذمہ داریوں میں صرف نماز پڑھانا ہی نہیں، بل کہ متعلقہ

[1] الاحقاف: ۳۵
[2] البخاری، الادب، باب من اخبر صاحبه بما يقال فيه، رقم ۶۰۵۹
[3] ماخوذ از اساتذہ کرام سے خطاب، ص ۳۷

لوگوں کی دینی تربیت بھی داخل ہے، وہ اگر اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے
اخلاص اور مکمل منصوبہ بندی اور ایک جامع نظام تربیت کے ساتھ اہل محلہ کی
تربیت کا کام شروع کردے تو اس کی محنت سے سارے محلے میں دینی انقلاب آ سکتا
ہے اور لوگوں کی زندگیاں بدل سکتی ہیں۔

❊ ...... اس تربیتی مہم میں جو امور بطور خاص شامل ہونے چاہئیں اور جو امام و
خطیب مسجد کی دینی محنت کو بارآور بنانے میں معاون بن سکتے ہیں، ان میں سب
سے زیادہ اہمیت "سلسلہ دروس" کو حاصل ہے۔ قرآن وحدیث کا درس اپنے اندر
ایک انقلاب آفریں تاثیر رکھتا ہے اور اسی سے اجڑی زندگیوں میں تعمیر کے
تابندہ نقوش ابھر سکتے ہیں۔ ہفتے کے ایام کو درس قرآن، درس حدیث اور فقہی مسائل
میں تقسیم کردیا جائے۔ مثلاً: تین دن درس قرآن، دو دن درس حدیث اور ایک دن
فقہی مسائل کے لیے رکھا جائے ...... اور پورے اہتمام اور تیاری کے ساتھ درس دیا
جائے، عام فہم اسلوب اور لوگوں کے مزاج، ماحول کو سمجھ کر انداز گفتگو اختیار کیا جائے
تو بڑی تیزی کے ساتھ اہل محلہ پر اس کے صالح آثار ظاہر ہونا شروع ہوجائیں گے۔

البتہ اس بات کا خیال رہے کہ درس کا دورانیہ بہت زیادہ طویل ہونے کے
بجائے مختصر ہو اور مقررہ وقت میں درس ختم کرنے کی پابندی کی جائے۔ مختصر وقت میں
مرتب اور منظم گفتگو کی جائے تو اس کا اثر لمبے بیانات سے بسا اوقات زیادہ ہوتا
ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "مَا قَلَّ وَكَفَى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَأَلْهَى"[1]
"کفایت کرنے والی کم گفتگو، مشغول کردینے والی لمبی گفتگو سے بہتر ہے۔"

❊ ...... جمعہ کے اجتماع کو بھی موثر بنانے کی بڑی ضرورت ہے، جمعہ کا اجتماع
مسلمانوں کی تاریخ کا ایک روح پرور اجتماع ہوتا تھا اور اس میں شریک ہوکر لوگوں

[1] صحیح ابن حبان، ذکر الاخبار عما یجب علی المرء من توقع الخلاف ...، الرقم: ۳۳۱۹

کے لیے روحانی غذا مل جایا کرتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ اس سے جان نکلتی رہی اور اب
حالت یہ ہوگئی ہے کہ عموماً امام صاحب خالی مسجد میں لمبی تقریر شروع کردیتے ہیں،
تقریباً سوا گھنٹہ بیان ہوتا ہے، نمازیوں کی اکثریت کو بیان سے کوئی دلچسپی نہیں
ہوتی بلکہ ایک بڑی تعداد تو تقریر ختم ہونے سے پہلے آتی نہیں اور جو لوگ آجاتے
ہیں وہ تقریر ختم ہونے کے منتظر ہوتے ہیں، اس کی بجائے اگر دس پندرہ منٹ موثر
بیان ہو اور اس وقت ہو جب مسجد لوگوں سے بھر جائے تو زیادہ مفید ثابت ہوسکتا ہے،
ہاں ایسے خطباء جنہیں لوگ شوق سے سنتے ہیں، ان کی بات اور ہے۔

❊ ...... محلے کی سطح پر اس تمام دینی محنت کے بارآور ہونے کے لیے ضروری ہے
کہ امام مکمل استغناء کے ساتھ رہے، استغناء ایک ایسا وصف ہے جو دنیاداروں میں
علماء کا مقام بڑھاتا اور احترام لاتا ہے، حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک
صحابی نے آکر پوچھا: "یارسول اللہ! مجھے ایسا عمل بتلائیں جسے اختیار کرنے کے بعد
اللہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔" حضور ﷺ
نے فرمایا: "دنیا میں دلچسپی لینا چھوڑ دیں، اللہ آپ سے محبت کرے گا اور لوگوں
کے پاس موجود مال ودولت میں دلچسپی لینا چھوڑ دیں لوگ تجھ سے محبت کرنے
لگیں گے۔"[1]

بے غرض اور دنیاوی مفادات کی سطح سے بلند ہوکر دین کی جو محنت کی جائے، وہ
بڑی جلد برگ وبار لاتی ہے۔ انبیاء کے اصول دعوت میں قرآن کریم نے جگہ جگہ
﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ﴾[2] ...... کہا ہے، ہر نبی نے دعوت کے ساتھ علی الاعلان
کہا اس دعوت کے ساتھ ان کا کوئی دنیوی بدلہ اور مفاد وابستہ نہیں، یہ صرف اللہ کے
لیے ہے اور وہی اس کا بدلہ دے گا ...... اگر اس دینی محنت میں، محنت کرنے والے
کے دل کا درد ...... اس کے جگر کی تڑپ ...... اور اس کی فکری دھڑکنیں بھی شامل ہوں

[1] ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب الزہد فی الدنیا، الرقم: ۴۱۰۲
[2] یونس: ۷۲

تو مسجد کو اسلامی معاشرے میں اس کا کھویا ہوا مقام اور وہ مرکزیت دوبارہ حاصل ہوسکتی ہے، جہاں سے ہدایت کے چشمے پھوٹتے تھے اور علم وعمل کے دو سپاہی پیدا ہوتے تھے جن کی اذانوں کی گونج سے دنیا کے بت کدے آج تک لرز رہے ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ کی نصیحتیں

مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے علماء کے لیے انتہائی نصیحت آموز اور حکمت وبصیرت سے بھرپور چند باتیں ارشاد فرمائیں، جو ہم یہاں ترتیب وار ذکر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

① فرمایا کہ فتویٰ کا حاصل ذوق اور ملکہ ہوتا ہے، جو مفتی میں ہونا ضروری ہے اور وہ کتنی ہی کتابیں پڑھنے کے باوجود اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک برسہا برس کسی ماہر مفتی کے زیرِ ہدایت فتویٰ لکھنے کا کام نہ کیا ہو۔

② فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب نے ہمیں دورۂ حدیث ہی کے سال میں اس بات کی تاکید فرمائی تھی کہ فارغ التحصیل ہوجانے کے بعد کبھی منتہائے مقصود نہ سمجھنا، فراغت کا حاصل صرف اتنا ہے کہ اس کے بعد انسان میں قوتِ مطالعہ پیدا ہو جس سے علم کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اب یہ فارغ ہونے والے کا کام ہے کہ وہ علم کی چند کلیوں پر قناعت کرنے کے بجائے اس دروازہ میں داخل ہو اور اس قوتِ مطالعہ کو کام میں لاکر علم میں وسعت وگہرائی پیدا کرے۔

③ فرمایا کہ فقہاء کرام نے محقق ابن ہمام اور شاہ ولی اللہ رَحِمَهُمَا اللهُ تَعَالَىٰ جیسے اصحاب اجتہاد کے تفردات کو قبول نہیں کیا تو بعد کے علماء کا معاملہ تو ان کے مقابلے میں بہت اہون (آسان) ہے، چناں چہ اگر کبھی آپ (مفتی اعظم) کا ذہن کسی اکیلی

---

۱ بشکریہ ماہنامہ وفاق المدارس، رجب ۱۴۲۶ھ/اگست ۲۰۰۵ء

رائے کی طرف مائل ہوتا جو معروف نقطۂ نظر سے مختلف ہوتی تو آپ اس تلاش میں رہتے کہ یا تو فقہاء متقدمین میں سے کسی کا قول اس کے موافق مل جائے یا معاصر علماء اس رائے پر مطمئن ہوجائیں اور جب تک یہ نہ ہوتا اس وقت تک آپ عموماً اس رائے کے مطابق فتویٰ نہ دیتے تھے۔

④ فرمایا کہ محض فقہی کتابوں کے جزئیات یاد کرلینے سے انسان فقیہ یا مفتی نہیں بنتا، میں نے ایسے بہت سے حضرات دیکھے ہیں، جنھیں فقہی جزئیات ہی نہیں ان کی عبارتیں بھی ازبر تھیں، لیکن ان میں فتویٰ کی مناسبت نظر نہیں آئی۔ وجہ یہ ہے کہ درحقیقت فقہ کے معنی "سمجھ" کے ہیں اور فقیہ وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمادی ہو اور یہ سمجھ محض وسعتِ مطالعہ یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے پیدا نہیں ہوتی بل کہ اس کے لیے کسی ماہر فقیہ کی صحبت، اور اس سے تربیت لینے کی ضرورت ہے۔

⑤ فرمایا کہ حضرت شیخ الہند رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ فرمایا کرتے تھے: "تقلید شخصی کوئی شرعی حکم نہیں ہے، بل کہ ایک انتظامی فتویٰ ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ چاروں ائمہ مجتہدین برحق ہیں اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لیے وزنی دلائل موجود ہیں، لیکن اگر ہر شخص کو یہ کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جب جس امام کے مسلک کو چاہے اختیار کرلے، تو ہر شخص اپنی آسانی کی خاطر آج ایک مسلک پر عمل کرے گا کل دوسرے مسلک پر اور اس طرح اتباعِ خداوندی کے بجائے اتباعِ نفس کا دروازہ کھل جائے گا۔"

⑥ فرمایا کہ درسِ حدیث میں "روایۃ" اور "درایۃ" کی تفریق عہدِ حاضر کی بدعت ہے، اسلاف میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے کہ بعض ابواب پر بحث کے دوران اجتہاد ومذاہب کی تحقیق کا مظاہرہ کیا جائے اور بعض کو تشریحِ مفہوم کے قابل بھی نہ سمجھا جائے۔ اس کے بجائے درسِ حدیث شروع سال سے اس معتدل انداز پر

ہونا چاہیے کہ تمام ابواب کے تحت ضروری معلومات طالب علم کے سامنے آ جائیں، اور درسِ حدیث کا اصل فائدہ حاصل ہو۔

۷ فرمایا کہ درسِ حدیث میں جو فقہی اختلافات اور ان کے مفصل دلائل بیان کیے جاتے ہیں ان کا مقصد جہاں اپنے مسلک کے دلائل کی وضاحت اور شبہات کا ازالہ ہوتا ہے، وہاں اصل مقصد طالب علم میں تحقیق ونظر کی صلاحیت پیدا کرنا ہے اور اس پر یہ بات واضح ہو جائے کہ حدیث سے مسائل واحکام کا استخراج، متعارض احادیث میں تطبیق اور احادیث میں صحیح وسقم کی تحقیق کن اصولوں کے تحت کی جاتی ہے۔

چناں چہ جب سال بھر تک اس قسم کے مباحث طالب علم کے سامنے آتے رہتے ہیں تو اس سے ایک مزاج پیدا ہو جاتا ہے، جس کے ذریعہ وہ آئندہ اپنی رائے کے مطابق تحقیقی کام کر سکتا ہے۔ لہٰذا ان مباحث کے دوران استاذ کو چاہیے کہ وہ دیکھتا رہے کہ طالب علم میں یہ مزاج پیدا ہوا یا نہیں؟ استاذ کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو یاد رکھنا طالب علم کی کامیابی کے لیے ضروری نہیں، لیکن جن اصولوں کے تحت یہ مباحث ہوتے ہیں ان کا محفوظ ہو جانا ضروری ہے۔

۸ فرمایا کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے: "حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ ہوں یا علامہ عینی رحمۃ اللہ تعالیٰ یہ سب حضرات صدیوں پہلے جنت میں اپنے خیمے گاڑ چکے ہیں، ان کی شان میں کوئی نامناسب بات کہہ کر اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔"

۹ فرمایا کہ ائمہ مجتہدین کا اختلاف تو ہوا ہی اس مقام پر ہے جہاں دلائل کی رو سے دونوں راہوں کی گنجائش موجود تھی، لہٰذا یہ ثابت کرنے کی فکر کہ دوسرا مسلک بلا دلیل ہے، بڑی نادانی کی بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دلائل دونوں طرف کے موجود ہیں، اور کسی ایک مجتہد کی تقلید تو کی ہی اس مقام پر جاتی ہے جہاں دلائل متعارض

ہوں، اس لیے اگر کسی حدیث کے بارے میں یہ مان لیا جائے کہ یہ شافعیہ، حنابلہ یا مالکیہ کے مسلک پر دلالت کرتی ہے تو یہ واقع کے عین مطابق ہوگا، کیوں کہ اگر کسی مسلک پر کوئی دلیل نہ ہوتی تو یہ حضرات اسے اختیار ہی کیوں فرماتے۔

۱۰ فرمایا کہ میں نے ۱۳۴۵ھ میں جو پہلا حج کیا تو وہاں حرم مکہ میں حدیث کے مختلف دروس ہوا کرتے تھے، ان میں شرکت کی تو ان کا طریقہ بہت پسند آیا کہ وہ حدیث میں تاویلات کرنے کے بجائے ایک ہی باب کی مختلف احادیث آئیں تو حدیث کے تحت فرماتے "فِيهِ حُجَّةُ سَادَاتِنَا الْمَالِكِيَّةِ" پھر اس کے مخالف دوسری حدیث آتی ہو تو فرماتے "فِيهِ حُجَّةُ سَادَاتِنَا الْحَنَفِيَّةِ"

۱۱ فرمایا کہ قرآن کریم کی محض تلاوت بھی بلاشبہ بہت موجب اجر ہے، لیکن ایک عالم کو چاہیے کہ وہ کچھ وقت تدبر قرآن کے لیے بھی نکالا کرے۔ قرآن کریم کا کوئی لفظ حشو یا زائد نہیں ہے، لہٰذا اگر غور کیا جائے تو اس کے ہر لفظ سے کسی نئے فائدے کی طرف راہنمائی مل سکتی ہے۔

۱۲ فرمایا کہ باطل فرقوں کی تردید بھی درحقیقت دعوت وتبلیغ ہی کی ایک قسم ہے۔ لہٰذا اس میں بھی حکمت..... موعظہ حسنہ..... اور "مُجَادَلَه بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ" کے..... اصولوں پر عمل ضروری ہے، آج کل دوسروں کی تردید میں طعن وتشنیع،...... طنز وتعریض...... اور فقرے کسنے...... کا جو انداز عام ہو گیا ہے اس سے اپنے ہم خیال لوگوں سے داد تو وصول ہو جاتی ہے لیکن اس سے مخالفین کے دل میں ضد اور عناد پیدا ہو جاتا ہے اور کسی کا ذہن بدلنے میں مدد نہیں ملتی۔

۱۳ فرمایا کہ یوں تو انسان کو اپنے ہر قول وفعل میں محتاط ہونا چاہیے، لیکن خاص طور پر جب دوسروں پر تنقید کا موقع ہو تو ایک ایک لفظ یہ سوچ کر لکھو کہ اسے عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا اور کوئی ایسا دعویٰ جزم کے ساتھ نہ کرو جسے شرعی اصولوں کے مطابق ثابت کرنے کے لیے کافی مواد موجود نہ ہو۔

۱۴ فرمایا کہ اکابر علماء دیوبند کا طریقہ یہی رہا ہے کہ دار العلوم دیوبند سے وابستہ رہنے کی حالت میں انہوں نے عملی سیاست میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا، لیکن جب حضرت شیخ الہند آزادیٔ ہند کے سلسلے میں تحریکاتِ خلافت میں مؤثر حصہ لینے لگے تو دار العلوم دیوبند سے الگ ہوگئے۔

۱۵ فرمایا کہ علامہ شبیر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ایک مرتبہ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا: ”اربابِ اقتدار اس غلط فہمی کو ذہن سے نکال دیں کہ ہم اقتدار چاہتا ہے، میں واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم کبھی اقتدار میں آنا نہیں چاہتے، لیکن اربابِ اقتدار کو تھوڑا سا ملا بنانا ضرور چاہتے ہیں۔“

۱۶ فرمایا کہ اگر صرف علم کسی شخص کی عظمت کے لیے کافی ہوتا تو شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے، اور وہ مستشرقین جو دن رات علمی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں، وہ بھی بہت سے مسلمان اہلِ علم سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ایسے علم کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے جو انسان کو ایمان کی دولت نہ بخش سکے، اسی طرح جو علم انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز نہ ہو وہ بے کار ہے۔

۱۷ فرمایا کہ حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا ارشاد ہے: ”میں نے تحصیلِ علم میں نہ تو محنت زیادہ کی ہے اور نہ بہت سی کتابیں میرے مطالعہ میں رہیں۔ بس اتنا اہتمام کیا کہ اپنے کسی بھی استاذ کو ایک لمحہ کے لیے اپنے آپ سے ناراض نہیں ہونے دیا۔ یہ سب اسی کی برکت ہے کہ اللہ نے دین اور علمِ دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی ہے۔“ اکثر اکبر مرحوم کا یہ شعر پڑھتے:

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
علم ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

۱۸ فرمایا کہ حضرات فقہاء نے ”مَنْ لَّمْ یَعْرِفْ عُرْفَ زَمَانِہٖ فَھُوَ جَاھِلٌ“ یعنی جو اپنے زمانے کے رسم و رواج وغیرہ سے واقف نہ ہو وہ فقیہ نہیں ہوسکتا، وغیرہ

صحیح فرمایا ہے۔

۱۹ طلباء و اساتذہ سے فرمایا کہ آپ کو ملکی سیاست کا علم ہونا ضروری ہے، البتہ جب تک تعلیم میں مصروف ہیں اس وقت تک عملی سیاست میں قطعاً حصہ نہ لیں اور نہ کسی دوسری تنظیم کا رکن بنیں، کیوں کہ اس سے تحصیلِ علم میں خلل واقع ہوگا۔

۲۰ فرمایا کہ قرآنِ عظیم میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ جو طائفہ علمِ دین حاصل کرنے کے لیے مرتفع ہوا ہے اس کا کام یہ ہے کہ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کرے، اور سمجھ بوجھ اس کو کہا جائے گا جب کہ اس علم کے ساتھ عمل بھی ہو، جس علم کے ساتھ عمل نہ ہو، وہ دین کی سمجھ بوجھ نہیں کہلاتی، ایسا علم تو شیطان کو بھی ہے۔

۲۱ فرمایا کہ تم شروع سال ہی سے اپنی نیت کو درست کرلو، اپنی نیت یہ رکھو کہ ہم جو کچھ پڑھ لکھ رہے ہیں اس سے رضائے خداوندی حاصل کرنا ہے اگر اس مقصد کو نظر رکھ کر تم نے تعلیم کی ابتداء کی تو ان شاء اللہ تم کو پڑھنے کا پورا پورا ثواب ملے گا۔ اگر خدانخواستہ یہ علم پڑھنے سے کوئی اور ارادہ ہے مثلاً یہ کہ لوگ تمہاری عزت کریں، تمہیں مفتی صاحب کہیں اور تمہارے ہاتھوں اور قدموں کو بوسہ دیں، اگر یہ نیت ہے تو فوراً توبہ کرو اور اپنی نیت کو فوراً صحیح کرو۔

۲۲ طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ تقریر کرنے کی مشق کیا کریں۔ فرمایا کہ مولویوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کو تقریر کرنی آتی ہو۔ فرمایا کہ ایک اچھا واعظ اور مقرر بننے کے لیے ضروری ہے کہ ہر واعظ قرآنِ حکیم کی اس آیت کو ملحوظ رکھے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾[1]

۲۳ طلبہ سے فرمایا کہ عصر کی نماز کے بعد کھیل وغیرہ ہلکی ورزش کا اہتمام کیا جائے۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو چہل قدمی ہی کی جائے۔ اس سے ان شاء اللہ صحت اچھی

[1] النحل: ۱۲۵

رہے گی اور پڑھائی وغیرہ میں دل لگے گا اور انسان دل جمعی کے ساتھ رات کے وقت مطالعہ کر سکے گا۔ فرمایا کہ چہل قدمی کے لیے بازار یا مارکیٹ یا پارکوں کا اہتمام نہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس میں بہت بڑی خرابی ہے۔ اول یہ کہ بازار وغیرہ وہاں انسان خواہ مخواہ کے گناہوں کا مرتکب ہو جاتا ہے اور بازاروں اور پارکوں وغیرہ سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اہل علم کو ایسے مقامات پر خواہ مخواہ جانا مناسب نہیں۔ ہاں بقدرِ ضرورت اگر کسی کام سے جائے تو چاہیے کہ فوراً لوٹ آئے۔

۲۴ فرمایا عزیزو! ایک عرصہ سے مدارس عربیہ کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔ سب سے پہلے مدارس میں روحانیت کی کمی واقع ہونی شروع ہوئی مگر تعلیمی استعداد پھر بھی اچھی تھی، مگر اب یہ افتاد آگئی ہے کہ عادات واعمال کے ساتھ ساتھ تعلیمی استعداد بھی گرتی جا رہی ہے اور اب مدارس بالکل بانجھ ہو گئے ہیں کہ اب بہت ہی کم اللہ والے علماء فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔

۲۵ فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا علم ہمیشہ باقی اور تازہ رہے اور اس میں دن رات اضافہ ہو تو تم کو چاہیے کہ اپنے اندر عمل پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ فرمایا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی پیر کامل اور شیخ کی صحبت اختیار کی جائے اور اس سے اپنی اصلاح باطن کروائیں۔

۲۶ فرمایا کہ جہل کا اعتراف بھی علم کا ایک حصہ ہے۔ اور پھر امام مالک رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کا مقولہ سنایا کہ وہ فرمایا کرتے:

"عَلِّمُوْا أَصْحَابَكُمْ قَوْلَ "لَا أَدْرِيْ"" "اپنے ساتھیوں کو "لا ادری (میں نہیں جانتا)" کہنا بھی سکھا دیا[1]

۲۷ فرمایا کہ دینی خدمت کے میرے سامنے اور بھی طریقے اور راستے تھے، لیکن میں نے فتویٰ کی خدمت کو اپنا مقصد زندگی سوچ سمجھ کر بنایا، اس لیے کہ اس کا نفع اللہ

[1] ماخذہ حلیۃ الأولیاء، ذکر تابعی التابعین: ۶/ ۳۵۳، رقم: ۸۸۹۸

ہے اور دوسرے طریقوں میں ایسا نہیں۔ فرمایا کہ اگر کوئی شخص صرف تصنیف و تالیف کو اپنا مقصد زندگی بنالے اور کتابیں لکھا کرے تو اس کا نفع مصنف کو اسی وقت حاصل ہوگا جب کوئی اس کی کتاب کو پڑھے گا اور اس پر عمل کرے گا اور معلوم نہیں کہ ایسا ہوگا بھی یا نہیں۔

۲۸ فرمایا کہ مفتی کو ہمیشہ اس امر کا خصوصی طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے فتویٰ سے کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو جائے۔ نہایت سوچ سمجھ کر لکھنا چاہیے۔ کتب کی طرف مراجعت کے ساتھ ساتھ موقع اور محل کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ فقہاء نے فرمایا ہے:

"مَنْ لَّمْ یَعْرِفْ أَھْلَ زَمَانِهٖ فَھُوَ جَاھِلٌ"

۲۹ فرمایا کہ مفتی کو چاہیے کہ جن مسائل کا تعلق اپنی ذات سے ہو ان مسائل میں دوسرے علماء سے استفسار کرے، اپنے نفس پر اعتماد نہ کرے۔ کیوں کہ نفس کے کید مخفی کا اندیشہ ہے۔

۳۰ فرمایا کہ میری زیادہ تر یہ خواہش رہتی ہے کہ مدرسہ میں چند اللہ والے جمع ہو جائیں، اگرچہ زیادہ محقق نہ ہوں۔ جس مدرس کا مقصود تنخواہ لینا ہو اس کو حضرت (مفتی اعظم) رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اپنی اصطلاح میں پیشہ ور مولوی فرمایا کرتے تھے۔

۳۱ ایک مرتبہ فرمایا کہ بعض مدرسین مدرسہ سے تنخواہ تو پوری وصول کر لیتے ہیں، مگر مدرسہ کی طرف سے جو کام ان کے ذمہ ہوتا ہے اس کو پورا نہیں کرتے۔ کبھی سبق میں دیر سے پہنچتے ہیں، کبھی بلاوجہ سبق کا ناغہ کر دیتے ہیں، کبھی سبق میں بے ضرورت اور بے فائدہ باتیں کرتے ہیں جس سے سبق کی کمیت اور کیفیت کا نقصان ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں امانت و دیانت کے خلاف ہیں، خیانت اور تطفیف میں داخل ہیں۔

۳۲ فرمایا کہ مدرسہ کی ضروریات کی اہل خیر کو عمومی اطلاع دے دی جایا کرے یا ان مخصوص حضرات کو اطلاع کر دی جائے جو ایسے مواقع خیر کے منتظر رہتے ہیں، مگر چندہ کرنے کا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے اہل علم کی بے وقعتی ہو۔

۶۳ فرمایا کہ میرے خیال میں مولوی وہ ہے جس میں اس قدر استعداد ہو کہ ... چاروں جلدوں میں جو جگہ اس کو بتلائی جائے اس کو حل کرکے سمجھا اور پڑھا سکے۔

۶۴ فرمایا کہ بقسم کہتا ہوں کہ میں نے ایک عالم بھی ایسا نہیں دیکھا کہ جس نے اللہ کے لیے پڑھا اور پڑھایا ہو اور اللہ نے اس کو عزت و راحت کی زندگی عطا نہ کی ہو، اگر عالم ہو اور رسوا ہوا تو اپنی بدعملی سے ہوا۔

۶۵ فرمایا کہ طلبہ کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے۔ اور اس دور میں کاہل پسندی اور کاہلی سے کام لے کر اپنی عمر کے قیمتی حصے کو برباد کر دیتے ہیں۔ یاد رکھو ایک ایک لمحہ آپ کا قیمتی ہے، اس کو یوں ہی نہ گزارو۔

۶۶ فرمایا کہ جو استاذ کسی مدرسے میں پڑھا رہا ہے، اسے وہاں پڑھانے کے دوران اپنے مدرسے میں آنے کی دعوت دینا اصول کے خلاف ہے۔ اول تو اس میں "سَوْمٌ عَلٰی سَوْمِ أَخِیْهِ" کا گناہ ہے۔ دوسرے ایک مدرسے کو اجاڑ کر دوسرا مدرسہ آباد کرنا دین کی کوئی خدمت نہیں۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ کوئی صاحب اس مدرسے سے الگ ہو گئے ہیں یا الگ ہونے کا ارادہ ہے تو ان سے زیادہ سے زیادہ جو بات (حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ) فرماتے وہ یہ تھی کہ اگر آپ اس مدرسے کو خود چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو دار العلوم حاضر ہے۔

۶۷ فرمایا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی وصیت کے مطابق جب تک دینی مدارس توکل، استغناء اور للہیت پر کاربند رہیں گے، ان کا کام ان شاء اللہ بابرکت ہوگا اور اہل علم سے دنیا کو فائدہ پہنچے گا؛ لیکن جب اہل علم بھی توکل، استغناء سے محروم ہو جائیں اور اہل ثروت کی ثروت پر ان کی نگاہ جانے لگے تو ان کی تعلیم و تبلیغ بھی انوار و برکات سے خالی ہو جائے گی۔

۶۸ حضرت والا (حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ) نے تمام متعلقین کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ ہم نے دار العلوم کی شکل میں کوئی دکان نہیں کھولی، بل کہ خدمت

دین کا ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ جب تک آپ حضرات اس ادارے کو صحیح اصولوں پر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق چلا سکیں چلائیں۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آجائے کہ اسے صحیح اصولوں پر چلانا ممکن نہ رہے تو میرے نزدیک اسے بند کر دینا بہتر ہے، بنسبت اس کے کہ اس کو غلط اصولوں پر چلایا جائے۔

۶۹ فلسفہ اور عقلیات کی حقیقت اور اس کے "پائے چوبیں" کی ناپائیداری حضرت والا (مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ) پر روز روشن کی طرح واضح تھی؛ لیکن جب کبھی آپ کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی کہ معقولات کو درس نظامی سے نکال دیا جائے تو حضرت والا اس کی سخت مخالفت فرماتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور عقائد پر لکھی ہوئی متقدمین کی کتابیں معقولات کی اصطلاحات سے بھری ہوئی ہیں۔ اور اگر قدیم منطق وفلسفہ کو بالکل درس نظامی سے نکال دیا جائے تو اسلاف کی ان کتابوں سے خاطر خواہ استفادے کی راہ مسدود ہو جاتی ہے جو ہمارا گراں قدر علمی سرمایہ ہے۔ اس کے علاوہ منطق وفلسفہ کی تعلیم سے ذہن و فکر کو جلا ملتی ہے۔ اور ذہن مسائل کو مرتب طریقے سے سوچنے کا عادی بن جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کے مسائل کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان علوم کی اصل حقیقت کو ذہن نشین کرکے کوئی شخص اس نیت سے ان علوم کو پڑھے پڑھائے کہ ان سے دینی علوم کی تحصیل میں مدد ملے گی تو ان علوم کی تحصیل بھی عبادت بن جائے گی۔ اور درس نظامی کے مرتبین نے اسی وجہ سے ان کو داخل درس کیا تھا۔

اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ اگر نیت بخیر ہو تو میرے نزدیک بخاری پڑھانے والے اور قطبی پڑھانے والے میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اور دونوں کی خدمت موجب اجر وثواب ہے۔

۲۰ فرمایا مدرس لمبی چوڑی تقریر کر کے سمجھتا ہے کہ میں نے سبق کا حق ادا کر دیا، کتاب سمجھا دی اور میرا حق ادا ہو گیا اور اسی طرح طالب علم سمجھتے ہیں کہ اب ہم امتحان میں پاس ہو جائیں گے، یا مدرس بن جائیں گے، یہ کافی نہیں ہے۔ زیادہ ضروری امر ہے کہ مدرس اور طالب علم جو کچھ پڑھتے پڑھاتے جائیں ان پر عمل بھی کرتے جائیں۔ اگر عمل کر لیا تو واقعی کتاب کا حق ادا کر لیا۔ اس لیے عمل کرنے اور کروانے کی نیت سے پڑھنا پڑھانا چاہیے۔

۲۱ ایک مرتبہ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: میں اپنی اسی (۸۰) سالہ زندگی کا نچوڑ اور حاصل آپ کو بتلاتا ہوں اس کو توجہ سے سنو! یہ خلاصہ ساری دنیا دیکھ کر، دنیاداروں اور دین داروں کا تجربہ کر کے اور زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ دیکھ کر بیان کر رہا ہوں۔ "وہ یہ ہے کہ آپ جس کام میں لگے ہیں (یعنی تعلیم و تعلم) اگر بے غرضی کے ساتھ محض حق تعالیٰ شانہ کی رضا کے لیے ہے تب تو یہ ایسا عظیم الشان کام ہے کہ دنیا کا کوئی کام اس کے برابر نہیں، یہ سب سے بہتر اور افضل ہے۔ اور اگر خدانخواستہ مقصود اس سے رضائے الٰہی نہیں دنیا کمانا پیش نظر ہے جیسا کہ آج کل یہ کام صرف ایک پیشہ بن کر رہ گیا ہے تو میرے عزیزو! پھر دنیا میں اس سے بدتر کوئی کام نہیں۔" (العیاذ باللہ)

۲۲ فرمایا کہ میں مدرسین میں محققین تلاش نہیں کرتا، جو شخص کتاب اچھی طرح سمجھا دے اسی سے کام چلا لیتا ہوں، آدمی مدرس ہو، منتظم ہو، صالح ہو۔ مفسد نہ ہو، بس یہ کافی ہے، اگر محقق ہو اور مفسد ہو تو مدرسہ اور طلبہ کا علم و عمل سب تباہ ہو جائے گا۔

۲۳ فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کا وہ زمانہ تھا کہ مہتمم سے لے کر دربان اور چپڑاسی تک ہر شخص صاحب نسبت تھا۔

۲۴ ختم بخاری شریف پر فرمایا: آج ہمیں اپنے پورے سال کی محنت کا نتیجہ دیکھنا ہے اور سال بھر جو پڑھی ہے اس کے بارے میں غور کرنا ہے کہ حاصل کیا ہوا۔ اور اس

موقع پر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد "جعجعة ولا طحين" نقل فرمایا کرتے تھے، یعنی چکی تو چلائی اب یہ دیکھو کہ آٹا بھی ہے یا نہیں۔ فرماتے تھے کہ سال بھر کی محنت سے چند آدمی تیار ہوتے ہیں، لیکن ان کو جو سند دی جاتی ہے اس کی دنیا میں دو پیسے کی بھی قیمت نہیں۔ اس کے علاوہ کالج و یونیورسٹی میں کوئی ملازمت نہیں مل سکتی اور درحقیقت ہمارے مدرسوں سے فارغ ہونے والوں کو چاہیے بھی یہی کہ مدرسوں ہی میں زندگیاں گزار دیں دوسری طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ اللہ کے یہاں علوم قرآن و حدیث کی قدر ہے، بس ہمیں وہی چاہیے۔ اس دنیا کی ملازمت کی ہمیں ضرورت ہی کیا۔[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝﴾[2]

ترجمہ: "تاکہ یہ لوگ اپنی قوم کو جب کہ وہ ان کے پاس آئیں، ڈرائیں تاکہ وہ ڈر جائیں۔"

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"یہاں بھی یہ بات قابل نظر ہے کہ اس جملہ میں عالم کا فرض انذار قوم بتلایا ہے۔"

"انذار" کا لفظی ترجمہ ہم اردو میں "ڈرانے" سے کرتے ہیں، مگر یہ اس کا پورا ترجمہ نہیں اردو زبان کی تنگی کی وجہ سے کوئی ایک لفظ اس کے پورے ترجمہ کو ادا نہیں کرتا، حقیقت یہ ہے کہ ڈرانا کئی طرح کا ہوتا ہے، ایک ڈرانا دشمن، چور ڈاکو، یا کسی درندے زہریلے جانور سے ہے، ایک ڈرانا وہ ہے جو باپ اپنی شفقت سے اولاد کو تکلیف دہ چیزوں جیسے آگ، زہریلے جانور، مضر غذا سے ڈراتا ہے، جس کا منشاء

[1] مجالس مفتی اعظم: ٦٢٢ تا ٩٣٣

[2] التوبة: ١٢٢

شفقت و محبت ہوتی ہے، اس کا لب ولہجہ بھی کچھ اور ہوتا ہے، انذار اسی طرح ڈرانے کا نام ہے، اسی لیے پیغمبروں اور رسولوں کو "نذیر" کا لقب دیا گیا ہے اور علماء کا یہ فریضہ انذار درحقیقت وراثتِ نبوت ہی کا جز ہے جو بنص حدیث عالم کو حاصل ہوتی ہے۔

مگر یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دو لقب ہیں "بشیر" اور "نذیر" نذیر کے معنی تو ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں، بشیر کے معنی ہیں بشارت اور خوش خبری سنانے والا، انبیاء علیہم السلام کا ایک کام یہ بھی ہے کہ نیک عمل کرنے والوں کو بشارت سنائیں، اس جگہ بھی اگرچہ صراحۃً ذکر انذار کا کیا گیا ہے، مگر دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کا فرض یہ بھی ہے کہ نیک کام کرنے والوں کو بشارت بھی سنائے، لیکن اس جگہ صرف انذار کے ذکر پر اکتفا کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے ذمے دو کام ہیں۔

ایک یہ کہ جو عمل اس کے لیے دنیا و آخرت میں مفید ہیں ان کو اختیار کرے۔ دوسرا یہ کہ جو عمل اس کے لیے مضر ہیں ان سے بچے، باتفاق علماء و عقلاء ان دونوں کاموں میں سے دوسرا کام سب سے مقدم اور اہم ہے، اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں "جلبِ منفعت" اور "دفعِ مضرت" کے دو لفظوں سے تعبیر کر کے دفعِ مضرت کو جلبِ منفعت سے مقدم قرار دیا ہے، اس کے علاوہ دفعِ مضرت میں ایک حیثیت سے جلبِ منفعت کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے، کیوں کہ جو کام انسان کے لیے مفید اور ضروری ہیں ان کا ترک بڑی مضرت ہے تو جو شخص مضرت اعمال سے بچنے کا اہتمام کرے گا وہ اعمال ضروریہ کے ترک سے بچنے کا بھی اہتمام کرے گا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل جو عموماً وعظ و تبلیغ بہت کم موثر ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں انذار کے آداب نہیں ہوتے جس کے طرزِ بیان اور لب ولہجے سے شفقت و رحمت اور خیر خواہی مترشح ہو۔

مخاطب کو یقین ہو کہ اس کے کلام کا مقصد نہ مجھے رسوا کرنا ہے..... نہ بدنام کرنا نہ اپنے دل کا غبار نکالنا..... بلکہ یہ جس چیز کو میرے لیے مفید اور ضروری سمجھتا ہے وہ محبت کی وجہ سے مجھے بتلا رہا ہے۔ اگر آج ہماری تبلیغ اور خلافِ شرع امور کے مرتکب لوگوں کو اصلاح کی دعوت کا یہ طرز ہو جائے تو اس کا ایک نتیجہ تو قطعاً لازم ہی ہے کہ مخاطب کو ہماری گفتگو سے ضد پیدا نہیں ہوگی، وہ جواب دہی کی فکر میں پڑنے کے بجائے اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور انجام سوچنے کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کبھی نہ کبھی اس کو قبول بھی کرے گا۔

اور دوسرا نتیجہ یہ لازمی ہے کہ کم از کم باہمی منافرت اور لڑائی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا، جس میں آج کل ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

آخر میں ﴿لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عالم کا کام اتنا ہی نہیں کہ عذاب سے ڈرا دیا بلکہ اس پر نظر رکھنا بھی ہے کہ اس کی تبلیغ و دعوت کا اثر کتنا اور کیا ہوا، ایک دفعہ موثر نہیں ہوئی تو بار بار کرتا رہے، تاکہ اس کا نتیجہ ﴿يَحْذَرُونَ﴾ برآمد ہو سکے یعنی قوم کا گناہوں سے بچنا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم[1]

مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی نصیحتیں

حضرات علماء کرام اپنے اپنے حلقے میں دین کے پیشوا اور قوم کے مقتدا ہیں، ان کے اس رفیع منصب کے لحاظ سے ان پر بڑی گراں قدر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اس لیے ہم سب کا فرض ہے کہ ان عظیم الشان ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کریں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی تدابیر کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو امانت ہمارے سپرد کی گئی ہے، اس کے لیے ہم فکر مند ہوں اور امت کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلانے کی ہر ممکن کوشش

[1] معارف القرآن: ۴/۴۹۱، ۴۹۲

کریں۔

❶ ...... جو حضرات امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، انھیں اس بات کی حرص ہونی چاہیے کہ ان کے وجود سے علاقے کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دینی نفع پہنچے اور لوگوں کا تعلق مساجد کے ساتھ قائم ہو، اس کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کی جائیں:

(الف) ...... قرآن کریم، حدیث نبوی اور مسائل فقہیہ کا درس باقاعدگی اور اہتمام سے دیا جائے اور ان کے لیے مناسب وقت تجویز کیا جائے۔

(ب) ...... جن مساجد میں قرآن کریم کے مکاتب نہیں، وہاں مکاتب قائم کیے جائیں اور جہاں مکاتب قائم ہیں، ان کی نگرانی کی جائے، ان کو فعال بنایا جائے اور ترغیب دے کر بچوں کو وہاں لایا جائے، تاکہ محلے کا ایک بھی بچہ ایسا نہ رہے جو ناظرہ قرآن کریم پڑھنے سے محروم ہو، اسی طرح لوگوں کو قرآن کریم حفظ کرانے کی ترغیب دلائی جائے۔

(ج) ...... تعلیم بالغاں کا بھی اہتمام کیا جائے اور لوگوں کو قرآن مجید پڑھنے کا شوق دلایا جائے، نیز اس مقدس کام کے لیے خود وقت دیا جائے۔

(د) ...... نوجوان طبقہ کو دین سے مانوس کرنے کی سعی کی جائے اور ان کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے بھی وقت دیا جائے۔

(ہ) ...... جمعہ کے خطبات "کَیْفَ مَا اتَّفَقَ" نہ ہوں، بل کہ ان کے لیے اہم دینی موضوعات کو ایک خاص ترتیب سے منتخب کیا جائے اور جس موضوع پر خطاب کرنا ہو اس کے لیے پوری تیاری کی جائے، نیز موثر انداز میں موضوع کا حق ادا کیا جائے۔ خطبات میں ترغیبی پہلو کو غالب رکھا جائے اور بات ایسے نپے تلے انداز میں کی جائے جس سے نہ صرف بات ذہن نشین ہو جائے، بل کہ سامعین کی فکری وعملی اصلاح بھی ہو۔

(و) ...... جن مساجد میں تبلیغی جماعت کے حلقے قائم ہیں، ان سے ربط وتعلق رکھا جائے، ان کی بھرپور اعانت وسرپرستی کی جائے اور نوجوانوں کو ترغیب دے کر تبلیغی جماعت سے وابستہ کرنے کی ہر ممکن سعی کی جائے۔[1]

(ز) ...... خطبات کے دوران نیز نجی محفلوں میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بزرگان دین خصوصاً اپنے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات وواقعات اور ملفوظات وارشادات بیان کرنے کا اہتمام کیا جائے، (مستند) حکایات وواقعات سے اکابر سے عقیدت پیدا ہوگی اور یہی تمام بدعات اور سارے فتنوں کا تریاق ہے۔

❺ ...... جو حضرات تجارت یا کاروبار کی لائن سے وابستہ ہیں، وہ اس کو صرف اپنا ذریعہ معاش نہ سمجھیں بل کہ اسے ذریعہ تبلیغ اور مرکز دعوت تصور کریں اور اس کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر ہو سکتی ہیں:

(الف) ...... بیع وشرا اور کاروبار سے متعلقہ احکام شرعیہ کو خوب محفوظ کیا جائے، اور ان پر عمل کیا جائے۔

(ب) ...... جو گاہک دکان پر آئے یا جس شخص سے معاملہ کرنا پڑے، باتوں باتوں میں اس کو احکام شریعت کی یاددہانی کی جاتی رہے۔

[1] شیخ الحدیث حضرت مولانا فضل الرحمن اعظمی [illegible] امامت [illegible] ساتھ [illegible] میں ہوتے ہیں اور ان کی کاوشوں کو اللہ تعالیٰ نے بہت مقبولیت عطا فرمائی ہے۔ حال ہی میں مکتبہ [illegible] سے ان کا ایک کتابچہ "کیا تبلیغی کام ضروری ہے؟" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں حضرت والا نے تبلیغی کام کی ضرورت اور اہمیت پر بہت ہی مفید باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ائمہ حضرات کے لیے اس کا مطالعہ بہت ہی مفید رہے گا۔
اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت" اور حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "ملفوظات مولانا الیاس" واقعی اس لائق ہیں کہ ہر امام صاحب اپنی لائبریری میں ان کو رکھیں اور عوام الناس کو بھی ان کا مطالعہ کرائیں [illegible] دینی حکمت وبصیرت کے ساتھ اس تبلیغی کام کو کرنے والے بنیں اور دوسروں کے لیے بھی [illegible] ہوں۔
از ...... راقم الحروف

(ج)...... اس امر کی کوشش کی جائے کہ آس پڑوس کے دکان داروں کے ...
دینی باتیں ہوجایا کریں اور اس کے لیے کچھ لمحات تجویز کرلیے جائیں۔

(د)...... بازار میں حق تعالیٰ سے غفلت چوں کہ عام ہوتی ہے، اس لیے وہاں
ذکر اللہ کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، لہٰذا کوشش ہونی چاہیے کہ کوئی نہ کوئی
تسبیح، درود شریف وغیرہ زبان پر جاری رہے اور اس کی عادت بنالی جائے۔

(ہ)...... کاروبار میں عام طور پر نمازوں سے غفلت ہوجاتی ہے، اس لیے اس کا
ضروری اہتمام کیا جائے کہ اذان ہوتے ہی قریب کی مسجد میں نماز باجماعت ادا ...

(و)...... حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بزرگانِ دین اور اپنے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ
کے واقعات وحالات کا مطالعہ اور مذاکرہ رکھا جائے۔

❸...... جو حضرات جدید تعلیم گاہوں میں تعلیم وتدریس کی خدمات انجام دے
رہے ہیں، ان کو حق تعالیٰ نے دینی دعوت کا ایک اہم اور وسیع میدان عطا فرمایا ہے،
وہ اپنے عالمانہ وقار اور مومنانہ کردار کے ذریعے دین کی بڑی خدمت انجام دے
سکتے ہیں:

(الف)...... دنیاوی تعلیمی اداروں میں جانے والے علماء کو حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ
کی نصیحت یہ ہے...... ان حضرات کو ماحول سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ تصور
کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ شانہ نے انہیں دین کی دولت اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم
الشان نعمت سے نواز کر اس بگڑے ہوئے ماحول کے لیے مسیحا بنا کر یہاں بھیجا ...

۱ درود شریف کے موضوع پر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ...
الوصول الی جناب الرسول ...... "حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ...
السعید" اور مکتبہ دارالہدیٰ کی طبع شدہ کتاب "مستند مجموعہ درود وسلام"...... "نہایت مفید ...
غموں و پریشانیوں سے نجات کے لیے ایک بیش قیمت اور خوب صورت تحفہ ہے۔ ان حضرات ...
کی ترغیب دیں اور درود شریف کو اپنے معمولات میں لائیں تو بہت اجر وثواب کا ذریعہ ہے۔

اور جو دولت ان کے سینے میں حق تعالیٰ نے ودیعت رکھی ہے وہی اس ماحول کے لیے
تریاق ہے، اس لیے انہیں خود اس ماحول کے مطابق نہیں ڈھلنا چاہیے بلکہ اس
ماحول کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ڈھالنا ہے۔

(ب)...... وہ اپنے رفقائے کار (اساتذہ) کو دین کی ترغیب دیں، اپنی تعلیم گاہوں میں
دینی شعائر کی سربلندی کے لیے تدابیر سوچیں اور اس کے لیے مناسب انداز میں
مشورے دیں۔

(ج)...... جو طلبہ ان کے ہاں زیر تعلیم ہوں، ان میں دینی رنگ پیدا کرنے کی کوشش
کریں، انہیں قرآن وحدیث کی ہدایات سے آگاہ کریں، بزرگانِ دین کے واقعات
سنائیں، نیکی کی ترغیب دلائیں، اخلاق حسنہ کی تلقین کریں اور دینی فرائض کی پابندی کا
شوق دلائیں۔

(د)...... نوجوان طلبہ کو "تبلیغی جماعت" میں وقت دینے کی ترغیب دیں اور انہیں
جماعت سے وابستہ کرنے کی کوشش کریں۔

الغرض حضرات علمائے کرام جس شعبہ میں بھی کام کررہے ہوں، اپنے آپ کو
دین کا مبلغ تصور کریں اور مخلوق کو زیادہ سے زیادہ دینی نفع پہنچانے کا فکر واہتمام
کریں۔

❹...... دوسروں کی فکر کے ساتھ ساتھ خود اپنی تکمیل کی فکر اور اپنے علم اور جذبہ عمل
کو تازہ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے اور اس کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر کی جائیں:

(الف)...... علمی ترقی کے لیے قرآن کریم، حدیث نبوی اور فقہ وفتاویٰ کا مطالعہ
جاری رکھنا چاہیے۔

❶...... تفسیر میں بیان القرآن، فوائد عثمانی اور معارف القرآن۔

❷...... حدیث میں مشکوٰۃ شریف، ریاض الصالحین، جمع الفوائد، ترجمان السنۃ،
معارف الحدیث اور حیاۃ الصحابہ۔

۳ ...... فقہ میں بہشتی زیور، عمدۃ الفقہ، امداد الفتاویٰ اور فتاویٰ دار العلوم دیوبند۔

۴ ...... بزرگوں کے حالات وسوانح میں نقش حیات، اشرف السوانح، علمائے دیوبند کا شاندار ماضی، ارواحِ ثلاثہ، تذکرۃ الرشید، تاریخ دعوت وعزیمت اور اس نوعیت کی دیگر کتابیں۔

(ب) ...... علمی ترقی کے لیے حضرت تھانوی قدس سرہ کے مواعظ وملفوظات کا مطالعہ کیا جائے۔

(ج) ...... حضرات علمائے کرام کا شمار چوں کہ خواص امت میں ہوتا ہے اور ان کی ترقی وتنزلی سے پوری امت متاثر ہوتی ہے، اس لیے اپنی اصلاح وتربیت کے لیے ہر عالم کا کسی متبع سنت شیخ کامل سے وابستہ ہونا ناگزیر ہے اور حضرات علمائے کرام کو اس کا ضرور اہتمام کرنا چاہیے۔[1]

مفتی عبدالرشید تونسوی صاحب کی نصیحتیں

امامت ایک نعمت ہے

حضرت مفتی عبدالرشید تونسوی صاحب نے ائمہ کرام کے لیے کچھ نصیحتیں کی ہیں جن کو یہاں نقل کیا جاتا ہے، فرمایا:

"امامت چوں کہ ایک انتہائی نازک اور عالی منصب ہے، لہٰذا اس کے آداب کی رعایت رکھنا بھی بہت ضروری ہے، ذرا سی غفلت اس منصب کو آلودہ کرنے کے لیے کافی ہے، چناں چہ امام کو درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

۱ امام نماز سنت کے عین مطابق پڑھائے، تمام تر مستحبات وآداب کا لحاظ رکھے اور بہتر یہ ہے کہ بزرگوں کے سامنے اس کی عملی مشق سیکھے اور اس کو عار نہ سمجھے، اس

[1] بتغییر یسیر "ماہنامہ بینات" ربیع الاول ۱۴۲۸ھ / اپریل ۲۰۰۷ء

بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی کتاب "نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے" اور مولانا رفعت قاسمی صاحب کی کتاب "مسائل امامت" مطالعہ میں ضرور رکھنی چاہیے۔

۲ مقتدیوں سے مطالبات وفرمائشیں کرنے سے احتراز کرے اور استغنا کی صفت سے خود کو آراستہ کرے اور سنجیدہ طبیعت رکھے، پُر وقار رہے۔

۳ بیانات میں سیاسی باتوں سے احتراز کرے اور اسی طرح وعظ اور تعلیم وتعلّم میں بھی سیاسی جماعتوں پر تبصرے کرنے سے گریز کرے، اپنا زیادہ سے زیادہ وقت درس وتدریس اور خدمات دینیہ میں صرف کرے۔

۴ خاص جماعت سے تعلق نہ رکھے، اگرچہ اہل حق کی جماعت ہو، بل کہ اہل حق کی تمام جماعتوں سے یکساں وابستگی رکھے اور خاص ایک جماعت سے تعلق ظاہر نہ کرے (کیوں کہ) کسی ایک جماعت کی طرف میلان رکھنے سے باقی جماعتوں سے وابستہ افراد سے دوری پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

۵ دین کی بات سمجھانے میں حکمت اور نرمی سے کام لے اور یاد رکھنا چاہیے کہ یہ شرعاً واجب ہے۔ حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو جب فرعون کی طرف تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا گیا تو ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ "تم دونوں اس (فرعون) سے نرمی سے بات کرنا۔" ایک اور جگہ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی طرف حکمت اور نصیحت سے بلاؤ۔" موجودہ دور میں جو حق بات لوگوں پر اثر نہیں کرتی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حق بات حق طریقے سے نہیں کی جاتی، حق بات کے لیے موقع دیکھ کر حق طریقے سے کہے۔

۶ کسی انتظامی معاملہ میں دخل نہ دے، اپنے کام سے مطلب رکھے، اگر کوئی مشورہ طلب کرے تو مضائقہ نہیں، جائز امور میں اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہ کرے۔ البتہ اپنی طرف سے کوئی رائے دینا چاہے تو ایک مرتبہ انتظامیہ تک اپنا

موقف پہنچادے اور پھر خاموش رہے۔

۷ کسی سے الجھنا نہ چاہیے، اس سے وقار جاتا رہتا ہے۔ بس احسن طریقے سے اپنی بات پیش کرے۔

۸ امامت ایک نعمت ہے۔ بہت سے فروعی اختلاف سے اس کی نماز محفوظ رہتی ہے، باجماعت نماز کی پابندی رہتی ہے، اس پر خوب شکر کرنا چاہیے اور نماز کے وقت سے پہلے مسجد میں آجائے اور نماز کے بعد زیادہ دیر تک مسجد میں رہے۔

۹ اگر کوئی غلطی ہو جائے دوسرا احساس دلائے تو اس پر معذرت کرے۔ اسی طرح سے نماز میں کوئی ایسی غلطی ہو جائے جس سے نماز فاسد ہو جاتی ہو تو معلوم ہونے پر اس کا اعلان کرادے اور اس کو معیوب نہ سمجھے۔

۱۰ اپنے آپ کو امامت کا اہل نہ سمجھے، انکساری و تواضع طبیعت میں رکھے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک امام صاحب نے عرض کیا کہ میں خود کو امامت کا اہل نہیں سمجھتا۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ جب تک خود کو امامت کا اہل نہ سمجھو کراتے رہو اور جب اہل سمجھنے لگو تو چھوڑ دو۔

۱۱ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین شخص ایسے ہیں، جن کی نماز ان کے سروں سے ایک بالشت بھی مقام مقبولیت کی طرف نہیں اٹھائی جاتی۔

ان میں ایک وہ شخص ہے جو امام بنا اس حال میں کہ لوگ اس کے امام بننے کو برا سمجھتے ہیں۔[1] غور کرنے کی بات ہے کہ منصب امامت میں کس قدر احتیاط کی ضرورت ہے۔"[2]

---

[1] ابن ماجہ، إقامة الصلوات، باب من أمّ قوما وهم له كارهون، رقم: ۹۷۱

[2] بشکریہ محاسن اسلام: ۳۱

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی نصیحتیں

رمضان المبارک میں عبادت کا خوب اہتمام ہو

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ رمضان میں انسان پہلے سے یہ سوچے کہ میں اپنے روز مرہ کے کاموں میں سے مثلاً تجارت، ملازمت، زراعت وغیرہ کے کاموں میں سے کن کن کاموں کو مؤخر کر سکتا ہوں، ان کو مؤخر کردے، اور پھر ان کاموں سے جو وقت فارغ ہو اس کو عبادت میں صرف کرے[1] (اسی طرح ائمہ حضرات بھی رمضان المبارک میں عبادت کا خوب اہتمام فرمائیں کیوں کہ) شیطان مولویوں کو علمی انداز سے دھوکے دیتا ہے۔ چناں چہ شیطان مولوی صاحب سے کہتا ہے کہ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ تم گیارہ مہینے تک دنیاوی کاموں میں لگے رہے، یہ ان لوگوں سے کہا جا رہا ہے جو تجارت اور کاروبار میں لگے رہے اور معیشت کے کاموں میں اور دنیاوی دھندوں میں اور ملازمتوں میں لگے رہے، لیکن تم تو گیارہ مہینے تک دین کی خدمت میں لگے رہے، تم تو تعلیم دیتے رہے، تبلیغ کرتے رہے، وعظ کرتے رہے، تصنیف اور فتویٰ کے کاموں میں لگے رہے اور یہ سب دین کے کام ہیں۔

حقیقت میں یہ شیطان کا دھوکا ہوتا ہے، اس لیے کہ گیارہ مہینے تک تم جن عبادات میں مشغول تھے، وہ عبادات بالواسطہ تھیں اور اب رمضان المبارک براہ راست عبادات کا مہینہ ہے، یعنی وہ عبادات کرنی ہیں، جو براہ راست عبادات کے کام تھے، اس عبادات کے لیے یہ مہینہ آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مہینہ کو اس عبادت میں استعمال کرنے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔[2]

---

[1] اصلاحی خطبات: ۱۰/۷۵

[2] اصلاحی خطبات: ۱/۷۷، ۷۸

رمضان میں دعا کی کثرت کریں

اس کے علاوہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی خوب کثرت کریں، رحمت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، رحمت کی گھٹائیں جھوم جھوم کر برس رہی ہیں، مغفرت کے بہانے ڈھونڈے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز دی جا رہی ہے کہ ہے کوئی مجھ سے مانگنے والا، جس کی دعا میں قبول کروں؟ لہٰذا صبح کا وقت ہو یا شام کا وقت ہو یا رات کا وقت ہو، ہر وقت مانگو۔ وہ تو یہ فرما رہے ہیں کہ افطار کے وقت مانگ لو، ہم قبول کرلیں گے۔ رات کو مانگ لو، ہم قبول کر لیں گے۔ روزہ کی حالت میں مانگ لو، ہم قبول کر لیں گے۔ آخر رات میں مانگ لو، ہم قبول کر لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا ہے کہ ہر وقت تمہاری دعائیں قبول کرنے کے لیے دروازے کھلے ہوئے ہیں، اس لیے خوب مانگو۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے: "یہ مانگنے کا مہینہ ہے" اس لیے ان کا معمول یہ تھا کہ رمضان المبارک میں عصر کی نماز کے بعد مغرب تک مسجد ہی میں بیٹھ جاتے تھے اور اس وقت کچھ تلاوت کرلی، کچھ تسبیحات اور مناجات مقبول پڑھ لی، اور اس کے بعد باقی سارا وقت افطار تک دعا میں گزارتے تھے، اور خوب دعائیں کیا کرتے تھے۔ اس لیے جتنا ہو سکے اللہ تعالیٰ سے خوب دعائیں کرنے کا اہتمام کرو۔ اپنے لیے، اپنے اعزہ اور احباب کے لیے اپنے متعلقین کے لیے، اپنے ملک وملت کے لیے، عالم اسلام کے لیے دعائیں مانگو۔ اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس رمضان کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے اوقات کو صحیح طور پر خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔[1]

[1] اصلاحی خطبات: ۱۰/۸۲

رمضان میں سالانہ چھٹیاں کیوں؟

ہمارے دینی مدارس میں عرصۂ دراز سے یہ رواج اور طریقہ چلا آرہا ہے کہ سالانہ چھٹیاں اور تعطیلات ہمیشہ رمضان المبارک کے مہینے میں کی جاتی ہیں۔ ۱۵ شعبان کو تعلیمی سال ختم ہو جاتا ہے اور ۱۵ شعبان سے لے کر ۱۵ شوال تک دو ماہ کی سالانہ چھٹیاں ہو جاتی ہیں۔ شوال سے نیا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کا جاری کیا ہوا طریقہ ہے۔ اس طریقہ پر لوگ اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ مولوی صاحبان رمضان میں لوگوں کو اس بات کا سبق دیتے ہیں کہ آدمی رمضان کے مہینے میں بے کار ہو کر بیٹھ جائے، حالاں کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تو رمضان المبارک میں جہاد کیا اور دوسرے کام کیے۔ خوب سمجھ لیں کہ اگر جہاد کا موقع آجائے تو بے شک آدمی جہاد بھی کرے۔ چناں چہ غزوۂ بدر اور فتح مکہ رمضان المبارک میں ہوئے، لیکن جب سال کے کسی مہینے میں چھٹی کرنی ہی ہے تو اس کے لیے رمضان کے مہینے کا انتخاب اس لیے کیا تاکہ اس مہینے کو زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی براہ راست عبادات کے لیے فارغ کرسکیں۔

اگرچہ ان دینی مدارس میں پورے سال جو کام ہوتے ہیں وہ بھی سب کے سب عبادات ہیں، مثلاً قرآن کریم کی تعلیم، حدیث کی تعلیم، فقہ کی تعلیم وغیرہ، مگر یہ سب بالواسطہ عبادات ہیں، لیکن رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس مہینے کو میری براہ راست عبادات کے لیے فارغ کرلو۔ اس لیے ہمارے بزرگوں نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ جب چھٹی کرنی ہی ہے تو بجائے گرمیوں میں چھٹی کرنے کے رمضان میں چھٹی کر دو تاکہ رمضان کا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی براہ راست عبادات میں صرف کیا جاسکے۔ لہٰذا رمضان المبارک میں چھٹی کرنے کا اصل منشا یہی ہے۔

بہر حال، رمضان المبارک میں چھٹی کرنا جن کے اختیار میں ہو وہ حضرات چھٹی کرلیں اور جن حضرات کے اختیار میں نہ ہو تو وہ کم از کم اپنے اوقات کو اس طرح مرتب کریں کہ ان کا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی براہ راست عبادات میں گزر جائے، اور حقیقت میں رمضان کا مقصود بھی یہی ہے۔

حضور ﷺ کو عباداتِ مقصودہ کا حکم

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ دیکھو قرآن کریم کی سورت "الم نشرح" میں اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝﴾ [1]

ترجمہ: "پس جب تو فارغ ہو تو عبادت میں محنت کر اور اپنے پروردگار ہی کی طرف دل لگا۔"

یعنی جب آپ دوسرے کاموں سے جن میں آپ مشغول ہیں فارغ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں تھکئے۔

کس کام کے کرنے میں تھکئے؟ نماز پڑھنے میں، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے میں، اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرنے میں تھکئے، اور اپنے رب کی طرف رغبت کا اظہار کیجیے۔ میرے والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ تم ذرا سوچو تو سہی کہ یہ خطاب کس ذات سے ہو رہا ہے؟

یہ خطاب حضور اقدس ﷺ سے ہو رہا ہے، اور آپ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جب آپ فارغ ہو جائیں، یہ تو دیکھو کہ حضور اقدس ﷺ کن کاموں میں لگے ہوئے تھے، جن سے فراغت کے بعد تھکنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟ کیا حضور اقدس ﷺ دنیاوی کاموں میں لگے ہوئے تھے؟ نہیں، بل کہ آپ کا تو ایک ایک کام

[1] الانشراح: ۷، ۸

عبادت ہی تھا، یا تو آپ کا کام تعلیم دینا تھا یا تبلیغ کرنا تھا یا جہاد کرنا تھا یا تربیت اور تزکیہ تھا، آپ کا تو اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔

لیکن اس کے باوجود آپ سے کہا جا رہا ہے کہ جب آپ ان کاموں سے فارغ ہو جائیں یعنی تعلیم کے کام سے اور تبلیغ کے کام سے اور جہاد کے کام سے فارغ ہو جائیں تو اب آپ ہمارے سامنے کھڑے ہو کر تھکئے۔ چناں چہ اسی حکم کی تعمیل میں جناب رسول اللہ ﷺ ساری ساری رات نماز کے اندر اس طرح کھڑے ہوتے کہ آپ کے پاؤں پر ورم آ جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کاموں میں حضور اقدس ﷺ مشغول تھے وہ بالواسطہ عبادت تھی اور جس عبادت کی طرف اس آیت میں آپ کو بلایا جا رہا تھا وہ براہ راست عبادت تھی۔[1]

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اکثر حضرات مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت و تبلیغ اور خلقِ خدا کو راستہ دکھانا ان کی اصلاح کی فکر، یہ آپ کی سب سے بڑی عبادت تھی، مگر یہ عبادت بواسطہ مخلوق ہے کہ ان کی اصلاح پر توجہ دیں اور اس کی تدبیر کریں، آیت کا مقصود یہ ہے کہ صرف اس عبادت بالواسطہ پر آپ قناعت نہ کریں، بل کہ جب اس سے فرصت ملے تو بلاواسطہ خلوت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں، اسی سے ہر کام میں کامیابی کی دعا کریں کہ اصل مقصود جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے، وہ ذکر اللہ اور عبادت بلاواسطہ ہی ہے اور شاید اسی لیے پہلی قسم یعنی عبادت بالواسطہ سے فراغت کا ذکر فرمایا کہ وہ کام ایک ضرورت کے لیے ہے۔ اس سے فراغت ہو سکتی ہے اور دوسرا کام یعنی توجہ الی اللہ ایسی چیز ہے کہ اس سے فراغت مؤمن کو کبھی نہیں ہو سکتی، بل کہ اپنی ساری عمر اور توانائی کو اس میں صرف کرنا ہے۔"

[1] اصلاحی خطبات: ۱۰/۷۵ تا ۷۷

فَائِدَة: اس سے معلوم ہوا کہ علماء، جو تعلیم وتبلیغ اور اصلاح خلق کا کام کرتے ہیں، ان کو اس سے غفلت نہ برتنا چاہیے کہ ان کا کچھ وقت خلوت میں توجہ الی اللہ اور ذکر اللہ کے لیے بھی مخصوص ہونا چاہیے جیسا کہ علماء سلف کی سیرتیں اس پر شاہد ہیں۔ اس کے بغیر تعلیم وتبلیغ بھی موثر نہیں ہوتی، ان میں نور وبرکت نہیں ہوتی۔

لفظ "فَانْصَبْ" نَصَبٌ سے مشتق ہے، جس کے اصلی معنے تعب اور تکان کے ہیں، اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ عبادت اور ذکر اللہ اس حد تک جاری رکھا جائے کہ کچھ مشقت اور تکان محسوس ہونے لگے، صرف نفس کی راحت وخوشی ہی پر اس کا مدار نہ رہے اور کسی وظیفہ اور معمول کی پابندی خود ایک مشقت اور تعب ہے، خواہ کام مختصر ہی ہو۔[1]

چالیس "مقاماتِ قرب" حاصل کرلیں

اب آپ اپنا ایک نظام الاوقات اور ٹائم ٹیبل بنائیں کہ کس طرح یہ مہینہ گزارنا ہے، چنانچہ جتنے کاموں کو موخر کرسکتے ہیں، ان کو موخر کردو۔ اور روزہ تو رکھنا ہی ہے اور تراویح بھی ان شاء اللہ ادا کرنی ہی ہے۔

تراویح کے بارے میں حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس سرہ بڑے مزے کی بات فرمایا کرتے تھے کہ "یہ تراویح بڑی عجیب چیز ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو روزانہ عام دنوں کے مقابلے میں اپنے سے زیادہ قرب کے مقامات عطا فرمائے ہیں، اس لیے کہ تراویح کی بیس رکعتیں ہیں، جن میں چالیس سجدے کیے جاتے ہیں اور ہر سجدہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا اعلیٰ ترین مقام ہے کہ اس سے زیادہ اعلیٰ مقام کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتا ہے اور اپنی معزز پیشانی زمین پر ٹیکتا ہے اور زبان پر "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى" کے الفاظ ہوتے ہیں تو یہ قرب خداوندی کا وہ اعلیٰ ترین مقام ہوتا ہے جو کسی اور صورت میں نصیب

[1] معارف القرآن: ۸/۷۷۶

نہیں ہوسکتا۔

یہی مقام قرب حضور اقدس ﷺ معراج کے موقع پر لائے تھے۔ جب معراج کے موقع پر آپ کو اتنا اونچا مقام بخشا گیا تو حضور اقدس ﷺ نے سوچا کہ میں اپنی امت کے لیے کیا تحفہ لے کر جاؤں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ امت کے لیے یہ "سجدے" لے جاؤ، ان میں سے ہر سجدہ مؤمن کی معراج ہے۔ یعنی جس وقت کوئی مؤمن بندہ اپنی پیشانی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زمین پر رکھ دے گا تو اس کو معراج حاصل ہوجائے گا۔ لہٰذا یہ سجدہ مقام قرب ہے۔

سورۃ العلق میں اللہ تعالیٰ نے کتنا پیارا جملہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۞﴾[1] ...... ترجمہ: "سجدہ کر اور قریب ہوجا۔"

معلوم ہوا کہ ہر سجدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب کا ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے، اور رمضان کے مہینے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں چالیس سجدے اور عطا فرمادیے، جس کا مطلب یہ ہے کہ چالیس قرب ہر بندے کو روزانہ عطا کیے جارہے ہیں۔ یہ اس لیے دیے کہ گیارہ مہینے تک تم جن کاموں میں لگے رہے، ان کاموں کی وجہ سے ہمارے اور تمہارے درمیان کچھ دوری پیدا ہوگئی ہے، اس دوری کو ختم کرنے کے لیے روزانہ چالیس مقامات قرب دے کر ہم تمہیں قریب کررہے ہیں، اور وہ ہے "تراویح" لہٰذا اس تراویح کو معمولی مت سمجھو۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو آٹھ (۸) رکعت تراویح پڑھیں گے، بیس (۲۰) نہیں پڑھیں گے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرمارہے ہیں کہ ہم تمہیں چالیس مقامات قرب عطا فرماتے ہیں، لیکن یہ حضرات کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہمیں تو صرف سولہ (۱۶) ہی کافی ہیں، چالیس (۴۰) کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے ان مقامات قرب کی قدر نہیں پہچانی، تب ہی تو ایسی باتیں

[1] العلق: ۱۹

کر رہے ہیں۔"

تلاوتِ قرآن کریم کی کثرت کریں

بہر حال! روزہ تو رکھنا ہی ہے اور تراویح بھی پڑھنی ہی ہے، اس کے علاوہ بھی جتنا وقت ہو سکے عبادات میں صرف کرو۔ مثلاً تلاوت قرآن کریم کا خاص اہتمام کرو، کیوں کہ اس رمضان کے مہینے کو قرآن کریم سے خاص مناسبت ہے، اس لیے اس میں زیادہ سے زیادہ تلاوت کرو۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک میں روزانہ ایک قرآن کریم دن میں ختم کیا کرتے تھے اور ایک قرآن کریم رات میں ختم کیا کرتے تھے اور ایک قرآن تراویح میں ختم فرماتے تھے، اس طرح پورے رمضان میں اکسٹھ (۶۱) قرآن کریم ختم کیا کرتے تھے۔ علامہ [illegible] رحمۃ اللہ تعالیٰ رمضان کے دن اور رات میں ایک قرآن کریم ختم کیا کرتے تھے۔ بڑے بڑے بزرگوں کے معمولات میں تلاوتِ قرآن کریم داخل رہی ہے۔ لہٰذا ہم بھی رمضان المبارک میں عام دنوں کی مقدار کے مقابلے میں تلاوت کی مقدار زیادہ کریں۔

دوسرے ایام میں جن نوافل کو پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی، ان کو رمضان المبارک میں پڑھنے کی کوشش کریں۔ مثلاً تہجد کی نماز پڑھنے کی عام دنوں میں توفیق نہیں ہوتی، لیکن رمضان المبارک میں رات کے آخری حصے میں سحری کھانے کے لیے تو اٹھنا ہوتا ہی ہے، تھوڑی دیر پہلے اٹھ جائیں اور اسی وقت تہجد کی نماز پڑھ لیں، اس کے علاوہ اشراق کی نوافل، چاشت کی نوافل، اوابین کی نوافل، عام ایام میں اگر نہیں پڑھی جاتیں تو کم از کم رمضان المبارک میں تو پڑھ لیں۔

رمضان المبارک میں زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقات بھی زیادہ سے زیادہ دینے کی کوشش کریں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی سخاوت کا دریا ویسے تو سارے سال ہی موجزن رہتا تھا، لیکن رمضان المبارک میں آپ کی

سخاوت ایسی ہوتی تھی جیسے جھونکیں مارتی ہوئی ہوائیں چلتی ہیں،[1] جو آپ کے پاس آیا اس کو نواز دیا۔ لہٰذا ہم بھی رمضان المبارک میں صدقات کی کثرت کریں۔

اس کے علاوہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کریں۔ ہاتھوں سے کام کرتے رہیں اور زبان پر اللہ تعالیٰ کا ذکر جاری رہے "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ. سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ. لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" ان کے علاوہ درود شریف اور استغفار کی کثرت کریں، اور ان کے علاوہ جو ذکر بھی زبان پر آجائے اس چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہیں۔

گناہوں سے بچنے کا اہتمام کریں

رمضان المبارک میں خاص طور پر گناہوں سے اجتناب کریں اور اس سے بچنے کی فکر کریں۔ یہ طے کرلیں کہ رمضان کے مہینے میں یہ آنکھ غلط جگہ پر نہیں اٹھے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ طے کرلیں کہ رمضان المبارک میں اس زبان سے غلط بات نہیں نکلے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جھوٹ، غیبت یا کسی کی دل آزاری کا کوئی کلمہ نہیں نکلے گا۔ رمضان المبارک کے مہینے میں اس زبان پر تالا ڈال لو۔ یہ کیا بات ہوئی کہ روزہ رکھ کر حلال چیزوں کے کھانے سے تو پرہیز کرلیا، لیکن رمضان میں مردہ بھائی کا گوشت کھا رہے ہو۔ اس لیے کہ غیبت کرنے کو قرآن کریم نے مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے برابر قرار دیا ہے۔ لہٰذا غیبت سے بچنے کا اہتمام کریں۔ جھوٹ سے بچنے کا اہتمام کریں۔ اور فضول کاموں سے، فضول مجلسوں سے اور فضول باتوں سے بچنے کا اہتمام کریں، اس طرح یہ رمضان کا مہینہ گزارا جائے۔[2]

[1] بخاری، الصوم، باب أجود ما كان النبي صلى الله عليه وسلم يكون في رمضان: ۱/۲۵۵

[2] اصلاحی خطبات: ۱۰/۷۸ تا ۸۲

تلاوتِ قرآن کے وقت رونا چاہیے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا﴾[1] تفسیر مظہری میں ہے کہ تلاوتِ قرآن کے وقت رونا مستحب ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص جہنم میں نہ جائے گا، جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے رویا، جب تک کہ دودھ دوبارہ تھنوں میں واپس نہ لوٹ جائے یعنی جیسے یہ نہیں ہو سکتا کہ تھنوں سے نکلا ہوا دودھ پھر تھنوں میں واپس چلا جائے، اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے والا جہنم میں چلا جائے۔[2] ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو آنکھوں پر جہنم کی آگ حرام کردی، ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئے، دوسرے جو اسلامی سرحد کی حفاظت کے لیے رات کو بیدار رہے۔[3]

اور حضرت نضر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم میں کوئی اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے والا ہو تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو اس کی وجہ سے آگ سے نجات فرمادیں گے۔[4]

آج سب سے بڑی مصیبت جو مسلمانوں پر پڑی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے والے بہت کم رہ گئے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ روح المعانی میں اس موقع پر اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے کے فضائل کی احادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"وَيَنْبَغِي اَنْ يَّكُوْنَ ذٰلِكَ حَالُ الْعُلَمَاءِ"[5] یعنی علماء دین کا یہی حال ہو

---

[1] بنی اسرائیل: ۱۰۹

[2] ترمذی، الزهد، باب ما جاء في فضل البكاء من خشية الله، رقم: ۲۳۱۱

[3] مستدرك، الجهاد: ۲/۱۰۲، رقم: ۲۴۸۶

[4] التفسير المظهري: ۵/۵۰۰، ۵۰۱، بنی اسرائیل: ۱۰۹

[5] روح المعانی: ۱۵/۱۹۰، ۱۹۱

چاہیے۔ کیوں کہ ابن جریر، ابن منذر وغیرہما نے عبد الاعلیٰ تیمی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ مقولہ نقل کیا ہے:

"جس شخص کو صرف ایسا علم ملا ہو، جو اس کو رلاتا نہیں تو سمجھ لو کہ اس کو علم نافع نہیں ملا۔"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

❶ "مَنْ ذَكَرَ اللّٰهَ فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ حَتّٰى يُصِيْبَ الْاَرْضَ مِنْ دُمُوْعِهٖ لَمْ يُعَذِّبْهُ اللّٰهُ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ"[1]

ترجمہ: "جو شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس کی آنکھوں سے کچھ آنسو زمین پر گر پڑیں تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے عذاب نہیں دیں گے۔"

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

❷ "لَيْسَ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ قَطْرَتَيْنِ وَاَثَرَيْنِ: قَطْرَةٌ مِنْ دُمُوْعٍ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، وَقَطْرَةُ دَمٍ تُهْرَاقُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَاَمَّا الْاَثَرَانِ فَاَثَرٌ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَثَرٌ فِي فَرِيْضَةٍ مِنْ فَرَائِضِ اللّٰهِ"[2]

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کو دو قطرے اور دو نشانوں سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں۔ ایک آنسو کا قطرہ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نکلے، دوسرا خون کا

---

[1] مستدرك للحاكم، التوبة والانابة: ۴/۲۹۲، رقم: ۷۷۴۹

[2] ترمذی، فضائل الجهاد، باب ما جاء في فضل المرابط: ۱/۲۹۶، الرقم: ۱۶۶۹

قطرہ جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں بہہ جائے۔ اور دو نشانوں میں ایک اللہ تعالیٰ کے راستے کا کوئی نشان (جیسے زخم یا غبار یا اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلنے کا نشان) اور ایک وہ نشان جو اللہ تعالیٰ کے کسی فریضہ کی ادائیگی میں پڑ گیا ہو (جیسے سجدہ یا سفر حج وغیرہ کا کوئی نشان)۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

۳ "سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهٗ: إِمَامٌ عَدْلٌ، وَشَابٌّ نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ، وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ، وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ، اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ، وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ: إِنِّيْ أَخَافُ اللّٰهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهٗ، وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ." [1]

ترجمہ: "سات آدمی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سایہ میں ایسے دن جگہ عطا فرمائیں گے جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ① عادل بادشاہ ② وہ جوان جو جوانی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو ③ وہ شخص جس کا دل ہر وقت مسجد میں لگا رہتا ہو ④ دو ایسے شخص جو اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھتے ہوں ان کے ملنے اور جدا ہونے کی بنیاد یہی ہو ⑤ وہ شخص جس کو کوئی اونچے خاندان والی حسین عورت اپنی طرف متوجہ کرے اور وہ کہہ دے کہ میں تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں ⑥ وہ شخص جو اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو

[1] بخاری، الزکوٰۃ، باب الصدقۃ بالیمین: ۱/۱۹۱، الرقم: ۱۴۲۳

کہ داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے ⑦ وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا ذکر تنہائی میں کرے اور آنسو بہنے لگیں۔"

کثرتِ ذکر سے قوتِ قلبیہ حاصل ہوتی ہے

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانے میں دار العلوم دیوبند کا کام بہت پھیل گیا تھا، بہت سے شعبے قائم ہو چکے تھے اور سینکڑوں طلباء دار الاقامہ میں رہتے تھے، اس لیے حضرت مولانا شب و روز انتظامی کاموں میں مصروف رہتے تھے، اس کے باوجود ان کی نوافل اور تلاوت وغیرہ کے علاوہ روزانہ سوا لاکھ مرتبہ ذکر اسم ذات کا معمول کبھی قضا نہ ہوا۔

ایک مرتبہ دار العلوم کی انتظامیہ کے خلاف ایک شدید طوفان کھڑا ہوا، جس میں بعض لوگ حضرت مولانا کی جان تک کے دشمن ہو گئے۔ ان حالات میں بھی آپ کھلی چھت پر تنہا سوتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ:

حضرت! ایسے حالات میں آپ کا اس طرح سونا مناسب معلوم نہیں ہوتا، آپ کم از کم کمرے کے اندر ہی سو جایا کریں، لیکن مولانا نے بڑی بے نیازی کے ساتھ ہنس کر فرمایا۔ ارے میاں! میں تو اس باپ یعنی سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیٹا ہوں، جس کے جنازے کو چار اٹھانے والے بھی میسر نہ آئے اور جسے رات کے اندھیرے میں بقیع کی نذر کیا گیا، لہٰذا مجھے موت کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔

حق تعالیٰ حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے درجات بلند فرمائیں۔ آمین [1]

[1] "چند عظیم شخصیات": ۳۳

باب سوم

آدابِ وعظ

① وعظ ونصیحت سے پہلے صلوٰۃ الحاجت یا دعا کا اہتمام

ویسے تو ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا رہے۔ کام کے شروع میں بھی کام کے بیچ میں بھی اور آخر میں بھی، اور موقع ہو تو یہ مدد دو رکعت نفل پڑھ کر مانگے۔ انسان جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے اور اپنی نفی کرتا ہے کہ میری تقریر...... میرا وعظ...... میری اصلاحی جدوجہد...... یہ ساری محنت کی کوئی حیثیت نہیں تو اللہ تعالیٰ کو یہ عاجزی بہت زیادہ پسند آتی ہے اور پھر انسان کی نگاہ سو فی صد اللہ تعالیٰ ہی کی مدد پر مرکوز ہو جاتی ہے، اور پھر بار بار صلوٰۃ الحاجت پڑھ کر مانگنے سے اور آخر میں اس عمل کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول کروانے کی فکر اور عاجزی کے ساتھ رو رو کر تہجد میں اٹھ کر مانگنے سے وہ درجہ میسر ہوتا ہے کہ اس وقت لوگوں کی مدح و ذم برابر ہو جاتی ہے۔ لوگوں کی تعریف کرنا یا نہ کرنا دونوں حال اس کے لیے برابر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ بار بار صلوٰۃ الحاجت کے اہتمام سے بندہ کی رشد و خیر کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے۔ ''کتاب الزہد والرقائق'' میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک روایت ذکر فرمائی ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن

رواد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد ان کی بیوی سے نکاح کیا اور فرمایا تم جانتی ہو کہ میں نے تم سے نکاح کیوں کیا؟

پھر فرمایا کہ میں نے تم سے نکاح اس لیے کیا ہے کہ تم مجھے عبداللہ بن رواد کے عمل کے بارے میں بتلاؤ کہ ان کے گھر میں کیا معمولات تھے، تو ان کی اہلیہ نے فرمایا:

جب وہ گھر سے نکلنے کا ارادہ کرتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور جب گھر میں داخل ہوتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور جب سونے کے لیے جاتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور اسی عمل پر ہمیشہ مداومت فرماتے تھے۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر سے نکلتے ہیں تو دو رکعت پڑھ کر نکلتے ہیں۔[2]

لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ اپنے وعظ و بیان سے پہلے دو رکعت صلوٰۃ الحاجت پڑھ کر دعا مانگ کر جائیں۔ خصوصاً جمعہ کے وعظ میں کہ اتنا مجمع جو جمع ہوتا ہے وہ ہم سے دین سیکھنے کے لیے طالب بن کر ہمارے پاس آتا ہے۔ اب ہم پر ان کا حق واجب ہو گیا تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس حق کو اس امانت کو صحیح طرح ادا کرنے کی توفیق نصیب فرمائے، صحیح طرح سمجھانے اور سمجھنے اور اس پر عمل کرنے اور اس کو پھیلانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اسلاف کا یہ معمول رہا ہے کہ وعظ سے پہلے بھی اور وعظ کے بعد بھی دعا مانگنے کا اہتمام فرماتے تھے۔

کم از کم قرآن کریم کی ان دو دعاؤں اور بقیہ دعاؤں کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے:

① ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ

[1] کتاب الزھد: ۲/۷۷۶ [2] کتاب الزھد: ۲/۷۷۵

عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝﴾[1]

ترجمہ: "اے میرے پروردگار! میرا سینہ کھول دیجیے، اور میرے کام آسان کر دیجیے، اور میری زبان سے گرہ کھول دیجیے تاکہ یہ لوگ میری بات سمجھ لیں۔"

❷ ﴿رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝﴾[2]

ترجمہ: "اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔"

ہمارے استاذ حضرت مولانا ادریس میرٹھی صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے ایک بہت پیاری دعا سکھائی تھی، ہم سب کو چاہیے کہ اس دعا کا معمول بنا لیں۔ خصوصاً درس دینے سے پہلے اور وعظ کرنے سے پہلے اس کو مانگ لیا کریں وہ دعا یہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ قَلْبِيْ بِنُوْرِ مَعْرِفَتِكَ، وَاشْرَحْ صَدْرِيْ لِعُلُوْمِ كِتَابِكَ، وَسُنَّةِ نَبِيِّكَ، وَاعْصِمْنِيْ عَنْ كُلِّ خَطَاءٍ وَزَلَلٍ فِيْ بَيَانِ مُرَادِ الْقُرْآنِ وَالْحَدِيْثِ"

ترجمہ: "اے اللہ! میرے دل کو اپنی معرفت کے انوار سے منور فرما اور میرے سینے کو قرآن و حدیث کے علوم کے لیے کشادہ فرما اور قرآن و حدیث کے مفہوم و مطالب بیان کرنے اور سمجھانے میں کسی قسم کی غلطی اور لغزش سے میری حفاظت فرما۔"

ہمارے استاذ مرحوم فرماتے تھے:

یہ دعائیں پڑھنے کے لیے نہیں ہوتیں بل کہ مانگنے کے لیے ہوتی ہیں۔ یعنی مانگنے کے لیے دل کے دھیان اور عربی الفاظ کا ترجمہ اور مفہوم ذہن نشین ہو۔ (۱) خوب غور و فکر کے ساتھ کامل توجہ ہو۔ جیسے عاجز اور مجبور شخص سب طرف سے یکسو (۲) ہو کر ایک ہی آخری سہارے سے مانگتا ہے کہ اے اللہ! آپ نے مدد نہ فرمائی تو میرا

[1] طٰہٰ: ۲۵ تا ۲۸　[2] طٰہٰ: ۱۱۴

کوئی نہیں۔ اس طرح ان دعاؤں کو مانگا جائے یہ نہ ہو کہ صرف وعظ سے پہلے ان کے الفاظ پر کفایت کی جائے، بل کہ دعائیں مانگی جائیں، اور مانگنے کے طرز پر مانگی جائیں، اور یہی اپنے احباب اور مقتدیوں کو سکھایا جائے۔

اسی طرح وعظ کرتے وقت کوشش یہ ہو کہ سب سامعین تک آواز پہنچ جائے، اتنی آہستہ آواز نہ ہو کہ دور والے نہ سن سکیں۔ اسی طرح اتنی زوردار گرج دار آواز نہ ہو کہ سامعین پر بوجھ ہو جائے، بسا اوقات تقریر کرنے والے کو پتہ نہیں چلتا کہ میری آواز کتنی تیز ہو گئی ہے اور لوگوں پر شاق گزر رہی ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ بیان کے بعد اپنے خاص دوستوں سے پوچھ لیا کریں۔

اگر واقعی آواز گرج دار اور لہجہ سخت ہے تو اس کو نرم کرنے کی کوشش کی جائے اور باتوں میں مٹھاس پیدا کی جائے تاکہ لوگ متنفر نہ ہوں۔ چناں چہ مشہور تابعی حضرت عروہ بن زبیر رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اپنے بیٹوں کو یہی نصیحت کرتے ہیں:

يَا بُنَيَّ، مَكْتُوْبٌ فِي الْحِكْمَةِ: "لِتَكُنْ كَلِمَتُكَ طَيِّبَةً، وَلْيَكُنْ وَجْهُكَ طَلْقًا، تَكُنْ أَحَبَّ إِلَى النَّاسِ مِمَّنْ يَّبْذُلُ لَهُمُ الْعَطَاءَ."[1]

ترجمہ: "اے میرے بچو! حکمت اور دانائی میں یہ بات منقول ہے کہ جب تمہاری باتوں میں مٹھاس ہو (یعنی خوش اخلاقی سے بات کرو گے) اور تمہارا چہرہ روشن ہو (یعنی خندہ پیشانی سے پیش آؤ گے) تو لوگوں کے نزدیک اس شخص سے بھی زیادہ محبوب اور پسندیدہ رہو گے جو بہت زیادہ سخی ہو اور لوگوں پر بہت سارا مال خرچ کرتا رہتا ہو۔"

خاص طور پر اس بات کا خیال رکھیں کہ سننے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، لہٰذا کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے کسی کی دل آزاری ہو اور رنج پہنچے۔ حق

[1] صور من حیاۃ التابعین: ۴۹۰

بیان کریں جس سے باطل خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ وعظ کہنے میں خیر خواہی و دل سوزی ہو۔ جذبات کا اتباع نہ ہو، بل کہ مقصود اللہ کی رضا ہے۔

اسی طرح بعض اوقات مائیک (اسپیکر) کی ضرورت نہیں ہوتی، چند ہی لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور مائیک کھول دیا جاتا ہے، یہ بھی مناسب نہیں ہے، اسراف تو ویسے ہی منع ہے اور خصوصاً مسجد کے وقف مال میں اسراف تو زیادہ برا ہے کہ مسجد کی بجلی کا استعمال بلاضرورت ہو، لوگوں پر بوجھ الگ ہو۔

لہٰذا ایسے مواقع پر بلاضرورت مائیک استعمال نہیں کرنا چاہیے، خصوصاً مسجد کے باہر کے مائیک کھولنا تو بہت ہی نامناسب ہے، جس شخص کے سامنے یہ بات ہو گی کہ یہ وعظ و بیان اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کہتا ہے وہ مجمع، آواز اور مائیک کو نہیں دیکھے گا، بل کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کرے گا کہ چند ہی لوگ ہیں جن کو آواز پہنچ سکتی ہے تو پھر کس کو دکھاتا ہے یا سناتا ہے کہ ہم بیان کر رہے ہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سورۂ لقمان کی آیت ۱۹ کی تفسیر میں فرماتے ہیں ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ ''یعنی آواز کو پست کرو'' مراد پست کرنے سے یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ بلند آواز نہ نکالو، اور شور نہ کرو، جیسا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ کلام ایسا کرتے تھے کہ حاضرین سن لیں، انہیں سننے میں تکلیف نہ ہو۔ اس کے بعد فرمایا ﴿إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾ ''یعنی چوپاؤں میں سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی ہے، جو بہت شور کرتا ہے۔''

یہاں آداب معاشرت میں چار چیزیں ذکر کی گئی ہیں:

1. لوگوں سے گفتگو اور ملاقات میں متکبرانہ انداز سے رخ پھیر کر بات کرنے کی ممانعت۔
2. زمین پر اترا کر چلنے کی ممانعت۔

3. درمیانی چال چلنے کی ہدایت۔
4. بہت زور سے شور مچا کر بولنے کی ممانعت۔[1]

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات وشمائل میں یہ سب چیزیں جمع تھیں۔ شمائل ترمذی میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے دریافت کیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تھے تو آپس میں آپ کا کیا طرز ہوتا تھا؟ انہوں نے فرمایا:

"كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَائِمَ الْبِشْرِ، سَهْلَ الْخُلُقِ، لَيِّنَ الْجَانِبِ، لَيْسَ بِفَظٍّ، وَلَا غَلِيْظٍ، وَلَا صَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ، وَلَا فَحَّاشٍ، وَلَا عَيَّابٍ، وَلَا مَشَّاحٍ، يَتَغَافَلُ عَمَّا لَا يَشْتَهِيْ، وَلَا يُؤْيِسُ مِنْهُ، وَلَا يُجِيْبُ فِيْهِ، قَدْ تَرَكَ نَفْسَهُ مِنْ ثَلَاثٍ: اَلْمِرَاءِ وَالْإِكْبَارِ وَمَا لَا يَعْنِيْهِ"[2]

ترجمہ: ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ خوش وخرم معلوم ہوتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق میں نرمی اور برتاؤ میں سہولت مندی تھی، نہ طبیعت سخت تھی، نہ بات میں درشتگی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بازاروں میں شور مچانے والے تھے، نہ فحش گو تھے، نہ کسی کو عیب لگاتے تھے، نہ بخل کرتے تھے، جو چیز دل کو اچھی نہیں لگتی اس کی جانب التفات نہ فرماتے (مگر) دوسرے کو اس کی طرف سے ناامید بھی نہ کرتے تھے (اگر حلال ہو اور اس کی رغبت ہو) اور جو چیز خود کو مرغوب نہ ہو دوسرے کے حق میں اس کی کاٹ نہ کرتے تھے (بل کہ خاموشی اختیار فرماتے تھے)۔ اور نہ اس میں کسی کو جواب دیتے جو خود پسند نہ ہو۔ تین چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] معارف القرآن: ۷/ ۴۰

[2] شمائل ترمذی: ۲۴، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ

بالکل چھوڑ رکھی تھیں: ① جھگڑنا ② تکبر کرنا ③ جو چیز کام کی نہ ہو اس میں مشغول ہونا۔"

ہمارے پیارے نبی ﷺ کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

"مَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْرُدُ سَرْدَكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّهُ كَانَ يَتَكَلَّمُ بِكَلَامٍ بَيِّنٍ فَصْلٍ يَحْفَظُهُ مَنْ جَلَسَ إِلَيْهِ."[1]

ترجمہ: "حضور ﷺ کی گفتگو تم لوگوں کی طرح سے لگاتار جلدی جلدی نہیں ہوتی تھی بل کہ ٹھہر ٹھہر کر اس طرح بات فرماتے کہ ہر مضمون دوسرے مضمون سے ممتاز ہوتا تھا، پاس بیٹھنے والے اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیتے تھے۔"

فائدہ: حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
"یعنی حضور ﷺ کی گفتگو مجمل یا جلدی جلدی نہیں ہوتی تھی کہ کچھ سمجھ میں آئے کچھ نہ آئے بل کہ ایسی اطمینان کی واضح گفتگو ہوا کرتی تھی کہ مخاطبین اچھی طرح سمجھ جاتے۔"[2]

ایک دوسری روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

"كَانَ يُحَدِّثُ حَدِيْثًا لَوْ عَدَّهُ الْعَادُّ لَأَحْصَاهُ."[3]

ترجمہ: "آپ ﷺ بات ایسی سمجھا کر اور ٹھہر ٹھہر کر فرمایا کرتے تھے کہ اگر سننے والا چاہتا کہ آپ کے کلمات اور حروف کا شمار کرے تو اس

[1] شمائل ترمذی، باب کیف کان کلام رسول اللہ: ۱۶

[2] شرح شمائل ترمذی: ۱۱۸

[3] بخاری، المناقب، باب صفۃ النبی، رقم: ۳۵۶۷

کے لیے ممکن ہوتا" (کیوں کہ آپ کی بات واضح اور صاف ہوتی تھی)۔

قربان جائیے حضور ﷺ پر کہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق آداب بتا کر گئے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان مبارک آداب پر عمل کریں اور ساری دنیا والوں کو یہ بات قول اور عمل سے سمجھا دیں کہ دنیا اور آخرت میں کامیابی حضور ﷺ کے طریقوں ہی پر عمل کرنے میں ہے۔

حضور ﷺ والے مبارک طریقے ہمارے اندر جتنے آتے جائیں گے اتنے ہی ہم کامیاب ہوتے جائیں گے، اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ حضور ﷺ کی محبت ہمارے دلوں میں اس طرح اتر جائے کہ دوسری ساری محبتوں پر غالب آجائے، ان کے ایک ایک طریقے پر عمل کرنے اور ساری دنیا میں اس کو پھیلانے پر جان و مال اور وقت کی قربانی دینا آسان ہو جائے، ہر امام اسی سنت پر عمل کرنے کی نیت سے اتنے ٹھہرے ہوئے لہجے میں آہستہ بات کرے کہ ایک ایک لفظ دوسرے لفظ سے جدا ہو، نہ اتنا تیز بولے کہ حروف کٹیں اور نہ اتنا آہستہ کہ مقتدی تنگ ہو جائیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ﴿كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ .....﴾[1] یعنی "تم سب رب کے ہو جاؤ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی "حکماء، علماء اور فقہاء ہو۔"

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ قول نقل کرکے لفظ "ربانی" کی یہ تفسیر فرمائی:
"جو شخص دعوت و تبلیغ اور تعلیم میں تربیت کے اصول کو ملحوظ رکھ کر پہلے آسان آسان باتیں بتلائے، جب لوگ اس کے عادی ہو جائیں تو اس وقت دوسرے احکام بتلائے۔ آج کل جو وعظ و تبلیغ کا اثر بہت کم ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عموماً اس کام کے کرنے والے ان اصول و آداب کی رعایت نہیں کرتے۔"[2]

[1] آل عمران: ۷۹

[2] بخاری، العلم، باب العلم قبل القول والعمل: ۱/۱۶

۲ حکومت کو برا بھلا کہنے کے بجائے لوگوں کو گناہوں سے بچانے کی فکر کرنی چاہیے

حکیم الامت حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

بعض لوگ بعض مصائب سے تنگ آ کر حکامِ وقت کو برا بھلا کہتے ہیں، یہ بھی علامت ہے بے صبری کی، پسندیدہ تدبیر نہیں ہے اور حدیث شریف میں اس سے ممانعت بھی آئی ہے فرماتے ہیں: "فَلَا تَشْغَلُوْا بِسَبِّ الْمُلُوْكِ" یعنی بادشاہوں کو برا مت کہو ان کے قلوب میرے قبضہ میں ہیں، میری اطاعت کرو میں ان کے دلوں کو تم پر نرم کر دوں گا[1] یاد رکھو جو مصیبت آتی ہے سب من جانب اللہ ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾[2]

ترجَمہ: "یعنی کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔"

اور جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس کا علاج یہی ہے کہ ادھر رجوع کرے اور پھر جو پیش آوے خیر سمجھے اس لیے کہ

ع ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود[3]

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ﴾[4]

ترجَمہ: "(اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ اس پر بھی وہی قادر ہے

[1] فیض القدیر: ۵/ ۴۷ — [2] التغابن: ۱۱

[3] فضائل صبر و شکر: ۳۱، ۳۳ — [4] الانعام: ۶۵

کہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے۔ یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے، یا تم کو مختلف گروہ گروہ کر کے سب کو بھڑا دے اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی چکھا دے، آپ دیکھیے تو سہی ہم کس طرح دلائل مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں، شاید وہ سمجھ جائیں۔"

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہٗ کے وسیع علم اور بے مثال قدرت کا یہ اثر مذکور تھا کہ ہر انسان کی ہر مصیبت کو وہی دور کر سکتا ہے، اور مصیبت کے وقت جو اس کو پکارتا ہے اللہ تعالیٰ کی امداد اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے، کیوں کہ اس کو تمام کائنات پر قدرت بھی کامل ہے اور تمام مخلوق پر رحمت بھی کامل، اس کے سوا نہ کسی کو قدرتِ کاملہ حاصل ہے اور نہ تمام مخلوق پر رحمت وشفقت۔

مذکور الصدر آیات میں قدرتِ کاملہ کے دوسرے رخ کا بیان ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ ہے کہ کوئی عذاب کوئی مصیبت اور کیسی ہی بڑی سے بڑی آفت ہو اس کو ٹال سکتا ہے اسی طرح اس کو اس پر بھی قدرت حاصل ہے کہ جب کسی فرد یا جماعت کو اس کی سرکشی کی سزا اور عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو ہر قسم کا عذاب دینا اس کے بس میں ہے، کسی مجرم کو سزا دینے کے لیے دنیا کے حکام کی طرح اس کو نہ کسی پولیس اور فوج کی حاجت ہے اور نہ کسی مددگار کی ضرورت۔

حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا اور مجاہد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا ہے: "اوپر کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ اور بے رحم حکام مسلط ہو جائیں، اور نیچے کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ اپنے نوکر، غلام اور خدمت گار یا ماتحت ملازم بے وفا، غدار، کام چور، خائن ہو جائیں۔"

رسول اکرم ﷺ کے چند ارشادات سے بھی حضرت عبداللہ بن عباس

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے، شعب الایمان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے:

"كَمَا تَكُونُونَ كَذٰلِكَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ." [1]

ترجمہ: "جیسے تمہارے اعمال بھلے یا برے ہوں گے ویسے ہی حکام اور اُمراء تم پر مسلط کیے جائیں گے۔"

فیض القدیر شرح الجامع الصغیر میں روایت ہے:

"كَمَا تَكُونُوا يُوَلَّى عَلَيْكُمْ." [2]

"اگر تم نیک اور اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار ہوگے تو تمہارے حکام و امراء رحم دل، انصاف پسند ہوں گے، اور اگر تم بدعمل ہوگے تو تم پر حکام بھی بے رحم اور ظالم مسلط کردیے جائیں گے۔"

مشہور مقولہ "اَعْمَالُكُمْ عُمَّالُكُمْ" کا یہی مفہوم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"أَنَا اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا مَالِكُ الْمُلْكِ، وَمَالِكُ الْمُلُوكِ، قُلُوبُ الْمُلُوكِ بِيَدِي، وَ إِنَّ الْعِبَادَ إِذَا أَطَاعُونِي حَوَّلْتُ قُلُوبَ مُلُوكِهِمْ عَلَيْهِمْ بِالرَّأْفَةِ وَالرَّحْمَةِ، وَ إِنَّ الْعِبَادَ إِذَا عَصَوْنِي حَوَّلْتُ قُلُوبَ مُلُوكِهِمْ عَلَيْهِمْ بِالسَّخَطِ وَالنِّقْمَةِ فَسَامُوهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ، فَلَا تَشْغَلُوا أَنْفُسَكُمْ بِالدُّعَاءِ عَلَى الْمُلُوكِ وَلٰكِنِ اشْغَلُوا أَنْفُسَكُمْ بِالذِّكْرِ وَالتَّضَرُّعِ إِلَيَّ، أَكْفِكُمْ مُلُوكَكُمْ." [3]

---

[1] شعب الإيمان للبيهقي: ۶/۲۲، رقم: ۷۰۰۶

[2] فيض القدير: ۵/۶۰، رقم: ۶۴۰۶ حرف الكاف

[3] حلية الأولياء، طبقة من أهل المدينة: ۲/۴۴۱، رقم: ۲۹۰۴

ترجمہ: "میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں سب بادشاہوں کا مالک اور بادشاہ ہوں، سب حکمرانوں کے قلوب میرے ہاتھ میں ہیں، جب میرے بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے حکمرانوں اور حکام کے دلوں میں ان کی شفقت و رحمت ڈال دیتا ہوں اور جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے حکام کے دل ان پر سخت کردیتا ہوں، وہ ان کو ہر طرح کا عذاب چکھاتے ہیں، لہٰذا تم اپنے آپ کو بادشاہوں کے لیے بددعا کرنے میں مشغول نہ رکھو، بلکہ تم اپنے آپ کو ذکر و رجوع الی اللہ میں پوری توجہ کے ساتھ مشغول رکھو، میں تمہارے لیے کافی ہو جاؤں گا تمہارے بادشاہوں کے بارے میں (یعنی انہیں تمہارا تابع بنادوں گا)۔"

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب اللہ تعالیٰ کسی امیر اور حاکم کا بھلا چاہتے ہیں تو اس کو اچھا وزیر اور اچھا نائب دیتے ہیں کہ اگر امیر سے کچھ بھول ہوجائے تو وہ اس کو یاد دلادے اور جب امیر صحیح کام کرے تو وہ اس کی مدد کرے، اور جب کسی حاکم و امیر کے لیے کوئی برائی مقدر ہوتی ہے تو برے آدمیوں کو اس کے وزراء اور ماتحت بنادیا جاتا ہے۔" [1]

ان روایات اور آیتِ مذکورہ کی متذکرہ تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو تکالیف اور مصائب اپنے حکام کے ہاتھوں پہنچتے ہیں، وہ اوپر سے آنے والا عذاب ہے اور جو اپنے ماتحتوں اور ملازموں کے ذریعہ پہنچتے ہیں وہ نیچے سے آنے والا عذاب ہے، یہ سب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتے، بلکہ ایک قانونِ الٰہی کے تابع اور انسان کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں، حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] أبو داؤد، الخراج والفيء والإمارة، باب في اتخاذ الوزير: ۲/۵۱

"جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو میں اس کا اثر اپنے نوکر ...... اور اپنی سواری کے گھوڑے اور باربرداری کے گدھے کے مزاج میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ یہ سب میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔"[1]

مولانا رومی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى نے فرمایا کہ:

خلق را با تو چنید بدخو کنند
تا ترا ناچار رو آں سو کنند

یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں تمہارے لیے بالادست حکام یا ماتحت ملازموں کے ذریعے تمہارے خلاف مزاج، تکلیف دہ معاملات کا ظاہری عذاب تم پر مسلط کرکے درحقیقت تمہارا رخ اپنی طرف پھیرنا چاہتے ہیں، تاکہ تم ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے اعمال کو درست کرکے آخرت کے عذابِ اکبر سے بچ جاؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا کی تفسیر کے مطابق حکام کا ظلم وجور اوپر سے آنے والا عذاب ہے۔

اور ماتحت ملازموں کی بے ایمانی، ...... کام چوری، ...... غداری، ...... نیچے سے آنے والا عذاب ہے، اور دونوں کا علاج ایک ہی ہے کہ سب اپنے اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بے راہ روی سے باز آجائیں تو قدرت خود ایسے حالات پیدا کردے گی کہ یہ مصیبت رفع ہو، ورنہ صرف مادّی تدبیروں کے ذریعے ان کی اصلاح کی امید اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ نہیں، جس کا تجربہ ہر وقت ہو رہا ہے۔

خویش را دیدیم و رسوائی خویش
امتحان ما مکن اے شاہ بیش

[1] ہمیں یہ روایت مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ ملی ہے۔ حضرت فضیل بن عیاض رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى فرماتے ہیں:
"أصلح ما أكون أفقر ما أكون ..... وإني لأعصي الله فأعرف ذلك في خلق حماري وخادمي ..... " (صفة الصفوة: ۲/۱۵۹، رقم: ۲۱۸)

اوپر اور نیچے کے عذاب کی جو مختلف تفسیریں آپ نے ابھی سنی ہیں درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں، کیوں کہ لفظ "عذابًا" جو اس آیت میں آیا ہے، درحقیقت ان تمام تفسیروں پر حاوی ہے، آسمان سے برسنے والے پتھر، ...... خون، آگ اور پانی کا سیلاب ...... اور بالادست حکام کا ظلم وجور ...... یہ سب اوپر سے آنے والے عذاب میں داخل ہیں، اور زمین شق ہو کر کسی قوم کا اس میں دھنس جانا ...... یا پانی زمین سے اُبل کر غرق ہو جانا، ...... یا ماتحت ملازموں کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہو جانا ...... یہ سب نیچے سے آنے والے عذاب ہیں۔[1]

۳ عوام میں اخوت کا جذبہ پیدا کرنا

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى فرماتے ہیں: کہ تہذیبی ولسانی تعصب، صوبائی تعصب بھی اس ملک کے لیے سخت خطرناک ہے۔ اسی تعصب نے بنگلہ دیش کو پاکستان سے کاٹ دیا۔ اس لسانی تعصب، صوبائی تعصب کے خلاف علماء کو دورے کرنے چاہئیں اور اس کے خلاف اسلام کے احکام بیان کرنے چاہئیں، حدیث میں آتا ہے:

"إِذَا اعْتَزَى أَحَدُكُمْ بِعَزَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَعِضُّوْهُ بِهَنِ أَبِيْهِ وَلَا تَكْنُوْا."[2]

تَرْجَمَہ: "جب تم میں سے کوئی شخص زمانۂ جاہلیت کی نسبت کے ساتھ اپنے کو منسوب کرے تو اس کے باپ کی "شرم گاہ" کٹواؤ (یعنی اس کو باپ کی گالی دو اور اس میں) اشارہ کنایہ سے کام نہ لو۔"

زبانِ نبوت جس پر وحی جاری ہوتی تھی، جس سے قرآن مجید دنیا نے سنا، جس کے متعلق آتا ہے کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی زبان سے کوئی نامناسب لفظ نہیں نکلتا تھا،

[1] معارف القرآن: ۳/۳۵۸ تا ۳۶۱
[2] "عمل اليوم والليلة" للنسائي، ص۲۸۳، رقم: ۹۸۱

پہلی مرتبہ اور آخری مرتبہ سخت ترین لفظ جو زبان نبوت ﷺ سے نکلے ہیں، "کوئی شخص تمہارے لیے جاہلیت کا نعرہ لگائے اور خاندان، برادری، قوم کی دہائی دے اور اس کام پر ابھارے تو اس کو اس کے باپ کی گالی دو، خالی کنایہ سے کام نہ لو" اَللّٰهُ اَکْبَرُ اللہ کے رسول جن کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور شہد ٹپکتا تھا اور قرآن مجید جن کی زبان سے جاری ہوتا تھا ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾[1] "اتنے سخت لفظ بولیں، مجھے یاد نہیں کہ آپ ﷺ نے کسی مسئلہ میں اتنے سخت لفظ استعمال کیے ہوں۔ آپ (ائمہ کرام) کا فرض ہے کہ آپ پاکستان کے صوبوں میں جائیں اور خاص طور پر تمام صوبوں کے بچوں کو یہاں بلائیں اور ان کو پڑھائیں اور ان کو ایسا عالم بنائیں کہ خود بخود ان کو اس عصبیت جاہلیہ سے نفرت پیدا ہو جائے، پھر ان کو اس صوبہ میں بھیجیں جس میں یہ لسانی، جغرافیائی تعصب پایا جاتا ہے۔ اس حمیت جاہلیہ نے ملکوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی اسلامی سلطنتوں کا چراغ گل ہو گیا۔

یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی زبان کا جادو لوگوں کے دل و دماغ پر بٹھا دیں ...... اور اپنی علمی قابلیت کا سکہ جما دیں،...... لیکن حقیقی احترام ...... عملی نمونہ، سیرت کی بلندی زہد و استغناء، روحانیت اور اخلاق عالیہ سے پیدا ہوتا ہے ...... علمی و فکری حیثیت سے بھی اخلاقی اور روحانی حیثیت سے بھی مؤثر شخصیتیں پیدا ہونی چاہئیں۔

ہمارے اکابر ایسے تھے، ہمارے اکابر ایسے تھے، ...... ہر وقت اس کی رٹ لگانا اور اس کا وظیفہ پڑھنا کچھ کام نہیں دیتا...... میں نے پچھلی مرتبہ یہیں جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ کوئی ملت اور کوئی دعوت تاریخ سے نہیں چلتی تحریک سے چلتی ہے۔

ہم پاکستان میں دعوت و مسلک، تاریخ سے نہیں چلانا چاہتے ہیں۔...... لوگ کہہ اٹھیں گے کہ صاحب سن چکے، بہت سن چکے، سنتے سنتے طبیعت بھر گئی، آپ کے اکابر ایسے

---

[1] النجم: ۳، ۴

ایسے تھے "پدرم سلطان بود، پدرم سلطان بود" بتائیے آپ کون ہیں؟

کام شروع کیجیے، تاریخ بہت سنائی جا چکی، کتابیں بہت لکھی گئیں، پورا کتب خانہ تیار ہے، اب حرکت اور عمل، جد و جہد و قربانی اور پرکشش و سحر انگیز زندگی کی ضرورت ہے۔

> وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
> علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی[1]

عصبیت ایک مہلک مرض

اس امت کی تباہی و بربادی، ذلت و پستی کے اسباب میں ایک بڑا سبب اختلاف و تفرقہ ہے، اگر امت مسلمہ میں اخوت و بھائی چارگی کی صفت پیدا ہو جائے تو ان شاء اللہ ہماری پستی بلندی سے، ذلت عزت سے بدل سکتی ہے۔

اختلاف کی وجوہ کثیرہ میں اگر غور کیا جائے تو اس کا سرچشمہ قومیت، لسانیت، عصبیت سمجھ میں آتا ہے، لہٰذا ضرورت ہے کہ اس مہلک مرض کے ازالہ کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

ان اوراق میں اس مرض کی قباحت پر قرآن و حدیث کی روشنی میں چند باتیں ناظرین (ائمہ کرام) کی خدمت میں پیش ہیں (جمعے کے خطبے میں یا درس وغیرہ کے موقع پر عوام الناس کو ضرور بتائیں)۔ حق تعالیٰ ان سطور کو راقم و ناظرین کے لیے نافع بنائیں، آمین!۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾[2]

---

[1] خطبات علی میاں: ۱/۸۶، ۸۷ [2] الحجرات: ۱۳

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت (آدم وحوا) سے پیدا کیا ہے، (پس اس میں سب برابر ہیں) اور (پھر جس بات میں فرق رکھا ہے کہ) تم کو مختلف قومیں اور (پھر ان قوموں میں) مختلف خاندان بنایا (سو محض اس لیے) تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو (جس میں بہت سی مصلحتیں ہیں، نہ اس لیے کہ ایک دوسرے پر تفاخر کرو دیکھو کہ) اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو (اور پرہیزگاری ایسی چیز ہے کہ اس کا حال کسی کو معلوم نہیں بل کہ اس کے حال کو محض) اللہ خوب جاننے والا (اور وہی اس سے) پورا خبردار ہے (پس اس پر بھی شیخی مت کرو) كَمَا قَالَ تَعَالٰى: ﴿فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ﴾ [1]

قرآن کریم کی اس آیت نے کیسے حکیمانہ انداز میں اس مرض کا علاج کیا کہ نسب اور خاندان کی بناء پر فخر وغرور درحقیقت کوئی تفاخر کی چیز نہیں، کیوں کہ تم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو، کسی کو کسی پر نسبی برتری حاصل نہیں۔ نسبی اور قومی تفاخر بے بنیاد ہے اور باہمی منافرت وعداوت کا پیش خیمہ ہے، اصل مدار شرافت تو تقویٰ ہے۔

اس آیت کا شان نزول بھی یہ بتلایا جا رہا ہے کہ قومیت ونسبیت کوئی بزرگی اور بڑائی کا ذریعہ نہیں، بل کہ ایمان اور تقویٰ باعث شرافت ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی، تو قریش مکہ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان میں سے عتاب بن اسید نے اذان سن کر کہا: "اللہ کا شکر ہے کہ میرے والد پہلے ہی وفات پا گئے، ان کو یہ روز بد دیکھنا نہیں پڑا۔" حارث بن ہشام نے کہا: "محمد ﷺ کو اس کالے کوے کے سوا کوئی اور آدمی نہیں ملا جو مسجد حرام میں اذان دے۔" (معاذ اللہ) سہیل بن عمرو نے کہا: "اگر خدا چاہے گا تو اس کی حالت بدل دے گا۔" ابوسفیان نے کہا: "میں کچھ نہیں کہتا ہوں کیوں کہ مجھے خطرہ

[1] النجم: ۳۲

ہے کہ میں کچھ کہوں گا تو آسمان کا مالک ان کو خبر دے دے گا۔" چناں چہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور آں حضرت ﷺ کو ان تمام گفتگو کی اطلاع دی۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو بلا کر اس کی بازپرس کی۔ انہوں نے اقرار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے بتلایا کہ فخر وعزت کی چیز درحقیقت ایمان و تقویٰ ہے، جس سے تم لوگ خالی اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آراستہ ہیں، اس لیے وہ تم سے افضل واشرف ہیں۔[1]

الغرض عزت کا مدار اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف تقویٰ اور اتباع شریعت وسنت پر ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا ارشاد خداوندی سے صاف ظاہر ہے۔ عارف جامی کا یہ شعر اس مضمون کو بخوبی ظاہر کر رہا ہے۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

البتہ انساب وقبائل کی تقسیم میں متعدد مصلحتیں اور حکمتیں پنہاں ہیں، من جملہ ان میں خاندان کے تفاوت سے ایک نام کے متعدد افراد میں امتیاز وفرق، اعزہ و اقارب کی صلہ رحمی کے حقوق ادا کرنا، تقسیم میراث میں حق دار کو حق ملنا وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ قبائل کی تفریق تفاخر کے لیے نہیں بل کہ تعارف کے لیے ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے صحیح لکھا: "خلاصہ یہ ہے کہ نسبی تفاوت کو تعارف کے لیے استعمال کرو تفاخر کے لیے نہیں۔"[2]

نبی اکرم ﷺ کے تعددِ ازواج کا ایک سبب عصبیت کا عملاً خاتمہ تھا

نبی اکرم ﷺ کی ایک سے زائد شادیوں کا ایک سبب خاندانی، علاقائی،

[1] معارف القرآن: ۱۲۴/۸
[2] معارف القرآن: ۱۲۵/۸

نسلی اور قبائلی عصبیت کا عملاً خاتمہ تھا، چناں چہ آپ ﷺ نے مختلف قبائل اور خاندانوں کی عورتوں سے شادی کر کے امت کے سامنے عملی نمونہ پیش کر کے ان تمام لعنتوں کا جو عرب کا سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی تھیں خاتمہ فرمادیا۔

آپ ﷺ نے بزرگی اور تقرب کے تصور پارینہ کو پارہ پارہ اور نسلی اور قومی احساس برتری کو پاش پاش کر دیا، مروجہ امتیازات مٹ گئے، اختلاف قومیت تخصیص رنگ ونسل، خاندانی وقبائلی بت فنا ہو گئے۔

آپ ﷺ نے جاہلی کبر ونخوت پر ضرب کاری لگاتے ہوئے انسانی غرور عصبیت کو کچل کر رکھ دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"وہ قومیں جو اپنے مردہ آباء واجداد پر فخر کرتی ہیں ان کو ان سے باز آنا چاہیے وہ جہنم کے کوئلے بن چکے ہیں، ورنہ پھر اللہ تعالیٰ کے نزدیک نجاست کے ان کیڑوں سے بھی ذلیل تر ہوں گے جو اپنی ناک سے نجاست کو دھکیلتے ہیں، اللہ تعالیٰ تم سے یقینی طور پر جاہلیت کی عصبیت اور باپ دادا پر فخر کرنے کو مٹا چکے ہیں۔"[1]

ظہور اسلام کے وقت مذاہب عالم اور اقوام وامم پر عصبیت، قومیت اور علاقائی وقبائلی اثرات چھائے ہوئے تھے جو انسان کے فکر ونظر پر غالب اور اس کے شعبۂ حیات پر حاوی تھے اور انسانوں کی زندگی کا لازمی عنصر بن کر رہ گئے تھے، یہودی اور نصرانی خود کو اللہ کی چہیتی اولاد قرار دیتے تھے، فراعنۂ مصر سورج کے اوتار کی صورت اختیار کیے ہوئے تھے، شاہان ایران اپنی اپنی رگوں میں خدائی خون کے دعویدار تھے، چینی اپنے شہنشاہ کو آسمان کا فرزند تصور کرتے تھے اور ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کی نسبت سورج اور چاند سے قائم کی گئی تھی، ایرانی اپنے رنگ کے فخر سے اتنے مغلوب تھے کہ وہ حبشیوں اور ہندوؤں کو "کوے" کہتے تھے، عرب اپنی نخوت اور شوکت کے مدنظر ساری دنیا کو عجم یا بے زبان سمجھتے تھے

[1] مشکوۃ، باب المفاخرۃ: (۱۷)

اور ہندوؤں نے طبقاتی تفوق کے لیے ذات پات کا نظام وضع کر رکھا تھا۔

جہاں تک عرب کا حال تھا، وہاں بھی یہی صورت حال پوری شدت کے ساتھ کار فرما تھی، عدنانی اور قحطانی قبائل کا باہمی تعصب اتنا شدید تھا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی اس کے اثرات گہرے تھے، پھر عدنانیوں میں مضر اور ربیعہ کی کشاکش بڑی ہی شدید تھی، اسی طرح قریش اور غیر قریش کی کشمکش ایک مستقل مسئلہ تھا اور خود قریش کے اندر، بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابتیں قدیم تھیں۔

اس باہمی تعصب نے نہ صرف آپس کی جنگ وخونریزی کو روا رکھا ہوا تھا، بلکہ نفرت وحقارت کا ایک ایسا سیلاب جاری کیا ہوا تھا جو تھمتا نہ تھا۔ اس حالت نے عربی قبائل کے اندر انفرادیت پسندی اتنی بڑھا دی تھی کہ ازدواجی تعلقات عموماً قبیلہ کے اندر ہی قائم کیے جاتے تھے۔

رسالت مآب ﷺ نے مختلف قبائل واقوام میں شادیاں کر کے صدیوں سے جاری مذاہب واقوام کی ان جاہلی اور خود ساختہ اقدار وروایات اور عصبیت کا قدیم حصار خاک آلود کر دیا۔

نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن جغرافیائی اعتبار سے جزیرۃ العرب کے مختلف قبائل کی نمائندگی کر رہی تھیں، ساتھ ہی اعلیٰ نسب اور بڑے رتبے والے خاندانوں کے فرد ہونے کی حیثیت سے اہم اقتدار واثرات کی حامل تھیں، چناں چہ مکہ معظمہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق بنو تیم سے، حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق بنو عدی سے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق بنو مخزوم سے، حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق بنو اسد ابن خزیمہ سے، حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق بنو امیہ سے تھا اور مکہ میں ان سے زیادہ بااثر کوئی خاندان نہ تھا۔

مکہ سے باہر ام المؤمنین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت

میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دونوں کا تعلق یمن کے طاقت ور قبیلہ معصد سے تھا۔ حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وسط عرب کے بنی مصطلق کے سردار کی اور حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا شمالی عرب کے بنو نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں۔

مذکورہ بالا حقائق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ زائد شادیاں قبائلی عصبیت کے خاتمہ اور پورے عرب اور مسلمان قوم کو وحدت اسلامی کی لڑی میں پرو کر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے راہیں ہموار کرنے کے لیے تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کوشش پوری طرح بار آور ثابت ہوئی۔[1]

لہٰذا ائمہ کرام کو چاہیے کہ اس تہذیبی و لسانی تعصب کے خاتمہ کے لیے مقتدیوں کی بھرپور تربیت فرمائیں، جمعہ کے وعظ اور درس کے ذریعے اس کی نفی کریں اور لوگوں کو بتایا جائے کہ ہم پہلے مسلمان ہیں اور بعد میں کسی قوم و قبیلہ سے وابستہ ہیں۔

❼ مثالوں کے ذریعے سمجھانا

مثالوں سے بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے اور اس بات کا ذہن پر اثر بہت جلد ہوتا ہے۔

❶ مثلاً یوں کہا جائے کہ دنیا میں گناہ گاروں کو بھی نعمتیں ملتی ہیں نیک لوگوں کو بھی ملا کرتی ہیں۔ اس دنیا کے اندر بعض اوقات گناہ گاروں پر نعمتوں کے بہت سے دروازے کھلے ہوئے نظر آتے ہیں طرح طرح کی نعمتوں کی مثلاً مال کی، اولاد کی ریل پیل نظر آتی ہے اور ان کی خواہشیں پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں جس سے لوگوں کو دھوکہ لگ جاتا ہے۔ تو اس کو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نعمتیں نہیں بلکہ فتح ابواب ہے پھر اس کے بعد

---

[1] ماہنامہ "الفاروق" کراچی شعبان ۱۴۲۱ھ

ہوتی چلی جاتی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ﴾[1]

ترجمہ: "پھر جب وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی، کھول دیے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے، یہاں تک کہ جب وہ خوش ہوئے ان چیزوں پر جو ان کو دی گئیں، پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک، اس وقت وہ رہ گئے ناامید۔"[2]

❷ اسی طرح دین داروں کو بھی نعمت ملتی ہے قرآنی اصطلاح میں وہ "حیٰوۃ طیبۃ" کہلاتی ہے۔ جیسے..... چوہے کو اپنے پنجرے کے اندر جو روٹی کا نوالہ یا گوشت کی بوٹی یا پنیر کا ٹکڑا نظر آتا ہے کہنے کے اعتبار سے گویا نعمت ہے، لیکن یہ نعمت انجام کے اعتبار سے نقمت (زحمت) ہے۔

❸ اسی طرح طوطے کو اس کے پنجرے کے اندر جو نعمت دی جاتی ہے وہ بھی ایک نعمت ہے، لیکن وہ دل بہلانے کے لیے نعمت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نیک شخص کو نعمت خوش ہو کر پاکیزہ انعام کے طور پر دیتے ہیں اور نافرمان پر جو ظاہری راحت آتی ہے اور اس کو جو نعمت ملتی ہے اس کو مہلت کہتے ہیں۔ اب سمجھے کہ فرماں بردار کو جو نعمتیں ملیں وہ ہیں فتح برکات..... اور گناہ گار کو جو اسباب عیش ملے وہ ہے فتح ابواب..... جس کا انجام ہے عذاب، چوہے کے پنجرے میں جو نعمت رکھی وہ اس کی پکڑ کے لیے رکھی اور طوطے کے پنجرے میں رکھی جانے والی نعمت اس کو خوش ہو کر دی۔

دونوں جگہ پنجرہ، دونوں جگہ نعمت ایک کو خوش ہو کر ایک سے ناراض ہو کر۔ نافرمان پر نعمتوں کے دروازے کھلیں تو سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نافرمانی کے باوجود

---

[1] الانعام: ۴۴
[2] معارف القرآن ۳/۳۱۷

نعمتوں سے نواز رہا ہے، یہ مجھ سے ناراضگی کے باوجود چیزوں کا ملنا، پکڑے کے لیے یہ ہو یہ چوہے کے پنجرے والی نعمت ہے۔ یعنی چوہے بہت بڑھ گئے ہیں گھر کے اندر پنجرے میں طرح طرح کی نعمتیں رکھ دیں اور سب دروازے کھول دیے اب آیا ایک چوہا پھر سارے چوہے آئے اور کہا، واہ واہ...... نعمتیں ہی نعمتیں، اور دروازے بھی سب کھلے ہوئے ہیں۔ نصیحت کرنے والے کسی چوہے نے کہا اور سمجھایا کہ یہ جو نعمتیں ہیں ان کے پیچھے مصیبتیں ہیں تو جواباً ان چوہوں نے اس سے کہا ارے او نیک بخت پرانے خیال کا! اپنی نصیحت اپنے ہی پاس رکھ، نعمتیں پڑی ہیں ان کو کہہ رہا ہے مصیبت ہے، دیکھ جب تو سوکھی روٹی کے ٹکڑے کھائے گا تو پچھتائے گا، پاگل کہیں کا۔ کہیں آ جا بھی نہیں سکے گا۔ پھر نیک چوہے نے کہا: اگر تم یہ نعمتیں کھا جاؤ گے (جو در اصل مصیبتیں ہیں) تو پکڑے جاؤ گے اور گھر والے بہت خوش ہوں گے کہ پکڑے گئے۔

تمھیں دیکھ کر بچے کودیں گے خوشی کے مارے اور تم اندر کودو گے غم کے مارے۔ پھر عورتیں آئیں گی سب تمھیں دیکھیں گی گرم پانی تمہارے اوپر ڈالا جائے گا، پھر سڑک پر تمھیں پھینک دیا جائے گا، پھر جب تم آدھے مرے ہوئے ہو جاؤ گے تو بلی آکر تمھیں نوچ نوچ کر کھا جائے گی، لیکن ابھی یہ ساری باتیں غیب میں ہیں یعنی تم سے پوشیدہ ہیں۔ تو ان سب چوہوں نے کہا اچھا ہم ذرا ریسرچ (Research) کر لیں۔ اب کہاں ریسرچ (Research) کریں؟ ارے جہنم اور جنت کی جب انسان ریسرچ (Research) کرے گا تو کہاں کرے گا؟ اس زمین و آسمان کے درمیان کرے گا۔ تو زمین اور آسمان کے درمیان جنت اور جہنم تو ہیں نہیں، وہ تو موت کے بعد نظر آئیں گی۔ جیسے ماں کے پیٹ کے اندر جو بچہ ہے وہ گھرا ہوا ہے اور اصول یہ ہے کہ جو گھرا ہوا ہو وہ اپنے گھیرنے والے کو دیکھ نہیں سکتا۔ چناں چہ ماں کے پیٹ کے اندر کے بچے کو ماں کا پورا وجود سمجھ میں نہیں آسکتا، اسی طرح جو زمین

و آسمان کے اندر گھرا ہوا ہے اس کو آسمانوں سے اوپر کی اور زمین کے اندر کی چیزوں کا کیا معلوم؟ اگر کوئی ماں کے پیٹ کے اندر موجود بچے سے کہے کہ کچھ خبر بھی ہے تیری ماں کے پیٹ کے باہر بڑے بڑے ہوائی جہاز ہیں، ریلیں (trains) چل رہی ہیں، چاند سورج اور زمین اور آسمان بھی موجود ہیں اور بچہ کہے کہ اچھا میں ذرا ریسرچ (Research) کروں گا۔ اچھا ماں کے پیٹ میں ریسرچ (Research) کرے گا؟

اب یہ کیا کہے گا، جس کی ابھی نہ ناک ہے نہ کان کہ کہاں ہیں ہوائی جہاز اور ریل گاڑی اور زمین اور آسمان، بے کار کی بات ہے؟ اب اگر آپ اس سے کہیں گے کہ جہاں یہ چیزیں اصل میں ہیں وہاں تو دیکھ نہیں سکتا، اور جہاں تو دیکھ رہا ہے وہاں یہ چیزیں ہیں ہی نہیں تو دکھائی کیا دے گا؟ ایسے ہی بعض دہریے جو آج بے دینی میں آگے بڑھ رہے ہیں ان کو اگر روکو گناہوں سے اور انجام بتاؤ جہنم کی سزا کا تو جواب کہتے ہیں کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ ارے نظر کہاں سے آئے گا؟ ہم زمین و آسمان کے بیچ میں گھرے ہوئے ہیں تو کیسے دیکھیں گے، اس سے تو یہی کہا جائے گا کہ مرنے کے بعد پتا چلے گا، جیسے بچے کو پیٹ سے نکلتے ہی سب سمجھ میں آ جاتا ہے۔ ایسے ہی اس بے دین کو مرتے ہی سب کچھ نظر اور سمجھ آ جائے گا مگر اس وقت سمجھنا بے فائدہ ہوگا۔

۲ کسی نے نیا اے سی (A C) یعنی ایئر کنڈیشنڈ خرید کر چلایا، دروازہ کھڑکی سب کھلے رکھے، چار گھنٹے چلانے کے بعد بھی کمرہ ٹھنڈا نہیں ہوا، وہ شکایت لے کر دکان دار کے پاس گیا کہ آپ نے کہا تھا آدھے گھنٹے میں کمرہ میں ٹھنڈک ہو جائے گی میں نے چار گھنٹے چلایا کمرہ ٹھنڈا ہی نہیں ہوا تو دکان دار اس کو یہی جواب دے گا، اے سی (A C) میں کوئی خرابی نہیں ہے، صرف آپ دروازہ بند کر دیں کھڑکیاں بند کر دیں، آپ بہت جلد کمرہ کو ٹھنڈا پائیں گے۔

اسی طرح اعمال کے نتائج جو ہم چاہتے ہیں وہ اس لیے موصول نہیں ہو رہے کہ نیکیاں کرنے کے ساتھ ساتھ ہم گناہوں کو نہیں چھوڑتے، لہٰذا ہمیں نیکیوں کے نتائج

حاصل کرنے کے لیے گناہوں کو چھوڑنا ہوگا، کسی کا دل دکھانے سے بچنا ہوگا، کسی کا ناجائز حق دبانے سے بچنا ہوگا...... پھر ہماری دعائیں بھی قبول ہوں گی، ہمارے وظائف کا بھی اثر ہوگا۔

۵ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب "اکابر دیوبند کیا تھے" میں لکھتے ہیں کہ ایک روز حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے مکان سے تشریف لائے مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج ہم ایک عجیب تماشا دیکھ کر آئے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس تماشے کی حقیقت سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگئے۔

فرمایا کہ "محلہ کوطلہ سے باہر جنگل میں چند چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بیٹھی ہوئی آپس میں لڑ رہی تھیں، ایک دوسرے کو مار رہی تھیں۔ ہم قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ سب مل کر جنگل سے گوبر چن کر لائی ہیں اور ایک جگہ ڈھیر کر دیا ہے اب اس کی تقسیم کا مسئلہ زیرِ نزاع ہے۔ حصوں کی کمی بیشی پر لڑنے مارنے پر تلی ہوئی ہیں۔

اول نظر میں مجھے ہنسی آئی کہ یہ کس گندی اور ناپاک چیز پر لڑ رہی ہیں۔ ہم ان کی کم عقلی اور بچگانہ ذہنیت پر ہنستے ہوئے ان کی لڑائی بند کرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ قدرت نے دل میں ڈالا کہ ان کی بے وقوفی پر ہنسنے والے جو دنیا کے مال و اسباب اور جاہ و منصب پر لڑتے ہیں اگر ان کو چشمِ حقیقت بین نصیب ہو جائے تو وہ یقین کریں گے کہ ان عقلاءِ زماں اور حکماءِ وقت کی سب لڑائیاں بھی ان بچیوں کی جنگ سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں۔ فنا ہو جانے والی اور چند روز میں اپنے قبضہ سے نکل جانے والی یہ سب چیزیں بھی آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں ایک گوبر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

غور کیجیے اس طرح کے سینکڑوں واقعات سب کی نظروں سے گزرتے ہیں مگر

کہاں ہے وہ نظر و فکر جو ان سے عبرت حاصل کرے؟[1]

۸ وعظ میں انبیاء اور صحابہ کے قصے بیان کرنا

انبیاءِ کرام کی جماعت وہ جماعت ہے، جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے منتخب فرمایا، اور ان کا ذکر خیر قرآن کریم میں بار بار فرمایا۔ ان کے تذکروں میں جو نور ہوگا وہ کسی اور میں نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اپنے ایمان کی مضبوطی اور اپنے مقتدیوں اور عام مسلمانوں کی تربیت کے لیے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حالات کا ذکر کریں، ان کے ایمانی واقعات کو بیان کیجیے، ان کی دعوت کو بیان کیجیے، کس طرح کفر و شرک کے خلاف انہوں نے توحید کی طرف لوگوں کو بلایا۔ اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے واقعات بیان کیجیے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جماعت وہ جماعت ہے جس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے تمام بندوں کے دلوں پر پہلی دفعہ نگاہ ڈالی تو ان میں سے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو پسند فرمایا، اور انہیں اپنا رسول بنا کر بھیجا، اور ان کو اپنا علم خاص عطا فرمایا۔ پھر دوبارہ لوگوں کے دلوں پر نگاہ ڈالی اور آپ کے لیے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو چنا، اور ان کو اپنے دین کا مددگار اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری اٹھانے والا بنایا۔ لہٰذا جس چیز کو مومن (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اچھا سمجھیں گے وہ چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اچھی ہوگی، اور جس چیز کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم برا سمجھیں گے وہ چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی بری ہوگی۔"[2]

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم نے اپنی مجلسوں میں، بیانات میں، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تذکرے چھوڑ گئے، بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسے ہیں

[1] "اکابر دیوبند کیا تھے" ۵۹

[2] حلیة الأولیاء، ذکر اهل الصفة: ۱/۳۶۰، رقم: ۱۲۹۷

جن کے نام بھی ہمیں یاد نہیں۔ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسے ہیں جن کے کارناموں کا ہمیں تعارف بھی نہیں۔ لہٰذا آج سے نیت کیجیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تذکرے کو عام کریں گے، اس پر افسوس کرتے ہوئے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں پر ایک ایسا وقت بھی آیا جب وہ اس تاریخ سے بے گانہ ہو کر اس کو فراموش کر بیٹھے، ہمارے اہلِ وعظ وارشاد اور اہلِ قلم و مصنفین نے اپنی تمام تر توجہ اولیاء متاخرین کے واقعات اور اربابِ زہد و مشیخت کی حکایات، بیان کرنے پر صرف کر دی اور لوگ بھی اس پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ وعظ وارشاد کی مجالس، درس و تدریس کے حلقے اور اس دور کی ساری تصانیف اور کتابیں ان ہی واقعات سے بھر گئیں اور سارا علمی سرمایہ صوفیائے کرام کے احوال و کرامات کی نذر ہو گیا۔"[1]

صرف اپنے شیخ کے حالات بیان کرنے یا ایک دو صدی پرانے مشائخ کے واقعات بیان کرنا بھی باعثِ خیر ہے ہی، اس کا بھی فائدہ ضرور ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اور بڑا فائدہ اور نتیجہ کے اعتبار سے زیادہ مفید صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے واقعات بیان کرنا ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر امت متفق ہو جائے گی، ہو سکتا ہے آپ کے مقتدیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں جن کو آپ کے شیخ یا آپ کے مسلک کے اکابر سے وہ عقیدت و تعلق نہ ہو جو آپ کو ہے۔

لیکن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ آپ کے تمام مقتدی (چاہے وہ آپ کے مسلک کے خلاف ہوں) معتقد ہوں گے، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی قربانی بڑی ہے، ان کے مجاہدے انوارات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے تذکرے سے ایمان میں ترقی، نئی نسلوں میں جوشِ ایمانی کو بیدار کرنے، حمیتِ اسلامی پیدا کرنے، اور اللہ تعالیٰ کے حکموں پر سب کچھ قربان

[1] مقدمہ حیاۃ الصحابہ (اردو) ۲۰/۱

کرنے کا جذبہ بنانے کے لیے ان کے واقعات کا بیان کرنا بہت ہی مفید ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جو آدمی کسی کے طریقے کو اختیار کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ ان لوگوں کا طریقہ اختیار کرے جو دنیا سے جا چکے ہیں، اور یہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں جو کہ اس امت میں سب سے بہترین اور سب سے زیادہ نیک دل اور سب سے زیادہ گہرے علم والے اور سب سے کم تکلف برتنے والے تھے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے اور اپنے دین پھیلانے کے لیے چن لیا ہے۔ لہٰذا ان جیسے اخلاق اور ان جیسی زندگی گذارنے کے طریقے اپناؤ۔ ربِ کعبہ کی قسم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ تمام صحابہ ہدایتِ مستقیم پر تھے۔[1]

لہٰذا ائمہ کرام کو چاہیے کہ وہ ایسی کتابوں کا مطالعہ فرمایا کریں جن میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے صحیح واقعات مذکور ہوں خاص طور پر حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی شہرۂ آفاق کتاب "حیاۃ الصحابہ" کا مطالعہ ضرور فرمایا کریں جس کی اہمیت کا اندازہ مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے فرمایا:

"اس کتاب کے اندر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے وہ حالات و واقعات درج ہیں جن کا کسی ایک کتاب میں ملنا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ یہ قصے اور حکایات مختلف حدیث کی کتابوں یا تاریخ وطبقات کے مجموعوں اور کتبِ مسانید سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ ایک ایسا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) تیار ہو گیا ہے جو اس زمانے کی تصویر سامنے رکھ دیتا ہے، جس میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زندگی، ان کے اخلاق وخصائص کے تمام پہلوؤں اور باریکیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔

واقعات وروایات کے استقصاء (پوری کوشش) اور مکمل بیان کی وجہ سے

[1] حلیۃ الأولیاء، ذکر الصحابۃ من المهاجرین: ۳۷۹/۱، رقم: ۱۰۶۵

کتاب میں ایک ایسی تاثیر پیدا ہوگئی ہے جو ان کتابوں میں نہیں پائی جاتی جو ادبِ عالی واختصار اور معانی کے اظہار پر تصنیف کی جاتی ہیں۔ اس کے لیے ایک قاری اس کی وجہ سے ایمان ودعوت، سرفروشی اور فضیلت اور اخلاص وزہد کے ماحول میں وقت گزارتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ کتاب مؤلف کا عکسِ جمیل اور جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے اور جس کیفیت ومعنویت، جذبہ، لگن، روح اور تاثیر سے تصنیف کی جاتی ہے، اس کی مظہر ہوتی ہے، تو میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب موثر، طاقت ور اور کامیاب ہے چوں کہ صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ کی محبت، ان کی رگ وریشہ میں سرایت کرچکی تھی اور دل ودماغ میں رچ بس گئی تھی، اس لیے مؤلف نے اس کو جس عقیدت، جذبِ الفت اور جوشِ محبت کی لازوال کیفیات کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

مؤلف کی عظمت واخلاص کے پیش نظر اس کتاب کو کسی مقدمے کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہ خود جہاں تک میرے علم میں ہے، ایمان کی قوت، دعوت میں فنائیت اور یک سوئی کے اعتبار سے عطیۂ ربانی اور زمانے کی حسنات میں سے تھے، اور ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

وہ ایک ایسی دینی تحریک ودعوت کی قیادت کررہے تھے جو وسعت وطاقت، عظمت اور اثر انگیزی میں سب سے بڑی تحریک ہے، لیکن اس ناچیز کو انہوں نے اس کے ذریعہ عزت بخشی اور اس عظیم الشان کام میں اس کا بھی حصہ ہوگیا۔ تقرب الی اللہ میں میں نے یہ کلمات تحریر کردیے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولِ عام عطا فرمائے اور بندگانِ خدا کو نفع پہنچائے۔"[1]

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرماتے تھے اہلِ علم اس کتاب (حیاۃ الصحابہ) کو کئی مرتبہ پڑھیں، بار بار پڑھیں، اس کے مطالعہ سے ان پر

[1] مقدمہ حیاۃ الصحابۃ (اردو) ۲۳،۲۲/۱

صحابہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ کی زندگی کھلے گی۔

وعظ اور درس میں انبیاء عَلَیْہِمُ السَّلَامُ اور صحابہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ اَجْمَعِیْنَ کے مستند قصے بیان کرنے کے لیے ائمہ حضرات کو یہ کتابیں اپنے پاس رکھنی چاہئیں۔

قصص القرآن	(مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی)	
قصص الانبیاء	(امام حافظ ابن کثیر)	
قصص الانبیاء	(مولانا عبد العزیز ہزاروی)	
قصص الاحادیث	(مولانا زکریا اقبال)	(دار الاشاعت کراچی)
صحابہ کے واقعات	(ترجمہ محمد حنیف عبد المجید)	(دار الہدیٰ کراچی)
تابعین کے واقعات	(ترجمہ محمد حنیف عبد المجید)	(دار الہدیٰ کراچی)
صحابہ کی زندگی	(محمد حنیف عبد المجید)	(مکتبہ بیت العلم کراچی)

ائمہ کرام کو درس دینے اور تقریر کرنے میں آسان اور عام فہم انداز اختیار کرنا چاہیے

ائمہ ایسا درس ہرگز نہ دیں جو مقتدیوں کی سمجھ اور استعداد سے بالاتر ہو اس میں بھی حضور صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی پیروی کریں قرآن وحدیث کی روشنی میں اہلِ علم فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ حکم ہوا ہے کہ لوگوں کے مراتب کا لحاظ رکھیں اور ان کی عقل وسمجھ کے مطابق ان سے گفتگو کریں اور فرمایا کہ کوئی کسی قوم کے سامنے ایسی بات کرتا ہے جس کو وہ نہیں سمجھ سکتے تو وہ فتنے کا سبب بن جاتی ہے۔[1]

اور امام بخاری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے بخاری شریف کے اندر ایک باب باندھا ہے:

"بَابُ مَنْ تَرَكَ بَعْضَ الْإِخْتِيَارِ مَخَافَةَ أَنْ يَقْصُرَ فَهْمُ بَعْضِ

[1] آداب المعلمین: ۴۸

"النَّاسِ عَنْهُ فَيَقَعُوْا فِي أَشَدَّ مِنْهُ." [1]

یعنی "یہ باب ان لوگوں کے بیان میں ہے جنہوں نے بعض علوم کے بیان کو اس لیے چھوڑا کہ عام لوگوں کی سمجھ اس سے قاصر ہے تاکہ وہ مشقت میں نہ پڑ جائیں۔"

اسی طرح بخاری شریف میں ایک روایت ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حطیم کے متعلق پوچھا: "کہ وہ بیت اللہ میں داخل ہے کہ نہیں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "داخل ہے" حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا: "اس کو بیت اللہ میں شامل کیوں نہیں کیا؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قریش کے پاس خرچہ ختم ہو گیا تھا" پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دروازے کے بارے میں پوچھا: "یہ اونچا کیوں ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ اس لیے کہ تیری قوم جس کو چاہے داخل کرے اور جس کو چاہے روک سکے" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد فرمایا: "عائشہ اگر مجھے تمہاری قوم کے فساد کا خطرہ نہ ہوتا (کہ زمانہ جاہلیت کے قریب ہیں) تو میں حطیم کو بیت اللہ میں داخل کرتا اور دروازہ زمین سے ملاتا۔" [2]

علماء کرام فرماتے ہیں کہ قریش کی کم فہمی کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کو بنیاد ابراہیم علیہ السلام پر نہ بنا سکے اور یہ عظیم کام قریش کی کم فہمی کی وجہ سے چھوڑ دیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں بہت سے علوم ہیں بشرطیکہ ان کا سمجھنے والا ہو یعنی میں ان کو اس لیے ظاہر نہیں کرتا کہ ان علوم کا کوئی متحمل نہیں۔ [3]

[1] بخاری، کتاب العلم: ۱/۲۴

[2] بخاری، المناسک، باب فضل مکۃ وبنیانہا: ۱/۲۱۵، ۲۱۶، رقم: ۱۵۸۶

[3] آداب المتعلمین: ۸

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

"حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ أَتُحِبُّوْنَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ." [1]

ترجمہ: "لوگوں کو اتنا بتاؤ جتنا وہ سمجھیں، کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے۔"

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر کلام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس کے سامنے ایسے مسائل بیان ہی نہ کرے، اسی لیے حضرات فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد لکھ دیتے ہیں: "هٰذَا مِمَّا يُعْرَفُ وَلَا يُعَرَّفُ"۔ [2]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

"مَا أَنْتَ بِمُحَدِّثٍ قَوْمًا حَدِيْثًا لَا تَبْلُغُهُ عُقُوْلُهُمْ إِلَّا كَانَ لِبَعْضِهِمْ فِتْنَةً." [3]

ترجمہ: "کسی قوم کے سامنے ایسی بات مت کرو جو وہ نہ سمجھیں ورنہ وہ بات فتنہ کا سبب بن جائے گی۔"

امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"لَا يَنْبَغِيْ لِلْعَالِمِ أَنْ يَّتَكَلَّمَ بِالْعِلْمِ عِنْدَ مَنْ لَا يُطِيْقُهُ." [4]

ترجمہ: "صاحب علم کے لیے مناسب نہیں کہ کسی شخص کے سامنے ایسی بات کرے، جس کا سمجھنا اس کی عقل سے بالاتر ہو۔"

بزرگوں کا ارشاد ہے "منتہی کے علوم مبتدی کے سامنے بیان نہ کیے جائیں اور

[1] بخاری، العلم، باب من خص بالعلم: ۱/۲۴ [2] معارف القرآن: ۱/۴۰۳

[3] مقدمۃ مسلم: ۱/۹ [4] الباب المعجب: ۱۵۷

متعلم کے سامنے اس کے فہم کے مطابق تقریر کی جائے ورنہ طلبہ کو نفرت ہو جائے گی۔

حضرت یونس بن عبدالاعلی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے ہماری سمجھ کے مطابق تقریر کرتے تھے اس لیے ہم سمجھ جاتے تھے۔ اگر وہ اپنی عقل کے مطابق فرماتے تو ہم بالکل نہ سمجھ پاتے۔[1]

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”طالب علم (یا مقتدی) کے سامنے ایسی بات نہ کی جائے جس کا وہ اہل نہ ہو ورنہ نقصان ہوگا۔“

ائمہ حضرات کو چاہیے کہ وہ درس اور وعظ کا خلاصہ نکال کر مقتدیوں کے سامنے سہل اور عام فہم انداز میں پیش کر دیں، تاکہ پورے درس یا وعظ کا خلاصہ ان کو یاد ہو سکے، اس کے دو فائدے ہوں گے ایک یہ کہ اس پر عمل کرنا آسان ہوگا اور دوسرا یہ کہ اگر آگے کسی کو سنانا پڑے تو آسانی سے بیان کر سکے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے پیش نظر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا“۔[2]

ترجمہ: ”آسانی پیدا کرو سختی نہ کرو۔“

بات مثبت انداز سے سمجھائی جائے

ائمہ حضرات کو چاہیے کہ جمعہ کے وعظ میں ان باتوں کا خیال رکھیں:

1. نیت عالم بھر کے انسانوں کی کریں۔
2. مثبت انداز میں بات کریں۔
3. آج کل کیا ہو رہا ہے اس کو بیان نہ کریں۔ معاشرے میں جو برائیاں ہو رہی ہیں اس کا ذکر کرنے کے بجائے ان برائیوں کو کس طرح دور کیا جائے ان سے

[1] حلیۃ الاولیاء، ذکر تابعی التابعین: ۹/۱۴۴، رقم: ۱۳۴۳۵
[2] صحیح بخاری، العلم: ۱/۱۶

کس طرح بچا جائے یا بچانے کی کوشش کی جائے ان کی تدابیر بیان کریں۔

اور یہ اصول حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مشہور قول سے لیا گیا ہے:

”اِنَّ لِلّٰہِ عِبَادًا یُمِیْتُوْنَ الْبَاطِلَ بِھَجْرِہٖ وَیُحْیُوْنَ الْحَقَّ بِذِکْرِہٖ“۔[1]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ جو باطل کو ختم کرتے ہیں اس کے چھوڑنے کے ساتھ اور حق کو زندہ کرتے ہیں اس کے ذکر کے ساتھ۔“

آپ جن حق باتوں کو وجود میں لانا چاہتے ہیں اس کو خوب ذکر کریں اس کے فوائد...... منافع،...... فضائل،...... حکمتیں...... بیان کیجیے اور جن باتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں اس کا ذکر اس طرح ہو کہ ”معاشرے میں یہ یہ ہو رہا ہے“ ان باتوں کو ذکر نہ کریں۔

غور فرمایئے کہ آپ کو پندرہ (۱۵) منٹ وعظ کے لیے ملتے ہیں اور اس میں سے بارہ منٹ صرف معاشرے کی برائیوں کے ذکر پر لگ جاتے ہیں اور تین (۳) منٹ ان برائیوں کے ارتکاب کرنے والوں کی غیبت میں لگ جاتے ہیں تو مقتدیوں کو ان برائیوں کا علاج تو نہ ملا، نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ جمعہ یہ مقتدی حضرات بھی نہیں آئیں گے بلکہ عین خطبہ کے وقت پر پہنچیں گے۔

4. جمعہ کے وعظ میں ڈانٹ ڈپٹ کا انداز ہرگز نہ ہو کہ اس سے اصلاح کم اور مفاسد زیادہ ہوتے ہیں۔

اکابر علماء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے جو ”تربیت کرنے والے لوگوں“ (ائمہ حضرات) کو نصیحتیں فرمائی ہیں ان میں یہ بھی ہے:

”لَا تُکْثِرِ الْقَوْلَ عَلَیْہِ بِالْعِتَابِ فِیْ کُلِّ حِیْنٍ فَلَا یُؤَبِّخْہُ اِلَّا

[1] حلیۃ الاولیاء، ذکر الصحابۃ من المہاجرین: ۱/۹۲، رقم: ۱۵۴

أَحْيَانًا." [۱]

ترجمہ: "لوگوں کو ہر وقت ڈانٹ مت پلایا کرو بلکہ کبھی کبھار ڈانٹا کرو۔"

اسی طرح فقیہ سحنون رحمہ اللہ تعالیٰ ایک معلم کو اس کے بیٹے کے بارے میں نصیحت کرتے فرماتے ہیں:

"لَا تُؤَدِّبْهُ إِلَّا بِالْمَدْحِ وَلَطِيفِ الْكَلَامِ وَلَيْسَ هُوَ مِمَّنْ يُؤَدَّبُ بِالضَّرْبِ أَوِ التَّعْذِيبِ." [۲]

ترجمہ: "اس کی تربیت تعریفی اور نرم کلمات سے کریں کیونکہ یہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کی تربیت مارنے اور سزا دینے سے کی جاتی ہے۔"

ائمہ حضرات کو چاہیے کہ اپنے وعظ سے پہلے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے مواعظ "اصلاحی خطبات" کا مطالعہ فرما لیا کریں تو بہت زیادہ مفید رہے گا۔

❺ اس بات کا بھی خیال رہے کہ وعظ روزانہ نہ ہو تاکہ مخاطبین پر بوجھ نہ ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت میں اس کا بڑا لحاظ رہتا تھا کہ مخاطب پر بوجھ نہ ہونے پائے اور اکتا نہ جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ کے بعض ایام ہی میں وعظ فرماتے تھے تاکہ ہم اکتا نہ جائیں، اور دوسروں کو بھی آپ کی طرف سے یہی ہدایت تھی۔ [۳]

❻ اسی طرح مختلف فیہ اور الجھانے والے مسائل جس سے فتنہ و فساد اور نفرت

---

[۱] التربیۃ الاسلامیۃ ورسالۃ معلمھا ۱۸۸

[۲] تربیۃ الاطفال فی رحاب الاسلام فی البیت والروضۃ: ۲۰۵

[۳] بخاری، العلم، باب ما کان النبی یتخولھم بالموعظۃ۔۔۔: ۱۶/۱

پھیلنے کا اندیشہ ہو وعظ میں بیان نہ کریں۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا." [۱]

ترجمہ: "لوگوں پر آسانی کرو دشواری پیدا نہ کرو اور ان کو (اللہ تعالیٰ کی رحمت) کی خوش خبری سناؤ، اور متنفر نہ کرو۔"

امام اپنے بڑوں کو کس طرح نصیحت کرے

اپنے بڑوں کو نصیحت کرنے کا طریقہ اور اس کے آداب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے جس کو حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تفسیر میں اس طرح نقل کیا ہے، فرماتے ہیں ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے والد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْـًٔا ۝ يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ ٱلْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَٱتَّبِعْنِيٓ أَهْدِكَ صِرَٰطًا سَوِيًّا ۝ يَٰٓأَبَتِ لَا تَعْبُدِ ٱلشَّيْطَٰنَ ۖ إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا ۝ يَٰٓأَبَتِ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ ٱلرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَٰنِ وَلِيًّا ۝﴾ [۲]

ترجمہ: "اے ابا جان! آپ ان کی پوجا پاٹ کر رہے ہیں جو نہ سنیں نہ دیکھیں، نہ آپ کو کچھ بھی فائدہ پہنچا سکیں میرے مہربان باپ! آپ دیکھیے میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس آیا ہی نہیں تو آپ میری ہی مانیں میں بالکل سیدھی راہ کی طرف آپ کی رہبری کروں گا، میرے ابا جان! آپ شیطان کی پرستش سے باز آ جائیں شیطان تو رحم

---

[۱] بخاری العلم: ۱۶/۱　[۲] المریم: ۴۲ تا ۴۵

کرم والے اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی نافرمان ہے، ابا جی مجھے خوف لگا ہوا ہے کہ کہیں آپ پر کوئی عذاب الٰہی نہ آپڑے کہ آپ شیطان کے ساتھی بن جائیں۔"

﴿ یٰٓاَبَتِ ﴾ عربی لغت کے اعتبار سے یہ لفظ باپ کی تعظیم ومحبت کا خطاب ہے۔ حضرت خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو حق تعالیٰ نے جو مقام جامعیت، اوصاف و کمالات کا عطا فرمایا تھا، ان کی یہ تقریر جو اپنے والد کے سامنے ہو رہی ہے؛ اعتدال مزاج اور رعایتِ اضداد کی ایک بے نظیر تقریر ہے کہ ایک طرف باپ کو شرک وکفر اور کھلی گمراہی میں نہ صرف مبتلا بلکہ اس کا داعی دیکھ رہے ہیں، جس کے مٹانے ہی کے لیے حضرت خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا کیے گئے ہیں۔ دوسری طرف باپ کا ادب اور عظمت ومحبت ہے ان دونوں ضدوں کو حضرت خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے کس طرح جمع فرمایا؛

اول تو ﴿ یٰٓاَبَتِ ﴾ کا لفظ جو باپ کی مہربانی اور محبت کا داعی ہے ہر جملہ کے شروع میں اس لفظ سے خطاب کیا۔ پھر کسی جملہ میں باپ کی طرف کوئی لفظ ایسا منسوب نہیں جس سے اس کی توہین یا دل آزاری ہو کہ اس کو گمراہ یا کافر کہتے بلکہ حکمتِ پیغمبرانہ کے ساتھ صرف ان کے بتوں کی بے بسی اور بے حسی کا اظہار فرمایا کہ ان کو خود اپنی غلط روش کی طرف توجہ ہو جائے۔

دوسرے جملہ میں اپنی اس نعمت کا اظہار فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو علوم نبوت کی عطا فرمائی تھی۔

تیسرے اور چوتھے جملے میں اس انجام بد سے ڈرایا جو اس شرک وکفر کے نتیجہ میں آنے والا تھا۔ اس پر بھی باپ نے بجائے کسی غور وفکر یا یہ کہ ان کی فرزندانہ گزارش پر کچھ نرمی کا پہلو اختیار کرتے، پورے تشدد کے ساتھ خطاب کیا۔

انہوں نے تو خطاب ﴿ یٰٓاَبَتِ ﴾ کے پیارے لفظ سے کیا تھا جس کا جواب

عرف میں "یا بنی" کے لفظ سے ہونا چاہیے تھا مگر آزر نے ان کا نام لے کر ﴿ یٰٓاِبْرٰهِیْمُ ﴾ سے خطاب کیا اور ان کو سنگسار کر کے قتل کرنے کی دھمکی اور گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

اس کا جواب حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے کیا ملتا ہے وہ سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہے فرمایا:

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ﴾ یہاں لفظ سلام دو معنے کے لیے ہو سکتا ہے۔

اول یہ کہ سلام متارکہ ہو یعنی کسی سے قطع تعلق کرنے کا شریفانہ اور مہذب طریقہ یہ ہے کہ بات کا جواب دینے کے بجائے لفظ سلام کہہ کر علیحدہ ہو جائے جیسا کہ قرآن کریم نے اپنے مقبول وصالح بندوں کی صفت میں بیان فرمایا ہے:

﴿ وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾[1]

یعنی جب جاہل لوگ ان سے جاہلانہ خطاب کرتے ہیں تو یہ ان سے دوبدو ہونے کے بجائے لفظ سلام کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ باوجود مخالفت کے میں تمہیں کوئی گزند اور تکلیف نہ پہنچاؤں گا۔

اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہاں سلام "عرفی سلام" ہی کے معنے میں ہو۔[2]

حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایک مرتبہ دریائے فرات کے کنارے ایک بوڑھے دیہاتی کو دیکھا کہ اس نے بڑی جلدی جلدی وضو کیا، اور اسی طرح نماز پڑھی، اور جلد بازی میں وضو اور نماز کے مسنون طریقوں میں کوتاہی ہو گئی۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے سمجھانا چاہتے تھے، لیکن اندیشہ یہ ہوا کہ یہ عمر رسیدہ آدمی ہے اور اپنی غلطی سن کر کہیں مشتعل نہ ہو جائے۔

چنانچہ دونوں حضرات اس کے قریب پہنچے اور کہا کہ:

---

[1] الفرقان: ۶۳

[2] معارف القرآن: ۶/ ۳۱، ۳۵

"ہم دونوں جوان ہیں، اور آپ تجربہ کار آدمی ہیں، آپ وضو اور نماز کا طریقہ ہم سے بہتر جانتے ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو وضو کرکے اور نماز پڑھ کر دکھائیں، اگر ہمارے طریقے میں کوئی غلطی یا کوتاہی ہو تو بتا دیجیے گا۔" اس کے بعد انہوں نے سنت کے مطابق وضو کرکے نماز پڑھی۔ بوڑھے نے دیکھا تو اپنی کوتاہی سے توبہ کی، اور آئندہ یہ طریقہ چھوڑ دیا۔[1]

امام کسائی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ علم نحو اور قراءت قرآن کے مشہور عالم ہیں، دونوں علوم میں ان کا مرتبہ محتاج تعارف نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے نماز میں ہارون رشید کی امامت کی، تلاوت کرتے ہوئے مجھے اپنی قراءت خود پسند آنے لگی، ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ پڑھتے پڑھتے مجھ سے ایسی غلطی ہوئی جو کبھی کسی بچے سے بھی نہ ہوئی ہوگی، میں ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ پڑھنا چاہ رہا تھا، مگر منہ سے نکل گیا: "لَعَلَّهُم يَرْجِعِيْن"

لیکن بخدا ہارون رشید کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ تم نے غلط پڑھا، بلکہ سلام پھیرنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا: "یہ کون سی لغت ہے؟"

میں نے کہا: "یا امیر المؤمنین! کبھی سبک رو گھوڑا بھی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔" ہارون رشید رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے فرمایا: "یہ بات تو ٹھیک ہے!"[2]

ایک (گورنر) والی مصر کبوتر بازی کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ان کے ایک خادم سے ان کا مقابلہ ہوگیا۔

کبوتروں کی دوڑ میں خادم کا کبوتر بازی لے گیا اس نے اپنے امیر کو یہ لکھنا برا جانا کہ آپ ہار گئے اور سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح خبر دی جائے، جس سے واقعہ معلوم ہو جائے۔ وہاں ایک کاتب تھا اس نے کہا اگر آپ چاہیں تو یہ شعر لکھ کر بھیج دیجیے۔

---

[1] "مناقب الامام الاعظم" الکردی: ۱/ ۳۹، ۴۰

[2] معرفة القراء الكبار على الطبقات والأعصار: ۱/ ۱۰۳

يَا أَيُّهَا الْمَلِكُ الَّذِيْ جَدُّهُ
لِكُلِّ جَدٍّ قَاهِرٌ غَالِبٌ

ترجمہ: "اے بادشاہ جس کی خوش قسمتی ہر دوسرے شخص کی قسمت کو دبانے والی اور جس کا نصیب سب کے نصیبوں پر غالب رہتا ہے۔"

طَائِرُكَ السَّابِقُ لٰكِنَّهُ
أَتٰى وَفِيْ خِدْمَتِهِ حَاجِبٌ

ترجمہ: "حقیقت میں تو آپ ہی کا پرندہ جیتا ہوا رہا، لیکن وہ اس شان سے آیا کہ اس کی خدمت میں (آگے چلنے والا) ایک حاجب (خادم) بھی تھا۔"

اس نے اس جواب کو پسند کیا اور انعام دیا اور یہی لکھ بھیجا۔[1]

لہٰذا امام کو بھی چاہیے کہ جب وہ اپنے بڑوں والدین یا بڑی عمر کے مقتدیوں کو نصیحت کرنا چاہے، مسئلہ سمجھانا چاہے تو ادب اور نرم رویہ کا لحاظ ضرور رکھے، توہین آمیز اور سخت لہجہ کبھی بھی اختیار نہ کرے، کیوں کہ امام لوگوں کا مقتدا اور راہنما ہوتا ہے بجائے اس کے کہ لوگ دین کی طرف آئیں اور مزید متنفر ہو جائیں گے۔

---

[1] مرجع بالا: ۱/ ۴۱، ۴۲

باب چہارم

ائمہ کرام کی مسجد کی ذمہ داریاں

❶ مسجد کو تعلیم و تعلّم کے حلقوں کے ذریعے آباد کرنا

اگر ہم مساجد کی تاریخ اور مساجد کا معاشرے کی اصلاح میں کردار، اور مساجد کے ذریعے ہر مرد و عورت (چاہے وہ عمر کی کسی بھی منزل میں ہو) تک علم دین کس طرح پہنچا اس پر غور کریں تو یہ بات ہم پر واضح ہو جائے گی کہ قرونِ اولیٰ میں مساجد فجر سے لے کر عشاء تک تعلیمی حلقوں سے آباد تھیں۔

محلے کا ہر فرد جس طرح کھانا پینا اپنے ذمے سمجھتا تھا اسی طرح مسجد سے اپنی روحانی غذا ان تعلیمی حلقوں میں بیٹھ کر حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا جس کے نتیجے میں اس امت کا ہر فرد شرک کے گناہ سے بچتا تھا اس لیے کہ تعلیمی حلقوں کے ذریعے ان کے عقائد کی اتنی اصلاح ہو جاتی تھی کہ وہ قبر پرستی، شخصیت پرستی، باطل کے تمام حربوں اور چالوں سے بچنے کے لیے ان تعلیمی حلقوں کے ذریعے اپنی حفاظت کرلیتا تھا۔

کاش ائمہ حضرات دوبارہ اپنی اپنی مساجد میں ایسی ترتیب بنالیں کہ محلے کا ہر شخص ان تعلیمی حلقوں میں بیٹھے اور ہماری مسجدیں دوبارہ ان تعلیمی حلقوں سے آباد ہو جائیں اور مساجد پر کسی وقت بھی تالا نہ لگے۔

لہٰذا ائمہ کرام کی خدمت میں نہایت ہی ادب سے عاجزانہ گزارش ہے کہ: (۱)

اپنی مساجد میں صبح تا شام تعلیمی حلقے قائم کریں۔ مساجد میں تعلیمی حلقے قائم کرنے سے معاشرے کی بہت سی برائیاں ختم ہو جائیں گی۔

(۱) آپ کے محلے میں امن و امان قائم ہوگا۔

(۲) رحمت و برکت کی فضا قائم ہوگی۔

(۳) آپس میں تعاون، اخوت (بھائی چارہ) قائم ہوگا۔

احادیث سے مساجد کے اندر تعلیم و تعلّم کے حلقے قائم کرنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور آپ ﷺ اہتمام سے ان حلقوں کو قائم فرما کر گئے، اس میں بیٹھنے اور بٹھانے کے فضائل ارشاد فرمائے۔ نہ بیٹھنے والوں اور نہ سیکھنے والوں اور نہ سکھانے والوں کے لیے وعیدیں ارشاد فرمائیں۔ اس سلسلے میں اہل علم نے آپ ﷺ کے زمانے کی مساجد اور صحابہ و تابعین کے زمانے کی مساجد میں تعلیم و تعلّم کے حلقوں کے قیام کی اہمیت پر کتابیں لکھی ہیں جن میں اس بات کے دلائل اس کے فوائد لکھے ہیں اور مساجد کو نمازوں کے بعد تالے لگوانا یا ان میں علمی حلقے نہ لگوانا اس کے نقصانات اور اس پر وعدے و وعید جمع کیے ہیں۔

عہد نبوی ﷺ اور بعد میں بھی دین کے سیکھنے اور سکھانے کا مرکز مسجدیں تھیں۔ یہ مسجد میں سیکھنے اور سکھانے کا سلسلہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے زمانے میں رہا، اور اسی طرح بعد کے زمانے میں بھی رہا۔ ذیل میں ہم اکیس اقتباسات اور پانچ احادیث مبارکہ دلیل میں ذکر کرتے ہیں۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نماز فجر کے بعد ستون ابولبابہ کے پاس تشریف لاتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس طرح حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے تھے کہ سب کا چہرہ رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک کی طرف ہوتا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مجلس اور حلقہ کا بھی یہی طریقہ تھا اور وہ مسجد کے ستونوں کے پاس عام طور سے بیٹھتے

تھے، اور ہر ستون کے پاس حلقہ قائم ہوتا تھا۔

(۲) مسجد نبوی میں مجلسوں اور حلقوں کا ذکر بڑے فصیح و بلیغ اور والہانہ انداز میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک شاگرد نے یوں کیا ہے:

"عَهْدِيْ بِهٰذَا الْمَسْجِدِ وَاَنَّهُ لَيُشْبِهُ الرَّوْضَةَ اِخْتَرْ مِنْهَا حَيْثُ شِئْتَ"[1]

تَرجَمۂ: "اس مسجد میں میرا وہ دور گزرا ہے جب یہ باغیچے کے مانند تھی تم اس کے جس حصہ میں چاہو بیٹھ جاؤ۔"

دوسرے شہروں میں بھی عام طور سے تعلیمی مجالس مسجدوں میں منعقد ہوتی تھیں اور بعض حضرات اپنے یہاں تعلیم دیتے تھے۔ شیوخ و اساتذہ عام طور سے کرسی (تخت) پر بیٹھتے تھے، اصحاب و تلامیذ ان کے قریب نیچے حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے، جس میں اعیان و اشراف، عوام و خواص، مقامی بیرونی اور عجمی و عربی سب طلبہ برابر برابر بیٹھتے تھے، شیوخ بعض طلبہ کو ان کے مقام و مرتبہ یا قراءت کی وجہ سے اپنے تخت پر یا اپنے قریب بٹھاتے تھے، طلبہ کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس میں ابو جمرہ خاص طور سے مجمع میں آواز پہنچانے اور عربی سے فارسی میں ترجمہ کے لیے رکھے گئے تھے، اساتذہ کے احترام و ادب کا لحاظ کرتے ہوئے طلبہ سوال کرتے تھے اور کافی و شافی جواب پاتے تھے، اساتذہ نشاط میں ہوتے تو طلبہ سے خود سوال کرنے کی فرمائش کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسے واقعات منقول ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ مجلس میں نوجوان طلبہ کے سوالات کے جوابات دینے کے بعد اس قدر زیادہ حدیث بیان کی کہ وہ سب گھبرا گئے۔ کبھی کبھی اہل مجلس میں نشاط پیدا کرنے کے لیے مجلس کا رنگ

[1] المحدث الفاصل: ۱۸۰

بدل جاتا تھا، شعر و شاعری ہونے لگتی تھی زمانہ جاہلیت کی جنگوں کے تذکرے ہونے لگتے تھے، ذاتی باتیں بھی ہوتی تھیں مگر شیوخ و مجالس کا وقار و ادب ہر حال میں باقی رکھا جاتا تھا۔

(۳) حضرت ابو الاحوص رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اہل علم کو دیکھا ہے کہ ان کی مجالس مسجدوں میں منعقد ہوتی تھیں۔[1]

(۴) حضرت خطیب بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب "الفقه و المتفقه" میں فصل "تدريس الفقه في المساجد" قائم کیا ہے اور اس باب میں بہت سے واقعات اس سلسلہ میں لکھے ہیں۔[2]

(۵) اسی طرح حضرت جندب بن عبد اللہ بجلی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ گیا۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جا کر دیکھا تو لوگ آپس میں حدیث کے سیکھنے اور سکھانے میں مشغول ہیں۔[3]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک شخص نے جہاد میں شرکت کے لیے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میں تم کو اس سے اچھی بات نہ بتاؤں؟ تم مسجد بناؤ اور اس میں فرائض سنت اور "تفقه في الدين" کی تعلیم دو۔[4]

حضرت ابو ادریس خولانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اَلْمَسَاجِدُ مَجَالِسُ الْكِرَامِ" یعنی مسجدیں اعیان و اشراف کی مجالس ہیں۔[5]

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو حکم دیا تھا کہ اپنی مسجدوں میں علم کی نشر و اشاعت کریں، (مساجد میں تعلیم و تعلم والی) سنت مٹ رہی ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے عامل جعفر بن برقان کو لکھا کہ تم اہل علم و فقہ کو حکم دو کہ اللہ

[1] الفقه و المتفقه للخطيب بغدادي: ۱۲۹/۲ [2] المحدث الفاصل: ۶۰۳
[3] طبقات ابن سعد: ۵۰۱/۳ [4] جامع بيان العلم: ۹۱/۱
[5] حلية الأولياء، ذكر طبقة من تابعي اهل الشام: ۱۲۱/۵، رقم ۶۶۲۱

نے ان کو جو علم دیا ہے اس کی اشاعت اپنی مجالس اور مساجد میں کریں۔

امام بخاری نے "بَابُ ذِكْرِ الْعِلْمِ وَالْفُتْيَا فِي الْمَسَاجِدِ" قائم کیا ہے۔[1]
قاضی ابن خلاد رامہرمزی نے "اَلْمُحَدِّثُ الْفَاصِلُ بَيْنَ الرَّاوِيْ وَالْوَاعِيْ" میں "عَقْدُ الْمَجَالِسِ فِي الْمَسَاجِدِ" کا باب باندھا ہے۔

عہد صحابہ میں مسجد نبوی میں جگہ جگہ تعلیمی حلقے قائم ہوتے تھے، جن میں مقامی اور بیرونی طلبہ کی کثرت ہوتی تھی۔

علامہ ابن الحاج "المدخل" میں فرماتے ہیں:

"أَخْذُ الدَّرْسِ فِي الْمَسْجِدِ أَفْضَلُ، لِأَجْلِ كَثْرَةِ الْإِنْتِفَاعِ بِالْعِلْمِ لِمَنْ قَصَدَهُ وَمَنْ لَمْ يَقْصِدْهُ، بِخِلَافِ الْمَدْرَسَةِ فَإِنَّهُ لَا يَأْتِي إِلَيْهَا إِلَّا مَنْ قَصَدَ الْعِلْمَ أَوِ الْإِسْتِفْتَاءَ فَأَخْذُهُ فِي الْمَدْرَسَةِ أَقَلُّ رُتْبَةً فِي الْإِنْتِشَارِ مِنْهُ فِي الْمَسْجِدِ"[2]

ترجمہ: "مسجد میں تعلیم کا حلقہ لگانا افضل ہے۔ کیوں کہ اس میں طلب علم کا قصد کرنے والے اور نہ قصد کرنے والوں دونوں کے حق میں زیادہ فائدہ ہے، بخلاف مدرسے کے کہ وہاں صرف علم کا طالب یا استفتاء کرنے والا ہی آئے گا۔ اس لیے مسجد کے بجائے مدرسہ میں تحصیل علم سے اس کی اشاعت کم ہوگی۔"

موجودہ طرز کے مدارس کی ابتداء چوتھی صدی میں ہوئی۔ اس سے پہلے اس کا کوئی وجود نہیں تھا اس سلسلہ میں علامہ مقریزی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

"إِنَّ الْمَدَارِسَ مِمَّا حَدَثَ فِي الْإِسْلَامِ، وَلَمْ تَكُنْ تُعْرَفُ فِي زَمَنِ الصَّحَابَةِ، وَلَا التَّابِعِيْنَ، وَ إِنَّمَا حَدَثَ عَمَلُهَا بَعْدَ

[1] بخاری: العلم باب نمبر ۵۲، ۲۵/۱ [2] المدخل ۲۰۲/۱

الْأَرْبَعِ مِائَةٍ مِنْ سَنَةِ بَعْدِ الْهِجْرَةِ، وَ أَوَّلُ مَنْ حُفِظَ عَنْهُ أَنَّهُ بَنَى فِي الْإِسْلَامِ أَهْلُ نَيْسَابُوْرَ فَبُنِيَتِ الْمَدْرَسَةُ الْبَيْهَقِيَّةُ"[1]

ترجمہ: "مدارس اسلام بعد میں بنائے گئے ہیں۔ صحابہ اور تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانے میں اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا ہے۔ ان کی تعمیر چوتھی صدی ہجری کے بعد آئی ہے اور اہل نیشاپور نے سب سے پہلا مدرسہ بنایا اور مدرسہ بیہقیہ کی تعمیر کی گئی۔"

مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد نبوی جس میں اصحاب صفہ، ضعفاء، و مساکین صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، اور باہر سے آئے ہوئے وفود ہوتے تھے۔

(۷) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر ادا فرما لیتے تو ہم لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ جاتے۔ ہم میں کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے بارے میں سوال کرتا، کوئی فرائض کے بارے میں، اور کوئی خواب کی تعبیر معلوم کرتا۔[2]

اس سلسلہ میں مولانا حکیم عبدالحئی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ہمارے پیر و مرشد روحی فداہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خاک پاک مدینہ میں جو پہلی عمارت بنائی تھی اور جس کو مسجد نبوی کہتے ہیں وہ ہمارا پہلا مدرسہ تھا، اس کے بعد جتنی مسجدیں دنیا میں تیار ہوئیں ان ہی کو آپ مدارس سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تعلیم کا پرانا طریقہ یہ تھا کہ استاذ مسجد میں آکر بیٹھ جاتا اور اس کے ارد گرد شاگردوں کا حلقہ بن جاتا اساتذہ خالصا لوجہ اللہ تعلیم دیتے اور ان کے شاگرد چٹائیوں پر بیٹھ کر اور چراغ جلا کر تحصیل علم کرتے تھے، بڑے بڑے شہزادوں کو بھی علم کا ذوق ہوتا تھا تو وہ گھروں میں جا کر اور اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھتے تھے۔ یہی

[1] کتاب الخطط والآثار: ۳۶۳/۲
[2] جمع الفوائد، العلم، آداب للعلم والسؤال: ۸۱/۱، رقم: ۲۷۸

طریقہ چوتھی صدی ہجری تک علی العموم جاری رہا۔

ہندوستان کی بعض مساجد سے بھی یہ کام لیا جاتا تھا۔ ان میں جونپور میں اٹالہ کی مسجد، لاہور میں وزیر خان کی مسجد، نئی دہلی میں ماہم بیگم کی مسجد، پرانی دہلی میں مسجد فتح پوری اور سورت میں مرجان شامی مسجد کا خصوصیت سے اس سلسلہ میں نام لیا جاتا ہے۔[1]

نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد بھی مسجد نبوی علم دین کے سیکھنے سکھانے کا مرکز بنی رہی۔ بے شمار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ اور اسلاف امت نے مسجد نبوی کو تعلیم دین کے لیے مرکز بنایا۔

وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ جنہوں نے مسجد نبوی ہی کو دینی تعلیم کے لیے مرکز بنایا تھا ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۷) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"كَانَ لِجَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ حَلْقَةٌ فِي الْمَسْجِدِ يَعْنِي النَّبَوِيَّ يُؤْخَذُ عَنْهُ الْعِلْمُ."[2]

ترجمہ: "جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حلقہ مسجد نبوی میں قائم ہوتا تھا ان سے علم دین حاصل کیا جاتا تھا۔"

(۸) زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی تعلیمی حلقہ مسجد نبوی میں لگتا تھا اور ان کے حلقے کے بارے میں صاحب "تذکرۃ الحفاظ" نے زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ثابت بن عبید رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"مَا رَأَيْتُ رَجُلًا أَفْكَهَ فِي بَيْتِهِ وَلَا أَوْقَرَ فِي مَجْلِسِهِ مِنْ زَيْدٍ."[3]

---

[1] یاد ایام ۳۶ تا ۳۸ [2] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۱/۲۱۳، رقم: ۱۰۲۵

[3] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۱/۵۶۱، رقم: ۲۸۸

ترجمہ: "میں نے کسی شخص کو اپنے گھر میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ ہنسی مزاح کرنے والا اور مجلس میں ان سے زیادہ باوقار نہیں دیکھا۔"

(۹) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی مسجد نبوی میں ہی بیٹھ کر درس دیتے تھے۔ ان کے بارے میں عمرو بن دینار رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"مَا رَأَيْتُ مَجْلِسًا أَجْمَعَ لِكُلِّ خَيْرٍ مِنْ مَجْلِسِ ابْنِ عَبَّاسٍ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ وَالْعَرَبِيَّةِ ......"[1]

"میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مجلس سے زیادہ باوقار مجلس کوئی اور نہیں دیکھی ان کی مجلس حلال و حرام کے احکام، عربی فصاحت، انساب اور اشعار سے معمور رہتی تھی۔"

(۱۰) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بھی مسجد نبوی کو اپنے اشاعتِ علم کا مرکز بنایا تھا۔ وہ صبح سے چاشت تک مسجد نبوی میں قبلہ رو بیٹھ کر احادیث کا درس دیتے تھے۔ ان کے بارے میں ان کے غلام و شاگرد حضرت نافع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"أَنَّهُ كَانَ يَجْلِسُ فِي مَسْجِدِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى يَرْتَفِعَ الضُّحَى، وَلَا يُصَلِّي، ثُمَّ يَنْطَلِقُ إِلَى السُّوقِ فَيَقْضِي حَوَائِجَهُ، ثُمَّ يَجِيءُ إِلَى أَهْلِهِ فَيَبْدَأُ بِالْمَسْجِدِ، فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ يَدْخُلُ بَيْتَهُ."[2]

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما مسجد نبوی میں چاشت کے وقت تک بیٹھتے تھے اس وقت نماز (چاشت) نہیں پڑھتے تھے

---

[1] ذخائر العقبیٰ فی مناقب ذوی القربیٰ، فصل ثانی فی ذکر علمہ: ۱/۲۳۰

[2] الطبقات الکبریٰ: ۴/۱۴۷

(مل کے درس دیتے رہتے) پھر اٹھ کر بازار جاتے اور اپنی ضروریات پوری کرکے واپس مسجد نبوی میں آکر دو رکعت نماز پڑھتے اس کے بعد پھر اپنے گھر میں داخل ہوتے۔"

(۱۱) عقیل بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی تھے ان کی بھی مجلس علم مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی۔

ان کے بارے میں بھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَكَانَ النَّاسُ يَأْخُذُوْنَ ذٰلِكَ عَنْهُ بِمَسْجِدِ الْمَدِيْنَةِ." [1]

ترجمہ: "ان سے لوگ یہ باتیں مسجد مدینہ (مسجد نبوی) میں حاصل کرتے تھے۔"

(۱۲) اسلم عدوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعد ان کے بیٹے زید بن اسلم عدوی رحمہ اللہ تعالیٰ متوفی ۱۳۶ھ نے مجلس علم کو باقی رکھا۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وَكَانَتْ لَهُ حَلْقَةٌ لِلْعِلْمِ بِالْمَسْجِدِ النَّبَوِيِّ" [2]

ترجمہ: "ان کا حلقہ علم مسجد نبوی میں قائم ہوتا تھا۔"

(۱۳) حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد حضرت نافع رحمہ اللہ تعالیٰ کی بھی ابتداءً مجلس علم مسجد نبوی ﷺ میں لگتی تھی، مگر جب وہ آنکھوں سے معذور ہوگئے تو اپنے گھر میں جو جنت البقیع کے قریب تھا وہیں درس دیتے تھے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ "تذکرۃ الحفاظ" میں امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"كُنْتُ آتِي نَافِعًا وَأَنَا غُلَامٌ حَدِيْثُ السِّنِّ، مَعِي غُلَامٌ

[1] الاصابۃ: ۲/۴۹۴، رقم: ۵۶۲۸

[2] التحفۃ اللطیفۃ فی تاریخ المدینۃ الشریفۃ: ۱/۳۶۵، رقم: ۱۳۵۸

يَنْزِلُ، وَيُحَدِّثُنِيْ، وَكَانَ يَجْلِسُ بَعْدَ الصُّبْحِ فِي الْمَسْجِدِ لَا يَكَادُ يَأْتِيْهِ أَحَدٌ فَإِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ قَامَ، وَكَانَ فِيْ حَيَاةِ سَالِمٍ لَا يُفْتِيْ" [1]

ترجمہ: "میں نافع رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آتا تھا اس وقت میں نو عمر لڑکا تھا۔ میرے ساتھ خادم ہوتا تھا۔ وہ اوپر سے اتر کر مجھ سے حدیث بیان کرتے تھے۔ اور صبح کے بعد مسجد نبوی میں بیٹھا کرتے تھے اس وقت ان کے پاس کوئی شخص نہیں آتا تھا اور سورج نکلنے کے بعد اٹھ جاتے تھے، سالم بن عبداللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی زندگی میں فتویٰ نہیں دیتے تھے۔"

(۱۴) تین بھائی حضرت موسیٰ بن عقبہ، حضرت ابراہیم بن عقبہ، اور حضرت محمد بن عقبہ رحمہم اللہ تعالیٰ یہ تینوں علم کی اشاعت کے لیے مسجد نبوی میں بیٹھا کرتے تھے:

"كَانَ لِإِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَمُحَمَّدِ بْنِ عُقْبَةَ حَلْقَةٌ فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانُوْا كُلُّهُمْ فُقَهَاءَ وَمُحَدِّثِيْنَ وَكَانَ مُوْسٰى يُفْتِيْ" [2]

ترجمہ: "حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا حلقہ بھی مسجد نبوی میں قائم تھا اور یہ سب کے سب فقیہ اور محدث تھے اور موسیٰ رحمہ اللہ تعالیٰ فتویٰ بھی دیتے تھے۔"

(۱۵) حضرت محمد بن عجلان رحمہ اللہ تعالیٰ کی بھی مجلس علم مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی۔ ان کے بارے میں علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَكَانَ مُفْتِيًا، فَقِيْهًا، عَالِمًا عَابِدًا، رَبَّانِيًّا، كَبِيْرَ الْقَدْرِ لَهُ

[1] تذکرۃ الحفاظ، طبقۃ ثالثۃ، نافع الامام العلم: ۱/۱۰۰

[2] تہذیب الکمال: ۲۹/۱۲۱، الطبقۃ الخامسۃ موسیٰ بن عقبۃ

حَلْقَةٌ كَبِيْرَةٌ فِي مَسْجِدِ النَّبَوِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"[1]

ترجمہ: "وہ مفتی، فقیہ، عالم، عابد، ربانی بڑی قدر و منزلت والے تھے۔ مسجد نبوی میں ان کا بڑا حلقہ تھا۔"

(۱۶) حضرت عبدالرحمن بن ہرمز رحمہ اللہ تعالیٰ کا حلقہ درس مسجد نبوی اور ان کے مکان میں دونوں جگہ قائم ہوتا تھا۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سات سال تک ان کے حلقہ درس میں بیٹھتے تھے۔ اس درمیان کسی اور درسگاہ میں نہیں گئے۔[2]

یہ چند مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور بعد کے لوگوں نے مسجد نبوی کے اندر بیٹھ کر تعلیم اور اشاعت علم کا کام کیا۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اسلاف امت جہاں جہاں گئے انہوں نے وہاں کی مسجد میں ہی بیٹھ کر اشاعت علم کا علم بلند کیا۔ مثلاً:

(۱۷) جب حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ دمشق تشریف لے گئے تو وہاں انہوں نے جا کر جامع مسجد دمشق میں اپنا مسکن اور ٹھکانہ بنایا۔

عبدالقادر مغربی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فجر کے بعد جامع مسجد دمشق میں بیٹھتے تھے، طلبہ قرآن پڑھنے کے لیے ان کو گھیر لیا کرتے تھے، حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ، دس دس طلبہ کی جماعت بنا کر ان میں ایک نگران مقرر فرما کر خود محراب میں بیٹھ جاتے اور طلبہ کی نگرانی فرماتے۔ ایک دن حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طلبہ کا شمار کیا تو ان کی تعداد سولہ سو نکلی۔[3]

(۱۸) حضرت عبدالرحمن بن غنم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ

[1] تذکرۃ الحفاظ، طبقۃ خامسۃ ۱/۱۶۵

[2] خیر القرون کی درسگاہیں ۲۹۳

[3] الاخلاق والواجبات ص ۱۰۱، خیر القرون کی درسگاہیں ۲۱۰

...ے علم کے امین ہیں۔ ان کا حلقہ بھی جامع مسجد دمشق میں ہی ہوتا تھا۔[1]

علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عبدالرحمن بن غنم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شام کے تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ نے علم حاصل کیا۔ یہ نہایت جلیل القدر اور صادق عالم تھے۔[2]

(۱۹) حضرت ابوادریس خولانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی بھی مجلس علم دمشق کی جامع مسجد میں قائم ہوتی تھی۔ جس میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین بھی شریک ہوتے تھے۔

ان کے بارے میں مکحول شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"كَانَتْ حَلْقَةٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْرُسُوْنَ جَمِيْعًا فَإِذَا بَلَغُوْا سَجْدَةً بَعَثُوْا إِلَى أَبِيْ إِدْرِيْسَ الْخَوْلَانِيِّ فَيَقْرَؤُهَا ثُمَّ يَسْجُدُ فَيَسْجُدُ وَأَهْلُ الْمَدَارِسِ"[3]

ترجمہ: "جامع مسجد دمشق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا حلقہ ہوتا تھا۔ سب حضرات قرآن پڑھتے تھے اور جب سجدہ کی آیت آ جاتی تو ابوادریس خولانی کو بلاتے اور وہ اس کو پڑھ کر سجدہ فرماتے، ان کے ساتھ تمام اہل درس سجدہ کرتے۔"

(۲۰) حضرت ابوعمرو شیبانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی علمی مجلس کوفہ کی جامع مسجد میں لگتی تھی ان کے بارے میں عاصم بن بہدلہ فرماتے ہیں:

"كَانَ أَبُوْعَمْرٍو الشَّيْبَانِيُّ يُقْرِئُ الْقُرْآنَ فِي الْمَسْجِدِ الْأَعْظَمِ"[4]

ترجمہ: "ابوعمرو شیبانی کوفہ کی جامع مسجد اعظم میں قرآن کا درس دیتے تھے۔"

[1] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ۲/۴۱۸، حرف العین، القسم الاول

[2] تذکرۃ الحفاظ الطبقۃ الثانیۃ ۱/۵۱، رقم ۳۰

[3] الآحاد والمثانی ۵/۳۳۸، رقم ۲۸۹۳

[4] تذکرۃ الحفاظ الطبقۃ الثانیۃ ۱/۶۸، رقم ۶۳

(۲۱) حضرت عمرو بن دینار رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ اصلاً یمنی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ کے خصوصی اصحاب میں شمار کیے گئے، کثیر الحدیث، ثقہ، ثبت، عالم و مفتی تھے۔ ان کا حلقۂ درس مسجد حرام میں قائم ہوتا تھا جو آخری زمانے تک جاری رہا۔ حضرت عمرو بن دینار رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ حدیث کے معانی بیان کرتے تھے، حضرت سفیان بن عیینہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کہتے ہیں:

"كَانَ عَمْرٌو يُحَدِّثُ بِالْمَعَانِي وَكَانَ فَقِيهًا."[1]

تَرجَمہ: "عمرو بن دینار حدیث کے معانی بیان کرتے تھے اور وہ خوب سمجھنے والے "فقیہ" تھے۔"

شیخ عبداللہ قاسم الوشلی نے اپنے رسالے "اَلْمَسْجِدُ وَدَوْرُهُ التَّعْلِيمِيُّ ...." میں وہ احادیث جمع فرمائی ہیں جن میں مسجدوں میں تعلیمی حلقوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

اب چند احادیث مساجد میں مجالس علم کی فضیلت کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں:

"احادیث مبارکہ"

(۱) رَوَى الْبُخَارِيُّ عَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ (رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ) أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَمَا هُوَ جَالِسٌ فِي الْمَسْجِدِ وَالنَّاسُ مَعَهُ، إِذْ أَقْبَلَ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ، فَأَقْبَلَ اثْنَانِ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذَهَبَ وَاحِدٌ قَالَ: فَوَقَفَا عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَرَأَى فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا، وَأَمَّا الْآخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ، وَأَمَّا الثَّالِثُ فَأَدْبَرَ ذَاهِبًا فَلَمَّا فَرَغَ رَسُولُ

[1] الطبقات الکبریٰ: ۵/۴۸۰

اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "أَلَا أُخْبِرُكُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلَاثَةِ؟: أَمَّا أَحَدُهُمْ فَأَوَى إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى فَآوَاهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ وَأَمَّا الْآخَرُ فَاسْتَحْيَا فَاسْتَحْيَا اللّٰهُ مِنْهُ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَأَعْرَضَ فَأَعْرَضَ اللّٰهُ عَنْهُ"[1]

تَرجَمہ: امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ ابو واقد اللیثی رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے اور دوسرے لوگ بھی موجود تھے اتنے میں تین آدمی آئے ان میں سے دو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی جانب متوجہ ہوئے اور ایک واپس چلا گیا، وہ دو کھڑے رہے ایک نے تھوڑی سی جگہ کشادہ پائی تو وہیں بیٹھ گیا اور اس کا ساتھی اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور جو تیسرا شخص ان کے ساتھ آیا تھا وہ واپس چلا گیا جب آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فارغ ہوئے تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کیا میں تمہیں بتلاؤں ان تین آدمیوں کے بارے میں؟

ان میں ایک وہ تھا جس نے اللہ عزوجل سے جگہ مانگی، اللہ رب العزت نے اسے جگہ عنایت فرمائی اور دوسرا وہ تھا جس نے اللہ رب العزت سے شرم رکھی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے شرم رکھی۔ اور جو تیسرا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ سے اعراض کیا تو اللہ نے بھی اس سے اعراض فرمایا۔

(۲) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ -رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا-: أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَجْلِسَيْنِ فِي مَسْجِدِهِ، وَأَحَدُ الْمَجْلِسَيْنِ يَدْعُونَ اللّٰهَ وَيَرْغَبُونَ إِلَيْهِ، وَالْآخَرُ يَتَعَلَّمُونَ الْفِقْهَ وَيُعَلِّمُونَهُ. فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "كِلَا الْمَجْلِسَيْنِ عَلَى خَيْرٍ، وَأَحَدُهُمَا أَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهِ. أَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيَدْعُونَ اللّٰهَ وَيَرْغَبُونَ إِلَيْهِ فَإِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ، وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ، وَأَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيَتَعَلَّمُونَ الْعِلْمَ

[1] بخاری، العلم، باب من قعد حیث ینتهی به المجلس: ۱/۱۶، الرقم: ۶۶

وَيُعَلِّمُوْنَ الْجَاهِلَ فَهُمْ أَفْضَلُ، وَ إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" ثُمَّ جَلَسَ مَعَهُمْ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی مسجد میں دو مجلسوں پر سے گزرے ایک مجلس والے اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے اور اسی کی جانب متوجہ تھے اور دوسری مجلس والے مسائل سیکھ رہے تھے اور سکھا رہے تھے آپ ﷺ نے فرمایا: "دونوں مجالس خیر پر ہیں، لیکن ان دونوں میں سے ایک مجلس والے افضل ہیں (آپ ﷺ نے ذکر والی مجلس کی طرف اشارہ فرمایا کہ) یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہیں اور اسی کی جانب متوجہ ہیں پس اللہ تعالیٰ اگر چاہیں تو انہیں عطا کر دیں اور چاہیں تو منع فرما دیں، اور یہ دوسری مجلس والے تو خود سیکھ بھی رہے ہیں اور دوسروں کو سکھا بھی رہے ہیں اور مجھے تو معلم بنا کر ہی بھیجا گیا ہے، پھر آپ ﷺ سیکھنے سکھانے والی جماعت کے ساتھ تشریف فرما ہوگئے۔

(۳) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ -رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ- قَالَ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ فِي الصُّفَّةِ فَقَالَ: "أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنْ يَغْدُوَ كُلَّ يَوْمٍ إِلٰى بُطْحَانَ، أَوْ إِلَى الْعَقِيْقِ فَيَأْتِيَ مِنْهُ بِنَاقَتَيْنِ كَوْمَاوَيْنِ فِيْ غَيْرِ إِثْمٍ وَلَا قَطْعِ رَحِمٍ؟" فَقُلْنَا: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نُحِبُّ ذٰلِكَ." قَالَ: "أَفَلَا يَغْدُوْ أَحَدُكُمْ إِلَى الْمَسْجِدِ فَيَعْلَمُ أَوْ يَقْرَأُ آيَتَيْنِ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ نَاقَتَيْنِ، وَثَلَاثٌ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ ثَلَاثٍ وَأَرْبَعٌ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ أَرْبَعٍ وَمِنْ أَعْدَادِهِنَّ مِنَ الْإِبِلِ؟"[2] وَفِيْ رِوَايَةِ أَبِيْ نُعَيْمٍ فِي الْحِلْيَةِ: فَيَتَعَلَّمُ.[3]

---

[1] مسند البزار: ۴۲۸/۶

[2] مسلم: ۲۷۰/۱، فضائل القرآن وما يتعلق به، باب فضل قراءة القرآن وفي الصلاة وتعلمه، رقم: ۸۰۳

[3] حلية الأولياء، ذكر أهل الصفة: ۱۰/۲، رقم: ۱۳۵۴

ترجمہ: امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہم صفہ میں تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ ہر روز بطحان یا عقیق جائے اور وہاں سے دو اونٹنیاں اونچے کوہان والی بغیر کسی گناہ اور قطع رحمی کیے ہوئے لے کر آئے؟"

ہم نے کہا: "اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر شخص اس کو پسند کرتا ہے۔"

آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم میں سے ہر ایک مسجد نہیں جاتا، پس وہاں جا کر قرآن کی دو آیتیں سیکھ لے یا پڑھ لے یہ اس کے لیے دو اونٹنیوں سے بہتر ہیں، اور تین آیتیں تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور چار آیتیں چار اونٹنیوں سے، اسی طرح آیات کی تعداد سے اونٹنیوں کا حساب ہے۔"

(۴) عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ -رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ- قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ غَدَا إِلَى الْمَسْجِدِ لَا يُرِيْدُ إِلَّا أَنْ يَتَعَلَّمَ خَيْرًا أَوْ يُعَلِّمَهُ كَانَ لَهُ كَأَجْرِ مُعْتَمِرٍ تَامِّ الْعُمْرَةِ، وَمَنْ رَاحَ إِلَى الْمَسْجِدِ لَا يُرِيْدُ إِلَّا لِيَتَعَلَّمَ خَيْرًا أَوْ يُعَلِّمَهُ فَلَهُ أَجْرُ حَاجٍّ تَامِّ الْحَجَّةِ."[1]

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص صبح کو مسجد جاتا ہے اور اس کا ارادہ صرف خیر کی بات کا سیکھنا یا سکھلانا ہوتا ہے، تو ایسے شخص کا اجر کامل عمرہ ادا کرنے والے کے برابر ہوتا ہے، اور جو شخص شام کو مسجد جاتا ہے، اور اس کا ارادہ صرف خیر کی بات کا سیکھنا یا سکھلانا ہوتا ہے، تو ایسے شخص کا اجر کامل حج کرنے والے کے برابر ہوتا ہے۔"

(۵) عَنْ أَنَسٍ -رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ- قَالَ: كَانَ أَخَوَانِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ أَحَدُهُمَا يَأْتِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْآخَرُ يَحْتَرِفُ فَشَكَا الْمُحْتَرِفُ أَخَاهُ إِلَى النَّبِيِّ

---

[1] كنز العمال، كتاب العلم: ۷۶/۵، جز: ۱۰، رقم: ۲۸۸۵۵

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: "لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهِ."[1]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دو بھائی تھے، ایک تجارت کرتا تھا جب کہ دوسرا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا (یعنی علم حاصل کرتا تھا) تاجر بھائی نے آپ ﷺ سے دوسرے بھائی کی شکایت کی (کہ یہ تو کماتا نہیں مجھے ہی کمانا پڑتا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: "شاید کہ تمہیں بھی اسی بھائی کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے۔"

حضرت ابن عبدالبر رحمہ اللہ تعالیٰ نے "جامع بیان العلم و فضلہ" میں ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ذکر فرمائی ہے۔

"ان دو بھائیوں میں سے ایک آپ ﷺ کی احادیث مبارکہ کو سیکھنے کے لیے آپ ﷺ کی مجلس میں آتا تھا اور دوسرا بھائی اپنا کاروبار کرتا تھا تو اس دوسرے بھائی نے حضور ﷺ سے شکایت کی کہ: "اے اللہ کے رسول! یہ میرا بھائی میری کچھ بھی مدد نہیں کرتا" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "شاید تجھے بھی اسی بھائی کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے۔"[2]

عہد نبوی میں مسجد نبوی کے اندر علمی حلقے

شیخ صالح بن غانم السدلان اپنی کتاب "المسجد ودورہ فی التوجیہ والترجیہ وعلاقتہ بالمؤسسات الدعویۃ فی المجتمع" میں لکھتے ہیں:

نَشْأَتُهَا: اَلتَّعْلِيْمُ مُنْذُ الْقِدَمِ مُرْتَبِطٌ إِرْتِبَاطًا وَثِيْقًا بِالْمَسْجِدِ وَخَاصَّةً إِذَا كَانَ تَعْلِيْمًا لِأَمْرٍ مِّنْ أُمُوْرِ الدِّيْنِ.

وَلَقَدْ مَارَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعْلِيْمَ الْمُسْلِمِيْنَ أُمُوْرَ

[1] الترمذی، الزھد، باب الزھادۃ فی الدنیا ۵۹/۲

[2] جامع بیان العلم وفضلہ، الحث علی طلب العلم وتعلیمہ ۵۹/۱

دِيْنِهِمْ فِيْ بَيْتِهِ فِيْ مَكَّةَ وَفِيْ دَارِ الْأَرْقَمِ بْنِ أَبِي الْأَرْقَمِ قَبْلَ أَنْ يَّكُوْنَ لِلْمُسْلِمِيْنَ مَسْجِدٌ.

لِذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ مُثِيْرًا لِلْعَجَبِ حِيْنَ هَاجَرَ الرَّسُوْلُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى الْمَدِيْنَةِ أَنْ يَّكُوْنَ أَوَّلُ أَعْمَالِهِ هُنَاكَ هُوَ بِنَاءُ مَسْجِدٍ لِلْمُسْلِمِيْنَ فِيْ قُبَاءٍ فِي الْأَيَّامِ الْأُوْلَى الَّتِيْ قَضَاهَا الرَّسُوْلُ فِي الْمَدِيْنَةِ.

وَيَذْكُرُ الْإِمَامُ الْغَزَالِيُّ أَنَّ حَلَقَاتِ الْعِلْمِ كَانَتْ تَعْقِدُ فِيْ مَسْجِدِ قُبَاءٍ. أَمَّا عِنْدَ إِنْتِقَالِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قُبَاءٍ إِلَى الْمَدِيْنَةِ فَقَدْ سَارَعَ بِبِنَاءِ مَسْجِدِهِ الْمَعْرُوْفِ الَّذِيْ عَمِلَ فِيْهِ بِيَدِهِ وَحَمَلَ أَحْجَارَهُ بِنَفْسِهِ وَهُوَ يَقُوْلُ:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةْ
فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةْ

وَكَانَ أَصْحَابُهُ الْكِرَامُ يَعْمَلُوْنَ وَهُمْ يُنْشِدُوْنَ:

لَا يَسْتَوِيْ مَنْ يَعْمُرُ الْمَسَاجِدَا
يَعْمَلُ فِيْهَا قَائِمًا وَقَاعِدًا
وَمَنْ يُّرٰى عَنِ الْغُبَارِ حَائِدًا

فَكَانَ هٰذَا الْمَسْجِدُ النَّبَوِيُّ مَدْرَسَةَ الدَّعْوَةِ الْإِسْلَامِيَّةِ الْأُوْلَى، وَدَارَ الدَّوْلَةِ الْإِسْلَامِيَّةِ الْكُبْرٰى.

تِلْكَ الْمَدْرَسَةُ الَّتِيْ فَتَحَتْ أَبْوَابَهَا لِمُخْتَلِفِي الْأَجْنَاسِ مِنْ عَرَبٍ وَعَجَمٍ، وَمُخْتَلِفِ الْأَلْوَانِ مِنْ بِيْضٍ وَسُوْدٍ، وَمُخْتَلِفِي الطَّبَقَاتِ مِنْ أَغْنِيَاءَ وَفُقَرَاءَ وَمُخْتَلِفِ الْأَسْنَانِ مِنْ شُيُوْخٍ وَشُبَّانٍ وَغِلْمَانٍ.

وَفَتَحَتْ صَدْرَهَا لِلْمَرْأَةِ تَشْهَدُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ فِيْ عَصْرٍ كَانَتْ

المرأة مخلوقا لا حق له في العلم ولا في مشاركة الرجل في الحياة.

مدرسة تلقن العلم والعمل، وتطهر الروح والبدن، وتبصر بالغاية والوسيلة، وتعرف بالحق والواجب، وتعنى بالتربية قبل التعليم، وبالتطبيق قبل النظريات، وتهذيب النفوس قبل تثقيف الأفكار، وكانت حلق العلم في مسجده صلى الله عليه وسلم تدار من قبله حينا وهو الأكثر، ومن قبل أصحابه تحت إشرافه وملاحظة في بعض الأحيان. وكانت هذه الحلقات تنتشر في أرجاء المسجد النبوي الشريف في البكور من الصباح كما في غيرها من الأوقات.

ومما يدل أيضا أن الحلق العلمية كانت تدار من قبل غيره حديث عبدالله بن عمرو بن العاص -رضي الله تعالى عنهما- السابق ذكره أنه صلى الله عليه وسلم مر بمجلسين ......

فالمسجد كان جامعة كبرى للتعليم وتخريج الأكفاء لإدارة الدولة الإسلامية وإمدادها بالعاملين في كل مجال من مجالات الحياة، وقد كانت المساجد في العالم الإسلامي تخرج الخلفاء والأمراء، والقواد، والعلماء، ورجال القضاء، والفتيا، والمحدثين والمفسرين، واللغويين وغيرهم.

وقد أقفرت أكثر مساجد المسلمين عن أداء هذا الأمر العظيم إلا ما ندر، وأن إعادة المسجد إلى مكانته مرهونة بإعطاء المسجد مكانته الأولى كما كان في صدر هذه الأمة، حيث كان مصدرا رئيسا من مصادر التوجيه والتربية والتعليم.

وأن ذلك إذا حصل سيكون فيه مصالح كثيرة جدا نذكر منها

المصلحة الأولى: إعادة مكانة المسجد التي كاد يفقدها في بعض بلدان المسلمين، وفقدها فعلا في بلدان أخرى.

المصلحة الثانية: نشر التعليم بين جميع طبقات الناس وهو ما تسعى إليه الدول في العصر الحاضر وتسميه بمحو الأمية.

المصلحة الثالثة: أن إنتشار العلم بين الناس يعيد من ابتعد عن الدين بسبب جهله إلى دينه بالعلم النافع.

المصلحة الرابعة: أن يتلقى الشباب الدين الحق على أيدي علماء متمكنين، ولا يأخذوا دينهم من الكتب مباشرة مما قد يؤدي ببعضهم إلى الغلو والإفراط، وبآخرين إلى الجفاء والتفريط.

المصلحة الخامسة: إزالة ما يعاني منه المسلمون من الفرقة والشتات بسبب سوء الفهم وعدم الفقه في الدين وضيق الأفق عند كثيرين منهم.

المصلحة السادسة: التعاون بين طلبة المعاهد الإسلامية والجامعات، لأنهم إذا اجتمعوا في المسجد وتعلموا أمور دينهم من مصادر موثقة ومن علماء متمكنين يبينون للناس أن كل علم من العلوم الكونية التي فيها مصالح لا تتعارض مع قواعد الشريعة الإسلامية ونصوصها.

صحابہ کرام کے ہاں مسجد میں حلقوں کی اہمیت

ولقد عرف الصحابة -رضوان الله عليهم- أهمية التعلم في المسجد، وعقد حلقة، وفضل ذلك، فكانوا يتنافسون في الحضور

إليها ويوصي بعضهم بعضا بها.

عن يزيد الرقاشي قال: كان أنس (رضي الله تعالى عنه) مما يقول: إذا حدثنا هذا الحديث إنه والله ما هو بالذي تصنع أنت وأصحابك. يعني يقعد أحدهم فيجتمعون حوله فيخطب. إنما كانوا إذا صلوا الغداة تعدوا حلقا حلقا يقرؤون القرآن ويتعلمون الفرائض والسنن.[1]

وعن علي الأزدي قال: سألت ابن عباس -رضي الله تعالى عنهما- عن الجهاد، فقال: "ألا أدلك على ما هو خير لك من الجهاد؟ تبني مسجدا فتعلم فيه القرآن وسنن النبي صلى الله عليه وسلم والفقه في الدين."

ومن هذا الاهتمام من رسول الله صلى الله عليه وسلم وأصحابه الكرام بحلقات العلم ومجالسه في المسجد تظهر أهمية الحلقات المسجدية وضرورتها لأمة المسلمة.

وبها يتحقق حفظ العلم وشيوعه في العامة، ويعلم من لا يعلم، فإن العلم لا يهلك حتى يكون سرا كما قال عمر بن عبد العزيز.

والمسجد هو أفضل مقر لتدريس العلم وتعليمه كما أنه أبرك مكان لتلقينه على مدى العصور. قال العبدري: أفضل مواضع التدريس هو المسجد لأن الجلوس للتدريس إنما فائدته أن تظهر به سنة، أو تخمد به بدعة أو يتعلم منه حكم من أحكام الله تعالى. وفي المسجد يحصل فيه هذا الغرض متوافرا لأنه موضع

[1] مجمع الزوائد، العلم، باب الجلوس عند العلم: ١/١٧٥، رقم: ٥٥٩

لاجتماع الناس رفيعهم ووضيعهم وعالمهم وجاهلهم.[1]

ومما لا ريب فيه كما يقول سعيد -رحمه الله تعالى-: "إن التربية والتعليم في أجواء المسجد لا يعدل بها شيء آخر. وخريجوا المساجد غير خريجي غيره في العلم والتقوى، والتطبيق والسلوك وغيره."

هذا كله فإنه لا بد من إحياء رسالة المسجد بإحياء حلقات العلم والذكر المأثور.

إن حلق المساجد خلال التاريخ هي التي أوصلت لنا الإسلام وحفظته علينا حتى وصل إلينا غضا طريا.

لقد درج علماء المسلمين وأفتوا: "أن يقيموا حلقات العلم والذكر في المساجد بطرق متعددة، ومتنوعة. فالواجب على الأمة المسلمة وخاصة علماءها أن تحيي هذا كله في البلد الواحد والقرية، والحي والمنطقة، ويجب دائما أن يكون للقرآن الحظ الأوفر في نشاطنا العلمي، قال تعالى: ﴿ولكن كونوا ربانيين بما كنتم تعلمون الكتب وبما كنتم تدرسون﴾."[2]

مسجد کی آبادی کے فضائل

ائمہ حضرات کو چاہیے کہ مقتدیوں کو مسجد کے درج ذیل فضائل بتلائیں، تاکہ ان میں مسجد کو آباد کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

❶ ...... حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ مسجد کا عادی بن گیا ہے۔ (جب کام سے

[1] المدخل: ١/٨٨ [2] آل عمران: ٧٩، المسجد ودوره في التربية ...... ٧٨،٧٧

چھوڑتا ہے مسجد کا رخ کرتا ہے) تو اس کے مومن ہونے کی شہادت دو کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾[1]

۲ ...... حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''جو شخص صبح یا شام کو مسجد جاتا ہے، جتنی مرتبہ بھی جائے اللہ تعالیٰ (ہر مرتبہ جانے کے بدلے میں) اس کے لیے جنت میں ایک مکان تیار کر دیتا ہے۔''[2]

۳ ...... حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''جس روز اللہ کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا اس دن سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں لے لے گا'' ان سات میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نے اس آدمی کا شمار بھی کیا کہ جب وہ مسجد سے نکلتا ہے تو واپس مسجد میں آنے تک ''اس کا دل مسجد میں ہی اٹکا رہتا ہے۔''[3]

۴ ...... حضرت سلمان رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا جو شخص گھر میں اچھی طرح وضو کرنے کے بعد مسجد کو جاتا ہے، وہ اللہ کی ملاقات کو آنے والا (یعنی اللہ کا مہمان) ہو جاتا ہے اور میزبان پر حق ہے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔[4]

۵ ...... عمرو بن میمون رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کے صحابی فرماتے تھے: ''زمین پر مسجدیں اللہ کے گھر ہیں جو ان مسجدوں میں اللہ کی ملاقات کو آئے اللہ پر حق ہے کہ وہ ان کی عزت کرے۔''[5]

[1] التوبۃ: ۱۸، مسند احمد: ۳/۷۶، رقم: ۱۱۳۲۰، ابوسعید خدری
[2] مسلم، المساجد، باب فضل الصلوٰۃ المکتوبۃ: ۱/۲۳۵
[3] بخاری، الزکوٰۃ، باب الصدقۃ بالیمین: ۱/۱۹۱
[4] مجمع الزوائد، الصلاۃ، باب المشی إلی المساجد: ۲/۱۱۴، رقم: ۲۰۸۷
[5] شعب الایمان للبیہقی، فضل المشی إلی المساجد: ۴/۳۷۸، رقم: ۲۶۸۲

۶ ...... حدیث میں ہے مسجدوں کو آباد کرنے والے اللہ والے ہیں۔[1]

۷ ...... حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مسجد والوں پر نظریں ڈال کر اپنا عذاب پوری قوم پر سے ہٹا لیتا ہے۔[2]

۸ ...... حدیث میں ہے اللہ عزوجل فرماتا ہے مجھے اپنی عزت کی اپنے جلال کی قسم کہ میں زمین والوں کو عذاب کرنا چاہتا ہوں لیکن اپنے گھروں کے آباد کرنے والوں اور اپنی راہ میں آپس میں محبت رکھنے والوں اور صبح سحری کے وقت استغفار کرنے والوں پر نظریں ڈال کر اپنے عذاب کو ہٹا لیتا ہوں۔[3]

۹ ...... مسند احمد میں ہے کہ شیطان انسان کا بھیڑیا ہے۔ جیسے بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے کہ وہ الگ تھلگ پڑی ہوئی ادھر اُدھر کی بکری کو پکڑ کے لے جاتا ہے پس تم پھوٹ اور اختلاف سے بچو۔ جماعت، عوام اور مسجدوں کو لازم پکڑے رہو۔[4]

مسجد کے آباد ہونے سے گھروں اور عصری اداروں میں بھی دین آئے گا

حضرت مفتی زین العابدین صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فرماتے تھے کہ اگر تم سارے مرد حضرت حسن بصری رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کی طرح بھی بن جاؤ پھر بھی دین زندہ نہیں ہوگا جب تک عورتوں کے اندر دین زندہ نہ ہو۔

اور عورتیں ساری رابعہ بصریہ رَحِمَهَا اللّٰهُ تَعَالٰی کی طرح بن جائیں پھر بھی دین زندہ نہیں ہوگا جب تک بچوں میں دین زندہ نہ ہو۔ اسی لیے رسول کریم صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

[1] شعب الایمان للبیہقی: ۴/۳۷۹، رقم: ۲۶۸۴
[2] تفسیر ابن کثیر: ۲/۶۰۱، التوبۃ: ۱۸
[3] تفسیر ابن کثیر: ۲/۶۰۱، التوبۃ: ۱۸
[4] مسند احمد: ۵/۲۳۳، رقم: ۲۱۵۲۴، معاذ بن جبل

نے جو محنت فرمائی اس سے مردوں میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان ہوئے، عورتوں میں امّ المؤمنین خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، بچوں میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور غلاموں میں سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جب ان چاروں طبقوں میں اوپر کی طرف سے محنت ہوگی تو دین تمام شعبوں میں زندہ ہوگا۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم مساجد کو اس طرح آباد کریں کہ اس کا اثر مغرب کے اسکولوں، یونیورسٹیوں، کالجوں تک بھی پہنچے۔

جس کالج، یونیورسٹی، مدرسہ، اسکول میں اگر معمولی دین داری بھی ہے تو وہ مسجد کے ذریعہ سے آئی ہوئی ہوگی، جو کسی نہ کسی امام مسجد نے اسکول کے پرنسپل، اساتذہ وغیرہ کو مسجد کے تعلیمی حلقوں میں بٹھایا ہوگا، ان کے اندر اس بات کا جذبہ بڑھا ہوگا کہ اپنے کام سے پہلے مسجد کے تعلیمی حلقے سے ایمانی نور حاصل کرتے جائیں۔

مسجد میں بیشتر وقت گزارنے سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور یہی نصیحت حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک نوجوان کو بھی کی چناں چہ ایک نوجوان حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور ان سے درخواست کرتا ہے:

"أَوْصِنِيْ يَا صَاحِبَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ."

"رسول اللہ کے محترم صحابی! مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔"

حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"يَا بُنَيَّ! اذْكُرِ اللّٰهَ فِي السَّرَّاءِ يَذْكُرْكَ فِي الضَّرَّاءِ،

يَا بُنَيَّ! كُنْ عَالِمًا أَوْ مُتَعَلِّمًا أَوْ مُسْتَمِعًا وَلَا تَكُنِ الرَّابِعَ فَتَهْلِكَ، يَا بُنَيَّ! لِيَكُنِ الْمَسْجِدُ بَيْتَكَ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "اَلْمَسَاجِدُ بَيْتُ

كُلِّ تَقِيٍّ"، وَقَدْ ضَمِنَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لِمَنْ كَانَتِ الْمَسَاجِدُ بُيُوْتَهُمْ الرَّوْحَ وَالرَّحْمَةَ، وَالْجَوَازَ عَلَى الصِّرَاطِ إِلٰى رِضْوَانِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ."[1]

ترجمہ: "اے میرے بیٹے! خوش حالی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہا کرو، وہ تم کو تنگ دستی کے دنوں میں یاد رکھے گا۔

اے میرے بیٹے! تم عالم بنو یا متعلم، یا (ان دونوں کی) ماننے والا بنو، چوتھے (جاہل) نہ بنو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔

پیارے بیٹے! مسجد تمہارا گھر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "اَلْمَسَاجِدُ بَيْتُ كُلِّ تَقِيٍّ" "مسجدیں ہر متقی آدمی کے گھر ہیں۔

اور اللہ عزوجل نے ان لوگوں کے لیے جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ مسجدوں میں گزارتے ہیں یعنی جو مسجد کو اپنا گھر بنالیتے ہیں راحت و رحمت اور پل صراط سے بآسانی گزر کر اللہ کی خوشنودی تک پہنچنے کی ضمانت لے رکھی ہے۔"[2]

مساجد کے متعلق ائمہ کرام کو ان دو رسالوں کا مطالعہ کرنا چاہیے:

(۱) "اَلْمَسْجِدُ وَأَثَرُهُ فِي تَرْبِيَةِ الْأَجْيَالِ"

(۲) "اَلْمَسْجِدُ وَدَوْرُهُ فِي التَّرْبِيَةِ وَالتَّوْجِيْهِ"

---

[1] مجمع الزوائد، الصلوۃ، باب لزوم المساجد: ۲/ ۱۰۱، رقم: ۲۰۲۷

[2] صحابہ کے واقعات: ۱/ ۳۵۹، حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لوگوں کو نصیحت کرنا۔

فائدہ: بندے نے الحمد للہ! "صور من حياة الصحابة" کا ترجمہ مکمل انداز میں "صحابہ کے واقعات" کے نام سے کیا ہے، جو طلبہ وطالبات کے لیے بہت ہی مفید ہے، ہر قاری سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا خود بھی مطالعہ فرمائے اور تعاونوا على البر والتقوى کے تحت اپنے حلقۂ احباب اور رشتہ داروں میں بھی تعارف کرانے کی کوشش فرمائے۔

اسی طرح اور رسائل میں عرب علماء کرام نے اسلام کی تاریخ سے "مسجد کی اہمیت" ثابت کرتے ہوئے خوب وضاحت سے لکھا ہے کہ زمانہ ماضی میں مسجد ہی ہر ایک کی تربیت گاہ تھی، مساجد...... ائمہ کرام کی قربانیوں اور محنتوں سے آباد ہوا کرتی تھیں، مسجد ہی کے ذریعہ باطل کی چالیں اور جال فیل ہوا کرتے تھے، مسجد ہی کے ذریعہ ہر گھر اور ہر مدرسہ، اسکول میں دین پہنچتا تھا، مسجد ہی کے ذریعہ ہر گھر کے ہر بچہ کی دینی ذہن سازی ہوتی تھی، مسجد ہی کے ذریعہ ہر طبقے کے افراد میں دین زندہ ہوتا تھا، اسی کے متعلق شیخ صالح لکھتے ہیں:

وَلَمْ يَكُنِ الْمَسْجِدُ مَوْضِعًا لِأَدَاءِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ فَحَسْبُ بَلْ كَانَ جَامِعَةً يَتَلَقَّى فِيهَا الْمُسْلِمُونَ تَعَالِيمَ الْإِسْلَامِ وَتَوْجِيهَاتِهِ، وَيَجْتَمِعُونَ فِيهِ، وَتَلْتَقِي فِيهِ الْعَنَاصِرُ الْقَبَلِيَّةُ الْمُخْتَلِفَةُ الَّتِي طَالَمَا نَافَرَتْ بَيْنَهَا نَزَعَاتُ الْجَاهِلِيَّةِ وَحُرُوبُهَا...... وَقَاعِدَةٌ لِإِدَارَةِ جَمِيعِ الشُّئُونِ، وَبَثِّ الْانْطِلَاقَاتِ، وَمَوْضِعًا لِعَقْدِ الْمَجَالِسِ الْاِسْتِشَارِيَّةِ وَالتَّنْفِيذِيَّةِ.

وَلِهٰذَا مَا أَقَامَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَكَانٍ فِي الْمَدِينَةِ إِلَّا كَانَ أَوَّلُ مَا يَفْعَلُهُ بِنَاءَ مَسْجِدٍ يَجْتَمِعُ فِيهِ الْمُؤْمِنُونَ، فَقَدْ أَقَامَ مَسْجِدَ قُبَاءٍ حِينَ أَقَامَ فِيهَا وَصَلَّى الْجُمُعَةَ فِي بَنِي سَالِمِ بْنِ عَوْفٍ بَيْنَ قُبَاءٍ وَالْمَدِينَةِ فِي بَطْنِ وَادِي (رَانُونَاء)، فَلَمَّا أَنْ وَصَلَ إِلَى الْمَدِينَةِ كَانَ أَوَّلُ عَمَلٍ عَمِلَهُ بِنَاءَ الْمَسْجِدِ فِيهَا. [1]

ترجمہ: "مسجدیں صرف پانچ وقت نمازیں پڑھنے کے لیے نہیں ہیں

[1] المسجد ودوره في التربية والتوجيه: ۱۶۳، ۱۶۴

بلکہ وہ ایک اجتماع گاہ ہیں۔ جہاں مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ مختلف گروہ وقبائل حاضر ہوتے ہیں جن کی آپس میں کافی رنجشیں وعداوت پہلے سے ہوتی ہے ایسے میں مسلمانوں کے اندر باہم مشاورت ہو ان کے فیصلے ہوں مختلف شعبوں اور کاموں میں ان کی رہبری ہو تو یہ اصلاح گاہ کا کام دیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جب ہجرت فرمائی تو مدینہ منورہ پہنچ کر کسی مکان میں نہیں ٹھہرے بلکہ سب سے پہلے مسجد قبا کی تعمیر فرمائی تاکہ مسلمان اس میں جمع ہوں۔ اپنے احوال بیان کریں۔ اور وہیں قیام کیا اور بنو سالم بن عوف کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی جو کہ قبا اور مدینہ کے درمیان "رانوناء" کی وادی میں ہے سب سے پہلا کام جب مدینہ پہنچے تو حضور ﷺ نے مسجد کی بنیاد ڈالی۔"

اسی طرح جب ہر مسلمان مسجد سے دین سیکھ کر گھر جائے گا اور امام صاحب نے ہر نمازی کے اندر دین کے پھیلانے کا جذبہ بھرا ہوگا تو یہ باتیں وہ اپنے گھر میں بھی سکھائے گا، پھر اس گھر کا تعلق اس مسجد سے ہو جائے گا، جو رحمتِ خداوندی مسجدوں پر برستی ہے وہ ان مسجدوں کی شاخوں پر جو ہر گھر میں بنی ہوئی ہوں گی ان پر بھی برسے گی اور پھر گھروں میں سے شیاطین کے اثرات دور ہو جائیں گے، رحمتوں کے اثرات غالب ہوں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپس میں الفت ومحبت قائم ہوگی۔

جب گھر کے اندر امام صاحب کی محنت سے مسجد کے اعمال زندہ ہوں گے تو مسجد والی برکات گھروں میں منتقل ہوں گی اور اس برکت کا ظہور آپس کے تعلقات میں ہوگا۔ میاں بیوی میں، بھائی بھائی میں، بہن بہن میں، ایثار، الفت ومحبت کے مناظر قائم ہوں گے پھر جس طرح مساجد کی آسمانوں سے حفاظت کی جاتی ہے ایسے

ہی ان گھروں کی بھی حفاظت کی جائے گی، جس طرح بیت اللہ کی ابرہہ کے لشکر سے حفاظت کی گئی اسی طرح زمین پر پھیلی ہوئی اس کی تمام شاخوں (مساجد) کی حفاظت کی جائے گی اور پھر جن مکانات کا مسجد سے تعلق ہو گیا اور ان مکانات میں مسجد کے اعمال زندہ ہو گئے تو وہ مکانات بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجائیں گے۔

اس لیے کہ برکت، حفاظت رحمت اعمال کے کرنے پر ہے، جب اعمال سارے گھروں میں وجود میں آئیں گے، تو گھروں میں بھی وہی رحمتیں و برکتیں اتریں گی۔ جس سے ہر گھر دنیا ہی میں جنت کا نمونہ بنے گا۔ اور دین کا گہوارہ بنے گا۔

پھر اس گھر سے جو نئی نسل تیار ہوگی وہ دین کی خادم بن کر زندگی گزارے گی اور دین کی مدد کرنے والی بن کر اپنی زندگی گزارے گی اور جب معاشرہ کا ہر فرد دین کی مدد کرنے والا بن جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی مدد بھی آئے گی جو کہ اللہ کا وعدہ ہے ﴿إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾[1]

شیخ آگے لکھتے ہیں:

"وَهٰذِهٖ هِيَ الثَّمَرَةُ إِذَا كَانَ الْبَيْتُ يَقِظًا وَاعِيًا، وَمُرَبِّيًا مُرْشِدًا، وَمُوَجِّهًا مُقْنِعًا، وَمُسْتَقِرًّا سَوِيًّا. أَمَّا إِذَا كَانَ الْبَيْتُ لَاهِيًا مُنْصَرِفًا، وَمَشْغُولًا مُشْغَلًا، وَغَافِلًا مُهْمَلًا، وَمُفَكَّكًا مُمَزَّقًا، وَضَعِيفًا وَاهِيًا، وَجَاهِلًا مُقَصِّرًا، فَسَيُثْمِرُ ثَمَرَةً مُرَّةً، وَنَبَاتًا ضَارًّا، وَهٰذَانِ هُمَا النَّتِيجَةُ الطَّبِيعِيَّةُ لِبَيْتٍ زَاخِرٍ بِالْأَثَاثِ، عَامِرٍ بِالطَّعَامِ، وَمُقَصِّرٍ فِي رِسَالَتِهِ الدِّينِيَّةِ وَالتَّرْبَوِيَّةِ."[2]

جس طرح مسجد نبوی اعمال سے آباد تھی، ہر مسلمان اس مسجد سے اپنے شعبہ زندگی کا دین سیکھتا اور سکھاتا تھا، اسی طرح آج بھی ائمہ کرام کی جماعت یہ فیصلہ کر

[1] محمد: ۷ [2] المسجد و دورہ فی التربیۃ والتوجیۃ: ۱۷۰

لیے کہ ہمیں بھی اپنی مسجدوں کو اعمال سے آباد کرنا ہے۔ تو آپ یقین رکھیے! دنیا میں بے دینی کا جو غلبہ ہے وہ ختم ہو جائے گا، دینی فضا ہر شعبہ میں غالب ہو جائے گی۔

آپ غور فرمائیے: آج جتنے بھی برائیوں کے مراکز ہیں ان سب کے بانی ان کے چلانے والے مسلم ممالک میں کسی نہ کسی مسجد کے آس پاس رہنے والوں میں سے ہی ہیں۔ اگر مسجدیں آباد ہوں اور ان میں یہ فکر کی جائے کہ محلّہ کے ہر شخص کو دین پر لانا مسجد والوں کی ذمہ داری ہے تو یہ برائیوں کے مراکز وجود میں نہ آتے۔ اسی طرح ہر شخص کا مسجد سے تعلق ہوتا ہے۔ مسجد سے موچی کا،...... ڈاکٹر کا،...... محاسب کا،...... باورچی کا،...... قصاب کا،...... حلاق (حجام) کا...... اسکول کے پرنسپل کا،...... مدرسے کے خادم کا،...... بینک کے چپڑاسی کا،...... ہر ایک کا تعلق ہوتا ہے۔

اگر ائمہ حضرات اپنی مسجد کے آس پاس رہنے والے لوگوں کو اس بات پر راضی کرلیں کہ اپنے کام پر مسجد سے ہوتے ہوئے جاؤ، اور جب کاروبار ملازمت سے واپس لوٹو تو مسجد میں پہلے آؤ وہاں تعلیم کے حلقے میں بیٹھو۔ جاتے ہوئے مسجد کے حلقے سے ایمانی نور حاصل کرکے بازاروں میں پھیلاؤ اور آتے ہوئے مسجد سے گھر پر ایمانی نور لے کر جاؤ۔ جب ہر شخص کا مسجد سے اس طرح تعلق ہو جائے گا تو واقعتا قرآن کریم کی یہ مثال اس پر صادق آئے گی:

﴿وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ﴾[1]

"اور ہم نے اس کو دی روشنی کہ لیے پھرتا ہے اس کو لوگوں میں۔"

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ فرماتے ہیں کہ نور ایمان صرف کسی مسجد یا خانقاہ یا گوشہ و حجرہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ نور دیا ہے وہ اس کو لے کر سب لوگوں کے رزم و بزم میں لیے پھرتا ہے اور ہر جگہ اس روشنی سے خود بھی فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ نور ظلمت سے دب نہیں سکتا

[1] الانعام: ۱۲۲

جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی اندھیرے میں مغلوب نہیں ہوتا، البتہ اس کی روشنی دور تک نہیں پہنچتی تیز روشنی ہوتی ہے تو دور تک پھیلتی ہے کم ہوتی ہے تو تھوڑی جگہ کو روشن کرتی ہے مگر اندھیری پر بہر حال غالب ہی رہتی ہے۔[1]

۲ مسجد و مدرسہ کا دعوت و تربیت میں باہمی ارتباط

شیخ صالح فرماتے ہیں:

"جس طرح ہم نے ایک ہی سایہ تلے منزل و مسجد کو جمع کیا ہوا ہے اسی طرح ہم مسجد و مدرسہ کو بھی ایک ہی چھت کے تلے جمع کر لیں تو یہ باہمی کوشش اور مقصد کے حصول میں اور زیادہ موثر رہے گا، جب کہ ایک طالب علم بچپن سے لڑکپن تک کی زندگی مدرسہ میں گزارتا ہے یہ وقت ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ سیکھتا ہے وہ اس کے ذہن کی پختگی اور کردار کے نکھار میں اثر انداز ہوتا ہے۔ اب اگر اس تعلیم کی روح کو اسکول کی عمارت کے بجائے مسجد کی فضا میں پھونکیں، شریعت و دعوت اور اس کی فضیلتوں کے پودے اس پاک ماحول میں اُگائے جائیں تو اس کا بچے کی طبیعت پر اچھا اثر ہوگا، بچہ دین دار بنے گا، حافظ قرآن اور نمازی بنے گا۔

اسکول کا تو یہ حال ہے کہ اس میں جدید ایجادات کی بھرمار کر دی ہے کہ یہ نعرہ لگایا جا سکے کہ اول الذکر دقیانوسوں کا گروہ ہے وہ زمانہ قدیم کی طرف لوٹ رہا ہے اور موخر الذکر روشن خیالوں کا ہے جن کا مستقبل تابناک ہے۔ طبقہ اولی کا کام صرف وعظ و تدریس رہ گیا ہے اور طبقہ ثانیہ بہت اونچی ذمہ داریاں نبھا رہا ہے۔ طبقہ اولی کی اکثریت معاشرے کے محروم اور بے کاروں کی ہے اور طبقہ ثانیہ کی اکثریت مالدار اور ذمہ داروں کی ہے۔ ان ساری پریشانیوں کا حل، اور باطل والوں سے مکر کا توڑ بھی ایک نسخۂ اکسیر ہے کہ ہم مساجد کو اعمال سے آباد کریں، مسجد ہر وقت کھلی ہوئی

[1] معارف القرآن: ۲/ ۴۳۹

ہو جس کا ہر آدمی مسجد سے اپنا دین سیکھ رہا ہو اور دوسروں کو سکھا رہا ہو۔"

۳ مقتدیوں کو گھروں میں مسجد بنانے کی ترغیب

امام صاحب مقتدیوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرے کہ سنت ہے اپنے گھر میں کوئی خاص جگہ نماز کے لیے مخصوص کر لی جائے اور اس کو پاک و صاف رکھا جائے اور اس میں خوشبو لگائی جائے، حدیث میں اس جگہ کے لیے مسجد ہی کا لفظ بولا گیا ہے۔[1]

گھر معاشرے کی اکائی ہے، گویا معاشرے کو اچھا یا برا بنانے کا سانچہ گھر ہی ہے، جیسا کہ دیوار کی مضبوطی کی پہلی ذمہ داری اس دیوار میں لگنے والی اینٹوں پر آتی ہے، اگر صحیح اینٹیں دستیاب نہ ہو سکیں تو دیوار و مکان کی بہتری اور پائیداری کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔

اسی طرح اگر گھر کا ماحول بہتر ہوگا تو اس گھر سے بہترین انسان ڈھل کر معاشرہ میں جائیں گے اور بہتر کردار ادا کر سکیں گے، اگر گھر کا ماحول بہتر نہ بن سکا تو اس سانچے سے بہتر انسان بھی نہیں ڈھل سکیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ گھر کے ماحول کو بچانا اور آگے کے مرحلوں پر ساری توجہ لگا کر بہتر معاشرتی ماحول کی امید لگانا ہماری زبان کے اس محاورہ کے مطابق ہے کہ "فلاں ہاتھ چھوڑ کر کہنیاں چاٹ رہا ہے" یا اس کی سادہ مثال یہ ہوگی کہ درخت کے تنے میں تو کوئی پانی نہیں ڈالتا شاخوں کو دھونے پر لگے ہوئے ہیں۔

ہمارے مسائل یہ ہیں کہ بچے نافرمان ہیں، بداخلاق ہیں، وقت ضائع کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، گھر میں سکون نہیں، میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ رہتے ہیں، ہمسائے آپس میں ایک دوسرے سے نالاں ہیں۔ بازار میں جاؤ خیانت اور

[1] ابن ماجہ، ابواب المساجد، باب تطہیر المساجد وتطییبہا، رقم: ۷۵۹

جھوٹ ہے، ہمدردی، تعاون باہمی نام کی کوئی چیز نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان مشکلات کے جراثیم خود ہمارے اپنے گھروں کے ماحول میں پیدا ہوئے، اس کا حل بھی یہ ہے کہ آپ اپنے گھروں کو ٹی وی اور گانوں جیسے خرافات سے پاک کریں کہ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے نہ آدمی تلاوت کر سکتا ہے اور نہ نماز پڑھ سکتا ہے اور نفلی نماز اور سنتیں گھروں میں ادا کریں، بچے دیکھیں گے انہیں نماز پڑھنے کی عادت پڑے گی۔ خواتین کو بھی خیال رہے گا اور گھر کے پورے ماحول پر اس کے اچھے اثرات پڑیں گے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ گھر میں (نفلی اور سنت) نمازیں پڑھا کرو اور گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔[1]

ایک مرتبہ آپ ﷺ ایک انصاری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ انہوں نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ آپ یہاں (ایک وقت کی) نماز پڑھ لیں تاکہ ہم اس جگہ کو مسجد بنا لیں۔[2]

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اپنے گھروں میں نماز کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیں جس میں جائے نمازیں ہوں اور نماز کے دوسرے لوازمات یعنی قرآن مجید اور دینی کتابیں وغیرہ موجود ہوں، اس کے کئی فائدے ہیں۔ ایک تو گھر کی خواتین کو نماز کی ادائیگی میں آسانی رہے گی ورنہ تو بڑی مشکل پیش آتی ہے، جائے نماز ڈھونڈو پھر جگہ ڈھونڈو۔ اس لیے سو تدبیروں کی ایک تدبیر یہی ہے کہ گھر کے ایک کمرے کو گھر کی مسجد بنادو۔ خصوصاً یہ جہاد کریں کہ ٹی وی لاؤنج کو ختم کر کے اس کو مسجد بنائیں۔ ایک مسلمان کی شان ہی نہیں کہ اس کے گھر میں ٹی وی لاؤنج ہو اور اس کے بچے ٹی وی پروگرام دیکھیں۔

لہٰذا گھر میں مسجد کے لیے جگہ خاص کرنا اس عمل میں بڑی برکت ہوگی اور گھر کی

[1] ترمذی، الصلوۃ، باب ماجاء فی فضل الصلوۃ التطوع فی البیت، رقم: ۴۵۱

[2] ابن ماجہ، ابواب المساجد، باب المساجد فی الدور، رقم: ۷۵۴

بنی جگہ، ان شاء اللہ مسجد ہونے کی وجہ سے جنت میں منتقل کر دی جائے گی۔ یہ کتنی بڑی سعادت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے مقتدا اور پیشوا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے یہی حکم فرمایا ہے۔[1]

گھر میں مسجد بنانے کے فائدے

اب گھر کا وہ حصہ جو نماز کے لیے مختص کیا گیا ہے وہاں ذکر و اذکار گھریلو خواتین کی دینی مجلسیں اور قرآن کریم کی تلاوت بھی کی جا سکتی ہے اور اگر گھر میں مسجد نہ بنائی گئی ہو تو پھر خواتین ٹیلیفون کے پاس یا ٹی وی والے کمرے میں نماز کے لیے کھڑی ہوں گی تو کبھی فون کی گھنٹی دوران نماز بجے گی اور کبھی ٹی وی کی آواز آئے گی جس سے نماز میں خلل واقع ہوگا اور خضوع خشوع ختم ہو جائے گا۔ چناں چہ اس اہتمام سے ان چیزوں سے حفاظت ہو جائے گی اور اس جگہ کا احترام ہر چھوٹے بڑے کے دل میں بیٹھ جائے گا۔ پھر وہاں آکر بچے بھی خلل نہیں ڈالیں گے۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ خواتین اس جگہ اعتکاف کے لیے بھی بیٹھ سکتی ہیں۔

اب اگر اس کی یوں ترتیب بنالیں کہ گھر کا ایک کمرہ ان مقاصد کے لیے خاص کر دیں۔ تو اس کمرے میں دینی و علمی کتابوں اور رسائل کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور چاروں طرف کی دیواروں میں شیلف بنا کر لائبریری کے مقاصد بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ گھر کے بچوں کی تعلیمی تربیت، ان کے اسباق کی حاضری وغیرہ یا پھر بچے اپنا (HOME WORK) گھر کا کام وغیرہ بھی اسی جگہ کر سکتے ہیں۔ اس کا پھل یہ ملے گا کہ گھر سے نیک اور صالح انسان ڈھلنے لگیں گے اور وہ پورے معاشرے میں نیکی پھیلائیں گے۔

ضروری وضاحت

ائمہ کرام لوگوں کو بتائیں کہ گھر کا کمرہ جس کو نماز کے لیے مختص کیا جائے وہ محلہ

[1] ابن ماجہ، ابواب المساجد، باب تطہیر المساجد وتطییبہا، رقم: ۷۵۹

کی وقف مسجد جیسا ہرگز نہیں ہوگا بل کہ وہ گھر ہی ہے آپ کسی ضرورت کے وقت اس کمرہ کو کھانے، سونے اور بیٹھنے اور سامان رکھنے کی ذاتی ضرورت کے لیے استعمال بھی کر سکتے ہیں، وہ آپ کا گھر ہی ہے۔ اسی طرح گھر کے اس مخصوص کمرہ کی وجہ سے محلہ کی مسجد میں فرض نماز چھوڑنا بھی سخت گناہ ہوگا، البتہ یہ مردوں کے لیے نوافل و تلاوت اور ذکر کی جگہ ہوگی، اور عورتیں اپنی مکمل نماز اسی میں ادا کریں۔

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے ہر مسلمان کے لیے مستحب ہے کہ اپنے گھر میں ایک مسجد بنالے جس میں سنتیں اور نوافل پڑھا کرے، لیکن اس کے واسطے (بالکل) مسجد کا حکم نہیں، مثلاً عورتیں بحالتِ حیض اس میں داخل ہو سکتی ہیں، بخلاف مساجد کے کہ ان میں داخل ہونا جائز نہیں۔[1]

یہ ضروری وضاحت نوٹ فرمالیں کہیں ایسا نہ ہو کہ نفع ڈھونڈتے ڈھونڈتے اصل پونجی کا ہی نقصان ہو جائے، یعنی گھر کا ماحول بہتر بناتے بناتے محلہ کی مسجد میں فرض نمازیں چھوٹ جائیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ”جو لوگ بغیر کسی عذر کے گھروں میں فرض نماز پڑھتے ہیں، مسجد میں نہیں آتے، میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔“[2]

❷ مسجد کی تعمیر

مساجد کی تعمیر میں ائمہ حضرات اور اہلِ علم کو چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک یہ کہ مسجد کے لیے زمین زبردستی کسی شخص یا کسی جماعت پر دباؤ ڈال کر نہ لی جائے۔ مسجد کے لیے زمین یا مالی چندہ وغیرہ امور میں خصوصاً طیبِ نفس کی رعایت رکھنا بہت ضروری ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

[1] خلاصۃ الفتاویٰ: ۲۲۷/۱

[2] بخاری: الأذان، باب وجوب صلاۃ الجماعۃ، رقم: ٦٤٤

”لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ.“[1]

تَرْجَمَہ: ”کسی مسلمان کا مال (تمہارے لیے) حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے نہ دے۔“

مسند احمد کی روایت میں بغیر ”مسلم“ کے لفظ کے یہ حدیث مروی ہے۔[2]

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

اس حدیث میں ”اجازت“ کا لفظ استعمال نہیں فرمایا بل کہ ”خوش دلی“ کا لفظ استعمال فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ صرف اجازت کافی نہیں بل کہ وہ اس طرح اجازت دے کہ اس کا دل خوش ہو، تب تو وہ چیز حلال ہے۔ اگر آپ دوسرے کی چیز استعمال کر رہے ہیں، لیکن آپ کو اس کی خوش دلی کا یقین نہیں ہے، تو آپ کے لیے وہ چیز استعمال کرنا جائز نہیں۔[3]

ہر ایک کی ملکیت واضح ہونی چاہیے

یہ اصول ذہن میں رکھو کہ جب تک دوسرے کی خوش دلی کا اطمینان نہ ہو، اس وقت تک دوسرے کی چیز استعمال کرنا حلال نہیں۔ جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے اتقیاء کا یہ مقام عطا فرمایا ہے وہ اس حد تک اہتمام فرماتے ہیں کہ دوسرے کی چیز کہیں اس کی خوش دلی کے بغیر ہمارے پاس نہ آجائے۔

مثلاً آپ نے کسی سے کوئی چیز مانگ لی تو مانگنے سے پہلے ذرا یہ سوچو کہ اگر تم سے کوئی دوسرا شخص یہ چیز مانگتا تو کیا تم خوش دلی سے اس کو دینے پر راضی ہو جاتے؟ اگر تم خوش دلی سے راضی نہ ہوتے تو پھر وہ چیز دوسرے سے بھی مت مانگو۔ اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ مروّت کے دباؤ میں آکر وہ شخص تمہیں وہ چیز دے دے لیکن اس کا

[1] شعب الإیمان، باب في قبض الید عن الأموال المحرمۃ……: ۳۴٦/۷، رقم: ٥١٠٥

[2] مسند أحمد: ٥/٧٣، رقم: ٢٠١٧٢

[3] اصلاحی خطبات: ۸۸/۹

دل اندر سے راضی نہ ہو، اور اس کے نتیجے میں تم نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے مصداق بن جاؤ کہ کسی مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے[1]

چاہے وہ بیٹا کیوں نہ ہو، باپ کیوں نہ ہو، بھائی اور بہن کیوں نہ ہو، چاہے بیوی اور شوہر کیوں نہ ہو۔ اس اصول کو فراموش کرنے کی وجہ سے ہمارے مال میں حرام کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میں تو کوئی غلط کام نہیں کرتا، رشوت میں نہیں لیتا، سود میں نہیں کھاتا، چوری میں نہیں کرتا، ڈاکہ میں نہیں ڈالتا، اس لیے میرا مال تو حلال ہے۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ اس اصول کا لحاظ نہ رکھنے کی وجہ سے مال حرام کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ اور مال حرام کی آمیزش حلال مال کو بھی تباہ کر دیتی ہے۔ اور اس کی برکتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ اس کا نفع ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس حرام مال کے نتیجے میں انسان کی طبیعت گناہوں کی طرف چلتی ہے۔ روحانیت کا نقصان ہوتا ہے۔ اس لیے معاملات کو صاف رکھنے کی فکر کریں کہ کسی معاملے میں کوئی الجھاؤ نہ رہے۔ ہر چیز صاف اور واضح ہونی چاہیے۔ ہر چیز کی ملکیت واضح ہونی چاہیے۔ کہ یہ چیز میری ملکیت ہے۔ یہ فلاں کی ملکیت ہے۔ البتہ ملکیت واضح ہو جانے کے بعد آپس میں بھائیوں کی طرح رہو۔ دوسرے شخص کو تمہاری چیز استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو دے دو، لیکن ملکیت واضح ہونی چاہیے۔ تاکہ کل کو کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو جائے۔

اصل مقصود دین ہے

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مدارس و مساجد حفاظت دین کا ذریعہ ہیں، ذریعہ کی حفاظت پر مقصود کو قربان نہیں کرنا چاہیے، اور اسی کو فقہ کہتے ہیں کہ دین کی سمجھ ہو، کون سا کام کس وقت کرنا چاہیے اور کون سا کام کس وقت نہیں کرنا چاہیے

[1] شعب الایمان: ۳۴۶/۷، رقم: ۵۱۰۵

"الأهم فالأهم" کو مقدم رکھنا چاہیے اسی طرح دین کو (یعنی اوامر الٰہیہ کو) کسی حال میں بھی چھوڑنا نہیں چاہیے اور منہیات، منکرات سے بہت ہی بچنا چاہیے اللہ نہ کرے کسی منکر پر عمل کرنے سے مسجد و مدرسہ کی حفاظت بھی نظر آئے تو یہ نظر کا دھوکہ ہے اس لیے کہ منکر (گناہ) کرنے سے اللہ کی مدد ہٹ جائے گی اور جس کام میں اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو تو وہ دنیا و آخرت میں بوجھ ہی ہے۔ اور معصیت کا ذریعہ ہے۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ واقعہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب ان کو مشورہ دیا گیا کہ فلاں بااثر رئیس کو دار العلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن بنالیا جائے کہ نہ بنانے میں اس سے فساد کا خطرہ ہے۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ اگر عند اللہ مجھ سے سوال ہوا کہ نالائق کو رکن کیوں بنایا؟ تو اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوگا، اور رکن نہ بنانے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی ضرر ہو سکتا ہے کہ مدرسہ بند ہو جائے گا، میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا یہ جواب دے سکوں گا کہ میں نے تو آپ کے حکم کی تعمیل کی، اس پر اگر مدرسہ بند ہو گیا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس تقویٰ کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ رئیس صاحب مدرسہ کے خلاف چیختے رہ گئے مگر الحمد للہ دار العلوم مسلسل حیرت انگیز ترقی پر گامزن رہا[1]

اسی طرح مفتی الٰہی بخش رحمہ اللہ تعالیٰ جو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے اجداد میں سے ہیں ان کا ایک عجیب واقعہ منقول ہے۔

مسلمان ہار گئے مگر اسلام جیت گیا

کاندھلہ میں زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا جس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑا تھا۔ ہندو کہتے تھے کہ یہ ہمارا ہے ہم یہاں مندر بنائیں گے اور مسلمان

[1] ملخصاً تحفۃ احسن الفتاوی: ۳۹/۱

کہتے تھے کہ یہ ہمارا ہے ہم یہاں مسجد بنائیں گے۔ جب دونوں طرف سے اس قسم کی باتیں ہونے لگیں تو پورے شہر کے اندر آگ لگنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ انگریز حکمران تھا۔ وہ پریشان ہوا کہ اب اس بات کو کیسے سنبھالا جائے۔ مقدمہ عدالت میں پہنچ گیا۔ جج انگریز تھا۔ اس کے سامنے مسلمان بھی کھڑے تھے اور ہندو بھی۔ جج نے کہا کوئی تجویز بتا دو کہ جس سے جھگڑے کے بغیر ہی کوئی فیصلہ ہو سکے۔ ہندوؤں نے کہا کہ ہمارے پاس ایک تجویز ہے۔ جج نے پوچھا وہ کون سی ہے؟ کہنے لگے، ہم ایک مسلمان عالم کا نام بتا دیتے ہیں۔ آپ ان کو اپنے پاس بلا لیجیے، اور ان سے پوچھ لیجیے کہ یہ جگہ کس کی ہے۔ اگر وہ کہیں کہ ہندوؤں کی ہے تو ہمارے حوالے کر دیجیے اور اگر وہ کہیں کہ مسلمانوں کی ہے تو ان کے حوالے کر دیجیے۔ مگر ہم ان کا نام صرف آپ کو تنہائی میں بتائیں گے، لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں کریں گے۔ جج نے مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا آپ کو یہ منظور ہے؟ مسلمانوں نے سوچا کہ وہ مسلمان ہو گا لہٰذا وہ مسجد بنانے کے لیے بات کرے گا۔ چناں چہ کہنے لگے، ہاں منظور ہے۔ جج نے فیصلے کے لیے اگلی تاریخ دے دی۔

جج نے ہندوؤں سے تنہائی میں پوچھا تو انہوں نے مفتی الٰہی بخش صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا نام بتا دیا جو کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے صاحب نسبت بزرگ تھے۔ باہر نکل کر دوسرے ہندوؤں نے اپنے نمائندہ ہندوؤں کی بڑی ملامت کی کہ تم نے ایک مسلمان کا نام دے دیا ہے۔ وہ تو مسلمانوں کے حق میں گواہی دے گا۔ تم نے تو اپنے ہاتھوں سے خود ہی زمین دے دی۔ مگر مسلمانوں کے دل بڑے خوش تھے کہ ایک مسلمان کی گواہی لی جائے گی۔ چناں چہ وہ خوشیاں منانے لگے۔

جب اگلی تاریخ آئی تو کثیر تعداد میں لوگ عدالت میں پہنچ گئے۔ مفتی الٰہی بخش رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی وہاں تشریف لے آئے۔ جج نے مفتی صاحب سے کہا، جناب! آپ بتائیے کہ یہ زمین مسلمانوں کی ہے یا ہندوؤں کی؟ مسلمان خوش تھے کہ

ابھی کہیں گے کہ مسلمانوں کی ہے مگر مفتی صاحب نے فرمایا، یہ زمین ہندوؤں کی ہے۔ جج نے پوچھا کیا اس زمین پر ہندو اپنا گھر بنا سکتے ہیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا، جب ہندوؤں کی ملکیت ہے تو مندر بنائیں یا گھر بنائیں ان کی مرضی، ان کو اختیار ہے۔ لہٰذا جج نے اسی وقت ایک فیصلہ تاریخی الفاظ میں لکھا:

''آج کے اس مقدمے میں مسلمان ہار گئے مگر اسلام جیت گیا۔''

جب جج نے یہ فیصلہ سنایا تو ہندوؤں نے کہا، جج صاحب! آپ نے فیصلہ ہمارے حق میں دے دیا ہے۔ ہم کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوتے ہیں۔ اب ہم اپنے ہاتھوں سے اس جگہ مسجد بنائیں گے۔ سُبْحَانَ اللّٰہ۔

ایک اللہ والے کی زبان سے نکلی ہوئی سچی بات کا یہ اثر ہوا کہ ہندوؤں نے اسلام بھی قبول کیا اور اپنے ہاتھوں سے مسجد بھی بنا دی۔ کسی نے کیا ہی اچھی بات کہی ہے

ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق[۱]

مسجد نبوی کے لیے زمین مفت قبول نہ کی

جب حضور اقدس ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے پیش نظر سب سے پہلا کام یہ تھا کہ یہاں پر کوئی مسجد بنائی جائے۔ وہ مسجد نبوی جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ چناں چہ ایک جگہ آپ کو پسند آگئی جو خالی پڑی ہوئی تھی۔ آپ نے اس جگہ کے بارے میں معلوم کرایا کہ یہ کس کی جگہ ہے؟ تو پتہ چلا کہ بنی نجار کے لوگوں کی ہے۔ جب بنو نجار کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ اس جگہ پر مسجد بنانا چاہتے ہیں تو انہوں نے آ کر عرض کیا: ''یا رسول اللہ! یہ ہماری بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہماری جگہ پر مسجد بنائی جائے۔ ہم یہ جگہ مسجد

[۱] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر: ۲۹۵، ۲۹۶

کے لیے مفت دیتے ہیں تاکہ آپ یہاں پر مسجد نبوی کی تعمیر فرمائیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں، میں مفت نہیں لوں گا، تم اس کی قیمت بتاؤ، قیمت لے کر یہ لوں گا۔" حالاں کہ بظاہر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اپنی سعادت اور خوش نصیبی سمجھ کر چاہ رہے تھے کہ ان کی جگہ مسجد نبوی کی تعمیر میں استعمال ہو جائے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے مفت لینا گوارہ نہیں کیا۔[1]

تعمیرِ مسجد کے لیے دباؤ ڈالنا

علماء کرام نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ویسے تو جب بنی نجار کے لوگ مسجد کے لیے چندہ کے طور پر مفت زمین دے رہے تھے تو یہ زمین لینا جائز تھا، اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں تھی۔ لیکن چوں کہ مدینہ منورہ میں اسلام کی یہ پہلی مسجد تعمیر ہو رہی تھی۔ اگرچہ قبا میں ایک مسجد تعمیر ہو چکی تھی۔ اور یہ وہ مسجد تھی جس کو آگے حرم مکہ کے بعد دوسرا مقام حاصل ہونا تھا۔ اس لیے آں حضرت ﷺ نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ یہ زمین اس طرح مفت، بغیر قیمت کے لے لی جائے۔ ورنہ آئندہ کے لیے لوگوں کے سامنے یہ نظیر بن جائے گی کہ جب مسجد بنانی ہو تو مسجد کے لیے زمین قیمتاً خریدنے کے بجائے لوگ مفت اپنی زمینیں دیں۔ اور اس لیے یہ زمین مفت قبول نہیں کی تاکہ لوگوں پر یہ واضح فرما دیں کہ یہ بات درست نہیں کہ مسجد کی تعمیر کی خاطر دوسروں پر دباؤ ڈالا جائے۔ یا دوسروں کی املاک پر نظر رکھی جائے۔ اس وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے پیسے دے کر وہ زمین خریدی۔ اور پھر مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی۔ تاکہ معاملہ صاف رہے اور کسی قسم کی کوئی الجھن برقرار نہ رہے۔[2]

مسلمانوں کی تاریخ میں یہ واقعہ کتنا مثالی اور رہتی دنیا تک ایک بہترین نمونہ

[1] بخاری، مناقب الانصار، باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ المدینۃ، رقم: ۳۹۳۲
[2] اصلاحی خطبات: ۹/۱۰۹

یہ کہ مسجد جیسی مقدس جگہ بنانے کے لیے بھی کسی انسان کو تکلیف دینا جائز نہیں۔

حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک گھر مدینہ منورہ کی مسجد (نبوی) کے بالکل ساتھ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے مسجد میں شامل کرنا چاہا تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: "بِعْنِيهَا" "آپ یہ گھر میرے ہاتھ بیچ دیں۔" حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "آپ یہ گھر مجھے ہدیہ ہی کر دیں۔" وہ بھی نہ مانے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "آپ خود ہی یہ گھر مسجد میں شامل کر دیں۔" انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "لَا بُدَّ لَكَ مِنْ إِحْدَاهُنَّ" "آپ کو ان تین باتوں میں سے کوئی ایک کام تو کرنا ہی پڑے گا، لیکن حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر بھی تیار نہ ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اچھا پھر کسی کو آپ ثالث مقرر کر لیں جو ہمارا فیصلہ کر دے۔ انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرر کیا۔ یہ دونوں حضرات اپنا مقدمہ ان کے پاس لے گئے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: "مَا أَرَى أَنْ تُخْرِجَهُ مِنْ دَارِهِ حَتَّى تُرْضِيَهُ" "میرا فیصلہ یہ ہے کہ آپ ان کی مرضی کے بغیر ان سے یہ گھر نہیں لے سکتے۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا: "آپ کو یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن میں ملا ہے یا حضور ﷺ کی حدیث میں؟"

انہوں نے کہا: "حضور ﷺ کی حدیث میں۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: "وہ حدیث کیا ہے؟"

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے جب بیت المقدس

کی تعمیر شروع کی تو جب بھی وہ کوئی دیوار بناتے تو صبح کو وہ گری ہوئی ہوتی تھی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی بھیجی کہ اگر آپ کسی کی زمین میں بنانا چاہتے ہیں تو پہلے اسے راضی کرلیں۔" یہ سن کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خوشی سے اس گھر کو مسجد میں شامل کردیا۔[1]

حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر لے کر مسجد (نبوی) میں شامل کردیں۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں گھر دینے سے انکار کردیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "میں تو یہ گھر ضرور لوں گا۔" حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فیصلہ کروالو۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "ٹھیک ہے۔"

چناں چہ دونوں حضرات حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور ان سے سارا قصہ بیان کیا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان بن داود علیہما السلام کی طرف وحی بھیجی کہ وہ بیت المقدس کی تعمیر کریں۔ وہ زمین ایک آدمی کی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے وہ زمین خریدی۔ جب اسے قیمت ادا کرنے لگے تو اس آدمی نے کہا: "جو قیمت تم مجھے دے رہے ہو وہ زیادہ بہتر ہے یا جو زمین تم مجھ سے لے رہے ہو وہ زیادہ بہتر ہے؟"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: "جو زمین میں تم سے لے رہا ہوں وہ زیادہ بہتر ہے۔" اس پر اس آدمی نے کہا: "تو پھر اس قیمت پر میں راضی نہیں ہوں۔" پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے پہلے سے زیادہ قیمت دے کر خریدا۔ اس آدمی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ دو تین مرتبہ اسی طرح کیا۔ (ایک قیمت مقرر کرکے پھر اس سے زیادہ کا مطالبہ کردیتا) آخر حضرت سلیمان

۱ کنز العمال، الرابع، کتاب الصلاۃ، حقوق المسجد: ۸/ ۱۵۰، رقم: ۲۳۰۹۰

علیہ السلام نے اس پر شرط لگائی کہ تم جتنی قیمت کہہ رہے ہو میں اتنے میں خریدتا ہوں، لیکن تم بعد میں یہ نہ پوچھنا کہ زمین اور قیمت میں کون سی چیز بہتر ہے۔ چناں چہ اس کی بتائی ہوئی قیمت پر خریدنے لگے تو اس نے بارہ ہزار قنطار سونا قیمت لگائی۔ (ایک قنطار چار ہزار دینار کو کہتے ہیں) حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ قیمت بہت زیادہ معلوم ہوئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ اگر تم اسے یہ قیمت اپنے پاس سے دے رہے ہو تو پھر تم جانو۔ اور اگر ہم اپنے دیے ہوئے مال میں سے دے رہے ہیں تو پھر اسے اتنا دو کہ وہ راضی ہوجائے۔ چناں چہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔" اور پھر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "میرا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے گھر کے زیادہ حق دار ہیں اگر ان کا گھر مسجد میں شامل کرنا ہی ہے تو پھر وہ جس طرح راضی ہوں انہیں راضی کیا جائے۔" اس پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "اب آپ نے میرے حق میں فیصلہ کردیا ہے تو میں یہ گھر مسلمانوں کے لیے صدقہ کرتا ہوں۔"[1]

مسجد میں نقش ونگار اور بے ضرورت چیزیں بنانا

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے آداب المساجد کے نام سے ایک چھوٹا سا رسالہ تصنیف فرمایا ہے، ائمہ کرام کو چاہیے کہ ضرور اس کا مطالعہ فرمائیں اور کمیٹی والوں کو بھی سنائیں تاکہ ہماری مساجد شریعت کے مزاج کے موافق تعمیر ہوں۔ اس رسالہ میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

مسجد کی دیوار اور فرش میں رنگ برنگ کے بیل بوٹے نکالنا جو نماز میں خیال کو منتشر کرتے ہوں مکروہ ہے، بالخصوص محراب میں اور قبلہ کی دیوار میں زیادہ مکروہ ہے۔[2]

۱ کنز العمال، الرابع، الصلوۃ، حقوق المسجد: ۸/ ۱۵۰، رقم: ۲۳۰۹۱
۲ فتاوی شامی، کتاب الصلوۃ، مطلب فی احکام المسجد: ۱/ ۶۵۸

مسجد کی صفائی کی اہمیت

ائمہ کرام کو عام طور پر مسجد کی خدمت کی سعادت حاصل ہوتی ہے اس سلسلے میں یہ نہ سمجھیں کہ مسجد میں ہمارا مقام مخدومیت کا ہے بل کہ مسجد کی ہر خدمت کو اپنے لیے نجات کا ذریعہ سمجھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے:

"أَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبِنَاءِ الْمَسْجِدِ فِي الدُّوْرِ وَأَنْ يُنَظَّفَ وَيُطَيَّبَ." [۱]

کہ نبی کریم ﷺ نے گھروں میں مسجدیں بنانے کا حکم فرمایا ہے اور یہ کہ ان کو صاف رکھا جائے اور ان میں خوشبوئیں لگائی جائیں۔

آج کل جیسا کہ عموماً ہر کام میں افراط و تفریط کا دور دورہ ہے مساجد کی صفائی میں بھی یہی آفت پیش آئی ہے، کہیں تو صفائی میں حد سے بڑھ کر اس کو زخرف اور تزئین کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ مسجدیں طرح طرح کی گل کاریوں سے آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہیں جو کہ مکروہ ہے، اور کہیں یہاں تک بے پروائی اور غفلت سے کام لیا گیا ہے کہ العیاذ باللہ مسجدوں میں کوڑیاں لگی ہوئی ہیں، جالے تنے ہوئے ہیں، گرد و غبار سے آلودہ ہیں، دیواریں اور زمین تیل کے بدنما دھبوں سے خراب ہیں جو یقیناً مساجد کی بے حرمتی ہے، اور کسی طرح جائز نہیں۔

حدیث میں ہے کہ ملائکہ کو بھی ان تمام چیزوں سے ایذا پہنچتی ہے جن سے آدمیوں کو ایذا پہنچتی ہے [۲] جب ایک انسان اپنے مکان کو اس طرح کوڑے کباڑے آلودہ دیکھنا نہیں چاہتا تو ملائکہ اللہ باوجود لطافت طبع کے کب اس کو پسند کرتے ہیں؟

[۱] ترمذی، الجمعة، باب ما ذكر في تطييب المساجد، رقم: ۵۹۴

[۲] مسلم، المساجد، باب نهي من أكل ثوما أو بصلا ..... رقم: ۵۶۴

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجد کی صفائی کا خود اہتمام فرماتے تھے۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ مبارک میں مساجد میں چھڑکاؤ کیا جاتا تھا، اور جھاڑو دی جاتی تھی۔ [۱]

اور حضرت یعقوب بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

"إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَتَتَبَّعُ غُبَارَ الْمَسْجِدِ بِجَرِيْدَةٍ." [۲]

ترجمہ: "نبی کریم ﷺ مسجد کے غبار کو کھجور کی ٹہنی سے صاف کیا کرتے تھے۔"

اور حضرت مطلب بن عبداللہ بن حنطب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ گھوڑے پر سوار ہو کر مسجد قبا میں تشریف لے گئے۔ اس میں نماز پڑھی، پھر فرمایا: "اے یرفا! (کسی شخص کا نام ہے) مجھے ایک کھجور کی ٹہنی لا دو۔" اس نے لا کر دے دی۔ حضرت یرفا کہتے ہیں میں نے ان کو ٹہنی دے دی۔ آپ نے ایک کپڑے سے اپنی کمر باندھی اور تمام مسجد میں جھاڑو دی۔ [۳]

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت کے اعمال کے ثواب سب میرے سامنے پیش کیے گئے۔ یہاں تک کہ ایک تنکا کہ جس کو کسی شخص نے مسجد سے نکال دیا ہو، اس کا ثواب بھی پیش کیا گیا۔ اور میرے سامنے امت کے گناہ بھی سب پیش کیے گئے۔ میں نے کوئی گناہ اس سے بڑا نہیں دیکھا کہ ایک آدمی قرآن مجید کی کوئی سورۃ یا آیت یاد کر کے بھول جائے۔ [۴]

[۱] مصنف ابن ابی شيبة، الصلاة (باب) في كنس المساجد: ۱/۳۴۲، رقم: ۱

[۲] مصنف ابن ابی شيبة، الصلاة (باب) في كنس المساجد: ۱/۳۴۵، رقم: ۵

[۳] مصنف ابن ابی شيبة، الصلاة (باب) في كنس المساجد: ۱/۳۴۲، رقم: ۲

[۴] ترمذی، فضائل القرآن، باب لم أر ذنبا أعظم من سورة، رقم: ۲۹۱۶

اور حدیث میں ہے کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کے زمانے میں مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی، جب انتقال ہوا تو چوں کہ رات کا وقت تھا، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے یہ سمجھ کر کہ اگر آں حضرت ﷺ کو اطلاع کی گئی تو آپ تشریف لائیں گے، اور اندھیرے میں آپ کو تکلیف ہوگی اس کو خود ہی نماز پڑھ کر دفن کر دیا۔ اور آپ کو اس وقت اطلاع نہیں کی۔ جب صبح کو اطلاع ہوئی تو فرمایا:

"إذا مات لكم ميت فآذنوني وصلى عليها وقال: إني رأيتها في الجنة تلقط القذى من المسجد"[1]

ترجمہ: "جب تم میں سے کسی کا انتقال ہو تو مجھے خبر کر دیا کرو اور آپ ﷺ نے اس پر نماز پڑھی اور فرمایا میں نے اس عورت کو جنت میں دیکھا ہے۔ اس لیے کہ وہ مسجد سے کوڑا کباڑ اٹھا دیتی تھی۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے "ھدی الساری مقدمہ فتح الباری" میں امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق محمد بن منصور رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"ہم امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس میں تھے کہ ایک شخص نے اپنی داڑھی میں سے تنکا نکال کر مسجد میں ڈال دیا، تو میں نے امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا کہ وہ اس تنکے اور لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پس جب لوگ غافل رہے تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کو زمین سے اٹھایا اور اپنی آستین ہی میں ڈال دیا۔ پس جب مسجد سے نکلے تو میں نے ان کو دیکھا کہ اس تنکے کو نکالا اور زمین پر پھینک دیا۔"

دیکھیے امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے مسجد کی زمین اس چیز سے بچائی جس سے داڑھی بچائی جاتی ہے۔

[1] الترغيب والترهيب، الترغيب في تنظيف المساجد: ۱/۱۲۲، رقم: ۳

مسئلہ: مسجد میں تھوکنا ناجائز ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

"البزاق في المسجد خطيئة."[1]

ترجمہ: "مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔"

اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

"من بزق في قبلته ولم يوارها جاءت يوم القيامة أحمى ما تكون حتى تقع بين عينيه"[2]

ترجمہ: "جو شخص مسجد کی جانب قبلہ میں تھوکتا ہے اور دفن (یا صاف) نہیں کرتا تو وہ قیامت کے دن سخت گرم ہو کر آئے گا۔ یہاں تک کہ اس کے ماتھے پر آ کر گرے گا۔"

مسئلہ: مسجد میں لہسن اور پیاز لے کر جانا یا اس کو کھا کر مسجد میں داخل ہونا ناجائز ہے۔[3]

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"من أكل من هذه الشجرة المنتنة فلا يقربن مسجدنا فإن الملائكة تتأذى مما يتأذى منه الإنس"[4]

ترجمہ: "جو شخص بدبودار درخت (یعنی پیاز) کھائے وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے اس لیے کہ فرشتوں کو بھی ان تمام چیزوں سے ایذا

[1] بخاري، الصلاة، باب كفارة البزاق في المسجد، رقم: ٤١٥

[2] كنز العمال، الرابع، الصلوة: ۷/۲۷۱، رقم: ۲۰۸۰۹

[3] در مختار مع الشامي، كتاب الصلوة، باب ما يفسد الصلوة وما يكره فيها: ۱/۶۶۱

[4] مسلم، المساجد، باب نهي من أكل ثوما أو بصلا ـــ، رقم: ٥٦٤

پہنچتی ہے جس سے انسانوں کو ایذا پہنچتی ہے۔"

مزید یہ ہے کہ جب تک اس کی بدبو منہ سے نہ جائے اس وقت تک مسجد میں نہ داخل ہو اور یہی حکم ہے ہر بدبودار چیز کا۔ جیسے حقہ اور سگریٹ اور لہسن وغیرہ کا جیسا کہ فقہ کی معتبر کتابوں میں لکھا ہے۔ اور طریقہ محمدیہ میں مولی کو بھی اسی حکم میں داخل کیا ہے۔

تنبیہ: حقہ، سگریٹ پینے والے کثرت سے اس میں غفلت کرتے ہیں۔ ائمہ حضرات بار بار لوگوں کو سمجھائیں، ان کو ہمیشہ اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

فائدہ: اس حدیث میں اگرچہ صراحۃً تو فقط کھانے کی چیز کا ذکر ہے، لیکن چوں کہ اخیر میں اس کی دلیل بھی یہ ذکر فرمائی ہے کہ فرشتوں کو بھی ان چیزوں سے ایذا ہوتی ہے جن سے انسانوں کو ہوتی ہے۔ اس لیے معلوم ہوا کہ یہ حکم فقط کھانے کی چیزوں میں منحصر نہیں، بل کہ تمام استعمال کی چیزوں کا بھی یہی حکم ہے۔

مسجد میں خوشبو کی دھونی دینا

مسجد میں لوبان عود وغیرہ کی دھونی دینا اور اگر بتیاں جلانا سنت ہے، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ہمیشہ دستور رہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَمَجَانِيْنَكُمْ وَشِرَاءَكُمْ وَبَيْعَكُمْ وَخُصُوْمَاتِكُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِكُمْ وَإِقَامَةَ حُدُوْدِكُمْ وَسَلَّ سُيُوْفِكُمْ وَاتَّخِذُوْا عَلٰى أَبْوَابِهَا الْمَطَاهِرَ وَجَمِّرُوْهَا فِي الْجُمَعِ."[1]

ترجمہ: "اپنی مسجدوں سے بچوں اور پاگلوں کو علیحدہ رکھو۔ اور ان کو اپنی

[1] ابن ماجہ، ابواب المساجد والجماعات، باب ما یکرہ فی المساجد، رقم: ۷۵۰

خرید و فروخت اور شور سے پاک رکھو۔ اور سزا دینے اور تلوار کھینچنے سے پاک رکھو۔ اور ان کے دروازوں پر وضو خانہ بناؤ اور ان کو ہر جمعہ کے دن خوشبو کی دھونی دیا کرو۔"

اس طویل حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منجملہ بہت سے ارشادات کے ایک یہ بھی حکم فرمایا ہے کہ جمعہ کے دن مساجد کو خوشبو کی دھونی دیا کرو۔ چناں چہ مصنف ابن ابی شیبہ نے بروایت حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر جمعہ کے روز مسجد میں دھونی دیتے تھے۔[1]

لہٰذا جو شخص اس سنت کو زندہ کرے گا تو جب تک لوگ اس پر عمل کرتے رہیں گے اس کو ثواب ملتا رہے گا، کیوں کہ حدیث میں ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِيْ فَلَهٗ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ."[2]

ترجمہ: "جو شخص میری امت کے فساد کے وقت میری سنت پر عمل کرتا رہے گا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔"

مقتدیوں کو مسجد میں آنے اور جانے کی دعائیں یاد کروائیں

ائمہ کرام مقتدیوں کو سکھلائیں کہ جب مسجد کے لیے گھر سے نکلیں تو یہ دعا پڑھیں:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ وَبِحَقِّ مَمْشَايَ هٰذَا فَإِنِّيْ لَمْ أَخْرُجْ أَشَرًا وَّلَا بَطَرًا وَّلَا رِيَاءً وَّلَا سُمْعَةً وَّخَرَجْتُ اتِّقَاءَ سَخَطِكَ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ أَسْأَلُكَ أَنْ

[1] مجمع الزوائد، الصلاۃ، باب اجمار المسجد: ۸۶/۲، رقم: ۱۹۶۰

[2] مشکوٰۃ، الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ: ۳۰/۱

تُعِيذَنِي مِنَ النَّارِ وَأَنْ تَغْفِرَ لِي ذُنُوبِي إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ"۔[1]

ترجمہ: "اے اللہ! سوال کرنے والوں کا جو حق میرے اوپر ہے اور میرے اس نماز کے لیے چلنے کے حق سے (میرے گناہوں کو معاف فرما دے) کیوں کہ میں جھگڑے، ریا، نمود، تکبر اور گھمنڈ کے لیے نہیں نکلا ہوں، بل کہ تیرے غصے سے بچنے اور تیری خوشنودی کی تلاش کے لیے نکلا ہوں۔ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ دوزخ سے مجھے بچا اور میرے گناہوں کو معاف فرما یقیناً آپ کے سوا کوئی گناہوں کو معاف نہیں کر سکتا۔"

مسئلہ: مسجد میں جانے کے وقت وقار اور سکون کے ساتھ چلنا چاہیے۔ دوڑنا نہیں چاہیے۔

مسجد میں داخل ہونے کی دعا

حدیث میں ہے کہ جب مسجد کے دروازے پر پہنچے تو یہ دعا پڑھے:

"بِسْمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ"۔[2]

ترجمہ: "میں داخل ہوتا ہوں اللہ کے نام سے اور سلام ہو رسول اللہ (ﷺ) پر۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو بخش دیجیے اور میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیجیے۔"

اس کے بعد نہایت ادب کے ساتھ مسجد میں داخل ہو۔

[1] ابن ماجہ، المساجد والجماعات، باب المشی إلی الصلاۃ، رقم: ۷۷۸

[2] ابن ماجہ، المساجد والجماعات، باب الدعاء عند دخول المسجد: ۵۶

کسی بزرگ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ جب وہ مسجد کے دروازے پر پہنچتے تو بوجہ خوف کے ان کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی؟ تو "فرمایا کہ لوگ جب دنیا کے کسی حاکم کے دربار میں جاتے ہیں تو ان پر اس کا رعب چھا جاتا ہے۔ اور ڈرتے ہیں کہ کوئی بات عدالت کے آداب اور حاکم کی شان کے خلاف نہ ہو جائے۔ تو کیا میں أَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ کے دربار کی اتنی بھی قدر نہ کروں، جتنی ایک ادنیٰ حاکم کی کی جاتی ہے۔ اس خوف سے میرا رنگ زرد ہو جاتا ہے کہ کہیں اس دربار کی شان کے خلاف کوئی بات صادر نہ ہو جائے۔"

پھر جب مسجد میں داخل ہو تو مستحب ہے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لے۔ جس کو تحیۃ المسجد کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس کا حکم فرمایا ہے:

"إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ"۔[1]

ترجمہ: "جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو چاہیے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت (نفل) پڑھے۔"

لہٰذا امام کو چاہیے کہ مقتدیوں کو تحیۃ المسجد کی اہمیت بتلائے اور اس کے فوائد و فضائل بھی بتلائے، اس لیے کہ ہمارے ہاں اس سنت پر بہت ہی کم عمل ہوتا ہے تو مقتدیوں میں اس سنت پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ اس کا اہتمام کریں گے۔

مسئلہ: جو شخص کثرت سے مسجد میں آتا جاتا رہتا ہو تو اس کے لیے ہر روز صرف ایک مرتبہ دو رکعتیں پڑھ لینا تحیۃ المسجد کے لیے کافی ہے۔[2]

[1] مسلم، صلوٰۃ المسافرین وقصرها، باب استحباب تحیۃ المسجد برکعتین: ۱/۲۴۸

[2] فتاویٰ رحیمیہ، کتاب الطہارۃ، متفرق مسائل: ۱/۲۲۶

تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضو کی اہمیت

ہمارے ملک میں بنسبت عرب اور دوسرے اسلامی ممالک کے اکثر ... بعض اہل علم کے سامنے تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضو کی اتنی اہمیت واضح نہیں ہے جتنی ... اس کی اہمیت وارد ہے۔ حدیث کے الفاظ اس سلسلے میں بڑی وضاحت کے ساتھ وارد ہیں۔

مسلم شریف میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

"دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ بَيْنَ ظَهْرَانَيِ النَّاسِ، قَالَ: "فَجَلَسْتُ" فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا مَنَعَكَ اَنْ تَرْكَعَ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ تَجْلِسَ؟" قَالَ: "فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، رَأَيْتُكَ جَالِسًا وَالنَّاسُ جُلُوْسٌ." فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "فَإِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِسْ حَتّٰى يَرْكَعَ رَكْعَتَيْنِ"."[1]

ترجمہ: "حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ساتھ تشریف فرما تھے میں بیٹھ گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آپ کو کس چیز نے بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھنے سے منع کیا؟" میں نے کہا: "اے اللہ کے رسول میں نے دیکھا کہ آپ اور دوسرے حضرات تشریف فرما ہیں (اس وجہ سے نہیں پڑھی)" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو جائے تو وہ نہ بیٹھے یہاں تک کہ دو رکعتیں پڑھے۔"

[1] مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها، باب استحباب تحیة المسجد برکعتین: ۲۴۸/۱

مسجد کو اللہ تعالیٰ سے ایک خاص نسبت ہے اور اسی نسبت سے اس کو "خانۂ خدا" کہا جاتا ہے، اس لیے اس کے حقوق اور اس میں داخلہ کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ وہاں جا کر بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کی جائے، یہ گویا بارگاہ خداوندی کی سلامی ہے، اسی لیے اس کو "تحیۃ المسجد" کہتے ہیں (تحیۃ کے معنی سلامی کے ہیں)۔[1]

لہٰذا مسلم شریف میں مذکورہ بالا حدیث کا باب "بَابُ اسْتِحْبَابِ تَحِيَّةِ الْمَسْجِدِ بِرَكْعَتَيْنِ وَكَرَاهَةِ الْجُلُوْسِ قَبْلَ صَلَاتِهِمَا" بھی اس کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے:

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَهِيَ سُنَّةٌ بِإِجْمَاعِ الْمُسْلِمِيْنَ."[2]

اسی طرح تحیۃ الوضو کی بھی بڑی فضیلت احادیث میں ذکر کی گئی ہے ان احادیث میں سے ایک مشہور حدیث ملاحظہ فرمائیں:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ -رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ- أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِبِلَالٍ عِنْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ: "يَا بِلَالُ! حَدِّثْنِيْ بِأَرْجٰى عَمَلٍ عَمِلْتَهُ فِي الْإِسْلَامِ فَإِنِّيْ سَمِعْتُ دَفَّ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَيَّ فِي الْجَنَّةِ" قَالَ: "مَا عَمِلْتُ عَمَلًا أَرْجٰى عِنْدِيْ إِنِّيْ لَمْ أَتَطَهَّرْ طُهُوْرًا فِيْ سَاعَةِ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ إِلَّا صَلَّيْتُ بِذٰلِكَ الطُّهُوْرِ مَا كُتِبَ لِيْ أَنْ أُصَلِّيَ"."[3]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فجر کی نماز کے بعد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: "اے بلال! تمہیں اپنے جس اسلامی عمل سے سب سے زیادہ

[1] معارف الحدیث، کتاب الصلوٰۃ: ۱۷۸/۳ [2] ایضاً

[3] بخاری، التہجد، باب فضل الطهور بالليل والنهار، رقم: ۱۱۴۹

امید خیر و ثواب ہو وہ مجھے بتاؤ۔ کیوں کہ میں نے تمہارے جوتوں کی چاپ (آواز) جنت میں اپنے آگے آگے سنی ہے" (مطلب یہ ہے کہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں چل پھر رہا ہوں اور آگے آگے تمہارے قدموں کی آہٹ سن رہا ہوں تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تمہارے کس عمل کی برکت ہے۔ لہٰذا تم مجھے اپنا وہ عمل بتاؤ جس سے تمہیں سب سے زیادہ ثواب اور رحمت کی امید ہو) حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: "مجھے اپنے اعمال میں سب سے زیادہ امید اپنے اس عمل سے ہے کہ میں نے رات یا دن کے کسی وقت میں جب بھی وضو کیا ہے تو اس وضو سے میں نے نماز ضرور پڑھی ہے۔ جتنی نماز کی بھی مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت توفیق ملی۔"

اس حدیث کی روح اور اس کا خاص پیغام یہ ہے کہ بندہ اس کی عادت ڈالے کہ جب بھی وضو کرے اس سے حسب توفیق کچھ نماز ضرور پڑھے خواہ فرض ہو، خواہ سنت، خواہ نفل۔[1]

مسجد سے نکلنے کی دعا

"بِسْمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ فَضْلِكَ"[2]

ترجمہ: "میں نکلتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ، اور سلام ہو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اے اللہ! میرے گناہوں کو بخش دیجیے اور میرے لیے اپنے فضل کے دروازے کھول دیجیے۔"

اور اس کے بعد یہ دعا پڑھیں:

[1] معارف الحدیث، کتاب الطہارۃ: ۳/۸۱، ۸۲

[2] ابن ماجہ، المساجد والجماعات، باب الدعاء عند دخول المسجد: ۵۶

"اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنِيْ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ"[1]

ترجمہ: "اے اللہ! مجھے شیطان مردود سے بچالے۔"

امامت کی تنخواہ اور اس کا معیار

ہندوستان کے مشہور و معروف جید عالم دین حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتووں کا مجموعہ "فتاویٰ رحیمیہ" سے یہ سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے، پڑھنے سے پہلے دعا مانگ لیں کہ اس بزرگ کے لکھے ہوئے مبارک الفاظ ہمارے دلوں میں گھر کر جائیں اور ہدایت کا سبب بن جائیں۔

سوال: امام مسجد کے لیے امامت کی تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

اگر لینا جائز ہے تو اس کا معیار کیا ہونا چاہیے؟

آج کل ائمہ مساجد کو تنخواہ بہت کم دی جاتی ہے مساجد کے متولی اور ذمہ داروں کو اس پر توجہ دینا ضروری ہے یا نہیں؟

ائمہ مساجد کا معقول مشاہرے کے مطالبے کے لیے تنظیم بنا کر تحریک چلانا اور اس سلسلے میں حکومت سے تعاون حاصل کرنا کیسا ہے، شرعاً اس میں کوئی قباحت ہے یا نہیں؟

جواب: اسلام میں منصب امامت کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ایک باعزت باوقار اور باعظمت اہم دینی شعبہ ہے۔ یہ مصلیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مصلیٰ ہے۔ امام نائب رسول ہوتا ہے، اور امام اللہ رب العزت اور مقتدیوں کے درمیان قاصد اور ایلچی ہوتا ہے۔ اس لیے جو سب سے بہتر ہو اسے امام بنانا چاہیے۔ حدیث میں ہے۔

"اِنْ سَرَّكُمْ اَنْ تُقْبَلَ صَلَاتُكُمْ فَلْيَؤُمَّكُمْ عُلَمَاؤُكُمْ فَاِنَّهُمْ وَفْدُكُمْ فِيْمَا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ رَبِّكُمْ"[2] وفی روایۃ الحاکم

[1] ابن ماجہ، المساجد والجماعات، باب الدعاء عند دخول المسجد: ۵۶

[2] مجمع الزوائد، الصلاۃ، باب الإمامۃ: ۲/۱۶۵، رقم: ۲۳۲۵

فَلْيَؤُمَّكُمْ خِيَارُكُمْ''[1]

ترجمہ: ''اگر تمہیں پسند ہے کہ تمہاری نماز درجۂ قبولیت کو پہنچے تو تم میں جو عالم (مسائل جاننے والا) ہو وہ تمہاری امامت کرے کہ وہ تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان قاصد ہے۔''

اور حاکم کی روایت میں ہے کہ تم میں جو سب سے بہتر ہو اس کو امام بناؤ۔ فقہ کی مشہور کتاب نورالایضاح میں ہے:

''فَالْأَعْلَمُ أَحَقُّ بِالْإِمَامَةِ ثُمَّ الْأَقْرَأُ ثُمَّ الْأَوْرَعُ ثُمَّ الْأَسَنُّ ثُمَّ الْأَحْسَنُ خُلُقًا ثُمَّ الْأَحْسَنُ وَجْهًا ثُمَّ الْأَشْرَفُ نَسَبًا ثُمَّ الْأَحْسَنُ صَوْتًا ثُمَّ الْأَنْظَفُ ثَوْبًا''[2]

ترجمہ: ''امامت کا زیادہ حق دار وہ ہے جو دین کے امور کا زیادہ جاننے والا ہو (خصوصاً نماز سے متعلق مسائل سے سب سے زیادہ واقف ہو) پھر وہ شخص جو تجوید سے پڑھنے میں زیادہ ماہر ہو، پھر جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو، پھر وہ جو عمر میں بڑا ہو، پھر وہ جو اچھے اخلاق والا ہو پھر وہ جو خوبصورت اور باوجاہت ہو، پھر وہ جو نسباً زیادہ شریف ہو، پھر وہ جس کی آواز اچھی ہو پھر وہ جو زیادہ پاکیزہ کپڑے پہنتا ہو۔''

اصلاً تو امامت پر اجرت اور تنخواہ (مشاہرہ) لینا جائز نہیں ہے کہ یہ طاعت ہے اور طاعت پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ مگر متأخرین فقہاء نے ضرورت کے پیش نظر اجرت اور مشاہرہ لینے اور دینے کو جائز قرار دیا ہے۔ درمختار میں ہے:

''وَلَا لِأَجْلِ الطَّاعَاتِ مِثْلُ الْأَذَانِ وَالْحَجِّ وَالْإِمَامَةِ وَتَعْلِيمِ الْقُرْآنِ وَالْفِقْهِ وَيُفْتَى الْيَوْمَ بِصِحَّتِهَا لِتَعْلِيمِ الْقُرْآنِ وَالْفِقْهِ

[1] مستدرك للحاكم، معرفة الصحابة، ذكر مناقب مرثد ...... ۲۶۸/۳، رقم: ۴۹۶۵

[2] نور الایضاح، الصلوة، باب الإمامة: ۷۸

وَالْإِمَامَةِ وَالْأَذَانِ''[1]

ترجمہ: ''تنخواہ لینا جائز نہیں طاعات پر جیسا اذان، حج، امامت، قرآن مجید کی تعلیم اور فقہ ہے، لیکن آج قرآن وفقہ کی تعلیم، امامت اور مؤذنی پر تنخواہ لینے کی صحت کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔''

''تاہم مساجد ومدارس کو ان (امام وغیرہ) کی حاجت، علمی قابلیت اور تقویٰ وصلاح کو ملحوظ رکھتے ہوئے مشاہرہ دینا چاہیے، مسجد سے متعلق وقف کی آمدنی میں گنجائش ہو تو اس میں سے اور اگر گنجائش نہ ہو تو مسلمانوں سے چندہ کرکے ان کی ضرورت کے مطابق مشاہرہ کا انتظام کرنا چاہیے۔''

درمختار میں ہے:

''وَيُعْطَى بِقَدْرِ الْحَاجَةِ وَالْفِقْهِ وَالْفَضْلِ فَإِنْ قَصَّرَ كَانَ اللّٰهُ عَلَيْهِ حَسِيبًا (زيلعي) وَفِي الْحَاوِي الْمُرَادُ بِالْحَافِظِ فِي الْحَدِيثِ حَافِظُ الْقُرْآنِ مِائَتَا دِرْهَمٍ هُوَ الْمُفْتَى الْيَوْمَ''

ترجمہ: ''اور یہ تنخواہ ان کی ضرورت اور ان کی علمی قابلیت اور تقویٰ وصلاح کو ملحوظ رکھتے ہوئے دی جائے گی اور اگر اس میں کوتاہی کی گئی تو اللہ تعالیٰ اس کا حساب لیں گے (مسجد کے متولی وغیرہ سے)۔

اور حاوی میں ہے کہ حدیث میں حافظ سے مراد حافظ قرآن ہے جس کو دوسو درہم دیے جائیں گے اور اسی پر آج فتویٰ دیا جاتا ہے۔''

رد المحتار میں ہے:

''(قوله وَيُعْطَى بِقَدْرِ الْحَاجَةِ) الَّذِي فِي الزَّيْلَعِي هٰكَذَا وَيَجِبُ عَلَى الْإِمَامِ أَنْ يَتَّقِيَ اللّٰهَ تَعَالٰى وَيَصْرِفَ إِلٰى كُلِّ

[1] الدر المختار، کتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة: ۵۵/۶

مُسْتَحِقٌ قَدْرَ حَاجَتِهِ مِنْ غَيْرِ زِيَادَةٍ فَإِنْ قَصَّرَ فِي ذٰلِكَ كَانَ اللّٰهُ عَلَيْهِ حَسِيبًا ...... وفي البحر عن القنية كَانَ أَبُوبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ يُسَوِّي فِي الْعَطَاءِ مِنْ بَيْتِ الْمَالِ وَكَانَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ يُعْطِيهِمْ عَلٰى قَدْرِ الْحَاجَةِ وَالْفِقْهِ وَالْفَضْلِ، وَالْأَخْذُ بِهٰذَا فِي زَمَانِنَا أَحْسَنُ فَتَعْتَبِرُ الْأُمُوْرَ الثَّلَاثَةَ ...... أَيْ فَلَهُ أَنْ يُعْطِيَ الْأَحْوَجَ أَكْثَرَ مِنْ غَيْرِ الْأَحْوَجِ وَكَذَا الْأَفْقَهُ وَالْأَفْضَلُ أَكْثَرَ مِنْ غَيْرِهِمَا وَظَاهِرُهُ أَنْ لَا تُرَاعَى الْحَاجَةُ فِي الْأَفْقَهِ وَالْأَفْضَلِ وَإِلَّا فَلَا فَائِدَةَ فِي ذِكْرِهِمَا وَيُؤَيِّدُهُ أَنَّ عُمَرَ -رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ- كَانَ يُعْطِي مَنْ كَانَ لَهُ زِيَادَةُ فَضِيْلَةٍ مِنْ عِلْمٍ أَوْ نَسَبٍ أَوْ نَحْوِ ذٰلِكَ أَكْثَرَ مِنْ غَيْرِهِ"[1]

ترجمہ: "اور یہ قول "وَيُعْطٰى بِقَدْرِ الْحَاجَةِ" جو زیلعی میں ہے یعنی امام کو بقدر ضرورت تنخواہ دی جائے گی، اسی طرح امام پر بھی لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور دوسرے مستحقین کی طرح اپنی ضرورت کے مطابق تنخواہ کا مطالبہ کرے بغیر کسی زیادتی کے اور اگر اس نے اس میں کوتاہی کی تو اللہ تعالیٰ اس سے (بھی) حساب لیں گے، اور بحر الرائق میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اپنے دور خلافت میں) جب تنخواہیں دیتے تھے تو سب کو برابر دیتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اپنے دور خلافت میں) ضرورت، فقہ (علم میں مہارت) اور مرتبہ کے بقدر تنخواہیں دیتے تھے اور ہمارے زمانے

[1] در مختار ورد المحتار ۳۶۹/۴، کتاب الجہاد، باب مصارف بیت المال قبیل باب المرتد

میں اس کو لینا زیادہ بہتر اور مستحسن ہے سو ہم ان تینوں امور کا اعتبار کریں گے۔

یعنی اس (متولی) کو چاہیے کہ ایسے امام کو جو زیادہ ضرورت مند ہو اس کو زیادہ دے بہ نسبت اس (امام، مؤذن اور قاری) کے جو کم ضرورت مند ہے اور اسی طرح جو زیادہ فقیہ یا جس کو فضیلت حاصل ہے کسی وجہ سے ان کو زیادہ دے بہ نسبت ان کے جو کم فقیہ اور کم مرتبے والا ہے، اور اصل بات یہ ہے کہ ضرورت کا لحاظ نہ کیا جائے زیادہ فقیہ اور افضل ہونے میں، ورنہ پھر ان دونوں کے ذکر کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس کا مؤید حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل ہے کہ وہ جو علم یا نسب میں فضیلت رکھتا تھا اس کو زیادہ تنخواہ دیتے تھے بہ نسبت اس کے غیر کے۔"

ہمارے زمانے میں ذمہ داری متولیان مساجد اور محلہ وبستی کے باا ثر لوگوں کی ہے۔ ان کو اس اہم مسئلہ پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ ائمہ مساجد کے ساتھ اعزاز و احترام کا معاملہ کریں۔ ان کو اپنا مذہبی پیشوا اور سردار سمجھیں۔ ان کو دیگر ملازمین اور نوکروں کی طرح سمجھنا منصب امامت کی سخت توہین ہے۔ یہ بہت ہی اہم دینی منصب ہے۔ پیشہ ور ملازمتوں کی طرح کوئی ملازمت نہیں ہے۔ جانبین سے اس عظیم منصب کے احترام، وقار، عزت اور عظمت کی حفاظت ضروری ہے۔

متولی اور مہتمم کا عالم باعمل ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا میسر نہ ہو سکے تو صوم و صلوٰۃ کا پابند، امانت دار، مسائل وقف سے واقف کار، خوش اخلاق، رحم دل، منصف مزاج، علم دوست اور اہل علم کی تعظیم وتکریم کرنے والا ہو۔ جس میں یہ اوصاف زیادہ ہوں اسی کو متولی اور مہتمم بنانا چاہیے۔ ان اوصاف کے حامل اگر متولی ہوں گے تو اچھے اور قابل اماموں کا انتخاب کریں گے اور مساجد کا نظام بھی بہتر ہوگا۔ آج کل

نااہل متولیوں کی وجہ سے نااہل اماموں کی بھرمار نظر آرہی ہے اور مساجد میں بدنظمی ظاہر ہورہی ہے۔

امام مسجد اگر حقیقتاً ضرورت مند اور معقول مشاہرہ (تنخواہ) کے بغیر اس کا گزر بسر مشکل ہورہا ہو تو مناسب انداز سے متولیانِ مسجد اور محلّہ کے باثر لوگوں کے سامنے اپنا مطالبہ بھی پیش کرسکتا ہے اور ذمہ دارانِ مساجد اور باثر لوگوں پر ہمدردی اور شفقت کے ساتھ اس طرف توجہ دینا بھی ضروری ہے۔ اس صورت میں اماموں کا ایسا طریقہ اختیار کرنا جس سے منصبِ امامت کی توہین لازم آتی ہو ہرگز جائز نہ ہوگا۔ امام منصبِ امامت کے وقار، عظمت اور قدر وقیمت کا محافظ اور امین ہے۔ ایسا طریقہ جس سے منصبِ امامت کی تذلیل وتنقیص لازم آتی ہو، ہرگز اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

لہٰذا معقول مشاہرہ کی درخواست کے لیے اپنا معاملہ عدالت اور حکومت کے حوالہ کردینا اور اس مقصد کے لیے ائمہ مساجد کی تنظیم (یونین) بنانا اور اس کا ممبر بننا کسی حال میں قابلِ مدح نہیں، بل کہ قابلِ مذمت اور لائقِ ترک ہے۔ اس سے دور رس غلط نتائج پیدا ہونے کے شدید خطرات ہیں اور بہت سی خرابیوں کا دروازہ کھلے گا۔ اماموں کے تقرر کے سلسلہ میں ہمیں پابند ہوجانا پڑے گا اور ائمہ کے تقرر کے سلسلہ میں جو شرائط اور معیار ہے اس کی پابندی نہ ہوسکے گی وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا از خود اپنا معاملہ ان کے حوالہ کرکے دخل دینے کا موقع ہرگز فراہم نہ کیا جائے۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

احقر الانام سید عبد الرحیم لاجپوری ثم راندیری غفرلہٗ

۱۲ شوال المکرم ۱۴۱۵ھ

"مَا قَالَ الْمُجِیْبُ الْمُحِقُّ الْمُحْتَرَمُ فَهُوَ الْحَقُّ وَالصَّوَابُ وَاِنِّیْ اَتَّفِقُ بِهٰذَا الْفُتْيَا كُلَّ الْاِتِّفَاقِ"

احقر اسمٰعیل وادی غفرلہٗ خادم الفقہ رئیس دارالافتاء، جامعہ حسینیہ راندیر ۱۴ شوال المکرم ۱۴۱۵ھ۔

"بندہ اس جواب سے مکمل اتفاق کرتا ہے، ائمہ کی تنخواہوں کے معیار میں اضافہ کا کام مسلمانوں کی تنظیموں اور جماعتوں کے ذریعہ انجام دیا جائے یہی مناسب ہے حکومت کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے سے اس کو دیگر خالص دینی اور مذہبی امور میں دخل کا موقع اور جرأت ہوگی جس کا ضرر اظہر من الشمس ہے۔"

فقط العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸ شوال ۱۴۱۵ھ

(مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع بلساڑ گجرات)

"هٰذَا هُوَ الْحَقُّ وَالصَّوَابُ"

(مفتی) عارف حسن عثمانی ۱۴ شوال المکرم ۱۴۱۵ھ

اس فتویٰ کا اہم پہلو یہ ہے کہ ائمہ مساجد کی تنخواہ کے اضافہ کے سلسلہ میں حکومت سے تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

چناں چہ دور اندیشی اور غلط نتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ بالا فتویٰ لکھا گیا ہے۔[1]

مسجد کی امامت کے لائق کون؟

امام کیسا ہونا چاہیے، اس کے متعلق جو بھی لکھا گیا ہے یہ پہلو بھی بہت زیادہ قابلِ توجہ اور لائقِ اصلاح ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی سید عبد الاحد مرحوم نے اپنی مشہور کتاب "مسلمان کی ڈائری" میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

[1] فتاویٰ رحیمیہ، کتاب الجنائز، نماز کے متفرق مسائل، ۸/ ۲۱۵ تا ۲۱۹

مسجد کا امام عالم باعمل بزرگ ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ملے تو جسے قرآن زیادہ یاد ہو اور اچھا پڑھتا ہو ایسا امام رکھا جائے۔ آج کل ایسے امام ملنا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن اب ایسے امام کی تلاش زیادہ ہے جو متولی کے اشاروں پر چلے اور متولی ایسے ہوتے ہیں جو کسی طرح مسجد کے اہتمام کے اہل نہیں۔

آخر یہ کیا بات ہے کہ ہمیں اپنے معمولی سے کام کے لیے ملازم کی تلاش ہوتی ہے تو ہم بڑی احتیاط برتتے ہیں اور ہر طرح دیکھ بھال کر اپنی پسند کا ملازم رکھتے ہیں، لیکن جب مسجد کے لیے امام کی ضرورت وتلاش ہوتی ہے تب ہم مسجد کے لائق نہیں، بلکہ اپنے مطلب کا امام ڈھونڈتے ہیں۔ اس وقت نہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ امام سند یافتہ عالم نہ سہی ضروری مسائل سے واقف بھی ہے یا نہیں، قاری اور حافظ نہ سہی لیکن کم از کم قرآن بھی صحیح پڑھتا ہے یا نہیں، کس عقیدہ کا پیرو ہے۔ اور کون سے مسلک کا حامی ہے۔ مقلد بھی ہے یا شتر بے مہار۔ نہ تحقیق ہے نہ تفتیش۔ نتیجہ یہ کہ جو مؤذن بنانے کا اہل نہیں وہ امام بن جاتا ہے اور جو دنیا میں کسی مصرف کا نہ ہو، مؤذن بنتا ہے۔

جب متولی مسجد کی ذمہ داری اٹھانے کا اہل نہیں ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی مرضی کا نا اہل امام ہی تلاش کرے گا گھوم پھر کر دیکھ لیجیے تو نااہل متولی اور نااہل امام کی جوڑی آپ کو اکثر جگہ نظر آئے گی۔[1]

اسلام میں مساجد کی بہت ہی اہمیت اور بہت ہی عظیم حیثیت ہے۔ مساجد مراکز اسلام اور شعائر اسلام ہیں۔ مساجد روئے زمین پر سب سے مقدس، سب سے پاکیزہ اور سب سے بہترین جگہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ دنیا میں جنت کے باغ ہیں۔ اسلام کے قلعے اور اہل اسلام کے اجتماعی نظام کے لیے مرکز ہیں۔ لہٰذا مساجد کا نظام جس قدر بہتر ہوگا مسلمانوں کی انفرادی ا

[1] مسلمان کی ڈائری ۱۵۲

وراجتماعی زندگی پر اس کے نہایت خوشنما اثرات مرتب ہوں گے۔ مسلمانوں کا معاشرہ پاکیزہ بنے گا اور اسلام کی روح ان کی زندگیوں میں جلوہ گر نظر آئے گی۔

مساجد کا نظام اور آبادی صرف اس کی ظاہری تعمیر وتزئین، اس کے نقش ونگار اور اس کے فلک بوس میناروں سے نہیں ہے۔ اس کی صحیح آبادی عبادت الٰہی اور ذکر الٰہی اور اعمال مساجد سے ہے۔ ان امور کے پیش نظر مساجد کا صحیح نظام خدا ترس امام، صالح مؤذن اور باصلاحیت واہل متولیوں پر ہے۔

امام حقیقت میں پورے محلے، پوری بستی اور پوری قوم کا پیشوا ہوتا ہے۔ لہٰذا امام بہترین عالم باعمل، مسائل واحکام نماز سے خوب واقف ہو۔ قرآن مجید با تجوید اور صحیح پڑھنے والا، خوش الحان سب سے زیادہ متقی، پرہیزگار، خدا ترس خوش اخلاق اور ملنسار ہونا چاہیے۔ امام ایسا ہو کہ اس کے اندر دین کا درد اور امت کا غم ہو اپنی اور قوم کی اصلاح کی فکر ہو اور اپنے دل سوز بیانات، مواعظ حسنہ اور تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ مسلمانوں میں دین کا شوق، خوف خدا، انابت الی اللہ، عبادت کا ذوق وشوق اور عبادت صحیح وسنت طریقہ کے مطابق ادا کرنے کا جذبہ، دنیا کی بے ثباتی اور فکر آخرت، حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے کی فکر پیدا کردے۔ بلا خوف لومۃ لائم معروف (نیکی) کا حکم کرے۔ اور نواہی ومنکرات (برائی) پر نکیر کرے۔

پریشانی کا موقع ہو یا خوشی کی تقریبات ہر موقع پر قوم کی صحیح رہنمائی اور اسلامی تعلیمات سے واقف کرے۔ بدعات اور رسومات کی نشاندہی اور برملا ان پر روک ٹوک کرے۔ خود بھی اسلامی احکامات اور حضور اقدس ﷺ کی مبارک اور نورانی سنتوں پر سختی سے عمل کرے اور مسلمانوں کو بھی عمل کرنے کا عادی بنائے۔

مسلمانوں اور لوگوں کے ساتھ ایسی ہمدردی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے کہ چھوٹے بڑے، مرد وعورتیں، اپنے اور پرائے سب اس کے دلدادہ اور دل وجان سے اس پر قربان ہوجائیں۔ حتیٰ کہ اپنے نجی معاملات میں بھی اس سے مشورہ اور رہنمائی

حاصل کر کے اس کے مطابق عمل کرنے لگیں۔ اپنے اعمال واقوال سے لوگوں میں اسلام کی محبت اور دین کی ایسی عظمت پیدا کر دے کہ ان کو اپنی اور اپنے اہل وعیال اور مسلمانوں کے اصلاح کی فکر پیدا ہو جائے۔ خود بھی دینی علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کی فکر کریں اور اپنی اولاد کو بھی دینی تعلیم وتربیت سے آراستہ وپیراستہ کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہو جائے اور قوم کے بچے بچیوں کی بھی دینی تعلیم کی فکر پیدا ہو اور اس کا انتظام کریں۔

خواتین میں بھی دین پر عمل کرنے، نماز، قرآن کی تلاوت اور عبادت کا شوق اور پردہ کی اہمیت پیدا ہو جائے اور ہر مسلمان اپنے گھر سے برائیوں ناچ گانے، ٹی وی (کیبل، سی ڈی) اور وی سی آر کی نحوست کو ختم اور دور کرنے کی فکر اور کوشش کرنے لگے۔ غرض کہ امام کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیے اور اپنی ذمہ داری سمجھ کر محض رضائے الٰہی کے لیے (نہ کہ دنیا کے بے حیثیت چند ٹکوں کے لیے) ان تمام خدمات کو انجام دے۔

فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ضرورت کی وجہ سے امامت وغیرہ پر اجرت (تنخواہ) لینے کے جواز کا اگرچہ فتویٰ دیا ہے، مگر اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ اجرت اور تنخواہ کو ہرگز مقصود نہ بنائیں، صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی مقصود ہو اور حضور اقدس ﷺ کی سیرت طیبہ اور سلف صالحین کے طرز عمل کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھیں۔

روزی کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے

حق تعالیٰ رزاق ہیں، اسی پر توکل اور اعتماد اور اسی کے خزانوں پر نظر رکھیں اور ارشادات ربانی وفرمودات نبوی (ﷺ) کو اپنا حرز جان بنائیں۔ قرآن مجید میں ہے:

❶ ﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ

حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾[1]

ترجمہ: "جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے (اس کی نافرمانی اور گناہ کے کام نہیں کرتا) تو حق تعالیٰ اس کے (مشکلات سے) نجات کی راہ نکالتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا اللہ اسے کافی ہوگا۔"

❷ ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾[2]

ترجمہ: "اور کوئی (رزق کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔"

❸ ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾[3]

ترجمہ: "اور کتنے جانور ہیں جو اٹھا نہیں رکھتے اپنی روزی، اللہ روزی دیتا ہے ان کو اور تم کو بھی اور وہی ہے سننے والا اور جاننے والا۔"

اس آیت کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"یہ روزی کی طرف سے خاطر جمع کر دی کہ "اکثر جانوروں کے گھر میں اگلے دن قوت نہیں ہوتا۔ نیا دن اور نئی روزی" (موضح) پھر جو خدا جانوروں کو روزی پہنچاتا ہے کیا اپنے وفادار عاشقوں کو نہ پہنچائے گا۔ خوب سمجھ لو رزاق حقیقی وہی ہے جو سب کی باتیں سنتا اور دلوں کے اخلاص کو جانتا ہے۔ ہر ایک کا ظاہر وباطن اس کے سامنے ہے۔ کسی کی محنت وہاں رائیگاں نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اس کے راستہ میں وطن چھوڑ کر نکلے ہیں انہیں ضائع نہیں کرے گا۔ سامان معیشت ساتھ لے جانے کی فکر نہ کریں۔ کتنے جانور ہیں جو اپنی روزی کمر پر لادے نہیں پھرتے پھر بھی رزاق حقیقی

[1] الطلاق: ۲، ۳ [2] هود: ٦ [3] العنکبوت: ٦٠

ان کو ہر روز رزق پہنچاتا ہے۔"[1]

④ ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾[2]

ترجمہ: "اللہ خود ہی سب کو روزی پہنچانے والا، نہایت قوت والا ہے۔"

حدیث شریف میں ہے:

⑤ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"لَوْ أَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُونَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرُزِقْتُمْ كَمَا تُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُو خِمَاصًا وَتَرُوحُ بِطَانًا."[3]

ترجمہ: "اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرو جیسا توکل کرنا چاہیے تو تم کو اسی طرح روزی عطا کی جائے گی جس طرح پرندوں کو روزی دی جاتی ہے کہ صبح کو بھوکے پیٹ جاتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ (اپنے گھونسلوں میں) واپس ہوتے ہیں۔"

شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ اپنی مناجات میں فرماتے ہیں ؎

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب گبر وترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمناں نظر داری

یعنی "اے اللہ! آپ ایسے کریم ہیں کہ یہود و نصاریٰ، آتش پرست اور بت پرست (وغیرہ) کو اپنے خزانۂ غیب سے روزی پہنچاتے ہیں۔ دشمنوں پر جب ایسی نظر کرم ہے تو اپنے دوستوں کو (جو تیرے عبادت گزار ہیں) کیسے محروم رکھیں گے؟"[4]

[1] تفسیر عثمانی: ۳/۳۰۲ [2] الذّٰریٰت: ۵۸
[3] ترمذی، الزھد، باب فی توکل علی اللہ، رقم: ۲۳۴۴ [4] دیباچہ گلستان: ۲

منقول ہے کہ کوے کا بچہ انڈے سے نکلتا ہے اس وقت اس کے بال و پر سفید ہوتے ہیں۔ نر و مادہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا بچہ نہیں ہے۔ اگر ہمارا ہوتا تو ہم جیسا سیاہ ہوتا۔ اس لیے وہ کھلانے سے گریز کرتے ہیں۔ بال و پر جب سیاہ ہونے لگتے ہیں تب اسے اپنا بچہ سمجھتے ہیں۔ اور پھر کھلانا پلانا شروع کرتے ہیں۔ اس عمر تک پہنچنے سے پہلے اللہ تعالیٰ اسے اس طرح روزی پہنچاتے ہیں کہ بچہ جب اپنی چونچ بار بار کھولتا ہے تو اس وقت حشرات الارض اور جراثیم ہوا کے ذریعہ اس کے منہ میں پہنچ کر اس کی خوراک بنتے ہیں۔[1]

اللہ پاک کوے کے بچے کو اس طرح روزی پہنچاتے ہیں۔ تو کیا وہ رحیم و کریم ذات اپنے وفا شعار بندوں کو روزی نہیں پہنچائے گا؟ اس ذات وحدہ لاشریک لہ پر توکل کرو اور روزی کی بہت فکر مت کرو۔ بقول شاعر:

؎ غم روزی مخور، برہم مزن اوراق دفتر را
کہ پیش از طفل ایزد پر کند پستان مادر را

ترجمہ: "فکر معاش میں حیران و پریشان مت ہو۔ اللہ تعالیٰ ایسی قدرت اور رحمت والے ہیں کہ بچے کے دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی پستان مادر میں دودھ مہیا کرتے ہیں۔"

⑥ تقدیر میں جو رزق ہے اس کا ملنا ایسا ہی یقینی ہے جس طرح موت آنا یقینی ہے۔ جو رزق مقدر میں ہے اس کے مکمل ہونے سے پہلے انسان کو موت نہیں آسکتی مومن کو اس پر ایمان رکھنا چاہیے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"وَإِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوعِي: "أَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمُ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ أَنْ تَطْلُبُوهُ بِمَعَاصِي اللّٰهِ فَإِنَّهُ لَا

[1] مظاہر حق: کتاب الرقاق، توکل اور صبر کا بیان: ۳/۸۰

يُدْرِكُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ إِلَّا بِطَاعَتِهٖ"[1]

تَرجَمہ: "حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی (یعنی بذریعہ وحی بتلایا کہ) کسی نفس کو موت نہیں آسکتی جب تک کہ وہ اپنا رزق مکمل نہ کرلے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اعتدال اور صحیح طریقہ سے رزق طلب کرو اور دیر سے رزق ملنا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرکے رزق تلاش کرنے لگو اس لیے کہ جو اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں ہے وہ اللہ کی اطاعت ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

۵ حضرت ابوالدرداء رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ الرِّزْقَ لَيَطْلُبُ الْعَبْدَ كَمَا يَطْلُبُهٗ أَجَلُهٗ"

تَرجَمہ: "بے شک رزق بندے کو اس طرح تلاش کرتا ہے جس طرح اس کی موت اسے تلاش کرتی ہے۔"[2]

اور بھی بے شمار قرآن مجید کی آیات اور احادیث ہیں جن میں غور و تدبر سے ثابت ہوتا ہے کہ رزق کا تعلق اللہ رب العزت سے ہے۔ لہٰذا اسی ذات وحدہٗ لا شریک لہٗ پر کامل اعتماد اور توکل کرنا چاہیے۔ ان آیات اور احادیث پر اگر انسان کی نظر رہے تو پھر ان شاء اللہ ادھر اُدھر حیران و سرگرداں نہ پھرے گا۔

ہر مسجد میں اگر ایسے امام ہوں گے تو ان شاء اللہ مسلمانوں کے معاشرہ میں اس کے بہترین اثرات آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب الرقاق، باب التوکل والصبر: ص۴۵۲

[2] مشکوٰۃ شریف، کتاب الرقاق، باب التوکل والصبر: ص۴۵۲

اسی طرح مؤذن دین دار اور صالح ہونا چاہیے۔ جو شخص پابند شرع نہ ہو بلکہ فاسق ہو تو اس کو مؤذن بنانا درست نہیں ہے۔ اللہ کے گھر کا مؤذن دین دار، تعلیم یافتہ، احکام دینیہ خصوصاً اذان و نماز کے مسائل سے واقف، اوقات نماز، صبح کاذب، صبح صادق، زوال، سایہ اصلی، ایک مثل، دو مثل، شفق احمر و ابیض وغیرہ کا جاننے والا، بلند آواز، خوش الحان، اذان کے کلمات صحیح ادا کرنے والا ہونا چاہیے۔ حدیث شریف میں ہے "لِيُؤَذِّنْ لَكُمْ خِيَارُكُمْ" یعنی تم میں جو صالح ہو وہ اذان کہے۔[1]

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"وَيَنْبَغِيْ أَنْ يَّكُوْنَ الْمُؤَذِّنُ رَجُلًا عَاقِلًا صَالِحًا تَقِيًّا عَالِمًا بِالسُّنَّةِ"

تَرجَمہ: "مؤذن عاقل، سمجھ دار، نیک، متقی اور طریقہ سنت سے واقف ہونا چاہیے۔"[2]

اور کبیری میں ہے:

"وَأَفَادَ هٰذَا أَنَّ الْأَوْلٰى أَنْ يَّتَوَلَّى الْعُلَمَاءُ الْأَذَانَ لِأَنَّهٗ مِنْ بَابِ الْجَمَاعَةِ وَالدُّعَاءِ إِلَيْهَا فَلَا يُفَوَّضُ إِلٰى غَيْرِهِمْ عَلٰى مَا مَرَّ وَفِي الْخُلَاصَةِ "الْمُؤَذِّنُ إِذَا لَمْ يَكُنْ عَالِمًا بِالْأَوْقَاتِ لَا يَسْتَحِقُّ ثَوَابَ الْمُؤَذِّنِيْنَ""[3]

تَرجَمہ: "اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بہتر یہ ہے کہ اذان دینا علماء کو سپرد کیا جائے اس لیے کہ اذان جماعت اور اس کی طرف بلانے کے باب میں سے ہے، لہٰذا اذان کو دوسروں کے حوالے نہ کیا جائے جیسا

---

[1] ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من أحق بالإمامة: ۸۷/۱

[2] فتاویٰ عالمگیری، الصلاۃ، الباب الثاني في الأذان: ۵۳/۱

[3] کبیری: ۳۶۲

گزر گیا۔

اور خلاصہ میں ہے کہ اگر مؤذن اوقات نہ جانتا ہو تو وہ مؤذنین کو دیے جانے والے ثواب کا مستحق نہیں ہوگا۔"

ہمارے زمانے میں مؤذنوں میں یہ اوصاف مفقود ہیں، ارزاں اور کم سے کم تنخواہ والا مؤذن تلاش کیا جاتا ہے۔ خواہ اذان صحیح نہ دے سکتا ہو۔ اذان کے کلمات کہیں دراز اور کہیں مختصر کر کے اذان کی روح ہی کو فنا کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اعادہ ضروری ہو جاتا ہو۔ مثلاً "اَشْہَدُ" کو "اَشْہَدُ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ" کو "حَیْ لَلصَّلٰوۃ" یا "حَیًّا لَلصَّلٰوۃ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" کو "حَیْ لَلْفَلَاحِ" یا "حَیًّا لَلْفَلَاحِ، اَللّٰہُ" کی جگہ "آللّٰہ، اَکْبَرُ" کی جگہ "آکْبَر" اور "اَکْبَار" اور اسی طرح "حَیّ" میں بڑی "ح" کی جگہ چھوٹی "ہ" پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے غلطیاں کی جاتی ہیں۔ ائمہ کرام وغیرہ جاننے والے حضرات بھی اصلاح نہیں کرتے۔

ائمہ کرام پر اس کی بڑی ذمہ داری ہے اذان صرف اعلان ہی کا نام نہیں ہے، بل کہ اذان عبادت بھی ہے اور مہتم بالشان اسلامی شعار بھی ہے، اس کو اسی کے شایان شان طریقہ سے ادا کیا جائے کہ اسلامی شان معلوم ہو، اور سامعین کے قلوب متأثر و متوجہ ہوں اور اس کی برکتیں ظاہر ہوں۔

"اِنَّ الْاَذَانَ اِظْہَارُ شَعَائِرِ الْاِسْلَامِ."[1]

ترجمہ: "اذان اسلام کی علامت ہے۔"

اور فتح القدیر میں ہے:

"لِاَنَّ الْاَذَانَ مِنْ اَعْلَامِ الدِّیْنِ."[2]

ترجمہ: "اذان دین کی علامتوں میں سے ہے۔"

[1] فتح الباری، کتاب الاذان: ۱۰۲/۱
[2] فتح القدیر، باب الاذان: ۲۰۹/۱

حق تعالیٰ متولیوں کو توفیق دے کہ اس کی اہمیت کو سمجھیں۔

مساجد کا نظام صحیح اور بہتر سے بہتر ہونے کا زیادہ تر دار و مدار عام طور پر متولیوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے متولی بہت ہی باصلاحیت ہونا چاہیے اور اس کے لیے سب سے بہتر عالم باعمل شخص ہے، اگر ایسا متولی میسر نہ ہو سکے تو کم از کم دین دار، صوم و صلوٰۃ کا پابند، امانت دار، مسائل و فقہ کا جاننے والا، خوش اخلاق، منصف مزاج، علم دوست، اہل علم کی تعظیم و تکریم اور ان سے مشورہ کر کے کام کرنے والا، دین اور اہل دین سے محبت اور دین کی فکر رکھنے والا ہونا چاہیے۔ اگر ایسا متولی ہوگا تو مندرجہ بالا اوصاف سے متصف امام و مؤذن تلاش کر کے ان کا تقرر کرے گا، پھر ان کی صحیح قدر اور ان کو خدمت کرنے کا موقع فراہم کرے گا اور دینی کاموں کی انجام دہی میں ان کا معین و مددگار بنے گا۔[1]

لہٰذا اگر ان باتوں پر عمل کیا گیا تو ان شاء اللہ اس کی نورانیت اور اس کی برکات آپ خود دیکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مساجد کا نظام بہتر سے بہتر بنا دے اور ہر مسجد میں ایسے امام، مؤذن اور متولیوں کا تقرر ہو کہ جن سے مساجد کا نظام صحیح اور بہتر سے بہتر ہو اور مساجد سے مسلمانوں کو صحیح رہنمائی مل سکے۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ اَللّٰهُمَّ آمِيْن.

[1] فتاویٰ رحیمیہ، کتاب الجنائز، نماز کے متفرق مسائل: ۲۲۰/۸ تا ۲۲۸

باب پنجم

مقتدیوں کی تعلیم و تربیت

اصلاح کرنے کا ایک بہترین طریقہ

حافظ ابن کثیر رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے ابن ابی حاتم کی سند سے نقل کیا ہے کہ اہل شام میں سے ایک بڑا بارعب قوی آدمی تھا جو حضرت فاروق اعظم رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے پاس آیا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ نہ آیا تو حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے لوگوں سے اس کا حال پوچھا۔ لوگوں نے کہا: ''امیر المؤمنین اس کا حال نہ پوچھیے وہ تو شراب میں بدمست رہنے لگا۔''

حضرت فاروق اعظم رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے اپنے منشی کو بلایا اور کہا کہ یہ خط لکھو۔

''مِنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ إِلٰى فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ. سَلَامٌ عَلَيْكَ فَإِنِّيْ أَحْمَدُ إِلَيْكَ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۭ إِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾''[1]

تَرجَمَہ: ''عمر بن خطاب کی طرف سے فلاں بن فلاں کے نام۔ سلام علیک، اس کے بعد میں تمہارے لیے اس اللہ کی حمد پیش کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ گناہوں کو معاف کرنے والا، توبہ قبول کرنے

[1] المؤمن: ۳

والا، سخت عذاب والا، بڑی قدرت والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

پھر حاضرین مجلس سے کہا کہ سب مل کر اس کے لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو پھیر دے۔ اور اس کی توبہ قبول فرمائے۔ فاروق اعظم رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے جس قاصد کے ہاتھ یہ خط بھیجا تھا اس کو ہدایت کر دی تھی کہ یہ خط اس کو اس وقت تک نہ دے جب تک کہ وہ نشہ سے ہوش میں نہ آئے اور کسی دوسرے کے حوالے نہ کرے۔ جب اس کے پاس حضرت فاروق اعظم رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا یہ خط پہنچا اور اس نے پڑھا تو بار بار ان کلمات کو پڑھتا اور غور کرتا رہا کہ اس میں مجھے سزا سے ڈرایا بھی گیا ہے اور معاف کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ پھر رونے لگا اور شراب خوری سے باز آ گیا۔ اور ایسی توبہ کی کہ پھر شراب کے پاس بھی نہ گیا۔

حضرت فاروق اعظم رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو جب اس اثر کی خبر ملی تو لوگوں سے فرمایا: ''ایسے معاملات میں تم سب کو ایسا ہی کرنا چاہیے کہ جب کوئی بھائی کسی لغزش میں مبتلا ہو جائے تو اس کو درستی پر لانے کی فکر کرو۔ اور اس کو اللہ کی رحمت کا بھروسہ دلاؤ۔ اور اللہ سے اس کے لیے دعا کرو کہ وہ توبہ کر لے۔ اور تم اس کے مقابلہ پر شیطان کے مددگار نہ بنو۔ یعنی اس کو برا بھلا کہہ کر یا غصہ دلا کر دین سے دور کر دو گے تو یہ شیطان کی مدد ہوگی۔''[1]

اسی طرح حضرت جنید بغدادی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص آیا اور کہا: ''حضرت آپ کا وعظ شہری کس کام کرتا ہے یا جنگل میں بھی کچھ تاثیر بخشتا ہے؟''

آپ نے حال پوچھا۔ اس نے عرض کیا: ''چند لوگ فلاں مقام پر جنگل کے اندر مصروفِ رقص و سرود اور دورِ شراب سے مخمور ہیں۔'' آپ نے اسی وقت منہ لپیٹ

[1] تفسیر ابن کثیر: ۱۱۲۶/۴، المؤمن: ۲،۳

کر جنگل کی راہ لی۔ جب آپ قریب پہنچے تو وہ لوگ بھاگنے لگے۔ فرمایا: ''بھاگو نہیں میں بھی تمہارا ہم مشرب ہوں، ہمارے لیے بھی لاؤ، شہر میں تو پی نہیں سکتے، اس لیے ہم ادھر یہاں آئے ہیں۔'' ان لوگوں نے کہا: ''افسوس ہے کہ اس وقت شراب ختم ہو رہی، فرمائیں! تو شہر سے منگوا دی جائے؟''

حضرت جنید بغدادی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے فرمایا: ''کیا تمہیں کوئی ایسی بات نہیں آتی کہ شراب خود بخود آجایا کرے؟''

وہ بولے: ''صاحب یہ کمال تو ہم میں نہیں۔'' فرمایا: ''آؤ تم کو ایک ایسی بات سکھا دوں کہ شراب خود بخود آجائے، پھر شراب کا مزہ دیکھو۔'' وہ سب مشتاق ہوئے۔ کہ یہ کمال تو ضرور بتا دیجیے۔ فرمایا: ''اچھا اول نہاؤ، پھر کپڑے بدل کر میرے پاس آؤ۔'' سب نے غسل کیا۔ کپڑے دھوئے۔ اور پاک وصاف ہو کر آموجود ہوئے۔ تب فرمایا: ''سب دو رکعت نماز پڑھو۔'' جب وہ نماز میں مشغول ہوئے تو آپ نے دعا مانگی: ''یا خدایا! میرا تو اتنا ہی کام تھا کہ تیرے حضور کھڑا کر دیا۔ اب تجھے اختیار ہے، خواہ ان کو گمراہ کر، خواہ ہدایت بخش۔'' چناں چہ حضرت کی دعا منظور ہوئی اور سب ہدایت کامل سے مستفیض ہوئے۔[1]

تَنْبِیْہ: جو لوگ اصلاحِ خلق اور تبلیغ و دعوت کی خدمت انجام دینے والے ہیں، ان کے لیے اس حکایت میں ایک عظیم الشان ہدایت ہے کہ جس شخص کی اصلاح مقصود ہو، اس کے لیے خوب گڑگڑا کر دعا کرو۔ اور پھر نرم تدابیر سے اس کو درستی کی طرف لاؤ۔ اشتعال انگیزی نہ کرو۔ اس سے اس کو نفع نہیں پہنچے گا۔ بل کہ شیطان کی امداد ہوگی۔ اور وہ اس کو اور زیادہ گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔

پیغمبرانہ دعوت کا ایک اہم اصول

حضرت موسیٰ و ہارون عَلَیْہِمَا السَّلَامُ کو فرعون کی ہدایت کے لیے بھیجنے کا حکم ایک

[1] مخزن اخلاق، اعمال الصالحین: ۳۰۸

خاص ہدایت کے ساتھ دیا گیا ہے، یعنی:

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾[1]

تَرْجَمَہ: ''آپ دونوں اس سے نرم بات کریں شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔''

یعنی یہ وصف بھی داعیانِ امت کے لیے بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ سختی سے لوگ بدکتے اور دور بھاگتے ہیں اور نرمی سے قریب آتے اور متاثر ہوتے ہیں اگر وہ ہدایت قبول کرنے والے ہوتے ہیں۔

اس آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ فریقِ مخالف کتنا ہی سرکش اور غلط سے غلط عقائد و خیالات کا حامل ہو اصلاح و ہدایت کا فریضہ انجام دینے والوں پر لازم ہے کہ اس کے ساتھ بھی ہمدردانہ اور خیر خواہانہ انداز سے نرم بات کریں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ مخاطب کچھ غور و فکر پر مجبور ہو جائے اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو جائے۔

فرعون جو خدائی کا دعوے دار، جابر اور ظالم ہے۔ جو اپنی ذات کی حفاظت کے لیے ہزارہا بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا مجرم ہے۔ اس کی طرف بھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص پیغمبروں کو جب بھیجتے ہیں تو یہ ہدایت نامہ دے کر بھیجتے ہیں کہ اس سے بات نرم کریں تاکہ اس کو غور و فکر کا موقع ملے۔ اور یہ اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ فرعون اپنی سرکشی سے اور گمراہی سے باز آنے والا نہیں ہے۔ مگر اپنے پیغمبروں کو اس اصول کا پابند کرنا تھا جس کے ذریعہ خلقِ خدا سوچنے سمجھنے پر مجبور ہو کر اللہ تعالیٰ کے خوف کی طرف آجائے۔ فرعون کو ہدایت ہو یا نہ ہو مگر اصول وہ ہونا چاہیے جو ہدایت و اصلاح کا ذریعہ بن سکے۔

آج کل جو بہت سے اہلِ علم اپنے اختلافات میں ایک دوسرے کے خلاف

[1] طٰہٰ: ۴۴

زبان درازی........ اور الزام تراشی........ کو اسلام کی خدمت سمجھ بیٹھے ہیں،
انہیں اس پر بہت غور کرنا چاہیے۔[1]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی مولانا محمد الیاس رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا ملفوظ نقل فرماتے ہیں: ''کہ مسلمانوں کی برائیوں کا انسداد ان کی برائیاں بیان کرنے سے نہیں ہو سکتا، بلکہ چاہیے کہ ان میں جو ایک آدھ بھی اچھائی موجود ہو اس کی تکثیر کی جائے، برائیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔

کوئی شخص اور کوئی مسلم ہرگز ایسا نہیں ہے کہ کچھ خوبیوں اور کچھ خرابیوں سے خالی ہو۔ ہر شخص میں یقیناً کچھ خوبیاں اور کچھ خرابیاں ہوتی ہیں۔ اگر خرابیوں کے ساتھ نظر اندازی اور ستر (پردہ پوشی) کا اور خوبیوں کی پسندیدگی اور ان کے اکرام کا ہم مسلمانوں میں رواج ہو جائے تو بہت سے فتنے اور بہت سی خرابیاں اپنے آپ جڑ سے اکھڑ جائیں اور ہزاروں خوبیوں کی کمی اپنے آپ بنیاد پڑ جائے مگر دستور اس کے خلاف ہے۔''[2]

ائمہ حضرات تنہائی میں بعض غلطیوں کو سمجھائیں

بعض اوقات کسی کی غلطی سامنے آتی ہے تو پوری قوم کو زجر و توبیخ میں شامل کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی چوکی دار سے غلطی ہو گئی تو یہ کہا جاتا ہے کہ سارے چوکی دار ایسے ہیں۔ یا کسی تاجر سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تو سارے تاجر ایسے ہیں۔ یا کسی دوسری زبان بولنے والے سے کوئی غلطی ہو گئی تو یہ کہا جاتا ہے کہ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ اس زبان بولنے والوں کا ظرف بہت تنگ ہے، اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ۔

لہٰذا ائمہ حضرات کو چاہیے کہ یہ عوام والی صفات بالکل اختیار نہ کریں، بلکہ اپنے مقتدیوں کو بھی سمجھائیں اور خود بھی اس پر عمل کریں کہ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو گئی

[1] معارف القرآن: ۶/۱۱

[2] حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت: ۱۴۲، ۱۴۱

تو اس کو تنہائی میں سمجھائیں اور اس کو سب کے سامنے ذلیل نہ کریں اور ایک شخص کی غلطی پر پوری قوم، یا پوری برادری کو شامل نہ کریں۔

امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

''مَنْ وَعَظَ أَخَاهُ سِرًّا فَقَدْ نَصَحَهُ وَزَانَهُ، وَمَنْ وَعَظَ عَلَانِيَةً فَقَدْ فَضَحَهُ وَشَانَهُ''[1]

ترجمہ: ''جس نے اپنے (مسلمان) بھائی کو تنہائی اور علیحدگی میں نصیحت کی تو ناصح نے اس کو زینت بخشی، اور جس نے اپنے (مسلمان) بھائی کو سب کے سامنے نصیحت کی تو ناصح نے اس کو ذلیل و رسوا کیا۔''

اور امام فضیل بن عیاض رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے تو مومن کی تعریف یہی کی ہے، چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

''اَلْمُؤْمِنُ يَسْتُرُ وَيَنْصَحُ وَالْفَاجِرُ يَهْتِكُ وَيُعَيِّرُ''[2]

ترجمہ: ''مومن وہ ہوتا ہے جو پردہ پوشی کرے اور نصیحت کرے اور فاسق وہ ہوتا ہے جو پردہ دری کرے اور عار دلائے، اور شرمندہ کرے۔''

اسی طرح بزرگوں کا مشہور مقولہ بھی ہے کہ:

''اَلنَّصِيحَةُ أَمَامَ النَّاسِ فَضِيحَةٌ'' لوگوں کے سامنے نصیحت کرنا فضیحت ہے، یعنی کسی کو لوگوں کے سامنے اس کے عیب بتلا کر نصیحت کرنا نصیحت نہیں ہے، بلکہ یہ رسوائی ہے، اس کو ذلیل کرنے کے مترادف ہے۔

لہٰذا اگر کسی کی غلطی سامنے آئے تو اس شخص یا اس قوم یا اس طبقے کو منبر پر یا بھری محفل میں سب کے سامنے نصیحت نہیں کرنی چاہیے۔

[1] حلیۃ الاولیاء: ۹/۱۴۹، رقم: ۱۳۴۶۴

[2] الفرق بین النصیحۃ والتعییر: ۳۹

ائمہ کرام کو امام ابن رجب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا رسالہ "اَلْفَرْقُ بَیْنَ النَّصِیْحَۃِ وَالتَّعْیِیْرِ" کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، یہ بہت مفید رسالہ ہے۔

بعض اوقات امام صاحب سمجھتے ہیں کہ میں نصیحت کر رہا ہوں، اپنا فرض ادا کر رہا ہوں، حالاں کہ وہ نصیحت نہیں ہوتی، بل کہ عار دلانا ہوتا ہے۔ چناں چہ مذکورہ رسالہ میں نصیحت اور عار دلانے کے فرق کو جلیل القدر تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال واشعار سے واضح کر دیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم اسی باب سے متعلق "دیوانِ امام شافعی" میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے کچھ اشعار نقل کرتے ہیں، عمل کی نیت سے ہر امام کو یاد کرنے چاہئیں، بڑے نصیحت آموز اشعار ہیں، فرماتے ہیں:

تَعَمَّدْنِي بِنُصْحِكَ فِي انْفِرَادِي
وَجَنِّبْنِي النَّصِيحَةَ فِي الْجَمَاعَةْ

ترجمہ: "مجھے علیحدگی اور تنہائی میں نصیحت کیا کرو، اور سب کے سامنے نصیحت کرنے سے پرہیز کیا کرو۔"

إِنَّ النُّصْحَ بَيْنَ النَّاسِ نَوْعٌ
مِنَ التَّوْبِيخِ لَا أَرْضَى اسْتِمَاعَهْ

ترجمہ: "کیوں کہ لوگوں کے سامنے (برملا) نصیحت کرنا ایک قسم کی ڈانٹ ہے، میں اس طرح نصیحت (قبول کرنا تو دور کی بات ہے) نہیں سن سکتا۔"

وَإِنْ خَالَفْتَنِي وَعَصَيْتَ قَوْلِي
فَلَا تَجْزَعْ إِذَا لَمْ تُعْطَ طَاعَةْ [1]

ترجمہ: "اگر آپ نے میری یہ بات نہیں مانی (اور سب کے سامنے

[1] دیوان الإمام الشافعي، قافية العين، حب الصالحين وأدب النصح: ۱۸۰

نصیحت کرنے پر ڈٹے رہے)، تو پھر ناراض مت ہو جانا جب میں تمہاری نصیحت پر عمل نہ کروں۔"

لہٰذا تنہائی میں نصیحت کرنا زیادہ مفید ہے، بہ نسبت برملا اور سب کے سامنے نصیحت کرنے کے۔

سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيٓ أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا﴾ [1]

اور انہیں نصیحت کرتے رہیے، اور انہیں وہ بات کہیے جو ان کے دلوں میں گھر کرنے والی ہو۔ یعنی اے پیغمبر! آپ ان کے ظاہر کو سامنے رکھتے ہوئے درگزری کیجیے اور وعظ ونصیحت اور قولِ بلیغ کے ذریعے سے ان کے اندر کی اصلاح کی کوشش جاری رکھیے، جس سے یہ معلوم ہوا کہ دشمنوں کی سازش کو عفو ودرگزر ..... وعظ ونصیحت اور قولِ بلیغ ..... کے ذریعے سے ہی ناکام بنانے کی سعی کی جانی چاہیے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام زمخشری فرماتے ہیں:

"قُلْ لَّهُمْ فِيٓ أَنْفُسِهِمْ خَالِيًا بِهِمْ لَيْسَ مَعَهُمْ غَيْرُهُمْ مُسَارًّا لَهُمْ بِالنَّصِيْحَةِ لِأَنَّهَا فِي السِّرِّ أَنْجَعُ" [2]

ترجمہ: "(اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں) آپ ان منافقین کو اس حال میں نصیحت کریں کہ جب ان کے ساتھ دوسرے لوگ موجود نہ ہوں یعنی بالکل خلوت میں ان کو نصیحت کریں، کیوں کہ علیحدگی کی نصیحت زیادہ مفید ہے۔"

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"مِنْ دَقَائِقِ صِنَاعَةِ التَّعْلِيْمِ أَنْ يَّزْجُرَ الْمُتَعَلِّمَ عَنْ سُوْءِ الْأَخْلَاقِ بِطَرِيْقِ التَّعْرِيْضِ مَا أَمْكَنَ، وَلَا يُصَرِّحُ وَبِطَرِيْقِ الرَّحْمَةِ لَا بِطَرِيْقِ التَّوْبِيْخِ، فَإِنَّ التَّصْرِيْحَ يَهْتِكُ حِجَابَ

[1] النساء: ۶۳ [2] الکشاف ۱/۵۲۷

النَّصِیحَۃِ.''[1]

تَرجَمَۃ: ''تعلیم کی باریکیوں میں سے ایک باریکی یہ ہے کہ طالب علم اور شاگرد کے ڈانٹا جانے میں جہاں تک ممکن ہو سکے تعریض کا طریقہ اپنائے اور صراحت کا طریقہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے اور صراحت بھی نرمی و شفقت کے ساتھ ہو، ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں نہ ہو کیوں کہ صراحت میں رسوائی و ذلت ہے۔''

یعنی امام غزالی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں کہ ناصح کا لہجہ نرم اور رحمت والا ہو سخت، ڈانٹنے اور غضب والا نہ ہو، حتی الامکان کمیوں، کوتاہیوں کے ذکر کے بغیر اشارۃً نصیحت کرے، کیوں کہ لوگ سخت لہجے والے کی نصیحت قبول نہیں کرتے بل کہ الٹا ضد میں آ کر اس کی مخالفت کرتے ہیں اور صراحۃً عیوب کے ذکر کرنے سے انسان میں چڑچڑے پن کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور مسلمان کی پردہ دری کا گناہ بھی ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اس کو سب کے سامنے رسوا و ذلیل نہ کیا جائے، بل کہ تنہائی میں اس کو نرم طریقہ سے سمجھایا جائے اور ماضی میں تم نے یہ کیا......اور یہ کیا...... کے بجائے مستقبل میں اچھی طرح رہنے کی نصیحت کی جائے، بعض لوگ شیطان کے اس دھوکہ میں ہوتے ہیں کہ ہم سب کے سامنے اس لیے کہہ رہے ہیں، تاکہ دوسرے لوگوں کی بھی اصلاح ہو جائے، لیکن ان کو یہ خبر نہیں ہے کہ اس طریقہ سے نہ اس آدمی کی اصلاح ہوگی اور نہ دوسرے لوگوں کی، بل کہ یہ جو اصلاح کا طریقہ ہے الٹا ایک نزاع کی صورت اختیار کر جائے گا، جس سے فائدے کے بجائے نقصان ہوگا۔

اگر یقینی اصلاح مقصود ہو تو اصلاح کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ بغیر عیب جتلائے اور بغیر قوم کا نام لیے تنہائی میں اس کو نصیحت کرے۔ اس میں ناصح اور منصوح لہ دونوں

[1] الرسول المعلم: ۱۲۷

[illegible] ہے کہ ایسی نصیحت میں ریا، عجب اور شیطان کو شامل ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

جیسا کہ شیخ احمد اپنی کتاب ''الحکم'' میں لکھتے ہیں:

''إِنَّہُ لَا مَجَالَ فِي النَّصِیحَۃِ سِرًّا لِحُظُوظِ النَّفْسِ وَالْھَوٰی وَالشَّیْطَانِ. وَالنَّاصِحُ قَدْ أَدّٰی مَا عَلَیْہِ وَامْتَثَلَ أَمْرَ رَبِّہٖ، وَنَصَحَ سِرًّا فَلَمْ یُدَاخِلْہُ شَيْءٌ مِنَ الرِّیَاءِ وَالْعُجْبِ أَوِ الْغُرُوْرِ، وَالْمَنْصُوْحُ لَہٗ اقْتَنَعَ بِالنَّصِیحَۃِ وَعَمِلَ بِھَا لِأَنَّہٗ نُصِحَ بِطَرِیْقَۃٍ حَسَنَۃٍ وَبِالْمَعْرُوْفِ. کَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ''یَا مَعْشَرَ مَنْ قَدْ أَسْلَمَ بِلِسَانِہٖ وَلَمْ یُفْضِ الْإِیْمَانُ إِلٰی قَلْبِہٖ! لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تُعَیِّرُوْھُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِھِمْ''.''[1]

تَرجَمَۃ: ''خلوت اور تنہائی میں نصیحت کرنے میں خواہشاتِ نفسانی (عجب، ریا) اور شیطان کو شامل ہونے کا موقع نہیں ملتا، اس لیے کہ جب ناصح نے اپنا فرضِ منصبی اور اپنے رب کا حکم اس طور پر بجا لایا کہ اس نے خلوت اور علیحدگی میں نصیحت کر دی تو پھر اس میں ریا، عجب اور غرور جیسی بری صفت بھی شامل نہیں ہوئی۔ اور منصوح لہ نے غور سے نصیحت سن لی اور اس پر عمل کیا تو اس کا بغور سننا اور اس پر عمل کرنا اس لیے ہوا کہ اس کو اچھے اور بہتر طریقے سے خلوت میں نصیحت کی گئی تھی جیسے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا ہے کہ ''اے وہ جماعت جس نے زبان سے ایمان کا اقرار کیا اور دل سے ایمان نہیں لایا! (یعنی منافقوں کی جماعت) مسلمانوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ، نہ ان کو عار دلاؤ اور نہ ان کی پردہ دری کرو یعنی ان کے عیوب کو ظاہر مت کرو۔''

[1] الترمذي: أبواب البر والصلۃ، باب ما جاء في تعظیم المؤمن: ۲/ ۲۳

غلطی پر تنبیہ میں حکمت کی رعایت

حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش خواہ کچھ رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ براہِ راست وحی کے ذریعہ بھی آپ کو اس پر متنبہ فرما سکتے تھے۔ لیکن اس کے بجائے ایک مقدمہ بھیج کر تنبیہ کے لیے یہ خاص طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟

درحقیقت اس طریقہ پر غور کرنے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ کسی شخص کو اس کی غلطی پر تنبیہ کے لیے حکمت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرنا زیادہ اچھا ہے۔ جس سے متعلق شخص خود بخود اپنی غلطی کو محسوس کرلے اور اسے زبانی تنبیہ کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اور اس کے لیے ایسی تمثیلات سے کام لینا زیادہ موثر ہوتا ہے۔ جس سے کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو اور ضروری بات بھی واضح ہو جائے۔[1]

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دستور العمل تھا کہ آپ اکثر اپنے ہاتھ سے سودا خرید کر بازار سے لایا کرتے تھے۔ آپ کی عادت تھی کہ ترازو کے دونوں پلڑوں میں ہر چیز کو وزن کرا لیتے تھے۔ ایک دن ایک سبزی فروش سے سبزی خرید کر دونوں پلڑوں میں وزن کرایا، سبزی فروش نے بطور اعتراض کہا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

فرمایا ”تیرا حق میری جانب اور میرا حق تیری جانب نہ آجائے۔“ ”میں تجھ کو بھی پاک کرتا ہوں اور خود بھی پاک ہوتا ہوں۔ کیوں کہ دوسروں کا حق عالم بقا میں بڑی خرابی پیدا کرتا ہے۔“[2]

امام لوگوں کو استخارہ کا طریقہ مسنونہ اور اس کی اہمیت بتلائے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو استخارہ اتنی اہمیت سے

[1] معارف القرآن: ۷/۷ ۵۰، ص: ۲۵　[2] مخزن اخلاق: ۳۰۸، اعمال الصالحین

سکھاتے تھے جیسے قرآن مجید کی سورت کی تعلیم دیتے تھے:

❶ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ - رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا - قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا الْإِسْتِخَارَةَ فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا كَمَا يُعَلِّمُنَا سُوْرَةً مِّنَ الْقُرْآنِ.[1]

ترجمہ: ”حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سارے کاموں میں استخارہ اس طرح سکھاتے تھے جس طرح قرآن مجید کی کوئی سورت سکھاتے تھے۔“

❷ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ تَرْكُهُ اسْتِخَارَةَ اللّٰهِ.[2]

”یعنی اللہ تعالیٰ سے استخارہ نہ کرنا انسان کے لیے بدبختی کی بات ہے۔“

❸ مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَمَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ.[3]

ترجمہ: ”جس نے استخارہ کیا وہ ناکام و نامراد نہیں ہوگا، اور جس نے مشورہ کیا وہ نادم و پشیمان نہیں ہوگا۔“

استخارہ کے خودساختہ طریقے اور ان کے مفاسد

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے وعظ استشارہ و استخارہ میں فرماتے ہیں:

اس زمانے کے مسلمانوں نے استخارہ کے کئی ایسے طریقے خود گھڑ لیے ہیں، جن کا طریقہ مسنونہ سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو استخارہ کا طریقہ بیان فرمایا درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے بندوں تک پہنچایا مگر بندوں نے یہ قدر کی کہ اسے پس پشت ڈال

[1] الترمذی، أبواب الصلوۃ الوتر، باب ماجاء فی صلوۃ الاستخارۃ ۱/۱۰۹
[2] الترمذی، أبواب القدر، باب ماجاء فی الرضاء بالقضاء ۲/۳۷
[3] مجمع الزوائد، الادب، باب ما جاء فی المشاورۃ ۸/۱۲۷

کر اپنی طرف سے کئی طریقے ایجاد کر لیے۔ اللہ تعالیٰ نے جو استخارہ رسول اللہ ﷺ کو سکھایا آپ ﷺ نے وہی اپنی امت کو سکھایا اور ایسے اہتمام سے سکھایا جیسے قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔

مگر آج کل کے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد فرمائے ہوئے طریقے کے مقابلہ میں اپنی پسند کے مختلف طریقے گھڑ لیے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے پر اعتماد نہیں۔

ایک مولوی صاحب نے (حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی) مجلس میں استخارہ کے ایک ایسے ہی طریقہ کی تعریف شروع کر دی، کہنے لگے کہ بہت ہی زبردست قسم کا استخارہ ہے۔ دو رکعت نفل کی نیت باندھیں پھر سورۂ فاتحہ پڑھیں جب "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" پر پہنچیں تو اسی کو بار بار لوٹاتے رہیں، آگے مت پڑھیں۔ اگر وہ کام آپ کے حق میں مفید ہوگا تو پڑھتے پڑھتے آپ خود بخود دائیں جانب کو گھوم جائیں گے اور اگر مضر ہوگا تو بائیں جانب کو گھوم جائیں گے۔ بس آپ کا استخارہ ہو گیا۔ میں (حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) نے کہا مولانا صاحب! آپ جس استخارہ کو بہت ہی زبردست کہہ رہے ہیں اس میں ایک نہیں کئی خرابیاں ہیں:

پہلی خرابی اللہ تعالیٰ کا مقابلہ

اللہ و رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مقابلہ میں خود ساختہ طریقہ اختیار کرنا گویا اللہ تعالیٰ کے علم پر اپنے علم کو ترجیح دینا ہے، یہ تو کفر ہے۔

دوسری خرابی ترکِ سنت

شیطان مسلمان سے سنت چھڑوا کر اس کے مقابلہ میں جو بات دل میں ڈالتا ہے شیطان کے بندوں کے نزدیک تو وہ زبردست ہی ہوتی ہے، اس میں کیا شک

مگر اللہ تعالیٰ کے بندوں کے سامنے اس کی حیثیت ایک تنکے کے برابر بھی نہیں:

﴿إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا﴾[1]

ترجمہ: "بے شک شیطان کی تدبیر بہت ہی ضعیف ہے۔"

شیطان جو بات دل میں ڈالتا ہے ساتھ یہ بھی سمجھاتا ہے کہ یہ بہت ہی زبردست بات ہے۔ اتنی زبردست کہ رحمٰن کی بات سے بھی مقدم ہے۔ اس کے سامنے رحمٰن کی معاذ اللہ! کوئی حیثیت نہیں اس لیے اس کو پلے باندھ لو۔

تیسری خرابی نماز کی بربادی

مسئلہ تو یہ ہے کہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کو اگر جان بوجھ کر دوبارہ پڑھ لیا جائے تو گناہ بھی ہوگا اور نماز بھی واجب الاعادہ ہوگی۔ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" جب ایک بار پڑھ لیا تو آگے پڑھنا واجب ہے پھر فاتحہ کے بعد متصل سورت کا ملانا واجب ہے اگر یہ استخارہ کرنے والا جان بوجھ کر اس آیت کو دہرائے گا تو اس کی نماز واجب الاعادہ ہوگی لہٰذا یہ دو رکعتیں بعد میں لوٹائے اور جان بوجھ کر نماز خراب کرنے کا جو گناہ ہوا اس سے توبہ بھی کرے۔ جو شخص گناہ کا کام کرے اور یہ امید رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس میں خیر عطاء فرمائیں گے تو وہ خود سوچے کہ اللہ کی نافرمانی میں خیر کہاں سے آگئی؟

چوتھی خرابی نماز سے مذاق

اس کا شروع ہی سے ارادہ ہے کہ دو رکعت نفل نہیں پڑھے گا بلکہ ایسے ہی نیت باندھ کر نماز کی صورت بنائی ہے تو یہ نماز جیسی اہم عبادت کا مذاق اڑا رہا ہے۔ یہ شخص نماز پڑھنا نہیں چاہتا صرف "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" بار بار پڑھنے کے لیے نماز کی صورت بنا کر کھڑا ہو گیا ہے، نماز پڑھنا مقصد نہیں اور اگر واقعتاً نماز ہی کی

[1] النساء: ۷۶

نیت باندھی تو چوں کہ دائیں بائیں گھومنے سے نماز ٹوٹ جائے گی، لہٰذا نماز شروع کر کے توڑنے کا گناہ الگ رہا، نہ بھی گھومتا تو بھی نماز واجب الاعادہ تو ہوتی ہی تھی مگر یہ گھوم کر نماز کو بالکل ہی توڑ دیتا ہے۔

رہی یہ بات کہ اگر ان مولوی صاحب نے یا کسی دوسرے صوفی صاحب نے اس کا تجربہ بھی کیا ہو اور وہ واقعتاً گھوم جاتے ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ گھومنے کی بات کر رہے ہیں، اگر یہ صاحب آسمان پر ہی کیوں نہ چڑھ جائیں تو جو بات شریعت کے خلاف ہے اسے ہم بہر حال خلافِ شرع ہی کہیں گے اور یہی کہیں گے کہ اس میں گناہ ہے، اس میں برکت نہیں ہو سکتی۔ دجال کیسے کیسے کرتب دکھائے گا مگر ان شعبدہ بازیوں سے وہ اللہ تھوڑا ہی بن جائے گا، دجال کا دجال ہی رہے گا۔ کوئی کرتب یا شعبدہ دکھا دینا سچائی کا معیار نہیں۔

اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" پڑھتے پڑھتے صوفی صاحب واقعتاً گھوم جاتے ہیں تو بھی اس سے یہ سمجھنا درست نہیں کہ یہ استخارے کا صحیح طریقہ ہے اور اس میں برکت ہے۔

دوسری بات یہ کہ یہ شیطان کا بتایا ہوا ہے تو شیطان سے کیا بعید ہے کہ وہ الوہیت اور قدرت جتانے کے لیے صوفی صاحب کو کندھوں سے پکڑ کر گھما دیتا ہو، گردن سے پکڑ کر کبھی دائیں جانب گھما دیا، کبھی بائیں جانب تاکہ شیطان کی بات پکی ہو جائے۔ شیطان کے لیے گھمانا کیا مشکل ہے۔ اس نے گھما دیا اور یہ صوفی صاحب بھی خوش ہو گئے کہ کام بن گیا۔

تیسری بات یہ کہ جب وہ کھڑے ہو کر مسلسل "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کی رٹ لگاتا رہے گا تو گھنٹہ دو گھنٹہ گزرنے پر ویسے ہی دماغ چکرا جائے گا اور کبھی دائیں جانب چکر کھانے لگے گا، کبھی بائیں جانب اور اس تھکاوٹ کے چکر کو ہی استخارہ کی کرامت سمجھنے لگے گا۔

چوتھی بات یہ کہ جو چیز انسان کے ذہن میں ہوتی ہے اس کا نفسیاتی اثر بھی ہوتا ہے، جب اس کے ذہن میں پہلے ہی سے یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ استخارہ کی برکت سے مجھے ایک طرف چکر آئے گا اور میں گھوم جاؤں گا تو اس تخیل کے اثر سے وہ خود ہی گھوم سکتا ہے۔

یہ تو ایک استخارہ بتا دیا اور بھی اس قسم کے کئی استخارے اور مختلف اعمال ہیں جو جاہل صوفیوں نے گھر بیٹھے بنا لیے ہیں۔ لوگوں کو بھی اتباعِ شریعت کے بجائے ان ہی اعمال میں مزا آتا ہے۔

ایک بات یہ بھی سمجھ لیجیے کہ میں جو غلط بات اور بدعات پر ٹوکتے ہوئے کبھی صوفیوں کا نام لے دیتا ہوں، ان سے مراد آج کل کے بگڑے ہوئے جاہل اور بدعتی صوفی ہیں، صحیح صوفی تو اللہ والے ہوتے ہیں۔

اس وقت صرف ایک استخارے کا حال بتایا ہے مزید نہیں بتاتا کہیں آپ لوگ سیکھ جائیں اور گھروں میں جا کر شروع کر دیں۔ اللہ کے بتائے ہوئے استخارے پر عمل کیا کریں۔ شیطان ایسا ہوشیار ہے ایسا ہوشیار کہ اگر کوئی اللہ کا کام شروع کرنے لگے تو اولاً تو کرنے ہی نہیں دیتا اور اپنی طرف مائل کرتا ہے کہ میرا کام کرو اور اگر کوئی اللہ کا کام شروع بھی کر لے تو یہ مردود اس کام کو خالص نہیں رہنے دیتا اپنی طرف سے کوئی نہ کوئی پیوند ضرور لگا دیتا ہے۔

استخارہ کا طریقۂ مسنونہ

سنت کے مطابق استخارہ کا سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نفل پڑھیں اس کے بعد استخارہ کی دعا پڑھیں۔ بس دعا کے جتنے الفاظ ہیں وہی اس سے مطلوب و مقصود ہیں۔ وہ الفاظ یہ ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْاَلُكَ مِنْ

فَضْلِكَ الْعَظِيمِ فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِّي فِي دِينِي وَمَعِيشَتِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي وَعَاجِلِهِ وَآجِلِهِ فَيَسِّرْهُ لِي ثُمَّ بَارِكْ لِي فِيهِ وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِّي فِي دِينِي وَمَعِيشَتِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي وَعَاجِلِهِ وَآجِلِهِ فَاصْرِفْهُ عَنِّي وَاصْرِفْنِي عَنْهُ وَاقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ أَرْضِنِي بِهِ.[1]

ترجمہ: ''اے اللہ! میں تیرے علم کے ساتھ بھلائی مانگتا ہوں اور قدرت چاہتا ہوں تیری قدرت کے ذریعے اور مانگتا ہوں تیرے فضل سے، کیوں کہ تو ہی قادر ہے میں قادر نہیں ہوں، اور تو ہی جانتا ہے اور میں نہیں جانتا، تو غیبوں کا جاننے والا ہے۔

اے میرے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام اچھا ہے میرے لیے میرے دین، دنیا اور میرے کام کے انجام میں ابھی یا بعد میں، تو تو اس کو میرے قابو میں کر دے اور اس کو میرے لیے آسان کر دے پھر اس میں میرے لیے برکت دے، اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لیے اچھا نہیں، میرے دین، دنیا اور میرے کام کے انجام میں ابھی یا بعد میں، تو تو اس کو مجھ سے پھیر دے اور مجھ کو اس سے پھیر دے اور میرے لیے بھلائی مقدر کر دے، جس جگہ بھی ہو پھر مجھ کو اس سے خوش کر دے۔''

عربی الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت ان کے معنی ومطلب بھی ذہن میں رکھیں بالخصوص آخری جملوں کے معنی کہ یا اللہ! یہ کام جس کے لیے میں استخارہ کر رہا ہوں تیرے علم میں میرے دین کے لیے دنیا کے لیے حال میں بھی مستقبل میں بھی تیرے علم میں اگر نافع ہے تو میرے لیے مقدر فرما، آسان فرما اور اس میں برکت عطا فرما اور اگر یہ کام میری دنیا میں یا میرے دین میں مضر ہے۔ تو تو اس کام کو مجھ سے

[1] ترمذی، أبواب الوتر، باب ماجاء في صلوة الإستخارة: ۱/۱۰۹

پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے، یعنی کرنا چاہوں تو بھی نہ ہو، اسباب سوخت کر دے، کام نہ ہو سکے، اور جہاں کہیں بھی خیر ہو میرے لیے مقدر فرما پھر مجھے اس پر رضا عطا فرما۔

بس استخارہ کی حقیقت اتنی سی ہے کہ دو رکعت نفل پڑھ کر دعا مانگ لی، پھر آگے جو کچھ ہوگا اسی میں خیر ہے۔ کام ہوگیا تو خیر نہیں ہوا تو خیر۔ جدھر کو دل کی توجہ ہو جائے اور جس کے اسباب پیدا ہو رہے ہوں یقین کرلیں کہ یہی میرے لیے بہتر ہے، اور اگر دل کی توجہ ہٹ گئی یا اسباب پیدا نہیں ہوئے یا اسباب موجود تھے مگر استخارہ کے بعد ختم ہوگئے کام نہیں ہو سکا تو اطمینان رکھے اللہ پر یقین رکھے کہ اس میں میری بہتری ہوگی۔ اپنی طبیعت بہت چاہتی ہے مگر اللہ تعالیٰ میرے نفع ونقصان کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں، اس طرح سوچنے سے اطمینان ہو جائے گا، اگر دل کا رجحان کسی جانب نہ ہو تو صرف اسباب کے پیش نظر جو فیصلہ بھی کرلے گا اسی میں خیر ہوگی، اگر استخارہ کے بعد کوئی نقصان ہوگیا تو یہ عقیدہ رکھے کہ استخارہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے چھوٹا نقصان پہنچا کر کسی بڑے نقصان سے بچا لیا۔ استخارہ کی دعا میں دین کا ذکر پہلے ہے اور دنیا کا بعد میں اس لیے کہ مسلمان کا اصل مقصد دین ہے دنیا تو دین کے تابع ہے۔

استخارہ میں پیوندکاری

اب دیکھیے یہ کس قدر آسان کام ہے، مگر اس میں بھی شیطان نے کئی پیوند لگا دیے ہیں۔ پہلا پیوند یہ کہ دو رکعت پڑھ کر کسی سے بات کیے بغیر سو جاؤ۔ سونا ضروری ہے ورنہ استخارہ بے سود رہے گا۔ دوسرا پیوند یہ لگایا کہ لیٹو بھی دائیں کروٹ پر۔ تیسرا یہ کہ قبلہ رو لیٹو۔ چوتھا پیوند یہ لگایا کہ لیٹنے کے بعد خواب کا انتظار کرو، استخارہ کے دوران خواب نظر آئے گا۔ پانچواں پیوند یہ لگایا کہ اگر خواب میں فلاں رنگ نظر

آئے تو وہ کام بہتر ہوتا ہے، فلاں نظر آئے تو وہ بہتر نہیں۔ چھٹا یہ کہ یہ لکھا ہے کہ خواب میں کوئی بزرگ آئے گا، بزرگ کا انتظار کیجیے کہ وہ خواب میں آکر سب بتا دے گا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ بزرگ کون ہوگا، کیسا ہوگا؟

اگر شیطان ہی بزرگ بن کر خواب میں آجائے تو اس کو کیسے پتا چلے گا کہ یہ شیطان ہے یا کوئی بزرگ؟

یاد رکھیے ان میں سے کوئی ایک چیز بھی حدیث سے ثابت نہیں۔ بس یہ باتیں لکھنے والوں نے کتابوں میں بغیر تحقیق کے لکھ دی ہیں، اللہ تعالیٰ ان لکھنے والے مصنفین پر رحم فرمائیں۔

کسی دوسرے سے استخارہ کروانا

استخارہ کے باب میں لوگ ایک اور غلطی بھی کرتے ہیں اس کی اصلاح بھی ضروری ہے وہ یہ کہ بہت سے لوگ خود استخارہ کرنے کے بجائے دوسروں سے کرواتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے، رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہدایت یہ ہے کہ جس کا کام ہو وہ خود استخارہ کرے۔ دوسروں سے کروانے کا کوئی ثبوت نہیں۔ لوگ یہ سوچ کر کہ ہم تو گناہ گار لوگ ہیں ہمارے استخارہ کا کیا اعتبار؟

اس لیے خود استخارہ کرنے کے بجائے فلاں بزرگ اور عالم سے یا کسی نیک آدمی سے کرواتے ہیں کہ اس میں برکت ہوگی، لوگوں کا یہ زعم اور یہ عقیدہ غلط ہے۔ جس کا کام ہو وہ خود استخارہ کرے خواہ وہ نیک ہو یا گناہ گار۔

رشتوں کے لیے استخارہ

رشتے کا معاملہ عام معاملات سے الگ ہے، یہ صرف اولاد کا کام نہیں بلکہ اس کے والدین کا کام بھی ہے۔ صحیح رشتہ کا انتخاب والدین ہی کرسکتے ہیں، یہ ان کی ذمہ داری ہے اور ان کو سوچنا پڑتا ہے کہ کہاں رشتہ کریں اس لیے بہتر یہ ہے کہ جن

لڑکوں یا لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ ہو وہ خود بھی استخارہ کرلیں اور اگر ان کے والدین راضی ہوں تو وہ بھی کرلیں۔

گناہ گار استخارہ کیسے کریں

لوگوں کا یہ خیال کہ "گناہ گار استخارہ نہیں کرسکتے" دو وجہ سے باطل اور غلط ہے۔

پہلی وجہ یہ کہ گناہوں سے بچنا آپ کے اختیار میں ہے۔ مسلمان ہو کر کیوں گناہ گار ہیں؟ گناہ صادر ہوگیا تو صدق دل سے توبہ کرلیجیے، بس گناہوں سے پاک ہوگئے، گناہ گار نہ رہے۔ نیک لوگوں کے زمرے میں شامل ہوگئے۔ توبہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے پاک کردیا، اب اللہ کی اس رحمت کی قدر کریں اور آئندہ جان بوجھ کر گناہ نہ کریں۔

دوسری وجہ یہ کہ استخارہ کے لیے شریعت نے تو کوئی ایسی شرط نہیں لگائی کہ استخارہ گناہ گار انسان نہ کرے کوئی ولی اللہ کرے، جو شرط شریعت نے نہیں لگائی آپ اپنی طرف سے کیوں بڑھاتے ہیں؟

شریعت کی طرف سے تو صرف یہ حکم ہے کہ جس کی حاجت ہو وہ استخارہ کرے خواہ وہ گناہ گار ہو یا نیک، جیسا بھی ہو خود کرے۔

استخارہ کروانے کی خرابیاں

کسی دوسرے سے استخارہ کروانے کے بارے میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس میں مندرجہ ذیل خرابیاں ہیں:

پہلی خرابی شریعت کی مخالفت

بزعم خود بزرگ ہو کر حکم شریعت کے خلاف کام کررہے ہیں۔

دوسری خرابی بزرگی کی بدنامی

لوگوں نے بزرگوں کو بے کار کے طور پر استعمال کرنے کا دھندا شروع کر رکھا ہے۔ وہ بزرگوں سے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کوئی کام نہیں بس بے کار بیٹھے ہیں لہٰذا ان سے بیگار لو۔ اگر صحیح معنوں میں کوئی بزرگ ہو تو وہ دوسروں کے ہاتھوں اس طرح استعمال نہیں ہوگا۔ بل کہ کوئی بے کار سمجھ کر استخارہ کروانے آئے بھی تو وہ یہ جواب دے گا کہ میں تمہارے استخاروں کے لیے پیدا نہیں ہوا اپنے استخارے خود کرو۔

تیسری خرابی من گھڑت استخارے

یہ بزرگ عجیب عجیب استخارے نکالتے ہیں، اس کی کچھ تفصیل پہلے بیان ہو گئی ہے۔ آج کل کے نام نہاد بزرگ سنت کے مطابق استخارہ کرنے کے بجائے اپنے بنائے ہوئے استخارے واللہ اعلم کہاں سے نکالتے ہیں۔ پھر مخصوص طریقے سے کچھ حساب لگاتے ہیں پھر حساب کے نتیجے میں جو بات سامنے آتی ہے اسے پوچھنے والے پر لازم قرار دے دیتے ہیں کہ ہم نے استخارہ نکال لیا ہے، بس اب ایسے کرو، ایسے کرو اس کے خلاف ہرگز نہیں کرنا ورنہ سخت نقصان ہوگا۔ حتیٰ کہ دنیا میں بزرگ کہلانے والے بعض ایسے بھی ہیں جو کہ دلائل شرعیہ کے مقابلہ میں ناجائز کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اگر کوئی سمجھائے گا کہ بزرگ صاحب یہ تو ناجائز کام ہے تو جواب دیتے ہیں کہ بس ہم نے استخارہ نکال لیا ہے گویا کسی کنویں یا دریا سے نکالا ہے، بہت محنت سے کھینچ کر نکالا ہے اس لیے اسی کام میں برکت ہوگی۔

آپ کتنا ہی سمجھائیں کہ آپ کا یہ فعل شریعت کی رو سے قطعاً ناجائز اور حرام ہے مگر ان کا ایک ہی جواب ہوگا کہ بس اب ہم نے استخارہ نکال لیا ہے اسی ناجائز کام میں برکت ہے۔ گویا آخری فیصلہ ان کا استخارہ ہے جو شریعت پر بھی مقدم ہے۔

بزرگوں کے بھیس میں ایسے بھیڑیے بھی موجود ہیں۔[1]

ایسے لوگ سنت کے خلاف اور غلط استخارہ نکال کر کئی گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

بعض بچیوں کو طلاق دلوادیں کہ استخارہ میں آیا ہے کہ اب یہ شوہر صحیح نہیں رہے، بعض شوہروں کو کہہ دیا کہ تم طلاق نہ دو چاہے بیوی کئی سال سے سسرال سے نہیں آرہی، لیکن استخارہ میں آیا ہے کہ وہ لوٹ کر تمہارے پاس آئے گی، اب وہ بیچاری سالہا سال سے میکے بیٹھی ہوئی ہے، نہ کہیں اور شادی کر سکتی ہے، نہ شوہر کے پاس جانا چاہتی ہے۔

لہٰذا لوگوں کو سمجھائیں کہ استخارہ کے ذریعہ کوئی شخص علم غیب پر مطلع نہیں ہوتا، لہٰذا خود استخارہ کریں اور کام شروع کردیں، خیر نہیں ہوگی تو کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی اسی طرح یہ سمجھائیں کہ حضور اکرم ﷺ نے کسی کے لیے بھی استخارہ نہیں فرمایا، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی کسی کے لیے استخارہ نہیں کیا، نہ کروایا، لہٰذا خود کریں۔ استخارہ کا جب بھی موقع ملے اسی وقت کرلے کسی بھی حدیث میں نہ رات کی کوئی قید ہے اور نہ دن کی، نہ سونے کی نہ جاگنے کی، لہٰذا اپنی طرف سے حدود بڑھا کر شریعت کی آسان چیز کو مشکل نہ بنایا جائے۔

اسی طرح خواب آنا کوئی ضروری نہیں کہ خواب میں کوئی بات ضرور بتائی جائے گی، معتقدین کو یہ سمجھایا جائے کہ استخارہ مشکل نہیں بہت آسان ہے، استخارہ کرکے کام شروع کردیں، خیر نہیں ہوگی تو خود بخود رکاوٹ پیدا ہو جائے گی، خیر ہوگی تو کام میں سہولت ہو جائے گی۔ اور ہاں اگر کوئی کام فی الفور کرنا ہو اور نماز پڑھنے کا موقع نہ ہو تو حدیث شریف میں یہ دعا آتی ہے:

---

[1] ...وعظ استشارہ و استخارہ: ۳۰ تا ۳۹

"اَللّٰھُمَّ خِرْلِیْ وَاخْتَرْ لِیْ" [1]

ترجمہ: "اے اللہ! میرے لیے خیر کا فیصلہ اور بہترین انتخاب فرما۔"

بس یہ دعا تین چار مرتبہ پڑھ لیں اور وہ کام شروع کریں ان شاء اللہ امید ہے اس کام میں خیر و برکت ہوگی۔

امام ہر ایک کو سکھانے والا بنائیں

امام کو چاہیے کہ نمازیوں کا قرآن مجید حتی الامکان صحیح کروائے۔

حضرت عبدالرحمن سلمی رحمۃ اللہ تعالیٰ مشہور تابعی ہیں۔ اگرچہ وہ تفسیر، حدیث اور دوسرے علوم دینیہ میں بڑے اونچے مرتبے کے حامل تھے۔ لیکن انہوں نے ساری عمر کوفہ کی جامع مسجد کے اندر قرآن کریم پڑھانے پر گزاری، اور چالیس سال تک لوگوں کو قرآن کریم (حفظ و ناظرہ اور تجوید و قرأت) پڑھاتے رہے۔

کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنایا تھا کہ:

"خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ" [2]

ترجمہ: "تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور سکھائے۔"

فرمایا کہ اس حدیث نے مجھے یہاں بٹھا رکھا ہے۔ [3]

امام میں ایک صفت یہ بھی ہونی چاہیے کہ لوگوں کو دین سکھانے کا ذوق اور شوق ہو۔ کم از کم اپنی قدرت کی حد تک جتنے لوگ اس کے محلے میں رہتے ہوں اور جتنے گھروں میں بالغ افراد ہوں ان کی (فہرست) لسٹ تیار کرکے اپنے پاس رکھے اور ہر ایک کے بارے میں سوچے کہ اس نے کتنا دین سیکھ لیا اور کتنا باقی ہے؟

---

[1] ترمذی، ابواب الدعوات، باب دعا اللہم خرلی ...... رقم: ۳۵۱۶

[2] ابو داود، الوتر، باب فی ثواب قراءۃ القرآن، رقم: ۱۴۵۲

[3] النشر فی القراءۃ والعشر: ۳/۱

جب امام اپنی ذمہ داری سمجھے گا اور یقین رکھے گا کہ اس ذمہ داری کو میں نے خوبی کے ساتھ ادا کیا تو اللہ تعالیٰ کی مدد و رحمت میرے ساتھ بھی شامل ہوگی اور میرے محلہ والوں پر بھی رحمت برسے گی۔

اور اللہ نہ کرے میں نے ان کو دین نہ سکھایا یا انہوں نے مجھ سے دین نہ سیکھا تو ہم دونوں کی پکڑ ہوگی اور ہمارے محلے سے اللہ کی رحمت ہٹ جائے گی۔ اللہ ہم سے ناراض ہو جائیں گے۔ ایک ایک آدمی جو میرے محلے میں رہتا ہے اس کو دین سکھانا میرے ذمہ ضروری ہو گیا اور پھر ان مردوں کے ذریعہ ان کی عورتوں کو اور ان کے معصوم بچوں کو دین اور ان کے اوامر سکھانے ان کے اندر سیکھنے کا شوق پیدا کرنا میرے ذمہ ہے۔

جب انسان کسی چیز کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے تو اس کے لیے فکر کرتا ہے، دعائیں کرتا ہے اور نئی نئی تدبیریں سوچتا ہے۔ اس کا ذہن ہر وقت مشغول رہتا ہے کہ مجھے اللہ نے امام بنایا ہے۔ ان کے دینی امور کا نگران و ذمہ دار بنایا ہے۔ میری سستی سے صرف میرا ذاتی نقصان نہیں ہوگا، بل کہ میری سستی سے کئی نسلوں کا نقصان ہوگا۔

میرا ویسے ہی وقت گزرنے اور صرف نمازوں کی حد تک ان کا امام رہ کر کفایت کرنے میں کئی گھرانے دینی علوم سے محروم ہو جائیں گے اور میرے محلے کے ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد پر محنت کرنے سے کئی گھر خانقاہ ہوں...... اور مدارس میں تبدیل ہو جائیں گے۔

مرد مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے دین سیکھ کر جائیں گے تو جس طرح مسجد میں علمی حلقہ لگا ہوا ہوتا ہے، گھروں پر بھی علمی حلقہ لگے گا اور یہ ایک گھنٹہ دو گھنٹے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت میں رہے، اسی طرح گھروں پر جا کر یہ عورتوں اور بچوں کو دین سکھائیں گے تو وہ بھی اللہ کی رحمت میں رہیں گے۔

اور پھر ہر ہر گھر بل کہ پورا محلہ رحمتِ الٰہی کا گہوارہ بن جائے گا اور ایک اچھا ماحول بنے گا، ورنہ امام اور اہلِ محلہ دونوں کی پکڑ کا خطرہ ہے۔

حجاج بن یوسف چوں کہ ظالم اور قاتل بادشاہ تھا اس لیے اس کے زمانے میں جب لوگ صبح کو بیدار ہوتے اور ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی تو باہم پوچھتے گزشتہ رات کون قتل کیا گیا؟ کس کو پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا؟ اور کس کی پیٹھ کوڑوں کی بوچھاڑ سے چھلنی ہوئی؟

ولید بن عبدالملک کثیر مال و جائیداد والا اور عمارتیں بنانے کا شوقین تھا، چناں چہ اس کے زمانے میں لوگ ایک دوسرے سے مکانات کی تعمیرات، نہروں کی کھدائی اور درختوں کی افزائش کے متعلق پوچھا کرتے تھے۔

جب سلیمان بن عبدالملک نے حکومت کی کرسی سنبھالی تو وہ کھانے پینے اور گانے بجانے کا شوقین تھا۔ چناں چہ لوگ اچھے کھانوں، گانے والیوں اور لونڈیوں کے متعلق ایک دوسرے سے پوچھتے اور یہی ان کا موضوعِ سخن بھی ہوتا۔

اور جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ منصبِ خلافت کی زینت بنے تو لوگوں کی آپس میں اس قسم کی گفتگو ہوتی: قرآن کتنا یاد کیا؟ ہر رات کتنا ورد کرتے رہے؟ رات کو کتنے نوافل پڑھتے ہو؟ فلاں آدمی نے کتنا قرآن یاد کیا؟ اور فلاں شخص مہینے میں کتنے دن روزے سے رہتا ہے؟

کسی نے سچ کہا ہے:

"اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ"

ترجمہ: "لوگ بالعموم اپنے حکمرانوں کے طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔"[1]

اسی طرح اگر امام بھی ایک دینی ماحول بنائے، فہمِ دین کورس، تعلیمِ بالغاں اور

[1] سنہرے اوراق: ۳۰۹

مسائل سیکھنے سکھانے وغیرہ کا سلسلہ شروع کرائے تو اس سے ان شاء اللہ ایک اچھا ماحول بنے گا اور پھر اس اچھے ماحول کا اچھا اثر ہوگا کہ لوگوں کی گفتگو بھی اسی سے متعلق ہوگی کہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ بھائی! امام صاحب نے کل فلاں مسئلہ بتایا تھا، کیا آپ کی سمجھ میں آیا ہے؟ امام صاحب نے کل یہ سبق دیا تھا، کیا آپ نے یاد کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت مولانا یوسف کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "حیاۃ الصحابہ" جلد سوم میں ایک عنوان "اَلتَّهْدِيْدُ عَلٰى عَالِمٍ لَا يُعَلِّمُ وَعَلٰى جَاهِلٍ لَا يَتَعَلَّمُ" کے نام سے باندھا ہے، جس کا ترجمہ حضرت مولانا احسان الحق صاحب نے اس طرح فرمایا ہے:

نہ سکھانے والے عالم اور نہ سیکھنے والے جاہل کے لیے وعیدیں

حضرت ابزی خزاعی ابو عبدالرحمن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ۔۔۔۔ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا اور مسلمانوں کی چند جماعتوں کی خوب تعریف کی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیا بات ہے کچھ لوگ ایسے ہیں جو نہ اپنے پڑوسیوں میں دین کی سمجھ پیدا کرتے ہیں اور نہ ان کو سکھاتے ہیں اور نہ انہیں سمجھ دار بناتے ہیں اور نہ ان کو بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور نہ انہیں برائی سے روکتے ہیں۔ اور کیا بات ہے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنے پڑوسیوں سے دین کی سمجھ حاصل نہیں کرتے اور ان سے سیکھتے نہیں اور سمجھ و عقل کی باتیں حاصل نہیں کرتے؟

اللہ کی قسم! یا تو یہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو سکھانے لگ جائیں اور انہیں سمجھ دار بنانے لگ جائیں اور ان میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے لگ جائیں اور انہیں بھلائی

کا حکم دینے اور برائی سے روکنے لگ جائیں اور دوسرے لوگ اپنے پڑوسیوں سے سیکھنے لگ جائیں اور ان سے سمجھ وعقل کی باتیں حاصل کرنے لگ جائیں اور دین کی سمجھ حاصل کرنے لگ جائیں ورنہ میں انہیں اس دنیا میں جلد سزا دوں گا۔" پھر منبر سے نیچے تشریف لائے اور اپنے گھر تشریف لے گئے۔ لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ کیا خیال ہے حضور ﷺ نے کن لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے؟

تو کچھ لوگوں نے کہا ہمارے خیال میں تو قبیلہ اشعر کے لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، کیوں کہ وہ خود دین کی سمجھ رکھتے ہیں اور ان کے پڑوسی ہیں جو چشموں پر زندگی گزارنے والے، دیہاتی اور اجڈ لوگ ہیں۔ جب یہ خبر ان اشعری لوگوں میں پہنچی تو انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا: "یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) نے بہت سے لوگوں کی تعریف فرمائی لیکن ہمارے بارے میں آپ (ﷺ) نے کچھ نہیں فرمایا ہے۔ تو ہماری کیا خامی ہے؟"

حضور ﷺ نے فرمایا: "لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو سکھائیں۔ ان میں دین کی سمجھ پیدا کریں اور انہیں سمجھ دار بنائیں اور انہیں نیکی کا حکم کریں اور انہیں برائی سے روکیں۔ اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے سیکھیں اور ان سے سمجھ وعقل کی باتیں حاصل کریں اور دین کی سمجھ حاصل کریں نہیں تو میں ان سب کو دنیا ہی میں جلد سزا دوں گا۔"

ان اشعری لوگوں نے عرض کیا:

"کیا دوسروں کی غلطی پر ہم پکڑے جائیں گے؟"

حضور ﷺ نے پھر وہی ارشاد فرمایا تو انہوں نے عرض کیا:

"ہمیں ایک سال کی مہلت دے دیں۔"

چناں چہ حضور ﷺ نے انہیں ایک سال کی مہلت دی تا کہ وہ ان پڑوسیوں کو سکھائیں۔ ان میں دین کی سمجھ پیدا کریں اور انہیں سمجھ دار بنائیں۔ پھر حضور

ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ [1]

ترجمہ: "بنی اسرائیل میں جو لوگ کافر تھے ان پر لعنت کی گئی تھی حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی زبان سے۔ یہ لعنت اس سبب سے ہوئی کہ انہوں نے حکم کی مخالفت کی اور حد سے نکل گئے۔ جو برا کام انہوں نے کر رکھا تھا اس سے باز نہ آتے تھے۔ واقعی ان کا فعل بے شک برا تھا۔" [2]

شیخ مصطفیٰ السباعی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"إِنَّكَ لَتَرَى فِيْ هٰذَا الْحَدِيْثِ مِنَ الْحَقَائِقِ مَا يَجْدُرُ التَّنْبِيْهُ إِلَيْهَا، أُعْتُبِرَ ذٰلِكَ عُدْوَانًا مُنْكَرًا يُوْجِبَانِ اللَّعْنَةَ وَالْعَذَابَ" "أَعْلَنَ الْحَرْبَ وَالْعُقُوْبَةَ عَلَى الْفَرِيْقَيْنِ حَتّٰى يُبَادِرُوْا إِلَى التَّعْلِيْمِ وَالتَّعَلُّمِ لَئِنْ كَانَتِ الْحَادِثَةُ قَدْ وَرَدَتْ بِشَأْنِ الْأَشْعَرِيِّيْنَ فَإِنَّ الرَّسُوْلَ أَعْلَنَ ذٰلِكَ الْمَبْدَأَ صِفَةً عَامَّةً لَا يَخُصُّ الْأَشْعَرِيِّيْنَ بِأَنَّ الْقَضِيَّةَ قَضِيَّةُ مَبْدَءٍ عَامٍّ غَيْرِ مَخْصُوْصٍ بِفِئَةٍ وَلَا عَصْرٍ مُعَيَّنٍ"

ترجمہ: "آپ نے اس حدیث میں ایک قابل تنبیہ حقیقت دیکھی۔ وہ یہ کہ یہاں پر دو چیزوں کا ذکر کیا گیا، ایک نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنا، اور دوسرا برے کام سے نہ روکنے کا۔ اور یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی

[1] المائدۃ: ۷۸، ۷۹

[2] الترغیب والترہیب، کتاب العلم، الترہیب من کتم العلم: ۷۱/۱

لعنت اور عذاب کی موجب بنتی ہیں، چناں چہ ان دونوں فریقین کو ازالی اور سزا کا مرتکب قرار دیا گیا، یہاں تک کہ وہ سیکھنے اور سکھانے (تعلیم، تعلم) کے عمل میں لگ جائیں۔ اگرچہ یہ حدیث اشعریین کے بارے میں وارد ہوئی ہے، مگر حضور ﷺ نے اس کا حکم عام ذکر فرمایا اور کو اشعریین کے ساتھ خاص کیا۔ چناں چہ اس کا حکم عام ہے کسی گروہ یا کسی زمانہ معین کے ساتھ خاص نہیں ہے۔"

مقتدیوں اور عوام الناس کے غلط سوالات

کسی مجلس، ضیافت یا عمومی لوگوں کے مجمع میں ایک شخص سوال کرتا ہے جس سے صرف بحث مباحثہ مقصود ہوتا ہے یا کسی شخص کی تذلیل مقصود ہوتی ہے کہ امام صاحب! ایسا جواب دے دیجیے جس سے فلاں کو اپنی غلطی معلوم ہو جائے اور ہو سکتا ہے فلاں صاحب کو غلطی کا احساس ہو جائے۔

اس طرح غلطی کی اصلاح بسا اوقات جس میں تذلیل بھی ہو آپس میں مزید عداوت و نفرت بڑھانے کا سبب بن سکتی ہے یا پھر وہ مخصوص مخاطب اسی مجلس میں بھڑک اٹھتے ہیں اور بات خوش گوار ماحول سے ہٹ کر کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے اور میزبان پریشان ہو جاتا ہے کہ کن لوگوں کو میں نے ضیافت میں بلایا تھا کہ اچھی خاصی خوشی کی مجلس کو غم سے بدل دیا۔

اسی طرح درس کے بعد بعض اوقات ایک شخص کا سوال سارے مجمع کا ذہن خراب کر دیتا ہے یا سب کو فائدہ ہوتا ہے۔ وہ سوال بعض اوقات موضوع درس کے متعلق ہی ہوتا ہے اور بعض اوقات سورج کے نیچے جتنی چیزیں ہیں ان کے متعلق فضول سوالات ہوتے ہیں۔ بعض اوقات اعتراض بصورت اشکال کیا جاتا ہے۔ اعتراض میں سائل اپنے آپ کو عالم اور اشکال میں سائل اپنے آپ کو جاہل اور

آپ کو عالم سمجھتا ہے۔ اگر قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اعتراض ہے تو ہرگز جواب نہ دیا جائے، اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو عالم سمجھ رہا ہے تو آپ کے کسی جواب سے بھی مطمئن نہیں ہوگا، چناں چہ ایسے معترض کو کہیں کہ لکھ کر یہ سوال لاؤ، امید تو یہی ہے کہ وہ لکھ کر نہیں لائے گا، اور اگر لکھ کر لے آئے تو کہیں کسی دار الافتا بھجوا دو، خود بھجوا دو اور جوابی لفافہ بھیج کر اپنے پاس جواب منگوالو۔

اسی طرح بعض اوقات ایک ہی سوال ایک امام سے پوچھ کر دوسرے امام سے بھی پوچھا جاتا ہے۔ پھر اگر دونوں جوابوں میں تفاوت ہو تو عوام دو اماموں یا دو عالموں کے درمیان آپس میں بدگمانی ...... یا ایک دوسرے کو نیچا کرنے کی سازش ...... یا آپس میں تقابل ...... وغیرہ پیدا کرنے میں کام یاب ہو جاتے ہیں جس سے دوسرے سادہ لوگوں کا بھی ذہن خراب ہو جاتا ہے۔

لہٰذا امام کو چاہیے کہ وہ اپنی مہارت اور استعداد کے ذریعے پہچانے کی کوشش کرے کہ کس قسم کا سوال ہے؟

اگر اصلاحی سوال ہے تو ضرور تشفی کرنی چاہیے۔ بعض سوالات کے جوابات مجمع میں دینا مناسب نہیں ہوتا تو تنہائی میں دے دیں۔

اسی طرح ہر سوال کا جواب فوراً دینا ضروری نہیں ہے، بل کہ سائل کے سوال سے ہٹ کر اس کو اصلاح کی غرض سے کچھ وعظ و نصیحت بھی کریں، اگر امام کو معلوم ہے کہ اس کا کاروبار حرام ہے یا اس کے عقائد خراب ہیں یا یہ فلاں فلاں گناہ میں مبتلا ہے وغیرہ وغیرہ تو پہلے حکمت و بصیرت اور نرمی و خیر خواہی کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش کریں اور بعد میں اس کے سوال کا جواب دیں۔

جیسے حضرت یوسف علیہ السلام سے جب دو قیدی ساتھیوں نے سوال کیا کہ:

﴿نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ۝٣٦﴾[1]

[1] سورۂ یوسف ۳۶

ترجمہ: "ہمیں آپ اس کی تعبیر بتائیے، ہمیں تو آپ خوبیوں والے شخص دکھائی دیتے ہیں۔"

تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو فوراً جواب نہیں دیا بلکہ پہلے ان کو دعوت و نصیحت کی اور بعد میں ان کو خواب کی تعبیر بتائی۔

اسی طرح اختلافی باتوں کا جواب بھی نہ دیا جائے کہ ایک ہی صف میں بیٹھنے والے مقتدی کئی صفوں میں نہ بٹ جائیں اور کہیں ہمارے جوابات سے مسلمانوں کا شیرازہ اتنا نہ بکھر جائے کہ ایک ہی محلہ میں رہنے والوں اور ایک ہی مسجد میں نماز پڑھنے والوں میں ایسے اختلافات ہو جائیں کہ وہ مسجد چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔

بسا اوقات مسجد میں نیا امام آتا ہے تو لوگ نئے نئے سوالات سے اس کو پریشان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان سے کہیں کہ جس کو ضرورت ہو وہ لکھ کر مجھے دے دیں میں دارالافتاء سے پوچھ کر جواب دے دوں گا، تو اس سے جن کو طلب نہیں ہے صرف مجلس گرم رکھنے کے لیے فضول سوالات کرنا مقصود تھے وہ خود بخود خاموش ہو جائیں گے۔

حضرت شریک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"سَأَلْتُ إِبْرَاهِيمَ بْنَ أَدْهَمَ عَمَّا كَانَ بَيْنَ عَلِيٍّ وَمُعَاوِيَةَ فَبَكَى، فَنَدِمْتُ عَلَى سُؤَالِي إِيَّاهُ فَرَفَعَ رَأْسَهُ فَقَالَ: إِنَّهُ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ اشْتَغَلَ بِنَفْسِهِ وَمَنْ عَرَفَ رَبَّهُ اشْتَغَلَ بِرَبِّهِ عَنْ غَيْرِهِ." [1]

"وَقَالَ الشَّافِعِيُّ: قِيلَ لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ مَا تَقُولُ فِي أَهْلِ صِفِّينَ؟ قَالَ: تِلْكَ دِمَاءٌ طَهَّرَ اللَّهُ يَدِي مِنْهَا فَلَا أُحِبُّ

[1] حلیۃ الاولیاء: ۸/۱۵ (ابراہیم بن ادہم)

أَنْ أُخَضِّبَ لِسَانِي فِيهَا." [2]

ترجمہ: "میں نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ تعالیٰ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بابت پوچھا، آپ رحمہ اللہ تعالیٰ رونے لگے اس سے مجھے اپنے سوال پر شرمندگی ہوئی پھر آپ رحمہ اللہ تعالیٰ نے سر اٹھایا اور فرمایا "جسے اپنے آپ کی پہچان حاصل ہوئی وہ اس میں لگ گیا اور جس نے اپنے رب کو پہچان لیا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اس کے ماسوا سے بے پروا ہوا۔"

اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا کہ اہل صفین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا! یہ ایسے لوگ تھے کہ ان کے خون سے اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ رنگین نہیں کیے، تو میں ان کے بارے میں نامناسب باتیں کہہ کر اپنی زبان کیوں رنگین کروں۔"

لہٰذا کسی کے بارے میں "کوئی بات کرنے" یا "فتویٰ دینے میں" بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"فتویٰ نویسی ایک مستقل فن ہے جس طرح مفتی کو بہت سی باتوں کی رعایت رکھنی پڑتی ہے، مثلاً: سب سے پہلے مفتی کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مستفتی کا سوال قابل جواب ہے یا نہیں اور بعض اوقات سوال کے انداز سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کا مقصد عمل کرنا یا علم میں اضافہ کرنا نہیں، بل کہ اپنے کسی مخالف کو زیر کرنا ہے یا حالات ایسے ہیں کہ اس سوال کے جواب سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے، ایسی صورت میں

[2] حلیۃ الاولیاء: ۹/۱۲۱ (امام شافعی)

استفتاء کے جواب سے گریز کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فرمایا: فتویٰ میں مسئلے کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہئیں، تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو وہ بآسانی حکم معلوم کرلے، اور جس شخص کو دلائل سے دل چسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھ لے۔ فتویٰ میں عام آدمی کے لیے تو صرف حکم ہوتا ہے اور دلائل اہل علم کے لیے ہوتے ہیں۔[1]

امام جصاص رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ فرماتے ہیں:

''مفتی اور عالم کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ سائل کے ہر سوال اور اس کی ہر شق کا جواب ضرور دے، بلکہ دینی مصالح پر نظر رکھ کر جواب دینا چاہیے، جو جواب سائل کے فہم سے بالاتر ہو، یا اس کے غلط فہمی میں پڑ جانے کا خطرہ ہو تو اس کا جواب نہیں دینا چاہیے۔''[2]

اسی طرح بے ضرورت اور لایعنی سوالات کا جواب بھی نہیں دینا چاہیے، البتہ جس شخص کو کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس کے متعلق اس کو کچھ عمل کرنا لازم ہے اور خود وہ عالم نہیں تو مفتی اور عالم کو اپنے علم کے مطابق اس کا جواب دینا ضروری ہے، ورنہ خاموش رہنا بہتر ہے۔

جیسا کہ عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے:

''وَالسُّكُوْتُ عَنْ جَوَابِ الْأَحْمَقِ سَعَادَةٌ''

تَرْجَمَۃ: ''احمقوں کے جواب میں خاموش رہنا سعادت ہے۔''

کہتے ہیں خاموشی، مخزن ہے حکمتوں کا ...... دب دبہ ہے حاکموں کا ...... شیوہ ہے عقل مندوں کا ...... جواب ہے جاہلوں کا ...... اور قلعہ ہے فتنوں سے بچنے کا۔

لہٰذا جاہل یا فتنہ باز لوگوں کے سوالات پر خاموشی اختیار کرلینی چاہیے۔

حضرت امام شافعی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ کو جس طرح اللہ تعالیٰ نے فقہ میں اونچا

[1] مجالس مفتی اعظم: ٦٢٥ [2] احکام القرآن: ٥/٣٤، باب السجود علی الوجہ

مقام و امامت عطا فرمایا تھا، اسی طرح وہ عربی زبان و ادب میں بھی نہایت ماہر تھے، انہیں ''شعری ملکہ'' قدرت کی طرف سے ملا ہوا تھا، چناں چہ حال ہی میں بحمد اللہ بیت العلم ٹرسٹ نے ان کے اشعار کا مجموعہ ''دیوان الامام الشافعی'' کے نام سے چھاپا ہے۔

اس مجموعے میں سے چند اشعار ہم یہاں نقل کرتے ہیں جو امام شافعی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ نے جاہل معترض کو جواب نہ دینے اور خاموش رہنے کے بارے میں کہے ہیں، یہ اشعار ہر امام کو یاد کرنے چاہئیں اور اپنی میز پر لگانے چاہئیں تاکہ ہر وقت نظر کے سامنے رہیں، چناں چہ فرماتے ہیں:

قَالُوْا سَكَتَّ وَقَدْ خُوْصِمْتَ قُلْتُ لَهُمْ
إِنَّ الْجَوَابَ لِبَابِ الشَّرِّ مِفْتَاحُ
وَالصَّمْتُ عَنْ جَاهِلٍ أَوْ أَحْمَقٍ شَرَفٌ
وَفِيْهِ أَيْضًا لِصَوْنِ الْعِرْضِ إِصْلَاحُ
أَمَا تَرَى الْأُسْدَ تُخْشٰى وَهِيَ صَامِتَةٌ
وَالْكَلْبُ يُخْسٰى لَعَمْرِيْ وَهُوَ نَبَّاحُ

تَرْجَمَۃ: ''دوستوں نے کہا: آپ معترضین کے جواب میں خاموش ہوگئے۔ ان کو جواب کیوں نہیں دیتے تو میں نے کہا بسا اوقات بے تکے سوالوں کا جواب دینا جھگڑوں کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ جاہل احمق کے جواب میں چپ رہنا شرافت ہے اور سکوت ہی عزت و صلاحیت کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ شیر چپ رہتا ہے تو بھی اس سے ڈرا جاتا ہے اور کتا بھونکتا ہے تو بھی اسے پتھر مارے جاتے ہیں۔''

تشریح: جاہل آدمی بوجہ اپنی جہالت و کم فہمی کے اور جھگڑالو آدمی بسبب اپنے عناد و سرکشی کے لاحاصل بحثیں...... طعن و تشنیع...... سب و شتم...... اور بہتان و افترا میں ہر وقت مشغول رہتا ہے، نرم گفتگو، جدالِ احسن اور افہام و تفہیم کی ساری کوششیں اس کی نادانی و ہٹ دھرمی کے سامنے بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ مکہ مکرمہ کے جاہل اور اہلِ کتاب کے ہٹ دھرم اور ان کے ساتھ کی گئی افہام و تفہیم کی جملہ کوششوں کی ناکامی اس کی بہترین مثال ہے۔ ایسے ہی مواقع کے لیے قرآن کریم نے ہدایت فرمائی ہے:

﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾[1]

شیخ سعدی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں ؎

ز جاہل گریزندہ چوں تیر باش　نا آمیختہ چوں شکر شیر باش

امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے مذکورہ اشعار میں ایسے ہی جاہل و ضدی آدمیوں سے نمٹنے کا اسلامی طریقہ سمجھاتے ہوئے فرمایا ہے کہ کبھی کبھی گفتگو کے بجائے خاموشی انسان کی عزت و ناموس کی بہترین محافظ اور بابِ شر کو بند کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور سکوت اختیار کرنے والے کا مقام بڑھ جاتی ہے۔ لوگ بکواس کرنے والے جاہل کو کتے کی طرح بھونکتے رہنے والے اور خاموش رہنے والے کو شیر کی طرح بولے بغیر اپنا رعب و وقار قائم کرنے والے کا مقام دیتے ہیں۔ آپ ﷺ کا سکوت و کلام کے مقامات کی تعیین کرنے والا ایک جامع ارشاد ہے:

"اَلْوَحْدَةُ خَيْرٌ مِّنْ جَلِيْسِ السُّوْءِ، وَالْجَلِيْسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِّنَ الْوَحْدَةِ، وَإِمْلَاءُ الْخَيْرِ خَيْرٌ مِّنَ السُّكُوْتِ، وَالسُّكُوْتُ خَيْرٌ مِّنْ إِمْلَاءِ الشَّرِّ."[2]

دوسری جگہ ارشادِ مبارک ہے:

[1] الاعراف ۱۹۹　[2] شعب الایمان، باب حفظ اللسان — ۹۹/۷، رقم: ۴۶۳۹

"مَقَامُ الرَّجُلِ بِالصَّمْتِ أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً."[1]

سورۂ بقرہ آیت ۱۵۰ ﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي﴾ کی تفسیر میں حکیم الامت حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی بیان فرماتے ہیں کہ:

"﴿لَا تَخْشَوْهُمْ﴾ میں مجادلہ و منازعت سے یکسو اور بے غم ہونے کی طرف اشارہ سے دلالت کر کے اس حکم کی غایت وضوح پر بھی دلالت فرما دی، جیسا کہ تقریر سے معلوم ہوا اور اس کے ضمن میں یہ تعلیم بھی ہوگئی کہ جب معترض کا عناد قرائن سے معلوم ہو جائے، پھر اس کا جواب دینا لاحاصل ہے، اگر کسی طالبِ حق کو اس اعتراض سے شبہ ہو جائے اس کی اصلاح ضرور کر دی جائے۔"[2]

اگر قرائن سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ مخاطب بغض اور حسد کر رہا ہے اور اس کو جتنی فصاحت و وضاحت کے ساتھ جواب دیا جائے یہ مانے گا ہی نہیں تو اس وقت بھی خاموشی اختیار کر لینی چاہیے اور مخاطب کو کہہ دینا چاہیے کہ آپ کسی اور اہلِ علم کی طرف رجوع فرمالیں تو شاید آپ کی تشفی ہو جائے۔

امام غزالی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اسی بات کو ارشاد فرماتے ہیں کہ

"مَنْ كَانَ سُؤَالُهُ وَ اِعْتِرَاضُهُ عَنْ حَسَدٍ وَبُغْضٍ فَكُلَّمَا تُجِيْبُهُ بِأَحْسَنِ الْجَوَابِ وَأَفْصَحِهِ وَأَوْضَحِهِ، لَا يَزِيْدُ ذٰلِكَ إِلَّا بُغْضًا وَعَدَاوَةً وَحَسَدًا، فَالطَّرِيْقُ أَلَّا تَشْتَغِلَ بِجَوَابِهِ، وَأَنْ تُعْرِضَ عَنْهُ وَتَتْرُكَهُ مَعَ مَرَضِهِ ﴿فَأَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلّٰى﴾ إِلٰى آخِرِ الْآيَةِ."[3]

قَالَ الْإِمَامُ النَّوَوِيُّ: اَلسَّائِلُ تَعَنُّتًا وَتَعْجِيْزًا لَا يَسْتَحِقُّ

[1] شعب الایمان، باب فی حفظ اللسان — ۹۷/۷، رقم: ۴۶۰۲؛ دیوان الامام الشافعی؛ [illegible] السکوت خیر من الاجابۃ: ۱۰۵، ۱۰۶
[2] بیان القرآن: [illegible] البقرۃ: ۱۵۰　[3] النجم: ۲۹؛ ایہا الولد: ۱۳۸

جَوَابًا.[1]

ترجمہ: ”جس کا سوال واعتراض حسد، بغض کی بنا پر ہو، تو اس کو بغض فصاحت ووضاحت اور احسن طریقے سے جواب دیا جائے، تو اس کے بغض وحسد اور دشمنی میں اضافہ ہی ہوگا۔ لہٰذا طریقہ یہ ہے کہ اس کو جواب نہ دیا جائے، بل کہ اس سے اعراض کیا جائے اور اس کو اسی کی بیماری (حسد) میں چھوڑ دیا جائے (جیسا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) ”اعراض کر دیجیے (اے پیغمبر) اس سے جس نے اعراض کیا۔“

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”جو سائل کسی کو محض خاموش کرنے اور عاجز کرنے کی غرض سے سوال کرے تو وہ جواب کا مستحق نہیں ہے۔“

اگر کسی جاہل اور بے وقوف مخاطب کو شرمندگی سے بچانے کے لیے موضوع بدل دیا جائے یا اکیلے میں اس کو سمجھا دیا جائے تو بحث مباحثے اور لڑائی جھگڑے سے بچا جا سکتا ہے۔

ملک ناصر الدین رحمہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف لکھ کر فروخت کیا کرتے اور اسی آمدنی پر بمشکل گزارہ کرتے تھے۔ شاہی خزانہ سے کبھی ایک پیسہ تک زندگی بھر نہ لیا۔ ایک مرتبہ ایک قرآن شریف نہایت اہتمام اور بڑی محنت سے لکھا۔ امراء وزراء نے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ آپ نے دکھایا۔ سب نے بہت تعریف کی۔ ایک ناسمجھ وبے وقوف اہلکار نے کہا کہ اس لفظ پر ”فتحہ“ یعنی ”زبر“ ہونا چاہیے۔

سلطان نے کہا ”نہیں، اسی طرح درست ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔ آپ نے قلم سرمہ سے اس پر نشان لگا دیا اور کہا کہ اس کو درست کر لوں گا۔ سب لوگ رخصت

[1] المجموع: ۳۹/۱

ہوگئے اور فقط ایک معتمد باقی رہ گیا۔ سلطان نے اس نشان کو مٹا دیا۔ معتمد نے کہا کہ اگر اس کو مٹانا ہی تھا اس وقت نشان لگانے کی کیا ضرورت تھی؟

سلطان نے فرمایا ”مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اہلکار غلط کہہ رہا ہے اور دوسرا قرآن شریف اگر میں اس کی غلطی کو ثابت بھی کر سکتا تھا لیکن میں نے اس کی بے وقوفی اور جہالت کا اندازہ لگا کر خاموشی اختیار کرنے میں طرفین کے لیے عافیت سمجھی، اور نشان لگا کر اس کے جہالت کے فتنہ کو دبانے کی کوشش کی، ورنہ وہ تو نہیں سمجھتا اور اپنے ساتھ کچھ مزید بے وقوفوں کو تیار کر کے رونق مجلس بن جاتا، طرفین کا مزید وقت بھی ضائع ہوتا، اور بے اطمینانی بڑھتی، جب کہ نشان لگانے میں میرا کوئی حرج نہ ہوا اور اس کی حوصلہ افزائی ہوئی اور وہ شرمندگی سے بچ گیا، اگر وہ مخلص تھا تو اس کی دل شکنی سے حفاظت ہوگئی، اور اگر وہ فتنہ باز تھا، تو اس کے مکر سے میری حفاظت ہوگی۔“[1]

ایک دن حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ حجاج بن یوسف الثقفی کے پاس آئے، حجاج نے پوچھا: ”آپ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: ”میں وہی بات کہتا ہوں جو مجھ سے بھی زیادہ بہتر شخص نے تجھ سے زیادہ برے آدمی کے سامنے کہی تھی، یعنی جب فرعون نے پوچھا:

﴿فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى﴾[2]

ترجمہ: ”اچھا تو پہلے لوگوں کا کیا حال ہوا؟“

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى﴾[3]“

[1] معدن اخلاق: اعمال الصالحین: ۳۰۶ [2] طٰہٰ: ۵۱ [3] ایضاً: ۵۲

ترجمہ: "ان لوگوں کا علم میرے پروردگار کے پاس دفتر (رجسٹر) میں ہے، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔"

حجاج بن یوسف نے کہا: "اے ابوسعید! آپ سید العلماء ہیں۔"[1]

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک خاص صفت بیان فرمائی کہ وہ جہالت کی بات کا ایسا جواب دیتے ہیں کہ جس سے شر ختم ہو جائے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب قبر میں اتار دیا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

"يَا أَبَا عُبَيْدَةَ، لَأُثْنِيَنَّ عَلَيْكَ وَلَا أَقُوْلُ بَاطِلًا أَخَافُ أَنْ يَلْحَقَنِيْ بِهَا مِنَ اللّٰهِ مَقْتٌ، كُنْتَ وَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُ مِنَ ﴿الذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ وَمِنَ ﴿الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَّإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا﴾، وَمِنَ ﴿الَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾، وَكُنْتَ وَاللّٰهِ مِنَ الْمُخْبِتِيْنَ الْمُتَوَاضِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَرْحَمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَالْمِسْكِيْنَ وَيَبْغَضُوْنَ الْخَائِنِيْنَ الْمُتَكَبِّرِيْنَ."[2]

ترجمہ: "اے ابوعبیدہ! میں تمہاری ضرور تعریف کروں گا (اور اس تعریف کرنے میں) کوئی غلط بات نہیں کہوں گا۔ کیوں کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا اندیشہ ہے۔ اللہ کی قسم! جہاں تک میں جانتا ہوں آپ ان لوگوں میں سے تھے جو "اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں" اور "جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جو جہالت کی بات کا ایسا جواب

[1] ہماری پریشانیاں اور ان کا حل: ۵۰

[2] المستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة: ۳۶۰/۳

دیتے ہیں جس سے شر ختم ہو جائے" اور جو "مال خرچ کرنے کے موقع پر خرچ کرنے میں نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ضرورت سے کم خرچ کرتے ہیں بل کہ ان کا خرچ اعتدال پر ہوتا ہے۔" اللہ کی قسم! آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنے والے اور تواضع کرنے والے ہیں جو یتیم اور مسکین پر رحم کرتے ہیں اور خائن اور متکبر قسم کے لوگوں سے بغض رکھتے ہیں۔"

● نیز بعض اوقات حکمۃً جواب دیتے وقت بات کا موضوع بدل دینا چاہیے۔ اور یہ سنت سے ثابت بھی ہے کہ کسی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ ﷺ سے سوال کیا:

"يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَتَى السَّاعَةُ؟" "قیامت کب آئے گی؟"

جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا "مَا أَعْدَدْتَ لَهَا؟" "تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی؟"

اس شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے اس کے لیے بہت ساری نمازیں، روزے اور صدقے تو نہیں تیار کیے، لیکن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا "فَأَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ" "تمہارا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ تم محبت رکھتے ہو۔"[1]

آپ ﷺ نے یہاں یہ پوچھے جانے پر کہ "قیامت کب آئے گی؟" اس سوال کے جواب میں (جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں) یہ جواب دینے کے بجائے اس شخص کو ان باتوں کی طرف متوجہ فرما دیا جس کا وہ زیادہ محتاج ہے کہ تم نے اس کے لیے تیاری کیا کی ہے؟

(شیخ عبد الفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب "الرَّسُوْلُ الْمُعَلِّمُ

[1] مسلم، البر والصلة، باب المرء مع من أحب: ۳۳۱/۲

(صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) وَأَسَالِیْبُہٗ فِی التَّعْلِیْمِ" میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اہلِ علم کو چاہیے کہ ضرور اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔

اسی طرح حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَامُ نے جب نمرود کو سمجھایا تو اس نے جاہلانہ اعتراض کیا اس پر حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَامُ نے اُس کی بات کا جواب دینے کے بجائے دوسری بات شروع فرمادی اور فرمایا:

﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾[1]

تَرجَمۂ: "میرا رب وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے وہ بولا میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں کہا ابراہیم نے بے شک وہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو لے آ اس کو مغرب سے تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ تعالیٰ سیدھی راہ نہیں دکھاتا ہے بے انصافوں کو۔"[2]

بسا اوقات لوگ ایسے فضول سوالات کرتے ہیں جن کا خارج میں کوئی وقوع نہیں، صرف "وَلَوْ فَرَضْنَا" کے درجہ میں ہوتے ہیں۔ ایسے سوالات کے جوابات بھی نہیں دینا چاہئیں۔

امام زہری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی زید بن ثابت رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے نقل فرماتے ہیں کہ جب ان سے کوئی سوال کیا جاتا تو فرماتے:

"ھَلْ "وَقَعَ"؟ فَإِنْ قَالُوْا: "لَمْ یَقَعْ"، لَمْ یُخْبِرْھُمْ وَإِنْ قَالُوْا: "قَدْ وَقَعَ" أَخْبَرَھُمْ."[3]

[1] البقرة: ۲۵۸ [2] معارف القرآن ۱/۶۱۸، البقرة: ۲۵۸
[3] اخلاق العلماء للآجری: ۷۶

"کیا یہ بات واقع ہو چکی ہے؟ اگر وہ کہتے: "نہیں (صرف ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں)" تو نہیں بتاتے تھے (کہ فضول سوالات جن کی تمہیں ضرورت نہ ہو وہ کیوں پوچھتے ہو)۔ ہاں اگر وہ بتاتے کہ واقعۃً ایسا ہو چکا ہے تو بتاتے۔"

ایسے فضول سوالات کرنے والوں کو حکمت سے سمجھا دیا جائے کہ ہمیں ان چیزوں میں پڑ کر اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

بے کار سوالات اور غیر ضروری باتوں کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ آہستہ آہستہ افراد اور جماعتوں کی قوتیں مضمحل اور سلب ہوتی چلی جاتی ہیں اور لوگ مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جن لوگوں میں عمل کی قوتیں بیدار رہتی ہیں وہ باتونی نہیں ہوا کرتے، بلکہ باعمل اور فعال ہوا کرتے ہیں۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے، جس کا مفہوم ہے کہ "پچھلے لوگ اس لیے تباہ ہوئے کہ انہوں نے پیغمبروں سے بے جا اور بے موقع سوالات کیے اور ان کے بتلائے ہوئے طریقے پر چل نہیں سکے۔"[1] اور پھر اس پر وقت ضائع ہوتا ہے لوگوں میں سمجھنے کی صلاحیت ہوتی نہیں اور علماء سے بحث و مباحثہ کرنا شروع کر دیتے ہیں جس سے سوائے دینی نقصان اور مزید پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ایک بزرگ کسی سے ملاقات کرنے کے لیے گئے، وہ نہ ملے تو پوچھا: "کہاں گئے ہیں؟" بعد میں یہ بزرگ آخر عمر تک اس بات پر روتے تھے کہ میں نے یہ فضول بات کیوں پوچھی کہ وہ کہاں گئے ہیں؟ یہ تھی ہمارے اکابر کی احتیاط۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا معمول تھا کہ بالکل، فضول سوالات اور بے فائدہ باتوں پر بہت سخت تنبیہ فرماتے تھے، یہاں پر حضرت رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے چند واقعات و ارشادات مقتدیوں کی اصلاح کی نیت سے نقل

[1] بخاری، کتاب الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول اللہ، رقم: ۷۲۸۸

کیے جاتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

آج کل ایسے فضول سوالات بہت کیے جاتے ہیں جن پر دین کا کوئی مقصد موقوف نہیں۔

مثلاً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ: ''فلاں کام بڑا گناہ ہے یا چھوٹا گناہ ہے۔''

میں جواب دیا کرتا ہوں کہ اگر چھوٹا گناہ ہوا تو کیا ارتکاب کا قصد ہے؟ اگر کہے: ''ہاں!'' تو میں کہتا ہوں کہ: ''کیا کبھی اپنے چھپر میں چنگاری لگانے کے متعلق بھی یہ سوال کیا ہے کہ یہ چنگاری چھوٹی ہے یا بڑا انگارہ ہے اور اگر یہ معلوم ہو کہ چھوٹی چنگاری ہے تو کیا اس کو چھپر میں لگانے کی جرأت کرو گے؟''

اگر کہو: ''نہیں کیوں کہ ذرا سی چنگاری بھی کبھی بڑھ جاتی ہے۔'' میں کہتا ہوں کہ: ''اسی پر چھوٹے گناہ کو قیاس کرلو جو شخص چھوٹے گناہ پر جرأت کرتا ہے وہ کل بڑے پر بھی جرأت کرے گا۔''

اسی طرح یہ سوال کیا جاتا ہے کہ: ''چند مُردوں کو ثواب بخشا جائے تو تقسیم ہوکر پہنچے گا یا بلا تقسیم کے سب کو برابر پہنچے گا؟ اگر تقسیم ہوکر پہنچتا ہے تو ایک جان کو بہت کم ملے گا۔''

میں کہتا ہوں کہ: ''تم اس فکر میں کیوں پڑے، اگر تقسیم ہوکر بھی ثواب پہنچا تو اللہ تعالیٰ کو بڑھانا بھی تو آتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ایک چھوارے کے صدقے کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ جبل اُحد سے بھی بڑھ جاتا ہے۔[1]'' اب بتلاؤ کہ پہاڑ میں کتنے ارب چھوارے ہوں گے اور اتنے ارب میں تقسیم جاری ہو تو کیا حرج ہے۔''

ارے میاں! اللہ تعالیٰ کے یہاں تو ذرا سا عمل بھی قبول ہو جائے تو بہت ہے۔

[1] صحیح مسلم، الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ ...... رقم: ۱۰۱۴

پھر تم کس فکر میں پڑے ہو؟

مگر اب علماء بھی ان مسائل کی تحقیق کے درپے ہو جاتے ہیں اور ہم نے بھی دو تین میں ایسی تحقیق کی ہے، مگر اب معلوم ہوا کہ یہ مشغلہ فضول تھا پس عوام کو یہ چاہیے کہ فضولیات کی تحقیق نہ کریں اور علماء کو چاہیے کہ ان فضولیات کا جواب نہ دیں۔

حضرت مولانا محمد نعیم صاحب لکھنوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک شخص نے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق سوال کیا۔ مولانا نے سائل سے پوچھا: ''یہ سوال کس کا ہے اور وہ اور تم کیا کام کرتے ہو؟''

کہا: ''سوال فلاں حافظ صاحب کا ہے اور وہ رنگریز ہیں اور میں درزی ہوں۔''

فرمایا: ''تم کپڑے سیتے رہو اور ان حافظ صاحب سے کہہ دو کہ کپڑے رنگتے رہیں۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جانیں اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جانیں۔ تم سے اُن کے معاملہ کا کیا تعلق؟ میں اطمینان دلاتا ہوں کہ قیامت کے دن اُن کا مقدمہ تمہارے اجلاس میں نہ آئے گا۔''

اسی طرح ایک شخص نے میرٹھ میں ایک عالم سے سوال کیا کہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین مؤمن تھے یا نہیں؟''

عالم نے کہا: ''آپ نماز پڑھتے ہیں یا نہیں؟'' کہا: ''ہاں! پڑھتا ہوں۔''

کہا: ''اچھا بتلاؤ نماز کے اندر کتنے فرض ہیں؟''

اب وہ خاموش ہیں فرمایا: ''جاؤ! تم کو نماز کے فرائض کی خبر نہیں جس کا سب سے اول قیامت میں حساب ہوگا اور زائد باتوں کی تحقیق کے درپے ہو۔''

ان فضولیات کی تحقیق میں نفس کا کید یہ ہے کہ فرائض و واجبات کی تحقیق میں تو عمل کرنا پڑتا ہے اور عمل دشوار ہے اور فضولیات کے سوال میں لوگ تو اس کو دین دار سمجھیں گے کہ ایسے ایسے باریک سوال کرتے ہیں اور کرنا کچھ پڑتا نہیں۔ اس لیے

عام طور سے لوگ فضول سوال کرکے دین دار مشہور ہونا چاہتے ہیں۔ غیر عوام تو جاہل ہیں، مگر بعض علماء کو کیا ہوگیا کہ وہ بھی ایسے سوالات کا جواب دیتے ہیں، میں ایسا روگ نہیں پالتا۔[1]

"ایک خط میں کاتب نے بعض لوگوں کی نسبت تعریضاً یہ لکھا کہ:

"جو لوگ حرام کھاتے ہیں ان کا حشر کیا ہوگا؟"

فرمایا: "مجھ کو فضول سوال سے گرانی ہوتی ہے انسان پہلے اپنی فکر کرے، کیوں کہ بعض لوگوں کی عادت ہے کہ ایسے مضمون سے نصیحت کرنا منظور نہیں ہوتا، بلکہ محض دوسرے کو چڑانا۔"

ایک شخص حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں آیا کہ فلاں شخص فلاں کام شرک کا کر رہا ہے اور اس پر بنظر تحقیر کہا تھا۔

حضرت نے فرمایا: "میاں بیٹھو بھی، جس وقت اپنی حقیقت کھلے گی تو سب بھول جاؤ گے اور اپنے کو کافر سے بھی بدتر سمجھو گے۔ دوسروں کے عیوب کی طرف نظر ہی نہ ہوگی۔"

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر فرمایا:

"ایک شخص نے کہا: یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے؟"

میں نے کہا: "ہاں اس شخص کو جائز ہے، جس کو یقین ہو جائے کہ میں اس سے بہتر ہو کر مروں گا۔"

اس نے کہا: "یہ مرنے سے پہلے کیسے ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا: "بس مرنے کے بعد جائز ہوگا۔"

ایک اور موقع پر فرمایا: "شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے کسی نے دریافت کیا کہ ہندوستان میں جمعہ کی نماز پڑھنا کیسا ہے؟"

[1] فضائل صبر و شکر: ۳۲۸ تا ۳۲۹

فرمایا: "جیسے جمعرات کی نماز پڑھنا۔" کسی اور نے یہ پوچھا: "فاحشہ عورت کا جنازہ پڑھنا کیسا جائز ہے؟" فرمایا: "اس کے آشناؤں کے جنازے کیسے جائز سمجھتے ہیں؟"

ایک عامی نے حضرت سے پوچھا: "ضاد (ض) کیسے پڑھا جائے؟"

آپ نے فرمایا: "جیسے قرآن میں لکھا ہے۔"

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس تشریف لے گئے۔ حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سے فرمایا: "ایک شخص بہشتی زیور کے ایک مسئلہ پر بہت اعتراض کرتا ہے۔" حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اس کو میرے پاس بھیجو۔" جب وہ سامنے آیا تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تمہیں "نفس مسئلہ" سمجھ نہیں آیا یا اس کی علت؟" اب وہ عامی شخص تھا اس بات کو سمجھ ہی نہ سکا اور چپ چاپ واپس آگیا۔

ایک شخص نے کہا: "حضرت! لوگ آپ پر اعتراض کرتے ہیں، اس لیے ایک جلسہ منعقد کیا جائے جس میں اعتراضات کے جوابات دیے جائیں۔" اس پر آپ نے فرمایا: "لوگ تو اللہ تعالیٰ واحد لا شریک پر بھی اعتراض کرتے ہیں، پہلے اس پر جلسہ قائم ہو، اس کے بعد حضور ﷺ پر بھی، کیوں کہ ان پر اعتراض کیے جاتے ہیں اس کے بعد قرآن پاک پر، کیوں کہ اس پر بھی اعتراض کیے جاتے ہیں، اسی طرح تمام عظیم ہستیوں پر جلسے کرا کر اعتراضات کے جوابات دیے جائیں پھر جب میرا نمبر آئے گا تو میں جلسہ کراؤں گا اور جوابات دوں گا۔"

ایک شخص نے کہا: "نمازیں پانچ کیوں فرض کی گئیں؟" حضرت نے جواب دیا: "تمہاری ناک کمر پر کیوں نہ لگائی؟" اس نے کہا: "بری لگتی" تو حضرت نے فرمایا: "سب کی ہوتی تو بری کیسی لگتی۔"

ایک شخص نے پوچھا: "دیہات میں جمعہ کیوں نہیں ہوتا؟"

حضرت رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے فرمایا: ''بمبئی میں حج کیوں نہیں ہوتا؟''

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کو اللہ تعالیٰ نے حکمت کا خزانہ عطا فرمایا تھا۔

حضرت رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے عوام کی اصلاح کی خاطر بہت سی اصلاحی تصانیف لکھیں جو انتہائی اہم ہیں حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم ارشاد فرماتے ہیں:

''علماء کو چاہیے کہ وہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے مواعظ کو معمولاتِ یومیہ میں جگہ دیں اور اس سے روزانہ کچھ صفحات مطالعہ کریں، اس سے بہت فائدہ ہوگا۔'' اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے مطالعہ سے نہ صرف دینی طور پر بلکہ دنیاوی طور پر بھی ذہن وسیع ہوتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ جن سوالات پر دنیا و آخرت کا کوئی عملی فائدہ مرتب نہ ہو ان کی ہمت شکنی کی جائے۔ حضرت مفتی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ایسے سوالات کے جواب میں فتویٰ لکھنے کے بجائے نصیحت فرماتے تھے جس سے عمل کا دھیان اور آخرت کی فکر پیدا ہو۔

مثلاً ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا: ''یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟''

آپ نے جواب دیا: ''یزید سے پہلے اپنی مغفرت کی فکر کرنا چاہیے۔''

ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے مسئلہ معلوم کیا اور حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سر نیچا کیے خاموش بیٹھے رہے۔ سائل نے دوبارہ معلوم کیا اور کہا: ''آپ نے میرا سوال نہیں سنا؟''

حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا: ''ہاں سنا، تم لوگ گویا سمجھتے ہو کہ جو باتیں ہم سے معلوم کرتے ہو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہم سے سوال نہیں کرے گا، اتنا موقع تو دو کہ ہم تمہارے مسئلہ میں غور کرلیں، اگر ہمارے نزدیک جواب ہوگا تو بتادیں گے ورنہ تم سے کہہ دیں گے کہ ہم کو اس کا علم نہیں ہے۔''[1]

---

[1] خیر القرون کی درسگاہیں: ۲۰۱

حضرت مسلم بن عقبہ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا بیان ہے کہ میں چونتیس سال تک حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کی مجلس میں بیٹھا ہوں، ابسا اوقات لوگ ان سے مسائل دریافت کرتے تو وہ جواب میں ''لَا اَدْرِیْ'' کہتے اور میری طرف متوجہ ہو کر فرماتے: ''یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ یہی چاہتے ہیں کہ ہماری پشت کو جہنم کا پل بنائیں۔'' اور ان لوگوں سے کہتے: ''تم لوگ ہماری پشت کو جہنم کا پل بنا کر کہنا چاہتے ہو کہ ابن عمر نے یہ فتویٰ دیا ہے۔''[1]

اسی طرح بعض اوقات امام مسجد کو ایسے لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑ جاتا ہے جو یا تو جاہل ہوتے ہیں، یا ہوتے تو وہ عالم ہیں، لیکن جاہلانہ کام کرتے ہیں...... یا مقابلہ میں آکر جاہلانہ باتیں کرتے ہیں کوئی ایسی بحث شروع کردیں گے جس کے ذریعے امام کو تنگ کرنا مقصود ہوتا ہے...... یا امام کے ذریعے اپنے دوسرے ساتھیوں کو ذلیل کروانا مقصود ہوتا ہے...... یا آپس کے نمازیوں میں تفرق پیدا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔

اس وقت امام کو چاہیے کہ اس صفت سے متصف ہو جائے جو صفت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رحمٰن کے بندوں کی بیان فرمائی ہے کہ:

﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾[2]

ترجَمۂ: ''اور جب بے علم لوگ ان سے باتیں کرنے لگتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ سلام ہے۔''

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''یعنی کم عقل اور بے ادب لوگوں کی بات کا جواب عفو و صفح سے دیتے ہیں جب کوئی جہالت کی گفتگو کرے تو ملائم بات اور صاحب سلامت کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ ایسوں سے منہ نہیں لگتے۔ نہ ان میں شامل ہوں نہ ان سے لڑیں۔''[3]

---

[1] خیر القرون کی درسگاہیں: ۲۰۱، ۲۰۲
[2] الفرقان: ۶۳
[3] تفسیر عثمانی: ۴۸۷ حاشیہ: ۹

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔
یعنی جب جہالت والے ان سے خطاب کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام۔ یہاں جاہلوں کا ترجمہ جہالت والوں سے کر کے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ مراد اس سے بے علم آدمی نہیں بل کہ وہ (شخص) جہالت کے کام یا جاہلانہ باتیں کرے خواہ واقع میں وہ ذی علم بھی ہو۔ اور لفظ سلام سے مراد یہاں عرفی سلام نہیں بل کہ سلامتی کی بات ہے۔[1]

امام قرطبی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ نے نحاس سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ سلام "تسلیم" سے مشتق نہیں بل کہ "تسلم" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "سلامت رہنا" [illegible] مراد یہ ہے کہ جاہلوں کے جواب میں وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں جس سے دوسروں کو ایذا نہ پہنچے اور یہ گناہ گار نہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ بے وقوف جاہلانہ باتیں کرنے والوں سے یہ حضرات انتقامی معاملہ نہیں کرتے بل کہ ان سے درگزر کرتے ہیں۔[2]

لہٰذا ہماری جماعت (ائمہ کرام) کو چاہیے کہ ایسے جاہل لوگوں کی باتوں کا جواب نہ دیں...... ان سے منہ نہ لگیں...... اگرچہ وہ ذی علم ہی کہلاتے ہوں...... کیوں کہ بسا اوقات شیطان ان ہی کی زبان سے ایسی باتیں کہلواتا ہے جس سے امام صاحب کو غصہ آئے، اور وہ تردید میں کچھ جواب دیں...... پھر محلے میں یہ مشہور ہو جائے امام صاحب نے یوں کہا...... یوں کہا...... پھر دونوں اہل علم لڑتے رہیں اور محلے کے بے دین عوام خوش ہوتے رہیں...... اور شیطان کی خوشی کا تو کیا ہی کہنا......

لہٰذا ایسے اوقات میں بہت ہی حکمت سے کام لیتے ہوئے اور اللہ جَلَّ جَلَالُهُ سے خوب مدد مانگتے ہوئے شیطان اور اس کے حواریین کے جال سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرے۔

یا تو اس مجلس سے چلا جائے...... یا کہہ دے کہ کسی دارالافتاء سے اس مسئلہ میں

[1] معارف القرآن: ۶/۵۰۳، الفرقان: ۶۳ [2] تفسیر قرطبی: ۷/۵۵، الفرقان: ۶۳

رجوع فرمائیں...... یا صاف کہہ دے یہ مسئلہ منبر و محراب پر بیان کرنے کا نہیں ہے جس کو جس قدر ضرورت ہو وہ کتابوں سے رجوع کرلے...... یا کوئی صاحب بے جا ضد کر رہے ہیں تو صبر و ضبط کرتے ہوئے ان کو سمجھائیں، یا کہہ دے کہ اس مسئلہ کے متعلق بعد میں بات کرلیں گے۔

مقتدیوں کو دعائیں سکھانا

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: "میں تمہیں پانچ ہزار بکریاں دے دوں یا ایسے پانچ کلمات سکھا دوں جن سے تمہارا دین اور دنیا دونوں ٹھیک ہو جائیں۔" میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! پانچ ہزار بکریاں تو بہت زیادہ ہیں، لیکن آپ مجھے وہ کلمات ہی سکھا دیں۔"

حضور ﷺ نے فرمایا یہ کہو:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ وَوَسِّعْ لِيْ خُلُقِيْ وَطَيِّبْ لِيْ كَسْبِيْ وَقَنِّعْنِيْ بِمَا رَزَقْتَنِيْ وَلَا تُذْهِبْ قَلْبِيْ إِلٰى شَيْءٍ صَرَفْتَهُ عَنِّيْ"[1]

ترجمہ: "اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما اور میرے اخلاق وسیع فرما اور میری کمائی کو پاک فرما اور جو روزی تو مجھے عطا فرمائے اس پر مجھے قناعت نصیب فرما اور جو چیز تو مجھ سے ہٹا لے اس کی طلب مجھ میں باقی نہ رہنے دے۔"

ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے ہر وقت اور ہر جگہ مانگتے رہنا چاہیے خصوصاً ائمہ کرام اور علماء عظام کو خود بھی اس پر عمل کرنا چاہیے اور اپنے اہل و عیال اور مقتدیوں کو اس کی تاکید کرنی چاہیے۔

[1] کنز العمال، الاول، کتاب الاذکار: ۲/۲۸۹، رقم: ۵۰۵۸

ذیل میں ہم صبح وشام کی دعاؤں میں سے کچھ دعائیں لکھ دیتے ہیں ائمہ کرام کو چاہیے کہ یہ دعائیں عوام الناس کو سکھلائیں اور ان کے فضائل بیان کریں۔

صبح کے وقت یہ دعا مانگیں:

"اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ وَفَتْحَهٗ وَنَصْرَهٗ وَنُوْرَهٗ وَبَرَكَتَهٗ وَهُدَاهُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِيْهِ وَشَرِّ مَا بَعْدَهٗ."[1]

ترجمہ: "ہم نے اور سارے ملک نے اللہ رب العالمین کے لیے صبح کی، اے اللہ! میں آپ سے آج کے دن کی بہتری (اور بھلائی) اور آج کے دن کی فتح اور مدد اور اس دن کے نور و برکت اور ہدایت کا سوال کرتا ہوں، اور ان چیزوں کے شر سے جو اس میں ہیں اور اس کے بعد ہوں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔"

شام کے وقت یہ دعا اس طرح مانگیں:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَفَتْحَهَا وَنَصْرَهَا وَنُوْرَهَا وَبَرَكَتَهَا وَهُدَاهَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَشَرِّ مَا بَعْدَهَا."

ترجمہ: "اے اللہ بے شک میں آپ سے سوال کرتا ہوں اس رات کی اچھائی اور فتح اور نصرت اور نور اور برکت اور ہدایت کا۔ اور آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس رات اور اس کے بعد آنے والے وقت کے شر سے۔"

شام کے وقت یہ دعا مانگیں:

"اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ

[1] ابو داؤد، کتاب الادب، باب ما یقول اذا اصبح: ۲/۳۳۷

شَيْءٍ قَدِيْرٌ. رَبِّ اَسْئَلُكَ خَيْرَ مَا فِيْ هٰذَا الْيَوْمِ وَخَيْرَ مَا بَعْدَهٗ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِيْ هٰذَا الْيَوْمِ وَشَرِّ مَا بَعْدَهٗ، رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَسُوْءِ الْكِبَرِ، رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابٍ فِي النَّارِ وَعَذَابٍ فِي الْقَبْرِ."[1]

ترجمہ: "صبح کی ہم نے اور ملک نے اس حالت میں کہ ساری بادشاہت صرف اسی کی تھی اور سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، بس وہی ہے (اپنی ذات وصفات میں) یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ساری بادشاہت اسی کی ہے اور سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں، اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔

اے میرے رب! جو کچھ اس دن میں (پیش آنے والا ہے) اور جو کچھ اس کے بعد (پیش) آئے گا، میں تجھ سے اس کی بھلائی اور بہتری مانگتا ہوں اور جو کچھ اس دن میں اور اس کے بعد (پیش آنے والا) ہے، میں اس کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

اے میرے رب! میں آپ کی پناہ لیتا ہوں کاہلی سے اور سخت بڑھاپے سے۔ اے میرے رب! میں عذاب جہنم سے اور عذاب قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

صبح وشام تین تین مرتبہ یہ دعا پڑھیں:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ، اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ."[2]

ترجمہ: "اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں کفر سے اور محتاجی سے۔

[1] ابو داؤد، کتاب الادب، باب ما یقول اذا اصبح: ۲/۳۳۵
[2] ابو داؤد، کتاب الادب، باب ما یقول اذا اصبح: ۲/۳۳۸

اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں عذاب قبر سے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ جُهْدِ الْبَلَاءِ وَدَرَكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ." تین مرتبہ[1]

ترجمہ: "اللہ کی پناہ مانگو آزمائش کی سختی اور بدبختی کی گرفت سے اور اس بات سے کہ مقدرات کے فیصلوں سے میرے دل میں تنگی پیدا ہو اور دشمنوں کے ہنسی اڑانے سے۔"

برے علم سے پناہ مانگنے کی دعا:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَلِمْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ أَعْلَمْ."[2]

ترجمہ: "اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں ان چیزوں کی برائی سے جن کو میں جانتا ہوں، اور ان کی برائی سے جن کو میں نہیں جانتا۔"

برے عمل سے پناہ مانگنے کی دعا:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ أَعْمَلْ."[3]

ترجمہ: "اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں اس عمل کے برے نتیجہ سے جو میں نے کیا ہے اور اس سے بھی جو میں نے نہیں کیا۔"

برے دوست اور برے پڑوسی سے پناہ مانگنے کی دعا:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ يَوْمِ السُّوْءِ وَمِنْ لَيْلَةِ السُّوْءِ وَمِنْ

[1] بخاری، کتاب القدر، باب من تعوذ باللہ من درك الشقاء: ۹۷۹/۲

[2] مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۲۳ [3] مسند احمد ۱۳۹/۶، رقم: ۲۴۵۶۱

سَاعَةِ السُّوْءِ وَمِنْ صَاحِبِ السُّوْءِ وَمِنْ جَارِ السُّوْءِ فِيْ دَارِ الْمُقَامَةِ."[1]

ترجمہ: "اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں برے دن سے بری رات سے اور ہر بری گھڑی سے اور برے ساتھی سے اور اپنی سکونت کے گھر کے برے پڑوسی سے۔"

لہٰذا ائمہ کرام کو چاہیے کہ ہفتے میں ایک دن مقتدیوں کو دعائیں سکھائیں، ان کا شوق دلائیں اور ان کے فضائل بتائیں تاکہ عوام میں دعائیں سیکھنے کا جذبہ پیدا ہو جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کلمات کو سیکھنے کا شوق ہوا اور پانچ ہزار بکریوں پر ان کلمات کو ترجیح دی۔

امام کا اپنے نائب کو لوگوں کے سکھانے کے لیے چھوڑ کر جانا

حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے حنین تشریف لے گئے تو اپنے پیچھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ والوں پر امیر بنا کر چھوڑ گئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ مکہ میں لوگوں کو قرآن سکھائیں اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کریں۔ پھر جب وہاں سے مدینہ واپس جانے لگے تو دوبارہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ والوں پر مقرر فرمایا۔[2]

لہٰذا امام صاحب کو چاہیے کہ جب وہ اپنا نائب مقرر کر کے سفر پر جا رہا ہو تو ان کو سمجھائے کہ آپ نے صرف نمازیں نہیں پڑھانی بلکہ جو ذمہ داری میری ہے مثلاً عشاء کے بعد درس قرآن دینا، عصر کے بعد حدیث کا درس دینا اور فجر کے بعد لوگوں

[1] مجمع الزوائد، کتاب الفتن، باب الاستعاذة من يوم السوء، رقم: ۱۱۹۶۱

[2] مستدرک للحاکم، مناقب احد الفقهاء الستة من الصحابة: ۳۶۸/۳، رقم: ۵۲۴۷

کو دعائیں سکھانا اور ان کی نمازیں درست کرنا یہ ساری چیزیں آپ کی ذمہ داری میں شامل ہیں۔

مقتدیوں کے وضو کو درست کرنے کی فکر کرنا

امام چوں کہ حضور اکرم ﷺ کا نائب ہے، اس لیے جس طرح حضور اکرم ﷺ امت کی تربیت کی فکر فرماتے تھے اسی طرح نائب کو چاہیے کہ امت کی تربیت کی فکر کرے۔ ابوداؤد شریف میں روایت ہے:

"أَنَّ رَجُلاً جَاءَ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ تَوَضَّأَ وَتَرَكَ عَلَى قَدَمِهِ مِثْلَ مَوْضِعِ الظُّفْرِ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِرْجِعْ فَأَحْسِنْ وُضُوْءَكَ."[1]

ترجمہ: ایک آدمی نے وضو کیا اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے (دوران وضو) اپنے پیر میں ایک ناخن کی مقدار جگہ خشک چھوڑ دی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: "واپس جاؤ اور اچھی طرح وضو کرو۔"

امام مسجد بھی لوگوں کے وضو اور نماز کی فکر کرے تاکہ ان کی نمازیں غارت (یعنی خراب) نہ ہو جائیں۔

مقتدیوں کو مسجد کی جماعت کی اہمیت بتلانا

جب ہم سفر پر ہوں یا اپنی مسجد کے علاوہ کہیں اور نماز پڑھ رہے ہوں تو اس وقت ہمارا امتحان ہوگا کہ جس طرح ہم اپنی مسجد میں محض اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اذان ہوتے ہی نماز کا اہتمام شروع کر دیتے تھے اب بھی کر رہے ہیں یا نہیں؟ بسا اوقات سفر میں یا ضیافتوں میں ہمیں سستی ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے ہماری

[1] أبو داؤد، كتاب الطهارة، باب تفريق الوضوء: ۱/۲۳

جماعت رہ جاتی ہے اور مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے ثواب سے محروم ہو جاتے ہیں۔

بندہ نے دیکھا ہمارے شیخ مولانا سعید احمد خان مہاجر مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ مسجد کی جماعت کا خوب اہتمام فرماتے تھے سعودی عرب میں ظہر تا عصر وقفہ بہت کم ہوتا ہے، قیلولہ بھی پورا نہیں ہو پاتا، ہمارے احناف کے ہاں تاخیر عصر کی نہ صرف گنجائش ہے بل کہ استحباب ومسنون کا درجہ ہے۔[1]

اس کے باوجود عصر کی نماز وہاں کی مساجد میں جماعت کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔ مسجد کی جماعت کے اہتمام میں جو نور ہے اس کا ایک خاص درجہ ہے۔

حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں.....

جماعت کے اہتمام کے بغیر نماز کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں جگہ جگہ اقامتِ صلوٰۃ کا حکم ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ صرف نماز پڑھنے کو نہیں کہتے، بل کہ نماز کو ہر جہت اور حیثیت سے درست کرنے کا نام اقامت ہے۔ جس میں نماز کے تمام فرائض، واجبات، مستحبات اور پھر ان پر دوام والتزام یہ سب اقامت کے مفہوم میں داخل ہیں۔[2]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: صحابہ وتابعین اور فقہائے امت رحمہم اللہ تعالیٰ کی ایک جماعت نماز کی جماعت کو واجب کہتی ہے اور اس کے چھوڑنے کو سخت گناہ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم تو اس نماز ہی کو جائز قرار نہیں دیتے جو بلا عذر شرعی بدون جماعت پڑھی جائے۔[3]

بسا اوقات ائمہ حضرات ضیافت یا کسی تقریب وغیرہ میں شرکت کرتے ہیں، اور جب نماز کا وقت ہو جاتا ہے، تو لوگوں کا اصرار ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ مولوی

[1] شامی، كتاب الصلوة، مطلب في طلوع الشمس من مغربها: ۱/۳۶۶
[2] معارف القرآن: ۱/۱۱۰ [3] معارف القرآن: ۱/۲۱۶

صاحب موجود ہے، لہٰذا اسی جگہ پر جماعت سے نماز پڑھ لیتے ہیں خصوصاً رمضان المبارک میں مغرب کی نماز میں حالاں کہ وہاں مسجد نزدیک ہوتی ہے۔

لہٰذا ائمہ کرام نہایت ہی ادب اور حکمت سے سمجھائیں کہ مسجد کی جماعت کی نماز نہیں چھوڑنی چاہیے۔

اور جمعہ کے وعظ میں ان کو وہ احادیث مبارکہ جن میں تارکین جماعت کے لیے وعیدیں آئی ہیں، سنائی جائیں تاکہ وہ جماعت سے نماز پڑھنے کا اہتمام کرنے والے بن جائیں، ذیل میں ہم طوالت کے خوف سے ان ہی احادیث میں سے بعض کا صرف ترجمہ لکھ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

احادیث مبارکہ میں ترکِ جماعت پر سخت وعیدیں آئی ہوئی ہیں۔

❶ ایک حدیث میں ارشاد ہے "(قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے) میرا ارادہ ہوتا ہے کہ لکڑی جمع کرنے کا حکم دوں پھر اذان دلواؤں اور کسی کو نماز پڑھانے کا حکم دوں اور میں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں اور ان کو کوئی عذر بھی نہیں ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔"[1]

❷ ایک حدیث میں ارشاد ہے اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں نماز قائم کرتا اور اپنے نوجوانوں کو حکم دیتا کہ گھروں کو آگ لگا دیں۔[2]

❸ ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ منافقین پر عشاء اور فجر سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں اگر ان دونوں نمازوں کا (باجماعت پڑھنے کا) ثواب ان کو معلوم ہو جائے تو یہ سرین کے بل گھسیٹ کر (مسجد) آئیں۔[3]

---

[1] بخاري، الأذان، باب وجوب صلوٰة الجماعة: ۸۹/۱

[2] مسند احمد: ۳۶۷/۲، ابوهريرة رضي الله تعالى عنه

[3] بخاري، الأذان، باب فضل صلوٰة العشاء في الجماعة: ۹۰/۱

❹ ایک حدیث میں ارشاد ہے: جس نے اذان سنی اور باوجود عذر نہ ہونے کے جماعت میں شریک نہیں ہوا تو اس کی وہ نماز جو اس نے پڑھی قبول نہیں۔ پوچھا گیا: "عذر کیا ہے؟" ارشاد فرمایا: "خوف اور مرض (ایسا خوف اور مرض مراد ہے جو مسجد آنے سے مانع ہو)۔"[4]

❺ ایک نابینا صحابی نے دربارِ رسالت میں عرض کیا: "مجھے کوئی مسجد لے جانے والا نہیں ہے تو کیا مجھے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے؟" حضرت محمد ﷺ نے اجازت دے دی۔ جب وہ نابینا جانے لگے تو بلا کر آپ ﷺ نے پوچھا: "اذان سنتے ہو؟" انہوں نے عرض کیا: "جی ہاں۔" فرمایا: "تو (پھر) حاضر ہونا ضروری ہے۔"[5]

❻ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: جو آدمی کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے مسلمان بن کر ملنا پسند کرتا ہو تو اس کو چاہیے کہ اذان کے وقت نمازوں کی پابندی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے لیے ہدایت کے وہ طریقے مقرر فرمائے ہیں جو سراسر ہدایت ہیں اور یہ نمازیں بھی ان ہی ہدایت کے طریقوں میں سے ہیں۔ اگر تم بھی اس پیچھے رہنے والے (فلاں شخص) کی طرح گھر میں نماز پڑھو گے تو اپنے نبی کا طریقہ چھوڑ بیٹھو گے اور یاد رکھو اگر اپنے نبی کا طریقہ چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ جو آدمی اچھی طرح وضو کر کے مسجد کی طرف چلتا ہے تو اس کو ہر قدم پر ایک نیکی ملتی ہے اس کا ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک گناہ مٹایا جاتا ہے ہمارے زمانہ میں کوئی کھلم کھلا منافق ہی جماعت سے پیچھے رہ سکتا تھا۔ ورنہ مریض آدمی کو بھی دو آدمیوں کے سہارے لا کر صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔[6]

---

[4] ابو داود، الصلوة، باب التشديد في ترك الجماعة، رقم: ۵۵۱

[5] مسلم، المساجد، باب فضل صلوٰة الجماعة والتشديد في التخلف: ۲۳۲/۱

[6] مسلم، المساجد، باب فضل صلوٰة الجماعة والتشديد في التخلف: ۲۳۲/۱

ان صحیح احادیث کو بار بار پڑھیں اور امت کا حال دیکھیں۔ اپنے اور دوسروں کے احوال کی اصلاح کی فکر کریں۔ دوسری طرف مسجد میں آنے کا ثواب دیکھیں کہ جماعت کی نماز پر اکیلے کی نماز سے ستائیس ۲۷ گنا زیادہ ثواب ہے[1]۔ جس نے عشاء کی نماز جماعت سے پڑھی گویا اس نے آدھی رات کا قیام کیا اور صبح کی بھی جماعت سے پڑھ لی تو گویا اس نے پوری رات قیام کیا[2]۔

اب ہم میں سے ہر ایک اپنی مسجد کا حال دیکھ لے، کہ جمعہ کے دن کتنے نمازی ہوتے ہیں اور عام دنوں میں کتنے؟ اور جس طرح جمعہ کی نماز میں مسجد بھر جاتی ہے اسی طرح فجر کی نماز میں مسجد مصلیوں سے بھر جائے، اس کے لیے ہم میں سے ہر ایک سوچے کہ میں نے کتنی کوشش کی ہے۔

یہ تو مردوں کا حال ہے...... لیکن غور کریں کہ ہمارے محلہ میں یعنی جس محلہ میں بندہ امام ہے اس محلہ میں گھروں میں عورتیں نماز پڑھ رہی ہیں یا نہیں؟

اور جو پڑھ رہی ہیں تو فرائض واجبات کا کتنا اہتمام ہے؟

تجوید کی تصحیح کا کتنا اہتمام ہے؟

قومہ اور جلسہ کی تصحیح کا کتنا اہتمام ہے؟ مسجد میں آنے والے جو ان کے محارم ہیں، ان کے ذریعے امام مسجد ہوتے ہوئے میں نے کتنی کوشش کی ہے، کہ میرے محلہ میں جتنے گھر ہیں ان میں بالغ افراد مسجد میں آئیں اور عورتیں وقت پر اہتمام سے گھروں میں نماز پڑھیں؟

اگر ذرا ہمت کرلیں تو وعید سے بچ جائیں اور بہت بڑے ثواب سے مالا مال ہوجائیں۔ "اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِیْ وَجَمِیْعَ الْاَئِمَّةِ لِهٰذَا"

---

[1] بخاری، الاذان، باب فضل صلوۃ الفجر فی جماعۃ: ۱/۹۰

[2] مسلم، المساجد، باب فضل صلوۃ الجماعۃ والتشدید فی التخلف: ۱/۲۳۲

حضرت عمر رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ کا خط

صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُم کے یہاں نماز کا کیسا اہتمام تھا اس کا کچھ اندازہ حضرت عمر رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ کے اس خط سے ہوتا ہے۔ آپ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ نے اپنے گورنروں کے نام خطوط لکھوائے اور ان میں لکھوایا۔

"تمہارا سب سے اہم کام میرے نزدیک نماز ہے۔ جس نے نماز کی حفاظت کی اور اس پر پابندی کی اس نے اپنے دین کی حفاظت کی اور جس نے ان کو ضائع کیا وہ دین کے دوسرے احکام کو اس سے زیادہ ضائع کرے گا۔"[1]

اب سوچئے نماز کو ضائع کر کے دین کی حفاظت کیسے ہوگی۔

اب جس مسجد میں آپ امام ہیں اس محلہ میں دین کتنا محفوظ ہے نمازیوں کے ذریعے سے سوچ لیجیے......؟

حضرت عمر رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ کا یہ خط اپنی میز پر لکھ کر لگا لیجیے، اور اس کے لیے محنت بھی خوب کیجیے اور رات کو تہجد میں اٹھ کر دعا بھی رو رو کر مانگئے کہ اے اللہ! میرے محلہ میں کوئی بے نمازی نہ رہے، ہر نمازی کو اتنا سمجھائیں کہ وہ دوسروں کو نمازی بنانا سیکھ لے۔ اور یقین رکھیے کہ آپ کے محلہ کا ہر رہنے والا شخص نمازی بن گیا۔

مقتدیوں کو نماز سکھانا

حضرت زید بن وہب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت حذیفہ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے لیکن رکوع سجدہ پورا نہیں کر رہا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو حضرت حذیفہ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ نے اس سے پوچھا: "کتنے عرصے سے تم ایسی نماز پڑھ رہے ہو؟" اس نے کہا: "چالیس سال سے۔" حضرت حذیفہ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ نے فرمایا:

---

[1] موطا للامام مالک، وقوت الصلوۃ، باب وقت الصلوۃ ۶

"تم نے چالیس سال سے ٹھیک نماز نہیں پڑھی اور اگر تم ایسی نماز پڑھتے ہوئے مر گئے تو تم اس حالت پر نہیں مروگے جس پر حضرت محمد ﷺ پیدا کیے گئے تھے۔" پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے نماز سکھانے لگے۔ پھر فرمایا: "آدمی کو چاہیے کہ چاہے وہ نماز میں قیام مختصر کرے لیکن رکوع سجدہ پورا کرے۔"[1]

حضرت ابو مالک اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی مسلمان ہوتا تو حضور ﷺ اسے سب سے پہلے نماز سکھاتے۔[2]

حضرت حکیم بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ ہمیں نماز سکھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے لگو تو پہلے "اللہ اکبر" کہو اور اپنے ہاتھوں کو اٹھاؤ لیکن کانوں سے اوپر نہ لے جاؤ اور پھر یہ پڑھو:

"سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ"[3]

ترجمہ: "اے اللہ تو پاک ہے ہم تیری تعریف کرتے ہیں تیرا نام برکت والا ہے تیری بزرگی بلند ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ہمیں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر پر اس طرح التحیات سکھاتے تھے جیسا کہ استاذ مکتب میں بچوں کو سکھاتا ہے۔[4]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے "التحیات" سکھائی اور ارشاد فرمایا کہ حضور ﷺ نے بھی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں التحیات سکھائی تھی "التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، الصلوٰۃ فی الرجل ینقص صلاتہ: ۳۲۳/۱

[2] اخرجہ الطبرانی فی الکبیر والبزار قال الہیثمی: ۲۹۳/۱ رجالہ رجال الصحیح

[3] ابوداؤد، الصلوٰۃ، باب من رأی الاستفتاح بسبحانک: ۱۱۳/۱

[4] مصنف ابن ابی شیبہ، الصلوٰۃ من کان یعلم التشہد ....: ۳۲۸/۱

الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ، الْمُبَارَكَاتُ لِلّٰهِ"[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ ہمیں التحیات "اس طرح سکھاتے تھے جیسے ہمیں قرآن کی کوئی سورۃ سکھاتے تھے۔"[2]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کے زمانے میں احادیث نہیں لکھتے تھے مگر استخارہ اور تشہد لکھا کرتے تھے۔[3]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھے التحیات اس طرح سکھائی جس طرح مجھے آپ ﷺ قرآن کی کوئی سورۃ سکھایا کرتے تھے، اور اس وقت میرا ہاتھ حضور ﷺ کے ہاتھوں میں تھا پھر اس کے بعد "التَّحِيَّاتُ" کو ذکر کیا۔[4]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ ہمیں سورتوں کا شروع والا حصہ اور قرآن سکھاتے تھے۔ چناں چہ ہمیں حضور ﷺ نے نماز کا خطبہ اور نکاح وغیرہ کا خطبہ بھی سکھایا۔ پھر "التحیات" کا ذکر کیا۔[5]

ہمارے استاذ اور جامعہ بنوری ٹاؤن دارالافتاء کے رئیس المفتی حضرت مفتی عبدالسلام چاٹگامی صاحب نے کراچی کی مسجد عثمانیہ میں فجر کے بعد درس دینا شروع کیا۔ درس کا طریقہ یہ ہوتا کہ خوش الحان قاری تلاوت کرتا۔ پھر مفتی صاحب ترجمہ و تشریح فرماتے۔ اگر قاری نہ ہوتا تو درس میں بیٹھنے والے سامعین تلاوت کرتے۔ جب مفتی صاحب نے ان سامعین کی تلاوت سنی تو درس روک کر فرمایا کہ پہلے ہم قرآن کریم ٹھیک سے پڑھنے کی مشق کرائیں گے۔

[1] کنز العمال، الصلوٰۃ الرابع: ۷۲/۸، رقم: ۲۲۳۳۱

[2] مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۱۸/۱

[3] مصنف ابن ابی شیبہ، الصلاۃ، من کان یعلم التشہد ویامر بتعلیمہ: ۳۲۸/۱

[4] مسلم، الصلوٰۃ، باب التشہد فی الصلوٰۃ، رقم: ۹۰۱

[5] کنز العمال، الصلوٰۃ الرابع: ۷۴/۸، رقم: ۲۲۳۴۴

آپ اس پر غور کریں گے تو افسوس ہوگا کہ آپ کے پیچھے بیس سال سے نماز پڑھنے والے احباب ہوں گے۔ لیکن ان کی سورۂ فاتحہ غلط ہوگی۔

لہٰذا امام صاحب اس کی بھی فکر فرمائیں کہ ہر مقتدی قرآن کریم صحیح پڑھنے والا بن جائے۔ اور ہر مقتدی کے گھر والے، بیٹے بیٹیاں، یہاں تک کہ خادم، خادمہ، باورچی، ڈرائیور، ہر آدمی قرآن کریم کو صحیح طرح پڑھے۔

حدیث شریف میں آتا ہے "اِقْرَؤُوا الْقُرْآنَ بِلُحُوْنِ الْعَرَبِ" "قرآن کریم کو عربوں کے لہجے میں پڑھو۔"[1]

خواب کے بجائے بیداری کی فکر کروائیں

اکثر مقتدی احباب ائمہ حضرات کے پاس خواب کی تعبیر پوچھنے آتے ہیں۔ ان میں بعض تو برے خواب دیکھ کر بہت پریشان ہوجاتے ہیں۔ اور بعض اچھے خواب دیکھ کر بہت مطمئن ہوجاتے ہیں۔

خوابوں کے پیچھے بہت زیادہ پڑنا مطلوب اور مقصود نہیں، البتہ اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ لیکن اس پر نجات کا مدار نہیں۔ کیوں کہ غیر اختیاری معاملہ ہے۔ ہمارے طبقے میں ایک بڑی تعداد ہے جو خوابوں ہی کے پیچھے پڑی ہے۔ دن رات یہی فکر ہے کہ کوئی اچھا خواب آجائے۔ اسی کو منتہا و مقصود سمجھا ہوا ہے۔ حالاں کہ یہ بات درست نہیں۔ اس لیے کہ پھر یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی کوئی اچھا خواب اپنے بارے میں دیکھ لیں تو بس یہ سمجھا کہ اب میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہوں۔ خوب سمجھ لیں کہ خواب اپنی ذات میں نہ تو کسی کا درجہ بلند کرتا ہے، اور نہ اجر و ثواب کا موجب ہوتا ہے، بل کہ اصل مدار بیداری کے اعمال پر ہے۔ یہ دیکھو کہ تم بیداری میں کیا عمل کر رہے ہو۔ لہٰذا اگر کوئی اچھا خواب دیکھے۔

[1] مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، باب القراءة بلحون العرب: ۷/۲۵۲، رقم: ۱۱۶۹۳

مثلاً اپنے بارے میں کوئی دینی یا دنیوی ترقی دیکھے، تو اس صورت میں اپنے چاہنے والے اور اپنے محبت کرنے والوں کے سامنے اس خواب کا تذکرہ کرے، دوسروں کو نہ بتائے، کیوں کہ بعض اوقات ایک آدمی وہ خواب سن کر اس کی الٹی سیدھی تعبیر بیان کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے اس اچھے خواب کی تعبیر اس کے مطابق ہوجاتی ہے، اس لیے اپنے محبت کرنے والوں کو وہ خواب بتائے، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔[1]

اور اگر کوئی شخص برا خواب دیکھے تو کسی سے بیان نہ کرے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"فَإِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ رُؤْيَا يَكْرَهُهَا فَلَا يُحَدِّثْ بِهَا أَحَدًا وَلْيَقُمْ فَلْيُصَلِّ".[2]

تَرجَمَہ: "تم میں سے کوئی برا خواب دیکھے تو کسی سے بیان نہ کرے (بل کہ) چاہیے کہ وہ کھڑا ہوجائے اور (نفل) نماز پڑھے۔"

لہٰذا ائمہ کو چاہیے کہ لوگوں کو بتلائیں کہ خواب کے معاملہ میں وہ درمیانی راستہ موقع مناسبت دیکھ کر اختیار کریں جو ہمیں شریعت نے بتلایا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نبی کریم ﷺ کے نورانی طریقوں پر عمل کرنے کی پوری پوری کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سوال اسی زندگی سے متعلق ہوگا، اگر یہ زندگی اللہ تعالیٰ کے حکموں اور رسول اللہ ﷺ کے طریقوں کے موافق ہو تو چاہے انسان اپنے آپ کو خواب میں کسی بھی حالت اور مقام پر دیکھے تو اسے پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے، اور اگر خدانخواستہ بیداری والی زندگی کے اعمال گندے ہیں تو خواہ اپنے آپ کو خواب میں اچھے سے اچھے مقام پر بھی دیکھ لے تو

[1] بخاری، التعبیر، باب الرؤیا الصالحة، حدیث نمبر: ۶۹۸۶

[2] ترمذی، ابواب الرؤیا، باب ماجاء فی رؤیا النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ۲/۵۵

کوئی فائدہ نہیں، اور نہ ہی اس پر مطمئن ہونا چاہیے۔

"حضرت محمد بن سیرین رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا ارشاد ہے: "اَلرُّؤْیَا تَسُرُّ وَلَا تَغُرُّ" خواب کسی انسان کو دھوکے میں نہ ڈالے اور وہ یہ نہ سمجھے کہ میں بہت پہنچا ہوا ہوں اور اس کے نتیجے میں بیداری کے اعمال سے غافل ہو جائے۔"

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی سے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کی درخواست کی۔ اس پر حضرت والا نے فرمایا کہ خواب میں کیا رکھا ہے، بیداری کی کوئی بات پوچھو؟۔

آج کل لوگ خوابوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کثرت سے خطوط میں خواب لکھے ہوئے آتے ہیں۔ میں اکثر یہ جواب لکھ دیتا ہوں کہ:

نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
زغلام آفتابم ہمہ آفتاب گویم

بیداری کو چھوڑ کر خواب کے پیچھے پڑنا ایسا ہے جیسے کوئی اصل شکار کو چھوڑ کر اس کے سائے کے پیچھے پڑ جائے اور یہ سب آخرت سے غفلت اور حقیقت سے بے خبری کی باتیں ہیں۔

تشریح: بہت سے لوگ اس مغالطے اور دھوکے میں ہیں کہ انہوں نے خواب دیکھنے کا نام تصوف سمجھا ہے۔ اور کوئی اچھا خواب دیکھ لیا تو یہ سمجھنے لگے کہ اب ہم ولی ہو گئے۔ خواب کے عجیب و غریب راز ہیں۔ اس کو کوئی پہچان نہیں سکتا۔

اس واسطے حضرت والا رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرمایا کرتے تھے کہ خوابوں کی فکر میں زیادہ نہ پڑو۔ بلکہ اپنی بیداری کی حالت کو درست کرو اور اگر کسی نے کیسا بھی برے سے برا خواب دیکھا ہو، لیکن اگر تمہاری بیداری کی حالت صحیح ہے تو پھر کوئی فکر کی بات نہیں۔

ورنہ ان فضولیات میں کیا رکھا ہے، کیوں بے کار وقت کھویا جائے۔ وقت کی

ذکر کرنا چاہیے اور ضروری کام میں لگنا چاہیے۔

"خواب حجت نہیں"

ایک قاضی تھے، لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مقدمہ سامنے آیا، اور مقدمہ کے اندر گواہ پیش ہوئے، اور شریعت کے مطابق گواہوں کی جانچ پڑتال کا جو طریقہ ہے، وہ پورا کر لیا، اور آخر میں مدعی کے حق میں فیصلہ کرنے کا دل میں ارادہ بھی ہو گیا، لیکن قاضی صاحب نے کہا کہ اس فیصلے کا اعلان کل کریں گے۔ یہ خیال ہوا کہ کل تک ذرا اور سوچ لوں گا، لیکن جب رات کو سوئے تو خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوئی، اور جب صبح بیدار ہوئے تو ایسا یاد آیا کہ خواب میں حضور ﷺ یہ فرما رہے تھے کہ جو تم فیصلہ کرنے کا ارادہ کر رہے ہو یہ فیصلہ غلط ہے۔ یہ فیصلہ یوں کرنا چاہیے، اب اٹھ کر جو غور کیا تو جس طریقے سے فیصلہ کرنے کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا، وہ کسی طرح شریعت کے دائرے کے مطابق نہیں ہوتا۔

اب بڑے پریشان ہوئے کہ ظاہری طور پر شریعت کا جو تقاضہ ہے، اس کے لحاظ سے تو یہ فیصلہ اس طرح ہونا چاہیے، لیکن دوسری طرف خواب میں حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ یوں فیصلہ کرو، اب معاملہ بڑا سنگین ہو گیا اور یہ جو مقدمہ کی ذمہ داری ہوتی ہے یہ بڑی سنگین ذمہ داری ہے۔ جن لوگوں پر گزرتی ہے، وہی اس کو جانتے ہیں، راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔

چناں چہ قاضی صاحب نے خلیفہ وقت کو جا کر بتایا کہ اس طرح سے یہ مقدمہ پیش آگیا، اور حضور ﷺ نے خواب میں اس طرح فیصلہ کرنے کو فرمایا۔ آپ علماء کو جمع فرمائیں، تاکہ اس کے بارے میں ان سے مشورہ ہو جائے۔

چناں چہ سارے شہر کے علماء جمع ہوئے، اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا کہ

اس طرح یہ مقدمہ درپیش ہے۔ ظاہری طور پر شریعت کا تقاضہ یہ ہے۔ لیکن دوسری طرف خواب میں حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟

علماء نے فرمایا کہ واقعۃً یہ معاملہ بڑا سنگین ہے۔ حضور ﷺ کے فرمان پر عمل کرنا چاہیے لیکن اس زمانے کے ایک بزرگ جو اپنی صدی کے مجدد کہلاتے تھے۔ حضرت شیخ عزالدین ابن عبدالسلام رحمہ اللہ تعالیٰ، وہ بھی مجلس میں حاضر تھے، وہ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میں پورے جزم اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ شریعت کے قاعدے کے مطابق آپ جو فیصلہ کرنے جا رہے ہیں، وہی فیصلہ کیجیے اور سارا گناہ، ثواب میری گردن پر ہے۔ خواب کی بات پر فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ خواب میں ہزاروں احتمالات ہو سکتے ہیں۔ اللہ جانے اپنے دل کی کوئی بات اس میں آگئی ہو۔ اگرچہ حضور ﷺ کی صورت مبارکہ میں شیطان نہیں آسکتا، لیکن ہو سکتا ہے کہ بیداری کے بعد شیطان نے کوئی وسوسہ ڈال دیا ہو۔ کوئی غلط بات دل میں آگئی ہو۔ شریعت نے حضور ﷺ کے بیداری میں سنے ہوئے ارشادات کے مقابلے میں ہمارے خواب کو حجت قرار نہیں دیا۔ اور حضور ﷺ کے جو ارشادات ہم تک سند متصل کے ساتھ پہنچے ہیں وہی ہمارے لیے حجت ہیں۔ ہمیں ان ہی پر عمل کرنا ہے۔ آپ بھی اس پر عمل کیجیے، اور گناہ و ثواب میری گردن پر ہے۔[1]

مقتدیوں کو فراغت کے نقصان بتلائیں

ہم ائمہ کو چاہیے کہ اپنی مساجد میں مقتدیوں پر ایسی محنت کریں کہ کوئی فارغ نہ بیٹھے۔ مسلمان دین کے کام سے فارغ ہو تو دنیوی کاموں میں صحیح نیت کے ساتھ لگ جائے تو یہ بھی دین بن جائے گا۔

ہم ایسی کوشش کریں کہ ۸۰ سال کا بوڑھا ہو یا ۸ سال کا بچہ ہو، فارغ بیٹھنے

[1] اصلاحی خطبات، خواب کی شرعی حیثیت: ۹۸/۵

بجائے اس کا ضمیر اس کو ملامت کرے۔ مقتدیوں کو فراغت کے نقصانات بتلائیں اور ان کو سمجھائیں کہ فراغت (سارے) گناہوں کا دروازہ ہے۔ جیسا عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے "اَلْفَرَاغُ بَابُ الْمَعْصِيَةِ"

اسی طرح انسان جب اپنے آپ کو کسی کام میں پورے طور پر مشغول کر لیتا ہے تو بڑے بڑے حادثات بھی اس کی نظر میں معمولی ہو جاتے ہیں، لیکن جب انسان اپنے کو کسی جائز کام میں مشغول نہ کرے، فضول کاموں، لہو و لعب میں پڑا رہے یا بے کار بیٹھا رہے تو یہ چیز انسان کے نقصان کا باعث ہے۔

بعض حکماء کا قول ہے:

"إِيَّاكُمْ وَالْخَلَوَاتِ فَإِنَّهَا تُفْسِدُ الْعُقُوْلَ وَتَعْقِدُ الْمَحْلُوْلَ"[1]

ترجمہ: "تنہائی اور بے کاری سے بچو، کیوں کہ ایسا کرنا عقل کو خراب کر دیتا ہے اور ذہن پر گرہ لگا دیتا ہے، جس سے سوچ و سمجھ کی صلاحیتیں متاثر ہو جاتی ہیں۔"

فراغت کے نقصان کو سمجھانے کے لیے ایک قصہ عرض کیا جاتا ہے۔ چوں کہ قصے سے بات جلدی سمجھ آجاتی ہے، اس لیے ائمہ کرام اپنے ہر مقتدی کو یہ قصہ یاد کروا دیجیے۔

اپاہج پرندہ۔۔۔۔۔۔:

حضرت شقیق بلخی اور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ تعالیٰ دونوں ہم زمانہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار حضرت شقیق بلخی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے دوست حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آئے اور کہا:

"میں ایک تجارتی سفر پر جا رہا ہوں، سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات

[1] [illegible]: ۳۶۰

کروں، کیوں کہ اندازہ ہے کہ سفر میں کئی مہینے لگ جائیں گے۔"

اس ملاقات کے چند دن بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے دیکھا کہ حضرت شقیق بلخی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی دوبارہ مسجد میں موجود ہیں۔ پوچھا:

"آپ سفر پر نہیں گئے؟"

کہا: "گیا تھا، لیکن راستے میں ایک واقعہ دیکھ کر واپس ہوا۔ ایک غیر آباد جگہ پہنچا، وہیں میں نے پڑاؤ ڈالا۔ وہاں میں نے ایک چڑیا دیکھی جو اڑنے کی طاقت سے محروم تھی۔ مجھے اس کو دیکھ کر ترس آیا۔ میں نے سوچا کہ ویران جگہ پر یہ چڑیا اپنی خوراک کیسے پاتی ہوگی۔ میں اس سوچ میں تھا کہ اتنے میں ایک اور چڑیا آئی۔ اس نے اپنی چونچ میں کوئی چیز دبا رکھی تھی۔ وہ معذور چڑیا کے پاس اتری تو اس کی چونچ کی چیز اس کے سامنے گر گئی۔ معذور چڑیا نے اس کو اٹھا کر کھا لیا۔ اس کے بعد آنے والی طاقت ور چڑیا اڑ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے کہا............ سُبْحَانَ اللہ! اللہ تعالیٰ جب ایک چڑیا کا رزق اس طرح اس کے پاس پہنچا سکتا ہے تو مجھ کو رزق کے لیے شہر در شہر پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چناں چہ میں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس چلا آیا کہ کوئی کام نہیں کروں گا فارغ بیٹھوں گا رزق اللہ تعالیٰ دے گا"...... یہ سن کر حضرت ابراہیم بن ادہم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے فرمایا:

"شقیق! تم نے اپاہج پرندے کی طرح بننا کیوں پسند کیا؟

تم نے یہ کیوں نہیں چاہا کہ تمہاری مثال اس پرندے کی سی ہو جو اپنی قوت بازو سے خود بھی کھاتا ہے اور اپنے دوسرے ہم جنسوں کو بھی کھلاتا ہے؟"

حضرت شقیق بلخی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے یہ سنا تو حضرت ابراہیم بن ادہم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا ہاتھ چوم لیا اور کہا: "ابو اسحاق! تم نے میری آنکھ کا پردہ ہٹا دیا، وہی بات صحیح ہے جو تم نے کہی ہے۔"

ایک ہی واقعہ ہے جس سے ایک شخص نے فارغ بیٹھنے کا سبق لیا اور دوسرے

نے ہمت اور کام کرنے کا۔[1]

حضرت عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے ان لوگوں کو جو کاہل اور سست بن کر فارغ بیٹھے رہتے تھے، نہ دین کا کام کرتے تھے نہ دنیا کا اور مسجد میں ڈیرہ لگا لیتے تھے، تنبیہ اور ارشاد فرمایا:

"أُخْرُجُوْا وَاطْلُبُوا الرِّزْقَ فَإِنَّ السَّمَاءَ لَا تُمْطِرُ ذَهَبًا وَلَا فِضَّةً"[2]

تَرْجَمَۃ: "(ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھو) نکلو اور روزی کے لیے کوشش کرو، آسمان سے تمہارے لیے سونا اور چاندی نہیں برسائے جائیں گے۔"

رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جب کسی شخص کو پسند فرماتے تو اس کے بارے میں دریافت فرماتے:

"هَلْ لَهُ حِرْفَةٌ ......؟" فَإِنْ قَالُوْا: "لَا" قَالَ: "سَقَطَ مِنْ عَيْنِيْ"[3]

تَرْجَمَۃ: "مجھے کسی آدمی کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے تو پوچھتا ہوں اس کا پیشہ (ذریعہ معاش) کیا ہے، جب لوگ کہتے ہیں کچھ بھی نہیں تو وہ شخص میری نظروں سے گر جاتا ہے۔"

مومن کی یہ شان ہے کہ وہ ہمہ وقت ایسے کاموں میں مشغول رہتا ہے، جن سے اسے دینی ترقی حاصل ہوتی رہتی ہے یا کم از کم دنیوی مصالح اسے حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ یہ مومن کی شان کے خلاف ہے کہ وہ کسی ایسے کام میں مشغول ہو

[1] راز حیات: ۱۸۰ [2] لا تحزن: ۲۵۳

[3] الجامع لأخلاق الراوي و آداب السامع: ۹۸/۱، رقم: ۴۸، باب ذکر ما یجب علی طالب الحدیث.....

جس میں اس کے لیے دنیوی فائدہ ہو نہ اخروی، یا بالکل فارغ بیٹھا ہو۔

لہٰذا امام صاحب مقتدیوں کو سمجھائیں کہ اپنے وقت سے فائدہ اٹھایئے اور ایک لمحہ بھی فارغ نہ رہیے، کیوں کہ جس دن آپ فارغ رہیں گے، مختلف قسم کے اندیشے اور وسوسے آپ کو آگھیریں گے، آپ پر غم سوار ہو جائیں گے اور آخر کار وہ غم آپ کو پریشانیوں میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔

مقتدیوں کو والدین سے دعا لینے کی ترغیب دیں

ہر مسلمان کو اپنے والدین کی خدمت کا اہتمام کرنا چاہیے، خصوصاً اہل علم اور مسلمانوں کے مقتدیٰ اور مسجد کے امام کو اس عمل صالح میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے، کیوں کہ والدین کی دعاؤں سے ان کے اپنے کام میں مزید ترقی ہوگی۔

حضرت محمد بن منکدر رحمۃ اللہ تعالیٰ مشہور تابعی اور راوی حدیث ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں ساری رات اپنی والدہ کے پاؤں دباتا رہا اور میرے بھائی ابوبکر بن منکدر رحمۃ اللہ تعالیٰ رات بھر نماز پڑھتے رہے، لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اپنی وہ رات ان کی رات سے بدلوں۔[1]

دعا کی برکت

حضرت بقی بن مخلد رحمۃ اللہ تعالیٰ (متوفی ۲۷۶ھ) اندلس کے مشہور محدثین میں سے ہیں۔ حدیث میں ان کی مسند اہل علم میں معروف ہے۔ یہ بلند پایہ محدث ہونے کے علاوہ نہایت عابد و زاہد اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔

ایک مرتبہ ان کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی کہ: "میرے بیٹے کو رومیوں نے قید کر رکھا ہے، اس کی وجہ سے میری راتوں کی نیند حرام ہے۔ میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے، میں چاہتی ہوں کہ اسے فروخت کر کے اپنے بیٹے کا فدیہ ادا کردوں اور

[1] المبسوط للسرخسی: ۱۰/۲۴۹

اسے قید سے چھڑا لوں، آپ کسی سے فرما دیجیے کہ وہ میرا گھر خرید لے، اس لیے کہ میرے دل کا سکون اور راتوں کا چین رخصت ہو چکا ہے۔"

حضرت بقی بن مخلد رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس کی فریاد سنی تو اس سے فرمایا: "تم جاؤ میں تمہارے معاملہ میں غور کروں گا۔" اس کے ساتھ ہی وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے اور اس کی رہائی کے لیے دعا کرتے رہے۔ اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہی عورت پھر واپس آئی، اس مرتبہ اس کا بیٹا اس کے ساتھ تھا۔ وہ کہنے لگی:

"اس سے سنئے کہ اس کے ساتھ کیا عجیب واقعہ پیش آیا۔" حضرت بقی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے واقعہ پوچھا، کہنے لگا: "مجھے بادشاہِ افرنگ کے ان قیدیوں میں شامل کر دیا گیا جو پابہ زنجیر بادشاہ کی خدمت کرتے تھے۔ ایک دن میں اپنی مفوضہ خدمت انجام دینے کے لیے جا رہا تھا، پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی تھی، اچانک چلتے چلتے زنجیر پاؤں سے گر پڑی۔ مجھ پر جو سپاہی متعین تھا، وہ مجھے گالیاں دینے لگا کہ پاؤں سے زنجیر کیوں نکالی؟ میں نے کہا اللہ کی قسم! مجھے پتہ بھی نہیں کہ یہ زنجیر میرے پاؤں سے کیسے نکلی ہے؟ اس پر انہوں نے لوہار کو بلوا کر دوبارہ میرے پاؤں میں پہنا دی اور اس مرتبہ اس کی میخیں خوب اچھی طرح مضبوط گاڑ دی گئیں، لیکن اس کے فوراً بعد میں اٹھ کر چلنے لگا تو زنجیر پھر گر پڑی۔ انہوں نے پھر اسے باندھا لیکن پھر چلا تو پھر گر گئی۔

وہ لوگ بڑے حیران ہوئے اور اپنے راہبوں سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا: کیا اس کی ماں زندہ ہے؟

میں نے کہا ہاں۔

انہوں نے کہا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دعا کی ہے اور اس کی دعا قبول ہو گئی ہے۔ پھر راہبوں نے متعلقہ لوگوں کو مشورہ دیا کہ اب اسے چھوڑ دیا جائے، چنانچہ انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور میں بلادِ اسلام میں پہنچ گیا۔"

حضرت بقی بن مخلد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے زنجیر گرنے کا وقت پوچھا تو یہ ٹھیک اسی وقت تھا، جب وہ اس کی رہائی کے لیے دعا کر رہے تھے۔[1]

والدین کا درجہ کتنا اونچا ہے، دنیا و آخرت میں ان کے ساتھ حسن سلوک کے کیا فوائد ہیں، ہمیں اپنی فلاح و سعادت حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمات کی کتنی ضرورت ہے؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اس موضوع پر ایک کتاب بندہ کی طرف سے ''والدین کی قدر کیجیے''[2] تیار ہو چکی ہے، جس میں واقعات اور قصوں کے ذریعہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کو سمجھایا گیا ہے، اللہ کرے یہ کتاب ہم سب کی ہدایت کا ذریعہ بن جائے، اور ہمیں اپنے والدین کے لیے دنیا و آخرت میں آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔

ائمہ حضرات مقتدیوں کو ہر پریشانی کے حل کے لیے نمازِ حاجت پڑھ کر دعا مانگنا سکھائیں

ائمہ حضرات مقتدیوں کو ہر معاملہ میں اللہ سے مدد مانگنا سکھائیں۔ کبھی کوئی پریشانی ہو، کوئی مسئلہ اٹکا ہوا ہو تو بجائے عاملوں کے پاس جانے کے صلوٰۃ الحاجت پڑھ کر اللہ سے مانگنے کی ترغیب دیں اور انہیں صلوٰۃ الحاجت کی دعا یاد کرائی جائے جو ذیل میں ذکر کی گئی ہے اور چار رکعت صلوٰۃ الحاجت کی نیت سے پڑھ کر وہ دعا ان میں مانگی جائے۔

پریشان حال لوگوں کو بتلایا جائے کہ جب لوگ سو رہے ہوں تو رات کو اٹھ کر گڑگڑا کر، رو رو کر دعا مانگیں اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی ...... ضرور قبول ہوگی، وہ دعا اور نماز کی ترکیب یہ ہے۔

[1] البدایۃ والنھایۃ ثم دخلت سنۃ ست وسبعین و مائتین: ۱۱/ ۵۹

[2] ''والدین کی قدر کیجیے'' مطبوعہ ادارۃ الہدیٰ کسی بھی قریبی دینی کتب خانے یا براہ راست ہم سے منگوا لیں۔

''فرات بن سلیمان کہتے ہیں کہ سیدنا علی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی یہ نہیں کرسکتا کہ کھڑا ہو کر چار رکعت نماز پڑھے پھر ان میں یہ کلمات کہے جو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کہا کرتے تھے؟

''تَمَّ نُوْرُكَ فَهَدَيْتَ فَلَكَ الْحَمْدُ، عَظُمَ حِلْمُكَ فَعَفَوْتَ فَلَكَ الْحَمْدُ، بَسَطْتَ يَدَكَ فَأَعْطَيْتَ فَلَكَ الْحَمْدُ رَبَّنَا، وَجْهُكَ أَكْرَمُ الْوُجُوْهِ، وَجَاهُكَ أَعْظَمُ الْجَاهِ، وَعَطِيَّتُكَ أَفْضَلُ الْعَطِيَّةِ وَأَهْنَاُهَا، تُطَاعُ رَبَّنَا فَتَشْكُرُ، وَتُعْصٰى رَبَّنَا فَتَغْفِرُ، وَتُجِيْبُ الْمُضْطَرَّ، وَتَكْشِفُ الضُّرَّ، وَتَشْفِي السُّقْمَ، وَتَغْفِرُ الذَّنْبَ، وَتَقْبَلُ التَّوْبَةَ. وَلَا يَجْزِيْ بِآلَائِكَ أَحَدٌ، وَلَا يَبْلُغُ مِدْحَتَكَ قَوْلُ قَائِلٍ''[1]

تَرجَمَہ: ''آپ کا نور مکمل ہے، چناں چہ آپ نے ہدایت دی، پس آپ ہی کے لیے تمام تعریف ہے۔ آپ کا حلم عظیم ہے، چناں چہ آپ نے معاف فرما دیا، پس آپ ہی کے لیے تمام تعریف ہے۔ آپ نے اپنے ہاتھ کو کشادہ فرما کر عطا و بخشش سے نوازا، پس اے ہمارے رب! تمام تعریف آپ ہی کے لیے ہے آپ کا مرتبہ سب سے عظیم اور آپ کا عطیہ افضل و خوش گوار عطیہ ہے، اے ہمارے رب! آپ کی اطاعت کی جاتی ہے تو آپ اس کی قدر فرماتے ہیں (اور ثواب عطا فرماتے ہیں) نافرمانی کی جاتی ہے تو مغفرت فرماتے ہیں، مجبور و بے کس کی دعا سنتے اور قبول فرماتے ہیں۔ تکلیف کو آپ ہی دور کرتے اور بیماری سے شفا عطا فرماتے ہیں، گناہوں کو معاف فرماتے اور توبہ قبول فرماتے ہیں۔ آپ کی نعمتوں کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا اور کسی کی تعریف آپ کی تعریف تک

[1] مجمع الزوائد، الأدعیۃ، باب فیما یستفتح بہ الدعاء: ۱۰/ ۱۷۷، ۱۷۸

نہیں پہنچ سکتی۔“

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو کوئی حاجت اور ضرورت ہو اللہ تعالیٰ سے متعلق یا کسی آدمی سے متعلق (یعنی ایسی حاجت ہو جس کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی سے ہو کسی بندے سے اس کا واسطہ ہی نہ ہو، یا ایسا معاملہ ہو کہ بظاہر اس کا تعلق کسی بندے سے ہو، بہر صورت) اس کو چاہیے کہ وہ وضو کرے اور خوب اچھا وضو کرے، اس کے بعد دو رکعت نماز پڑھے، (جس کا ذکر ابھی کیا گیا) اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کچھ حمد و ثنا کرے اور اس کے نبی ﷺ پر درود پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس طرح عرض کرے:

”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، أَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ، وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ، وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ إِثْمٍ، لَا تَدَعْ لِيْ ذَنْبًا إِلَّا غَفَرْتَهُ وَلَا هَمًّا إِلَّا فَرَّجْتَهُ وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًا إِلَّا قَضَيْتَهَا يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔[1]

تَرجَمَہ: ”اللہ کے سوا کوئی مالک و معبود نہیں، وہ بڑے حلم والا اور بڑا کریم ہے پاک اور مقدس ہے، وہ اللہ جو عرشِ عظیم کا بھی رب اور مالک ہے، ساری حمد و ستائش اس اللہ کے لیے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ان اعمال اور ان اخلاق و احوال کا جو تیری رحمت کا موجب اور وسیلہ اور تیری مغفرت اور بخشش کا پکا ذریعہ بنیں اور تجھ سے طالب ہوں ہر نیکی سے فائدہ اٹھانے اور حصہ

[1] ترمذی، أبواب الصلوٰۃ، باب ماجاء في صلوٰۃ الحاجۃ: ۱/۱۰۸، ۱۰۹

لینے کا، اور ہر گناہ اور معصیت سے سلامتی اور حفاظت کا۔ اے اللہ! میرے سارے ہی گناہ بخش دے اور میری ہر فکر اور ہر پریشانی دور کر دے اور میری ہر حاجت جس سے تو راضی ہو اس کو پورا فرما دے۔ اے سب مہربانوں سے بڑے مہربان!“

تشریح: حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”یہ ایک حقیقت ہے، جس میں کسی مؤمن کے لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ مخلوقات کی ساری حاجتیں اور ضرورتیں اللہ کے اور صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں، اور بظاہر جو کام بندوں کے ہاتھوں سے ہوتے دکھائی دیتے ہیں دراصل وہ بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کے حکم سے انجام پاتے ہیں، اور ”صلوٰۃ حاجت“ کا جو طریقہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں تعلیم فرمایا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجتیں پوری کرانے کا بہترین اور معتمد ترین طریقہ ہے، اور جن بندوں کو ان ایمانی حقیقتوں پر یقین نصیب ہے ان کا یہی تجربہ ہے اور انہوں نے ”صلوٰۃ حاجت“ کو خزائنِ الٰہیہ کی کنجی پایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں ان حاجتوں کے لیے بھی ”صلوٰۃ حاجت“ تعلیم فرمائی ہے جن کا تعلق بظاہر کسی بندے سے ہو۔ اس کا ایک خاص فائدہ یہ بھی ہے کہ جب بندہ اپنی ایسی حاجات کے لیے بھی ”صلوٰۃ حاجت“ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا کرے گا تو اس کا یہ عقیدہ اور یقین اور زیادہ مستحکم ہو جائے گا کہ کام کرنے اور بنانے والا دراصل وہ بندہ نہیں ہے، نہ اس کے کچھ اختیار میں ہے، بل کہ سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور بندہ اللہ تعالیٰ کا صرف آلۂ کار ہے، اس کے بعد جب وہ کسی بندے کے ہاتھ سے کام ہوتا ہوا بھی دیکھے گا تو اس کے توحیدی عقیدے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔“[1]

[1] معارف الحدیث، کتاب الصلوٰۃ: ۳/۳۶۴، ۳۶۵

تیسری صدی ہجری میں مصر میں چار محدثین بہت مشہور ہوئے چاروں کا نام محمد تھا اور چاروں علم حدیث کے جلیل القدر ائمہ میں شمار ہوئے۔ ان میں سے ایک محمد بن نصر مروزی ہیں دوسرے محمد بن جریر طبری تیسرے محمد بن المنذر اور چوتھے محمد بن اسحاق بن خزیمہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ان کا ایک عجیب واقعہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ یہ چاروں حضرات مشترک طور سے حدیث کی خدمت میں مشغول تھے، بسا اوقات ان علمی خدمات میں انہماک اس قدر بڑھتا ہے کہ فاقوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ایک دن چاروں ایک گھر میں جمع ہو کر احادیث لکھنے میں مشغول تھے، کھانے کو کچھ نہیں تھا، بالآخر طے پایا کہ چاروں میں سے ایک صاحب طلب معاش کے لیے باہر نکلیں گے تاکہ کھانے وغیرہ کا انتظام ہو سکے۔ قرعہ ڈالا گیا تو حضرت محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام نکلا۔ انہوں نے طلب معاش کے لیے نکلنے سے پہلے نماز پڑھنی اور دعا کرنی شروع کر دی۔

یہ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا اور مصر کے حکمران احمد بن طولون رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی قیام گاہ میں آرام کر رہے تھے۔ ان کو سوتے ہوئے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ''محدثین کی خبر لو، ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔''

ابن طولون رحمہ اللہ تعالیٰ بیدار ہوئے تو لوگوں سے تحقیق کی کہ اس شہر میں محدثین کون کون ہیں؟

لوگوں نے ان حضرات کا پتہ دیا۔ احمد بن طولون رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کے پاس ایک ہزار دینار بھجوائے اور جس گھر میں وہ خدمتِ حدیث میں مشغول تھے اسے خرید کر وہاں ایک مسجد بنوا دی اور اسے علم حدیث کا مرکز بنا کر اس پر بڑی جائیدادیں وقف کر دیں۔[1]

[1] البدایہ والنہایہ: ۱۱/۱۰۳، سن ۲۹۴، ۱۱/۱۴۶

حدیث شریف میں آتا ہے:

''اِذَا سَاَلْتَ فَسْئَلِ اللّٰہَ، وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ.''[1]

ترجمہ: ''جب تو کوئی چیز مانگے تو اللہ ہی سے مانگ اور جب کوئی مدد طلب کرنی ہو تو اللہ ہی سے مدد طلب کر۔''

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ عجیب بات فرماتے ہیں (جو ہر مسلمان کو خصوصاً اس کو یاد کر لینی چاہیے اور بار بار اس کو پڑھنا چاہیے، تاکہ اس کی حقیقت دل میں اتر جائے فرماتے ہیں) اللہ تعالیٰ ابن آدم سے خطاب کرتے ہیں:

((قَلْبُکَ لِیْ، فَلَا تُدْخِلْ فِیْہِ حُبَّ غَیْرِیْ وَلِسَانُکَ لِیْ، فَلَا تَذْکُرْ بِہٖ اَحَدًا غَیْرِیْ وَبَدَنُکَ لِیْ، فَلَا تَشْغَلْہُ بِخِدْمَۃِ غَیْرِیْ وَاِنْ اَرَدْتَ شَیْئًا فَلَا تَطْلُبْہُ اِلَّا مِنِّیْ))[2]

ترجمہ: ''(اے آدم کے بیٹے) تیرا دل میرے لیے ہے اس دل میں میرے سوا کسی اور کی محبت داخل مت کر، تیری زبان میرے لیے ہے اس سے میرے سوا کسی اور کا ذکر مت کر، تیرا بدن میرے لیے ہے اس کو میرے حکموں کے سوا کسی اور کی چاہت پر استعمال نہ کر اور جب تیرا دل کسی چیز کو چاہے تو سوائے میرے کسی اور سے مت مانگ۔''

اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ یہ دعا کیا کرتے تھے:

''اَللّٰھُمَّ کَمَا صُنْتَ وَجْھِیْ عَنِ السُّجُوْدِ لِغَیْرِکَ فَصُنْ وَجْھِیْ عَنِ الْمَسْاَلَۃِ لِغَیْرِکَ.''[3]

ترجمہ: ''اے اللہ! جیسا کہ آپ نے میری پیشانی کی حفاظت فرمائی

[1] الترمذی: صفۃ القیامۃ، باب (حدیث حنظلۃ) رقم: ۲۵۱۶

[2] التفسیر الکبیر، المسألۃ الثالثۃ: ۱۶/۱۷۵، الفلق: ۱

[3] حلیۃ الاولیاء، ذکر تابعی التابعین: ۹/۲۴۴، رقم ۱۳۷۸۳

ہے کہ وہ آپ کے غیر کے آگے جھکے پس آپ میری پیشانی کو (بھی) غیر کے سامنے سوال کرنے سے بچائیں۔"

پریشان حال مقتدیوں کی آمد اور جنات وجادو سے بچنے کی تدبیریں

ہمارے ہاں بہت سے لوگ ائمہ حضرات کے پاس اپنی مختلف پریشانیاں لے کر آتے ہیں۔ چوں کہ ہمارے معاشرے میں چند دنوں تک بیمار رہنے کی بنا پر فوراً کوئی صاحب یا صاحبہ کہہ دیتے ہیں کہ تم پر اثرات ہیں،...... کسی نے جادو کروادیا ہے...... اور جب آدمی کے ذہن پر ایک چیز سوار ہوتی ہے تو باہر کی دنیا میں اس کو وہی چیزیں نظر آتی ہیں مثلاً ایسے ڈرپوک وبزدل شخص کو گندے انڈے، یا تازہ گوشت اچانک گھر کے باہر نظر آگیا تو وہ یقینی طور پر سمجھتا ہے کہ ہاں اب تو مجھ پر جادو ہوچکا ہے...... یا جنات ہیں...... یا سفلی، بھوت...... وغیرہ ہے۔

ائمہ حضرات خود بھی اور ایسے آنے والے مریضوں کو بہادر بنائیں ایمان مضبوط کروائیں کہ جن، جادو یہ سب مخلوق ہے۔ مؤمن مخلوقات سے نہیں ڈرا کرتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جنگل کے درندے، سانپ، بچھو وغیرہ موذی جانور سے بھی نہ ڈرے۔ فتح افریقہ کے بعد عقبہ بن نافع رحمہ اللہ تعالیٰ جنگل کے جانوروں کو خطاب کررہے ہیں:

"أَيَّتُهَا الْحَيَّاتُ وَالسِّبَاعُ إِنَّا أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ارْحَلُوْا عَنَّا فَإِنَّا نَازِلُوْنَ وَمَنْ وَجَدْنَاهُ بَعْدَ ذٰلِكَ قَتَلْنَاهُ." [1]

ترجمہ: "اے سانپ اور درندو! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب

[1] الکامل لابن الاثیر: ۳/۴۰۷، ولایۃ عقبۃ بن نافع

ہیں اس لیے تم یہاں سے چلے جاؤ اس کے بعد تم میں سے جس کو بھی پائیں گے قتل کردیں گے۔"

سو لوگوں نے حیرت ناک منظر دیکھا کہ شیر، بھیڑیے اور سانپ اپنے بچوں کو اٹھائے غول درغول بھاگے جارہے ہیں، یہ دیکھ کر دشمن کی قوم "بربر" کے بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

ابن آدم پر وہی چیز مسلط ہوتی ہے جس سے ابن آدم ڈرتا ہے۔ اگر ابن آدم اللہ کے سوا کسی چیز سے نہ ڈرے تو اس پر اللہ کے علاوہ اور کوئی چیز مسلط نہ ہو۔ ابن آدم اسی چیز کے حوالے کردیا جاتا ہے جس چیز سے اسے نفع یا نقصان ملنے کا یقین ہوتا ہے اگر ابن آدم اللہ کے علاوہ کسی اور چیز سے نفع یا نقصان کا یقین نہ رکھے تو وہ اللہ اسے کسی اور چیز کے بالکل حوالہ نہ کرے۔[1]

حضرت عبد القادر رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

"وَمَنْ عَرَفَ اللّٰهَ لَا يَهْرُبُ مِنْ شَيْءٍ وَلَا يَخَافُ مِنْ شَيْءٍ سِوَاهُ." [2]

ترجمہ: "جس نے اللہ تعالیٰ کو اس کی عظمت وصفات کے ساتھ پہچان لیا تو وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گا، صرف اور صرف اللہ کی نافرمانی سے ڈرے گا (یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے اس سے دنیا کی ہر چیز ڈرتی ہے اور جو اللہ سے نہیں ڈرتا اسے دنیا کی ہر چیز ڈراتی ہے)۔"

لہٰذا جنات اور جادو کا خوف دل سے نکال دیجیے اور حتی الامکان کسی آنے والے شخص کو کسی بھی عامل کے پاس نہ بھیجیں۔

[1] کنز العمال، الثانی کتاب الأخلاق، رقم ۵۸۶۲ [2] علو الهمة: ص ۲۶۶

مل کر اس کو مندرجہ ذیل امور کی ترغیب دیں۔

1. پہلے توبہ، استغفار کروائیں، لوگوں پر خصوصاً ماتحتوں پر ظلم کرنے سے بچائیں۔
2. صدقے کی کثرت کی ترغیب دیں۔
3. اچھی طرح ماہر طبیب سے مستقل تشخیص کروا کر علاج کروائیں، بار بار ڈاکٹر، حکیم نہ بدلیں۔ اہتمام سے طبیب کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کریں۔
4. جنات اور سفلی کا وہم ذہن سے نکالنے کی کوشش کریں اور سمجھائیں کہ خدا نہ کرے یہ اگر ہوں بھی تو حضور اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے اعمال و اذکار کافی ہیں وہ اعمال و اذکار کچھ آگے ہم لکھتے ہیں۔

ان اعمال و اذکار کے علاوہ کسی عامل کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ حضور اکرم ﷺ ہمیں سب اعمال بتا کر گئے ہیں، شیاطین، جنات، جادو، نظر بد وغیرہ سے حفاظت کے لیے دعائیں سکھا کر گئے ہیں۔

جس شخص کو حضور اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے نسخوں سے حفاظت نہ ملے تو وہ سمجھ لے یہ عذاب ہے جو نافرمانی کے وبال میں یا مخلوقِ خدا پر ظلم کرنے کی وجہ سے آیا ہے تو مجھے ظلم کرنا چھوڑ دینا چاہیے اور اللہ کی نافرمانی سے توبہ کرلینی چاہیے اور موت سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہیے، اگر موت اس مرض میں مقدر ہے تو دنیا کے سارے عاملین مل کر بھی سارے تعویذات اور عوامل کے ذریعہ بچا نہیں سکتے۔

ائمہ حضرات سے ہماری گزارش ہے "آسیب کا علاج" وعظ فقیہ العصر مفتی اعظم حضرت اقدس مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا مطالعہ ضرور کریں۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اس وعظ میں فرماتے ہیں:

درحقیقت یہ آج کے مسلمان پر نافرمانی کا وبال ہے، جنات کے وجود کا انکار نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی انسان پر ان کا تسلط ہو مگر وہ تو شاذ و نادر ہزاروں لاکھوں میں کسی پر ہو تو ہو یہ گھر گھر جن کہاں سے آگئے؟ یہ نافرمانیوں کا وبال ہے، جیسے اپنے

اوپر جنات کا شک گزرے اسے چاہیے کہ نافرمانیاں چھوڑ دے توبہ و استغفار کرے۔[1]

دوسری جگہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ایک بات بہت عجیب ہے کہ ان عاملوں کو کسی بھی نوعیت کی تکلیف بتائیں کوئی جسمانی مرض ہو...... معاشی پریشانی ہو...... کوئی گھریلو ناچاقی ہو...... کچھ بھی ہو ان کی تشخیص ہر ایک کے بارے میں یہی ہوگی کہ کسی نے سفلی کردیا ہے...... بندش لگا دی ہے...... اور اتنے اتنے جن ہیں۔ مجھے ان لوگوں پر بہت تعجب ہوتا ہے جو ان کی باتوں پر یقین کرلیتے ہیں، اچھے خاصے پڑھے لکھے دانشور قسم کے لوگ عاملوں کے سامنے ایسے احمق بن جاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ دیں ان کی طرف سے "آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا" اللہ کے بندو! کبھی ان بدعمل عاملوں کا امتحان بھی تو لے کر دیکھو۔[2]

بہرحال ائمہ کرام کو ایسے مواقع پر فائدہ اٹھاتے ہوئے ان دکھی لوگوں کو دین دار بنانے کی کوشش کرنی چاہیے ان کو یہ سمجھایا جائے کہ:

اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا چھوڑ دیں

اس حقیقت سے کسی کو جائے فرار نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی طبیعت اور مزاج مختلف بنائے ہیں۔ طبیعتوں کا اختلاف اور مزاجوں کا سرد و گرم ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ خاندانی زندگی میں دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کا دوسرے سے الجھ جانا انہونی بات نہیں مگر اس الجھاؤ کا طویل ہو جانا خطرناک ہوتا ہے۔

جھگڑے ہوتے ہیں تو لوگ ان کے حل کے لیے تگ و دو کرتے ہیں زیادہ تر لوگ فقیروں کے پاس بھاگتے ہیں...... آپ پیروں کے آستانوں پر چلے جائیں آدھے سے زیادہ مرد و خواتین خاندانی جھگڑوں کو ختم کرانے کے لیے تعویذ اور وظیفہ

[1] آسیب کا علاج: ۳۶
[2] آسیب کا علاج: ۳۷

لینے آئے ہوں گے، ہماری سادگی کی بھی انتہا ہے کہ ہم قرآنی آیات کے ورد کرنے، اور تعویذ لینے، وظیفے پڑھنے اور چلہ کاٹنے کے لیے طرح طرح کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔

اگر کوئی پیر صاحب کہہ دیں کہ چالیس دن تک روزانہ آدھی رات کے بعد قبرستان جاکر فلاں وظیفہ پڑھو گے تو اولاد ہوگی تو اس کے لیے فوراً تیار ہو جائیں گے، لیکن اگر کوئی یہ کہہ دے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھو...... اپنے مال کی زکوٰۃ دو...... تقویٰ اور پاکیزگی اختیار کرو...... حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو...... جو مانگنا ہے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے دو رکعت پڑھ کر مانگو تو طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یہ بندہ پورے یقین و اعتماد سے کہتا ہے کہ اگر کسی گھر میں حرام داخل نہ ہوتا ہو، زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کا اہتمام ہو، اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کو پامال نہ کیا جاتا ہو، اس کے احکام کی تعمیل کی جاتی ہو، طہارت و پاکیزگی کا اہتمام ہو تو اس گھر میں جن، بھوت، پریت اور آسیب کا کبھی ڈیرا نہیں ہو سکتا، نہ ہی اس پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے۔

آج کا انسان جب گھریلو پریشانیوں سے تنگ آتا ہے تو پیروں فقیروں کے پاس بھاگتا ہے کہ وہ کوئی وظیفہ بتائیں، آپ خود بتایئے......؟ آپ اہلِ علم ہیں یہ بتائیے کہ روز ایک لاکھ مرتبہ "یَا عَزِیْزُ" پڑھنا ہے تو کیا اس طرح پڑھ لینے سے مسئلے کا حل ہو جائے گا؟ جب کہ گھر میں ٹی وی چل رہا ہے، عورتیں بے پردہ ہیں، حرام کی کمائی ادھر ادھر پیٹ کا ایندھن بن رہی ہے، منگنی اور شادی کی دعوت میں وہ بے حیائی جو اللہ کے غضب کو دعوت دے تو کیا وظیفے سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟ ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ بعض پریشان حال اور پراگندہ لوگ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر یَا رَبِّ یَا رَبِّ پکارتے ہیں لیکن ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں اس

لیے کہ ان کا کھانا حرام، پینا حرام، پہننا حرام ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ کیا کرو اس سے بلائیں اور بیماریاں دور ہوتی ہیں۔[2] لیکن ہمارے بھولے بھالے مسلمان کا عمل یہ ہے کہ وہ یتیموں مسکینوں غریبوں کو تو اپنے دروازے سے دھکے دے کر بھگاتا ہے جب کہ ایک تعویذ حاصل کرنے کے لیے عاملوں کی تجوریاں بھرنے تیار رہتا ہے یہ مسلمان کی سادگی نہیں کہ وہ قرآن کی آیتوں کو گھول کر پی گیا، تعویذ بنا کر گلے کا ہار بنا لیا، نئی دکان بنائی یا مکان تعمیر کیا تو برکت کے لیے سپارے پڑھوا لیے، گھر والوں میں سے کوئی بیمار ہو گیا تو سورۂ یٰسین کا ورد کرا لیا لیکن اگر کچھ نہ کر سکا تو قرآن کے پیغام پر غور و فکر نہ کیا۔[3]

لہٰذا ائمہ کرام ان پریشان حال مقتدیوں کو بتائیں کہ اللہ کو ناراض کرنا چھوڑ دیں۔

جب آدمی اللہ کو راضی کرلے گا، تو پریشانیاں دور ہو جائیں گی، علماء سلف میں کچھ نصیحتیں ایسی تھیں جو باہم ایک دوسرے کو لکھا کرتے تھے، وہ نصیحتیں امام ہر مقتدی کو کرے اور اپنے پاس ہر آنے والے شخص کو ان تین نصیحتوں پر عمل کرنے کی ترغیب دے، وہ تین نصیحتیں یہ ہیں:

1 ...... مَنْ عَمِلَ لِآخِرَتِہٖ كَفَاهُ اللّٰهُ أَمْرَ دُنْيَاهُ۔

2 ...... وَمَنْ أَصْلَحَ سَرِيْرَتَهٗ أَصْلَحَ اللّٰهُ عَلَانِيَتَهٗ۔

3 ...... وَمَنْ أَصْلَحَ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ أَصْلَحَ اللّٰهُ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّاسِ۔[4]

---

[1] مسند احمد ۲/۳۲۸، رقم: ۸۱۴۸

[2] ترمذی، الزکوۃ، باب ماجاء فی فضل الصدقة، رقم: ٦٦٤

[3] بشکریہ "خواتین کا اسلام" (۷۰) ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ [4] تفسیر روح البیان: ۲/۱۳۱

تَرجَمہ: جو شخص آخرت کے لیے کام میں مشغول ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دنیا کے کاموں کو خود بخود درست فرما دیتے ہیں، اور ان کی ذمہ داری خود لے لیتے ہیں۔

جو شخص اپنے باطن کو صحیح کرلے کہ قلب کا رخ سب سے ہٹا کر اللہ کی طرف پھیر دے تو اللہ تعالیٰ اس کی ظاہری حالت کو خود بخود درست فرما دیتے ہیں۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے معاملہ کو صحیح و درست کرلے اللہ تعالیٰ اس کے اور تمام لوگوں کے درمیان کے معاملات کو خود درست فرما دیتے ہیں" (دنیا ذلیل ہو کر اس کے قدموں میں گرتی ہے)۔[1]

اسی طرح ایسے مواقع پر امام صاحب کو چاہیے کہ بجائے تعویذ گنڈے کے ان کو تسلی دے، حوصلہ بڑھائے اور ان مسنون اعمال کی طرف متوجہ کرے، مثلاً:

(۱) توبہ، استغفار، اللہ کے حقوق ادا کرنے میں جو کوتاہی ہو رہی ہے اس کی طرف توجہ دلائے اور پیار محبت سے سمجھائے کہ گھر کے تمام مرد حضرات مسجد میں جماعت کے ساتھ پانچ وقت کی نماز پڑھیں، اور عورتیں وقت داخل ہوتے ہی اہتمام سے اطمینان کے ساتھ پانچ وقت کی نماز پڑھیں۔

اسی طرح اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایک پیسے اور دیگر قابل زکوۃ اشیاء کا حساب لگا کر پوری پوری زکوۃ ادا کرے کہ جس مال کی زکوۃ ادا کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔

(۲) اسی طرح مال کمانے میں بہت احتیاط رکھے، اذان سنتے ہی سیدھا نماز کے لیے چلا جائے اور غلط قسم کا مال جمع نہ ہونے پائے کہ وہ پھر صحیح مال کو بھی لے ڈوبتا ہے، بغیر عیب بتاتے ہوئے سودا بیچ کر نظر تو یہ آتا ہے کہ دھوکہ یا غلط بیانی کرکے اتنا مال کما لیا، لیکن مستقبل میں وہ مال خود بھی جاتا ہے اور گاہک کی بد دعا سے دوسرے

[1] معارف القرآن: ۶۷۹/۴، ہود: ۱۱۵

مال کو بھی لے جاتا ہے۔

الغرض مصیبتوں سے حفاظت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کا دل نہ دکھائے...... کسی کی آہ نہ لے...... کسی کا شرعی حق ضائع نہ کرے...... ماتحتوں مثلاً بیوی بچوں شاگردوں اور ملازموں پر ظلم نہ ہو...... اور جس جگہ کام کر رہے ہیں وہاں ساتھیوں پر حسد اور چغل خوری نہ ہو...... اسی طرح والد کے انتقال کے بعد بہنوں یا چھوٹے بھائیوں کے حق دبانے سے نئی نئی بلاؤں بیماریوں اور مصیبتوں کا دروازہ کھلتا ہے...... اور یہ جو پیسہ بہنوں کا یتیموں کا دبایا ہوا ہوتا ہے وہ ہسپتالوں یا عدالتوں میں ضائع ہو جاتا ہے۔

(۳) مسنون اعمال اور مسنون دعاؤں کی طرف متوجہ کریں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ضرورت پوری کرکے گھر واپس آتے اور دروازے پر پہنچتے تو کھنکارتے اور تھوکتے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ اچانک اندر آئیں اور ہمیں کسی نامناسب حالت میں دیکھ لیں۔

چناں چہ وہ ایک دن آئے اور انہوں نے کھنکارا، اس وقت میرے پاس ایک بڑی عورت تھی جو منتر پڑھ کر مجھ پر دم کر رہی تھی۔ میں نے اس کو پلنگ کے نیچے چھپا دیا۔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اندر آکر میرے پاس بیٹھ گئے۔ ان کو میری گردن میں ایک دھاگہ نظر آیا، انہوں نے کہا یہ دھاگہ کیسا ہے؟

میں نے کہا اس پر منتر پڑھ کر کسی نے مجھے دیا ہے۔ انہوں نے دھاگہ پکڑ کر کاٹ دیا اور فرمایا عبد اللہ کے گھر والوں کو شرک کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ منتر، تعویذ گنڈا یہ سب شرک ہے (بشرطیکہ ان چیزوں کو ہی خود اثر کرنے والا سمجھے) میں نے ان سے کہا: آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں؟ میری آنکھ دکھتے آتی تھی میں فلاں یہودی کے پاس جایا کرتی تھی وہ دم کیا کرتا

تھا۔ جب بھی وہ دم کرتا میری آنکھ ٹھیک ہو جاتی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ سب کچھ شیطان کی طرف سے تھا۔ شیطان تمہاری آنکھ پر ہاتھ سے چوکا دیتا تھا (جس سے آنکھ دکھنے لگ جاتی تھی) جب وہ یہودی دم کرتا تو وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیتا (جس سے آنکھ ٹھیک ہو جاتی) تمہیں یہ کافی تھا کہ تم اس موقع پر یہ دعا پڑھ لیتیں جو کہ حضور ﷺ پڑھا کرتے تھے:

"اَذْهِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ اِشْفِ اَنْتَ الشَّافِیْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُكَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا."[1]

جب آپ پریشان حال شخص کو گناہوں کے چھوڑنے اور توبہ کرنے پر آمادہ کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر آیا ہوا عذاب دور ہو جائے گا، پھر یہ مسنون دعائیں انسان کی زندگی میں آنے والی ہر قسم کی بلاؤں اور مصیبتوں سے بچاؤ کا ذریعہ بن جائیں گی، یہ دعائیں جان ومال، گھر اور اہل خانہ کو شیاطین، جن وانس کے شر سے محفوظ رکھنے کا ایک ایسا تعویذ بھی ہیں جو ہر مشکل اور ہر تکلیف کے موقع پر ہر طرح کی حفاظت کا سبب بھی بنے گا۔

حضور ﷺ نے کوئی انسانی ضرورت اور حاجت ایسی باقی نہیں چھوڑی جس کے لیے دعا مانگنا سکھائی نہ ہو۔ لہٰذا ہم صبح ان دعاؤں کا معمول بنالیں تو گویا شام تک حفاظت اور عافیت کے اسباب کا انتظام کرلیا۔ اور شام کو بھی یہ دعائیں مانگنے کا معمول بنالیں تو آئندہ صبح تک ہم اللہ کی حفاظت کے دائرے میں آگئے۔

جادو...... آسیب...... نظر بد...... دل کی گھبراہٹ...... دشمن کی بدخواہی...... وغیرہ سے بھی حفاظت کا یہ دعائیں بہترین ذریعہ ہیں۔

ترمذی شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا، اس کے لیے رحمت

[1] ابن ماجہ، ابواب الطب، باب تعلیق التمائم: ۲۵۲

کے دروازے کھل گئے" اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند یہ ہے کہ بندہ عافیت کی دعا مانگے، اور آپ ﷺ نے فرمایا: دعا فائدہ دیتی ہے اس بلا ومصیبت سے جو نازل ہو چکی (یعنی بطور دل کی تسلی کے اور بڑی مصیبت کے نزول سے بچاؤ کے) اور اس سے بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی (یعنی آنے والی مصیبت کے لیے آڑ بن جاتی ہے)۔[1]

نہایت ہی ادب سے اور عاجزانہ گزارش ہے کہ زبانِ نبوت سے نکلی ہوئی صبح شام کی دعاؤں کو (جن میں دنیا وآخرت کی ساری خیروں کی طلب ہے اور شرور سے پناہ مانگی گئی ہے) اپنے معمولات میں ضرور شامل فرمالیں۔

حضور ﷺ سے محبت شرط ایمان ہے اور اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ذکر ہو یا دعا ہو، صلوٰۃ وسلام ہو یا مناجات ہوں سب اسی طریقے پر اور ان ہی الفاظ میں ادا کیے جائیں جو خود نبی اکرم ﷺ نے سکھائے اور تلقین فرمائے ہیں۔

اس لیے کہ جو دعائیں قرآن مجید میں مذکور ہیں اور جو اذکار ووظائف نبی کریم ﷺ نے تعلیم وتلقین فرمائے ہیں وہ اس قدر کافی ہیں کہ کسی اور طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا حضور اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے جو فیضان صبح وشام ان دعاؤں کی شکل میں ہمیں ملا ہے، ہم میں سے ہر ایک کو اس عظیم نعمت اور بہت بڑی سعادت کی قدر کرنی چاہیے۔ اس طرح کہ ہر مرد دفتر جانے سے پہلے اور عورت گھریلو کاموں میں لگنے سے پہلے یہ دعائیں ضرور مانگ لے۔ یہ صبح وشام کی تیس دعائیں اللہ کی دی ہوئی توفیق سے ہم نے جمع کی ہیں مستند حوالوں کے ساتھ۔ ان دعاؤں کے بارے میں مقتدیوں کو ترغیب دیں کہ ان کا معمول بنائیں۔ اسی طرح عام دینی کتب خانوں میں صبح وشام کی دعائیں کارڈ میں چھپی ملتی ہیں۔ وہ خرید کر اپنے پاس رکھیں۔

[1] ترمذی، الدعوات، باب من فتح له منكم باب الدعاء: ۲/۱۹۵

② اسی طرح ہمارے استاذ حضرت مفتی ولی حسن صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی عجیب بات فرماتے تھے کہ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ قرآن کریم کی بالکل آخری دو سورتیں ہیں اور ان کو آخر میں لانے میں ایک لطیف اشارہ یہ بھی ہے کہ ان دو سورتوں کی مسلمانوں کو آخری زمانے (قرب قیامت کے دور) میں چوں کہ وہ زمانہ فتنوں سے بھرا ہوا ہوگا، زیادہ ضرورت پڑے گی۔ لہٰذا ہم سب کو چاہیے کہ اس زمانہ میں خصوصاً ان دو سورتوں کو کثرت سے پڑھنے کا معمول بنالیں۔ اور پریشان حال مقتدیوں کو ان دو سورتوں کے پڑھنے کی مستقل ترغیب دیں۔

③ سورۂ بقرہ گھر میں پابندی سے تلاوت کروائیں۔

④ ایسے گھر والوں کو نصیحت کریں کہ ایسا مریض جس کو شیطان یا جنات پریشان کرتے ہوں ان کے کان میں اذان دیں۔

جو شخص کسی رنج و غم میں مبتلا ہو اس کے کان میں اذان دینے سے اس کا رنج و غم دور ہوتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے مجھے غمگین دیکھ کر فرمایا: ابن ابی طالب! میں تمہیں غمگین دیکھ رہا ہوں؟ میں نے کہا:

جی ہاں! آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

"فَمُرْ بَعْضَ اَهْلِكَ يُؤَذِّنُ فِیْ اُذُنِكَ فَاِنَّهٗ دَوَاءُ الْهَمِّ"[1]

تَرْجَمَہ: تم اپنے گھر والوں میں سے کسی سے کہو کہ وہ تمہارے کان میں اذان دے کیوں کہ یہ غم کا علاج ہے۔"

حضرت علی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ عمل کیا تو میرا غم دور ہو گیا، اسی طرح اس حدیث کے تمام راویوں نے اس کو آزما کر دیکھا تو سب نے اس کو

[1] کنز العمال، الاوّل، الاذکار: ۲/۵۵، رقم: ۳۱۳۷

تجربہ پایا۔

⑤ ہر مقتدی کو اور ہر پریشان شخص کو یہ نصیحت کریں کہ گھر سے نکلنے کے وقت اور گھر میں داخل ہونے کے بعد دو رکعت نفل پڑھ لیا کریں کہ اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ اندرونی اور بیرونی پریشانیوں سے اور بلاؤں سے حفاظت رہے گی۔

حضرت ابو ہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا کہ:

"اِذَا دَخَلْتَ مَنْزِلَكَ فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ تَمْنَعَانِكَ مَدْخَلَ السُّوْءِ، وَاِذَا خَرَجْتَ مِنْ مَنْزِلِكَ فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ تَمْنَعَانِكَ مَخْرَجَ السُّوْءِ."[1]

تَرْجَمَہ: "جب تم گھر میں داخل ہو تو دو رکعت نماز پڑھ لیا کرو یہ دو رکعتیں تمہیں گھر میں داخل ہونے کے بعد کی برائی سے بچالیں گی۔ اسی طرح گھر سے نکلنے سے پہلے دو رکعت پڑھ لیا کرو یہ دو رکعتیں تمہیں گھر سے باہر نکلنے کے بعد کی برائی سے بچالیں گی۔"

جن میاں بیوی میں جھگڑے رہتے ہیں وہ اہتمام سے اس تدبیر پر عمل کریں کہ گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے دو رکعت نفل پڑھیں۔

حضرت مولانا یوسف کاندھلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے "حیاۃ الصحابہ" میں اس پر باب باندھا ہے "اَلْاِهْتِمَامُ بِالنَّوَافِلِ عِنْدَ دُخُوْلِ الْمَنْزِلِ وَالْخُرُوْجِ مِنْهُ" کہ گھر میں داخل ہوتے وقت اور نکلتے وقت نوافل کا اہتمام۔

اسی طرح ایسے شوہر کو "تحفۂ دولہا" اور "مثالی باپ" نامی کتاب کے مطالعہ کرنے کی ترغیب دیں اور بیوی کو "تحفۂ دلہن" اور "مثالی ماں" کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دیں۔

[1] مجمع الزوائد، الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ اذا دخل منزلہ: ۲/۴۷۳، رقم: ۳۶۸۶

❻ اسی طرح پریشان حال لوگوں کے لیے جامعہ دارالعلوم کراچی کے حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی مدظلہ العالی نے فرمایا کہ یہ تین دعائیں کسی بھی وقت کسی بھی ہیئت کے ساتھ پڑھ کر اپنی حاجت ذکر کر کے اللہ سے رو رو کر مانگیں اور وہ یہ ہیں:

اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھ کر درج ذیل کلمات پڑھیں:

❶ ۵۰۰ مرتبہ آیت کریمہ پڑھیں، آیت یہ ہے:

﴿لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ﴾

❷ ۵۰۰ مرتبہ:

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾

پڑھیں۔

❸ ۵۰۰ مرتبہ:

﴿لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ﴾

پڑھیں۔

اس کے بعد گڑگڑا کر دعا کریں۔ نیز روزانہ کسی وقت دو رکعت نفل بھی پڑھ لیا کریں اور اس کے بعد دعا کیا کریں، اور پریشانی دور ہونے تک روزانہ مذکورہ عمل کرتے رہیں اور اوپر لکھا ہوا کلمہ نمبر ۲ چلتے پھرتے زبان پر رکھیں اور دل ہی دل میں گڑگڑا کر دعا کرتے رہیں، یہ بہت مفید اور مجرب عمل ہے۔

یہ وہ چھ اعمال ہیں، جن کے کرنے کی طرف آپ لوگوں کو آمادہ کریں گے تو دو فائدے حاصل ہوں گے:

❶ عوام الناس اس غلط قسم کے عاملین، ...... پروفیسرز، ...... جوتشی ...... اور نجومی ...... سے بچ جائیں گے۔ چناں چہ اس طرح وہ شرک اور کفریہ عقائد سے محفوظ ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کی جہنم میں جانے سے بچ جائیں گے، نہ وہ کسی کو اپنا ہاتھ دکھائیں گے نہ وہ کسی کو

ہاتھ دکھائیں گے۔ ان پریشان حال لوگوں کا یہ یقین بنائیے کہ ساری دنیا کے جنات قدیم وجدید اور سارے جادوگر بھی مل کر اللہ کے حکم کے بغیر آپ کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس لیے جنات سے ہرگز ڈرنا نہیں چاہیے یہ مخلوق ہیں، نفع اور ضرر پہنچانے میں اللہ کے حکم کے محتاج ہیں، نافع اور ضار صرف اور صرف اللہ جل جلالہ ہے۔

اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اللہ کو راضی رکھے، اللہ کی مدد کو اپنے ساتھ رکھے، جب اللہ کی مدد شامل حال ہوگی تو پھر کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا، لوگوں کو یہ سمجھائیں کہ ڈرنے کی چیزیں وہ نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو بلکہ ڈرنے کی چیزیں اللہ کی نافرمانیاں، ...... گناہ، ...... بندوں پر ظلم، ...... لوگوں کی آہیں، ...... والدین کو ستانا، ...... بیوی، بچوں یا بہو کو ستانا، ...... گاہکوں کو دھوکہ دینا، ...... ملازمت کے اوقات میں ڈنڈی مارنا، ...... رشتہ داروں کے ساتھ قطع رحمی کرنا، ...... بے پردہ پھرنا، ...... گھروں میں ٹی وی کی لعنت رکھنا ...... یہ سب چیزیں ڈرنے کی ہیں۔ اس لیے کہ اگر اللہ ناراض ہے اور اس نے اپنی ناراضگی کی بنا پر کوئی عذاب بھیجا ہے چاہے جنات کی شکل میں ہو یا چاہے بے سکونی کی شکل میں ہو تو اس عذاب کو عاملین اور تعویذ دور نہیں کر سکتے۔ اگر ایک جن ظاہر میں دور ہو گیا تو دوسرے دس جن مزید مسلط ہو جائیں گے، اگر ایک روزگار مل گیا تو دوسرے دس خرچے مسلط ہو جائیں گے، ایک پریشانی دور ہوئی تو دس اور پریشانیاں مسلط ہو جائیں گی۔ اس لیے سب سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اللہ سے صلح کر لو۔

❷ دوسرا فائدہ ان مسنون اعمال کی طرف توجہ دلانے کا یہ ہوگا کہ ہر شخص کا تعلق براہِ راست اللہ سے ہوگا جو شریعت کا اصل مقصود ہے۔ ہر ایک خود گناہوں سے بچ کر نیکیاں کر کے دعا مانگنے لگا، دعا مانگنے میں بزرگوں کے پاس جانے کا، یا ان کے مزاروں پر جانے کا خواہش مند نہیں رہے گا۔

مولانا منظور نعمانی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے اپنی کتاب ”قرآن آپ سے کیا کہتا ہے“ میں اس پر بہت پیاری بحث فرمائی ہے چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

اللہ ربّ العزت کی مہربانیاں عام ہیں

اللہ تعالیٰ کے بارے میں بہت سی قومیں نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اس غلط فہمی میں مبتلا رہی ہیں کہ انہوں نے اس کو ایک جلالی شہنشاہ سمجھا جو قہر اور غضب سے بھرپور ہے اور جس کو راضی اور خوش کرنا بڑا ہی مشکل ہے۔ گویا عام انسانوں کے بس کی بات ہی نہیں ہے اور (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) جس کے پاس گنہگار اور خطا کار بندوں کے لیے بس لعنت ہی لعنت ہے اور غضب ہی غضب اور عذاب ہی عذاب ہے۔

اور اگر رحیم اور مہربان ہے بھی تو اس کی رحمت اور مہربانیاں کسی خاص خاندان یا خاص نسل اور قوم کے لیے محدود ہیں، باقی ساری دنیا کے لیے وہ بڑا سخت گیر اور جبار وقہار حاکم ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہی غلط فہمی اور گمراہی بہت سی قوموں کے شرک کا سبب بنی ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ ان کی زندگی گناہوں سے پاک نہیں ہے اور اس دنیا میں نیکی اور پاکی والی زندگی گزارنا گویا ان کے بس کی بات ہی نہیں ہے اور اپنی جہالت سے انہوں نے سمجھا کہ خدا ایسا سخت گیر اور جلالی ہے کہ خطا کاروں اور گناہ گاروں پر وہ ہرگز رحم اور مہربانی نہیں کرسکتا، اس لیے اللہ کی طرف سے تو وہ بالکل ناامید ہوگئے۔

اور شیطان نے ان کے کان میں پھونکا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں کچھ ہستیاں ایسی بھی ہیں، جو اپنی نیکی اور پاکی کی وجہ سے بڑی مقرب اور بڑی پیاری ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی بہت کچھ اختیار دے رکھا ہے اور ان میں اللہ تعالیٰ کا سا جلال اور غصہ بھی نہیں ہے اور انہیں راضی کرنا اللہ کو راضی کرنے کی طرح زیادہ مشکل بھی نہیں

ہے۔ اس لیے ان کے دامنوں میں تم جیسے گناہ گاروں کو بھی پناہ مل سکتی ہے اور ان سے تعلق جوڑنے سے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور گرفت سے بھی بچایا جاسکتا ہے۔

بس اسی کو انہوں نے آسان سمجھا اور اللہ تعالیٰ سے ناامید ہوکر شیطان کی بتلائی ہوئی ان ہستیوں کی تعظیم وعبادت اور ان کے نام کی نذر ونیاز اس امید پر کرنے لگے کہ ان کی مہربانی سے ہم سرسبز رہیں گے اور ان کی توجہ اور عنایت سے ہمارے کام بنے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کی گرفت اور اس کے عذاب سے بھی ان کا یہ تعلق ہمیں بچالے گا۔

الغرض اکثر مشرک قوموں کے حالات اور خیالات پر گہری نظر ڈالنے سے یہی پتا چلتا ہے کہ شرک میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ ان کی یہی گمراہی رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وبخشش اور جود وکرم کی صفت کو انہوں نے نہیں جانا اور اس کو صفت قہر وجبر والا اور نہایت سخت گیر قسم کا جلالی بادشاہ سمجھ کر اس کی طرف سے ناامید ہوگئے اور شیطان کی بتائی ہوئی واقعی یا محض فرضی اور وہمی ہستیوں کو انہوں نے اپنی امیدوں کا قبلہ بنادیا۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بے انتہا وسعت اور اس کی غفاریت اور بخشش کی شان سے واقف ہوتے تو اس شرک میں ہرگز گرفتار نہ ہوتے۔

اسی لیے قرآن مجید میں جو اس دنیا کے لیے آخری ہدایت نامہ ہے اللہ تعالیٰ کی اس شان اور اس صفت کو بہت زیادہ اجاگر کیا گیا ہے اور بلا مبالغہ سیکڑوں جگہ مختلف عنوانوں اور مختلف پیرایوں میں اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت ورافت اور اور بخشش وغفاریت اور تملق کے ساتھ اس کی عنایت ومحبت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ جن خوش بختوں کو قرآن مجید کی تلاوت کی توفیق ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس میں کتنی جگہ اللہ تعالیٰ کو ”غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ، تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ، خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ، اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ“ کی صفات سے یاد کیا گیا ہے یہاں تک کہ ”بِسْمِ اللّٰہِ“ جو

قرآن مجید کا سرنامہ ہے اس میں اس کی صفت رحمت ہی کا تعارف کرایا گیا ہے۔[1]

بے خوابی اور برے خواب سے بچنے کے لیے

مسنون اعمال

اب جو لوگ بے خوابی، اور خوف و ڈر جیسی پریشانیاں لے کر آتے ہیں یا برے خواب سے پریشان ہوتے ہیں تو ائمہ کرام ان تدابیر پر عمل کرنے کی ترغیب دیں۔

1. ذہنی دباؤ یا غم کو بھول جائیں، بار بار اسے یاد نہ کریں اور تقدیر پر راضی رہیں۔
2. رات کا کھانا کھانے کے فوراً بعد نہ سوئیں بلکہ وقفہ رکھیں، کہ پیٹ بھرے ہوئے لیٹنے سے بھی بخارات ذہن پر جمع ہو کر برے خواب نظر آتے ہیں اس لیے رات کو کھانے کے بعد ٹہلنا آداب میں سے ہے۔
3. عشاء کی نماز پڑھ کر کچھ ذکر و اذکار کر کے باوضو لیٹیں اور بستر پر بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہیں۔

امام طبرانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ حضرت ابن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُمَا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:

"طَهِّرُوْا هٰذِهِ الْأَجْسَادَ طَهَّرَكُمُ اللّٰهُ، فَإِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يَبِيْتُ طَاهِرًا إِلَّا بَاتَ مَعَهٗ فِيْ شِعَارِهٖ مَلَكٌ لَا يَنْقَلِبُ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ إِلَّا قَالَ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعَبْدِكَ فَإِنَّهٗ بَاتَ طَاهِرًا."[2]

تَرجَمَہ: "ان جسموں کو پاک کرو اللہ تعالیٰ تمہیں پاکیزگی عطا فرمائے۔ جو بندہ بھی طہارت کی حالت میں سوئے یقیناً ایک فرشتہ اس کے ساتھ رات بسر کرتا ہے، جب بھی وہ شخص رات کے کسی وقت کروٹ بدلتا ہے تو وہ فرشتہ (دعا کرتے ہوئے) کہتا ہے "اے اللہ! اپنے بندے کو معاف فرما، یقیناً وہ حالت طہارت میں سویا تھا۔"

[1] قرآن آپ سے کیا کہتا ہے ص ۴۷

[2] الترغیب والترھیب، کتاب النوافل، الترغیب فی ان یبام الانسان طاھرا ۲۳۱/۱

حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُمَا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ بَاتَ طَاهِرًا بَاتَ فِيْ شِعَارِهٖ مَلَكٌ، فَلَمْ يَسْتَيْقِظْ إِلَّا قَالَ الْمَلَكُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعَبْدِكَ فُلَانٍ فَإِنَّهٗ بَاتَ طَاهِرًا."[1]

تَرجَمَہ: "جو شخص حالت طہارت میں سوئے تو اس کے ہمراہ ایک فرشتہ ہوتا ہے، جب بھی وہ بیدار ہوتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! اپنے فلاں بندے کو معاف فرما۔ یقیناً وہ طہارت کی حالت میں سویا تھا۔"

امام ابن حبان رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے اپنی کتاب میں اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا ہے:

"ذِكْرُ اسْتِغْفَارِ الْمَلَكِ لِلْبَائِتِ مُتَطَهِّرًا عِنْدَ اسْتِيْقَاظِهٖ."[2]

تَرجَمَہ: "حالت طہارت میں سونے والے کے لیے بیدار ہونے پر فرشتے کا استغفار کرنا۔"

مذکورہ بالا احادیث سے حالت طہارت میں سونے والے شخص کے بارے میں دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

1. ایک فرشتہ اس کے ساتھ رات بسر کرتا ہے۔ فرشتے کی صحبت کا میسر آنا کتنی عظیم الشان اور جلیل القدر نعمت ہے۔ حالت طہارت میں سونے کی اس کے علاوہ اور کوئی فضیلت بھی نہ ہوتو اس عمل کی عظمت پر دلالت کرنے کے لیے یہی ایک بات

[1] الترغیب والترھیب، کتاب النوافل، الترغیب فی ان یبام الانسان طاھرا ۲۳۰/۱

[2] صحیح ابن حبان، الطھارۃ، باب فضل الوضوء: ۱۵۰/۲، رقم: ۱۰۴۸

کافی ہے۔

❷ رات کو کروٹ بدلتے وقت اور بیدار ہونے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ فرشتہ ایسے شخص کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

حالتِ طہارت میں سونے کی صرف یہی فضیلت نہیں۔

ایک حدیث شریف میں اس عمل کی ایک اور فضیلت دعاؤں کی قبولیت بھی بیان کی گئی ہے۔ امام ابوداؤد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ حضرت معاذ بن جبل رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَبِيتُ عَلَى ذِكْرٍ طَاهِرًا فَيَتَعَارُّ مِنَ اللَّيْلِ، فَيَسْأَلُ اللّٰهَ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ إِلَّا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ." [1]

تَرجَمَہ: "ذکر کرتے ہوئے حالتِ طہارت میں سونے والا مسلمان رات کو بیدار ہونے پر دنیا و آخرت کی جو بھلائی اللہ تعالیٰ سے طلب کرتا ہے وہ اس کو عطا فرماتا ہے۔"

اس حدیث شریف سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ دعاؤں کی قبولیت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ بندہ ذکر کرتے ہوئے حالتِ طہارت میں سوئے اور رات کو بیدار ہونے پر دعا کرے۔ [2]

کیوں کہ اس بات کی خبر رسول اللہ ﷺ نے امت کو دی ہے اور معلوم ہے کہ آں حضرت ﷺ دینی باتوں کے متعلق خبر اللہ تعالیٰ کی وحی ہی سے دیتے تھے۔

اور اگر پھر بھی اس طرح کا کوئی خواب نظر آئے تو درج ذیل تین کام کریں:

(الف) اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں شیطان مردود سے اور

[1] ابو داؤد، الادب، باب فی النوم علی طہارۃ: ۳۳۱

[2] فرشتوں کا درود پانے والے: ۲۸

(ب) بائیں طرف تھتکاریں اور

(ج) کروٹ بدل کر بے فکر ہو کر سو جائیں۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جب برا خواب دیکھو تو اس دعا کو پڑھ لیا کرو:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ وَسَيِّئَاتِ الْأَحْلَامِ فَإِنَّهَا لَا تَكُونُ شَيْئًا." [1]

تَرجَمَہ: "اے اللہ! تیری پناہ چاہتا ہوں میں شیطان کے عمل سے اور برے خواب سے کیوں کہ وہ کچھ نہیں ہے۔"

جادو سے بچنے کے لیے مسنون اعمال

اب جادو کے اثر کو ختم کرنے کے لیے چند مسنون اعمال ذکر کیے جاتے ہیں ان اعمال کو کرنے سے اِنْ شَاءَ اللّٰہُ جادو کا اثر ختم ہو جائے گا۔

❶ مدینہ منورہ کی عجوہ کھجور کے سات دانے صبح نہار منہ کھالیں، اگر مدینہ منورہ کی عجوہ کھجور نہ ملے تو کسی بھی شہر کی عجوہ کھجور استعمال کر سکتے ہیں۔

حدیث نبوی میں آتا ہے: "جو شخص عجوہ کھجور کے سات دانے صبح کے وقت کھا لیتا ہے اسے زہر اور جادو کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" [2]

❷ احتیاطی تدبیر وضو ہے، کیوں کہ باوضو مسلمان پر جادو اثر انداز نہیں ہو سکتا اور وہ فرشتوں کی حفاظت میں رات گزارتا ہے۔ [3]

❸ مردوں کے لیے باجماعت نماز کی پابندی، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی پابندی کی وجہ سے انسان شیطان سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اس سلسلے میں سستی برتنے

[1] عمل الیوم واللیلۃ لابن سنی، باب ما یقول إذا رأی في منامہ ما یکرہ: ۲۵۱

[2] بخاری کتاب الطب، باب الدواء بالعجوۃ للسحر: ۲/۸۵۹

[3] صحیح الزوائد، الطہارۃ: ۱/۳۲۷، رقم ۱۱۴۶

کی وجہ سے شیطان اس پر غالب آجاتا ہے اور جب وہ غالب آجاتا ہے تو اس کے اندر داخل بھی ہوسکتا ہے اور اس پر جادو بھی کرسکتا ہے، رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: "کسی بستی میں جب تین آدمی موجود ہوں اور وہ باجماعت نماز ادا نہ کریں تو شیطان ان پر غالب آجاتا ہے، سو تم جماعت کے ساتھ رہا کرو، کیوں کہ بھیڑیا اس بکری کا شکار کرتا ہے جو ریوڑ سے الگ ہوجاتی ہے۔"[1]

۴ قیام اللیل: جو شخص جادو کے اثر سے بچنے کے لیے قلعہ بند ہونا چاہے اسے قیام اللیل ضرور کرنا چاہیے، کیوں کہ اس میں کوتاہی کرکے انسان خود بخود اپنے اوپر شیطان کو مسلط کرلیتا ہے، اور اس کے مسلط ہونے کی صورت میں اس کے لیے جادو کا راستہ ہموار ہوجاتا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے پاس ایک ایسے شخص کا ذکر کیا گیا جو صبح ہونے تک سویا رہتا ہے اور قیام اللیل کے لیے بیدار نہیں ہوتا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اس کے کانوں میں شیطان پیشاب کرجاتا ہے۔"[2]

۵ بیت الخلا میں جاتے ہوئے اس کی دعا پڑھنا، ناپاک جگہ پر شیطان کا گھر اور ٹھکانہ ہوتا ہے، اس لیے اس میں کسی مسلمان کی موجودگی کو شیطان غنیمت تصور کرتا ہے، اور خود ایک جن نے بتایا تھا کہ وہ ایک شخص میں داخل ہوجانے میں کامیاب ہوگیا تھا جب اس نے بیت الخلا میں جاتے ہوئے دخولِ خلا کی دعا نہیں پڑھی تھی، اور ایک اور جن نے بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایک طاقتور اسلحہ عطا کیا ہے جس کے ذریعے تم ہمارا خاتمہ کرسکتے ہو، صاحب کتاب (جادو کا علاج) نے کہا: وہ کیا ہے؟ اس نے جواباً کہا کہ وہ مسنون اذکار ہیں۔

---

[1] أبو داود، الصلاۃ، باب التشدید فی ترک الجماعۃ، رقم: ۵۴۷

[2] بخاری، التہجد، باب إذا نام ولم یصل بال الشیطان فی أذنہ، رقم: ۱۱۴۴

اور رسول اکرم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ بیت الخلا میں جاتے ہوئے یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ"[1]

۶ نماز شروع کرتے وقت شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے تو یہ دعا فرماتے:

"أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ."[2]

ترجمہ: "میں اس اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں جو ہمیشہ سننے والا جاننے والا ہے، شیطان مردود سے اس کے وسوسے اور جھاڑ پھونک سے۔"

۷ سونے سے پہلے وضو کرلیں، پھر آیت الکرسی پڑھ لیں اور اللہ کو یاد کرتے کرتے سو جائیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ شیطان نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا تھا: "جو شخص سونے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ لیتا ہے، صبح ہونے تک ایک فرشتہ اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے اور شیطان اس کے قریب نہیں آسکتا" یہ بات جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو بتائی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"أَمَا إِنَّهٗ قَدْ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوْبٌ"[3]

"اس نے سچ کہا ہے حالاں کہ وہ جھوٹا ہے۔"

۸ نماز فجر کے بعد یہ دعا سو مرتبہ پڑھیں:

---

[1] بخاری، الدعوات، باب الدعاء عند الخلاء: ۹۳۶/۲

[2] الترمذی، الصلوۃ، باب ما یقول عند افتتاح الصلوۃ: ۵۷/۱

[3] بخاری، الوکالۃ، باب إذا وکل رجلاً فترک الوکیل شیئاً۔۔۔ رقم: ۲۳۱۱

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

اور حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص بھی یہ دعا سو مرتبہ صبح کے وقت پڑھ لیتا ہے اسے دس غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے، اس کے لیے سو نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں، اس سے سو برائیاں مٹا دی جاتی ہیں اور شام ہونے تک وہ شیطان سے محفوظ رہتا ہے۔"[1]

ایک روایت میں "حِرْزًا مِنْ كُلِّ مَكْرُوْهٍ" ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن غنم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص فجر کی نماز کے بعد (جس طرح نماز میں بیٹھتے ہیں اسی طرح) دو زانوں بیٹھے ہوئے بات کرنے سے پہلے دس مرتبہ یہ کلمات پڑھتا ہے:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"[2]

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اپنی ذات و صفات میں اکیلے ہیں۔ کوئی ان کا شریک نہیں، سارا ملک دنیا اور آخرت ان ہی کا ہے۔ ان ہی کے ہاتھ میں تمام تر بھلائی ہے اور جتنی خوبیاں ہیں وہ ان ہی کے لیے ہیں۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہیں۔"

تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں، دس گناہ مٹا دیے جاتے ہیں، دس درجے بلند کر دیے جاتے ہیں، پورے دن ہر ناگوار اور ناپسندیدہ چیز سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ کلمات شیطان سے بچانے کے لیے پہرہ داری کا کام دیتے ہیں اور اس دن

[1] بخاری، الدعوات، باب فضل التهليل: ۲/۹۴۷

[2] كنز العمال، كتاب الأذكار، الأول ۲/۶۵، ۶۶ رقم ۳۵۲۵ و ۳۵۲۶

شرک کے علاوہ کوئی گناہ اسے ہلاک نہ کر سکے گا۔" ہر کلمہ پڑھنے پر اس کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ اور عصر کی نماز کے بعد پڑھنے پر بھی رات بھر وہی ثواب ملتا ہے جو فجر کی نماز کے بعد پڑھنے پر دن بھر ملتا ہے۔

❾ مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھیں:

"اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ"[1]

اسی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "جو آدمی یہ دعا پڑھ لیتا ہے، شیطان اس کے متعلق کہتا ہے، یہ آج کے دن مجھ سے محفوظ ہو گیا۔"[2]

❿ مسجد سے نکلتے وقت ابن ماجہ کی ایک روایت میں یہ دعا بھی آئی ہے کہ:

"اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنِيْ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ"[3]

ترجمہ: "یا اللہ! مجھے پناہ میں رکھیے شیطان مردود سے۔"

⓫ صبح و شام تین مرتبہ یہ دعا پڑھیں:

"بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ"[4]

⓬ گھر سے نکلتے ہوئے یہ دعا پڑھیں:

"بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ"[5]

[1] أبو داود، الصلاة، باب ما يقول الرجل عند دخوله المسجد، رقم: ۴۶۶

[2] أيضاً

[3] ابن ماجه، باب الدعاء عند دخول المسجد: ۵۶

[4] ترمذي، الدعوات، باب ما جاء في الدعاء اذا أصبح و إذا أمسى، رقم: ۳۳۸۸

[5] ترمذي، الدعوات، باب ما جاء ما يقول اذا خرج من بيته، رقم: ۳۴۲۶

کیوں کہ یہ دعا پڑھنے سے آپ کو یہ خوش خبری (اللہ کی طرف سے فرشتوں کے ذریعے) ملتی ہے:

"یہ دعا تجھے کافی ہے، تجھے بچا لیا گیا ہے اور تجھے سیدھا راستہ دکھا دیا گیا ہے، اور شیطان تجھ سے دور ہو گیا ہے، اور دوسرا شیطان پہلے شیطان سے کہتا ہے، تو اس آدمی پر کیسے غلبہ حاصل کر سکتا ہے جب کہ اسے ہدایت دے دی گئی ہے اور اس کی حفاظت کر دی گئی ہے اور اسے بچا لیا گیا ہے؟"

اسی طرح گھر سے نکلتے ہوئے یہ دعا بھی پڑھیں:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ أَوْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ." [1]

ترجمہ: "اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں کہ میں کسی کو بہکاؤں یا مجھے کوئی بہکائے یا میں خود لغزش کھاؤں یا کسی دوسرے کو لغزش دوں، خود کسی پر ظلم کروں یا مجھ پر کوئی ظلم کرے اور خود کسی کے ساتھ نادانی کی بات کروں یا کوئی دوسرا میرے ساتھ کرے۔"

۱۳ صبح و شام یہ دعا مانگا کریں:

"أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ." [2]

سو یہ ہیں وہ احتیاطی اقدامات جنھیں اختیار کر کے انسان ہر قسم کے جادو سے عموماً قلعہ بند ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ مخلص ہو اور اس علاج پر اس کو یقین کامل حاصل ہو۔ لہٰذا اپنے مقتدیوں کو ان ۱۱۳ اعمال کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔

اسی طرح کتاب "حقائق الایمان بالملائکۃ والجان" کے آخر میں

---

[1] ابوداؤد، الأدب، باب ما يقول الرجل اذا خرج من بيته: ۳۳۹/۲

[2] مسلم، الذكر والدعاء، باب في التعوذ من سوء القضاء ..... رقم: ۲۷۰۹

مصنف نے ایک "فائدہ لطیفہ" کے عنوان کے تحت پانچ اعمال بتائے ہیں جن کے اہتمام سے شیطان اور اس کے حواری کے شر سے اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں۔ ائمہ کرام ان پانچ اعمال کا بھی اہتمام فرمائیں۔

چناں چہ فرمایا

هُنَاكَ عِدَّةُ سُبُلٍ وَوَسَائِلَ لِلْاِعْتِصَامِ بِهَا، بَعْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى، مِنَ الشَّيْطَانِ وَدَفْعِ شَرِّهِ، وَمِنْ هٰذِهِ السُّبُلِ الْوَاقِيَةِ، نَذْكُرُ مَا يَلِيْ:

۱ اَلْاِسْتِعَاذَةُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ، قَالَ تَعَالٰى: ﴿وَ إِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۖ إِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ [1]

۲ قِرَاءَةُ سُوْرَتَيِ الْفَلَقِ وَالنَّاسِ.

۳ قِرَاءَةُ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ وَخَاتِمَتِهَا.

وَثَبَتَ فِي الصَّحِيْحِ أَنَّ الرَّسُوْلَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ مَقَابِرَ، وَإِنَّ الْبَيْتَ الَّذِيْ تُقْرَأُ الْبَقَرَةُ فِيْهِ لَا يَدْخُلُهُ الشَّيْطَانُ" [2]

۴ قِرَاءَةُ سُوْرَةِ الْمُؤْمِنِ مِنْ بِدَايَتِهَا إِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى: ﴿لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ إِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ [3]

۵ كَثْرَةُ ذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ. [4]

---

[1] حم السجدة: ۳۶

[2] جامع الترمذي، أبواب فضائل القرآن، باب ما جاء في سورة البقرة، رقم: ۲۸۷۷

[3] المؤمن: ۳

[4] حقائق الايمان بالملائكة والجان ۳٤٤ نقلا عن تفسير ابن القيم ۶۲۲، ۶۲٤

باب ششم

ائمہ کرام کی امامت کی ذمہ داریاں

امامت سے متعلق کچھ اہم ہدایات

حضرت مولانا فضل الرحمٰن اعظمی صاحب لکھتے ہیں:

امامت بہت بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس کے لیے صلاحیت کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ احتیاط کی بھی ضرورت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ" "امام ذمہ دار ہے۔"[1]

امام کی نماز اگر فاسد ہوئی تو مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہوگی، امام کی نماز اگر واجب یا سنت چھوڑنے کی وجہ سے مکروہ ہوئی تو تمام مقتدیوں کی نماز بھی مکروہ ہوگی۔ سنن ومستحبات کے ترک کی وجہ سے ثواب میں کمی ہوئی تو اس کا وبال بھی امام کے سر پر ہوگا حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"يُصَلُّوْنَ لَكُمْ فَاِنْ اَصَابُوْا فَلَكُمْ وَ اِنْ اَخْطَأُوْا فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ"

یعنی ائمہ تم کو نماز پڑھاتے ہیں۔ اگر ٹھیک اور درست پڑھائی تو تم کو اور ان کو پورا ثواب ملے گا اور اگر انہوں نے غلطی کی تو تمہیں پھر بھی پورا ثواب ملے گا اور وبال ائمہ کے سر پر رہے گا۔[2]

[1] ترمذی، الصلوٰۃ، باب ماجاء ان الامام ضامن ۵۱/۱

[2] بخاری، الاذان، باب اذا لم یتم الامام واتم من خلفہ: ۹۶/۱

اس لیے ذیل میں چند خاص باتیں بطور یاد دہانی کے لکھی جاتی ہیں، ان کا خاص اہتمام کیا جائے:

1. غسل اور وضو مسنون طریقہ پر کیا جائے۔ اس کے لیے مسائل کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔
2. پاکی اور صفائی کا بھی اہتمام کیا جائے کپڑے اور بدن وغیرہ غیر مشکوک طریقے پر پاک ہوں۔ (یعنی پاکی کا ایسا اہتمام ہو کہ شک وشبہ بھی نہ ہو)
3. پائجامہ اور لنگی کو خوب اچھی طرح ٹخنے سے اوپر رکھا جائے۔ اسی طرح لمبے کرتے کو بھی، اس میں بہت کوتاہی ہوتی ہے، اس سے نماز مکروہ ہو جاتی ہے۔
4. جماعت کا وقت ہونے سے قبل امام کو مسجد میں حاضر ہو جانا چاہیے۔ سنن و نوافل سے فارغ ہو جانا چاہیے۔
5. سورۂ فاتحہ کے ختم ہونے پر سراً آمین کہنا چاہیے۔ رسول پاک ﷺ ٹھہر کر آمین کہتے تھے۔ اس موقع پر تھوڑی دیر کے لیے سکتہ معلوم ہوتا تھا۔[1]
6. سورۂ فاتحہ اور سورت کے درمیان "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھ لینا چاہیے، بہتر ہے۔ "اِنْ سَمّٰى بَيْنَ الْفَاتِحَةِ وَالسُّوْرَةِ الْمَقْرُوْءَةِ سِرًّا اَوْ جَهْرًا كَانَ حَسَنًا عِنْدَ اَبِيْ حَنِيْفَةَ"[2] اور ہر رکعت کے شروع میں بھی بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنی چاہیے۔

سورۂ فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔[3]

7. سورۂ فاتحہ کے بعد سورت کی قرأت میں سنت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس بارے میں بہت کوتاہی دیکھی جاتی ہے۔ سنت یہ ہے کہ فجر اور ظہر میں طوال مفصل یعنی

[1] ترمذی، الصلوٰۃ، باب ماجاء فی السکتتین: ۵۹/۱

[2] شامی: ۳۴۲/۱، کتب خانہ رشیدیہ کوئٹہ

[3] معارف السنن، باب ماجاء فی ترک الجہر ..... بحث سنیۃ التسمیۃ ووجوبہا: ۳۷۲/۲

"سورۂ حجرات سے سورۂ بروج" تک کی سورتوں میں سے کوئی سورت پڑھی جائے۔ ظہر میں ایک روایت کے مطابق اوساط مفصل کی بھی گنجائش ہے۔ عصر و عشاء میں اوساط مفصل یعنی سورۂ "بروج" سے "لم یکن" تک کوئی سورت پڑھی جائے اور مغرب میں قصار مفصل یعنی "لم یکن" سے آخر قرآن تک کی قرأت کی جائے۔[1]

❽ اور سنت یہ ہے کہ ہر رکعت میں پوری سورت پڑھی جائے۔[2]

❾ یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے کہ ایک رکعت میں کسی سورت کا آخری حصہ اور دوسری رکعت میں کسی دوسری سورت کا آخری حصہ پڑھے۔ اسی طرح یہ کرنا بھی ٹھیک نہیں کہ ایک رکعت میں کسی سورت کے اول یا درمیان سے پڑھے ایسا کرنے سے اگرچہ نماز صحیح رہتی ہے لیکن یہ خلاف اولیٰ اور مکروہ تنزیہی ہے۔[3]

❿ سنت کے مطابق قرأت کرتے ہوئے اختصار اور تخفیف کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ احادیث میں ائمہ کو تخفیفِ صلوٰۃ کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب علماء اور فقہاء کے یہاں یہ ہے کہ سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے اختصار سے کام لے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ مسنون سورتوں میں سے مختصر کو پڑھے اور تجوید کی پوری رعایت کرتے ہوئے تیزی سے پڑھے، آج کل یہ عادت ہوگئی ہے کہ تغنی کی خاطر دیر لگائی جاتی ہے جس سے گرانی بھی ہوتی ہے اور مسنون قرأت نہیں ہو پاتی مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے لکھا ہے کہ قرأت میں تغنی کی خاطر دیر لگانا تخفیف کے خلاف ہے۔[4]

---

[1] البحر الرائق: ۳۴۰/۱

[2] ردالمحتار، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ، فصل فی القراءۃ: ۵۳۹/۱

[3] ردالمحتار، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ، فصل فی القراءۃ، مطلب الاستماع ۵۴۶/۱، ۵۴۷

[4] تقریر ترمذی، مفتی محمد تقی عثمانی: ۱۹۴/۱

"اَلْحَاصِلُ فِيهِ اَنَّهُ يَنْبَغِي لِلْاِمَامِ اَنْ يَقْرَأَ مِقْدَارَ مَا يَخِفُّ عَلَى الْقَوْمِ وَلَا يَثْقُلُ عَلَيْهِمْ بَعْدَ اَنْ يَكُوْنَ عَلَى التَّمَامِ"[1]

● جن سورتوں کو نماز میں پڑھنا ہو اس کی تجوید خصوصی طور پر صحیح کر لینی چاہیے۔ بعض غلطیوں سے نماز فاسد ہو سکتی ہے۔

● جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۂ "الم السجدہ" اور سورۂ "دھر" اکثر پڑھنی چاہیے، کبھی کبھی چھوڑ دینی چاہیے، تاکہ لوگ واجب نہ سمجھیں، آں حضرت ﷺ ان سورتوں کو پڑھا کرتے تھے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ پڑھتے تھے۔[2]

● جن نمازوں کے بعد سنتیں ہیں، ان نمازوں میں سلام کے بعد مختصر دعا کر لینی چاہیے۔

حدیث میں آیا ہے کہ آں حضرت ﷺ صرف اتنی دیر بیٹھتے تھے جتنی دیر میں "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ" پڑھیں۔[3]

اس حدیث کو ہمارے فقہاء نے ان نمازوں پر محمول کیا ہے جن کے بعد سنتیں ہیں جیسے ظہر، مغرب، عشاء۔ اس لیے مذکورہ دعا سے زیادہ سنتوں میں دیر نہیں کرنی چاہیے اور علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ ......" سے مراد خاص وہی ذکر نہیں بل کہ یہ یا اس کے قریب کوئی ذکر مراد ہے، اس لیے صحیحین میں یہ ذکر بھی آیا ہے:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا

---

[1] ردالمحتار، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ، فصل فی القراءۃ: ۵۴۱/۱

[2] فتح الباری: ۳۷۸/۲

[3] مسلم شریف، کتاب المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلوۃ ۲۱۸/۱

مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ.“[۱]

جمعہ بھی ان نمازوں میں داخل ہے جن کے بعد سنتیں ہیں۔

۱۴ جن نمازوں کے بعد سنتیں نہیں ہیں ان میں سلام پھیرنے کے بعد قوم کی طرف متوجہ ہوکر یا دائیں طرف یا بائیں طرف مڑ کر بیٹھے اور تسبیحات واذکار کے بعد دعا کرے۔[۲]

۱۵ نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے اس کی طرف توجہ کی جائے اور ہر لفظ کو محض یاد سے نہیں بل کہ مستقل ارادے سے نکالے۔[۳]

۱۶ نماز کے مفسدات ومکروہات نیز سجدہ سہو واجب کرنے والے امور کو فقہ کی کتابوں میں غور سے پڑھنا چاہیے۔

حدیث شریف میں آتا ہے جو امام اس طرح نماز پڑھائے کہ قوم راضی ہو اس کو قیامت کے دن مشک کا ٹیلہ نصیب ہوگا۔[۴]

اور آں حضرت ﷺ نے ایسے ائمہ کے لیے یوں دعا فرمائی ہے:

”اَللّٰهُمَّ اَرْشِدِ الْأَئِمَّةَ.“[۵]

تَرْجَمَہ: ”اے اللہ! ائمہ کو رشد وہدایت عطا فرما۔“ (آمین ثم آمین)[۶]

---

[۱] شامی: ۲/۳۹۱، مسلم المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ: ۱/۲۱۸

[۲] شامی: ۲/۳۹۲ فرض نمازوں کے بعد استحباب دعاء برفع الایدی پر تحقیقات کے لیے ”التحفۃ المطلوبۃ فی استحباب رفع الیدین فی الدعا بعد المکتوبۃ“ (مؤلف پیرزادہ مفتی شمس الدین نور) دیکھیں۔

[۳] اصلاح انقلاب حضرت تھانوی: ص ۱۱۴

[۴] ترمذی، صفۃ الجنۃ، باب صفۃ انہار الجنۃ: ۲/۸۴

[۵] ترمذی، الصلوٰۃ، باب ماجاء ان الامام ضامن: ۱/۵۱

[۶] ماخوذ از قومہ اور جلسہ میں اطمینان کا وجوب اور ان میں اذکار کا ثبوت: ۳۳، ۳۵، ۳۸، ۳۹

صفوں کی نگرانی اور اس سے متعلق احادیث

مصلّٰی پر پہنچتے ہی امام صاحب کو دیکھنا چاہیے کہ صفیں درست اور مرتب ہیں یا نہیں، وہ شریعت کے قوانین پر پوری اترتی ہیں یا نہیں! یوں تو مقتدی کا فریضہ ہے ہی کہ وہ شرعی ہیئت کے ساتھ کھڑا ہو، مگر امام کا بھی فریضہ ہے کہ وہ نگرانی کرے۔

آں حضرت ﷺ بذات خود صفوں کو درست اور برابر فرماتے اور دائیں بائیں سے مطمئن ہوکر تکبیر تحریمہ کہتے۔

چناں چہ نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

۱ ”كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَوِّيْ يَعْنِيْ صُفُوْفَنَا إِذَا قُمْنَا لِلصَّلٰوةِ فَإِذَا اسْتَوَيْنَا كَبَّرَ.“[۱]

تَرْجَمَہ: ”رسول اللہ ﷺ ہماری صفوں کو برابر فرماتے تھے جب ہم نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے اور جب ہم برابر ہو لیتے تو آپ ﷺ تکبیر کہتے تھے۔“

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

۲ ”إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلٰوةِ أَخَذَهُ بِيَمِيْنِهِ ثُمَّ الْتَفَتَ فَقَالَ اِعْتَدِلُوْا سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ ثُمَّ أَخَذَهُ بِيَسَارِهِ فَقَالَ اِعْتَدِلُوْا سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ.“[۲]

تَرْجَمَہ: ”رسول اللہ ﷺ دائیں طرف متوجہ ہوکر فرماتے ٹھیک طور پر کھڑے ہوجاؤ اور اپنی صفوں کو درست کرلو اور بائیں جانب متوجہ ہوکر فرماتے درست ہوجاؤ اور اپنی صفوں کو ٹھیک کرلو۔“

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[۱] ابوداود، الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف: ۱/۹۷

[۲] ابوداود، کتاب الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف: ۱/۹۸

❸ "سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصَّفِّ مِنْ تَمَامِ الصَّلٰوةِ"[1]

"وَفِيْ رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوْفِ مِنْ إِقَامَةِ الصَّلٰوةِ."[2]

ترجمہ: "اپنی صفوں کو درست کرو کہ صفوں کی درستگی اتمام نماز میں سے ہے۔"

"اور بخاری کی روایت میں ہے کہ صفوں کی درستگی نماز کی اقامت میں سے ہے۔"

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

❹ "لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ أَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوْهِكُمْ"[3]

ترجمہ: "اپنی صفوں کو درست کرو ورنہ تمہارے چہروں کو اللہ تعالیٰ پھیر دیں گے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

❺ "أَقِيْمُوا الصُّفُوْفَ وَحَاذُوْا بَيْنَ الْمَنَاكِبِ وَسُدُّوا الْخَلَلَ وَلِيْنُوْا بِأَيْدِيْ إِخْوَانِكُمْ وَلَا تَذَرُوْا فُرُجَاتٍ لِلشَّيْطَانِ وَمَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللّٰهُ."[4]

ترجمہ: "صفوں کو درست کرو اور اپنے کندھوں کو ایک دوسرے کے قریب کرو اور خالی جگہوں کو پر کرو اور اپنے بھائیوں کے لیے نرم ہو جاؤ

[1] مسلم، الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف: ۱/۱۸۲

[2] البخاری، الاذان، باب اقامۃ الصف من تمام الصلوٰۃ: ۱/۱۰۰

[3] مسلم، الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف: ۱/۱۸۲ والبخاری، الاذان، باب الصف الاول: ۱/۱۰۰

[4] ابوداؤد، الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف: ۱/۹۷

اور شیطان کے لیے صفوں میں خالی جگہیں مت چھوڑو اور جو شخص صف کو ملائے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے ملائے گا اور جو صف کو کاٹے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے کاٹے گا (یعنی محروم کر دے گا)۔"

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اہتمامِ صفوف

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے اپنے زمانہ میں صفوں کے اہتمام کو باقی رکھا۔ چناں چہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دستور تھا کہ نماز شروع کرنے سے پہلے صفوں کی دیکھ بھال کر لیتے اور صفوں کی درستگی کے بعد نماز شروع کرتے۔ حتیٰ کہ آپ نے ایک مستقل آدمی اس کام کے لیے مقرر کر دیا تھا جو صف میں گھوم کر دیکھتا اور آ کر درستگی کی خبر دیتا۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں:

"عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَأْمُرُ بِتَسْوِيَةِ الصُّفُوْفِ فَإِذَا جَاءُوْهُ فَأَخْبَرُوْهُ أَنْ قَدِ اسْتَوَتْ كَبَّرَ."[1]

ترجمہ: "حضرت نافع سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صفوں کی درستگی کا حکم دیا کرتے تھے جب ان کو صفوں کی درستگی کی اطلاع دیتے تو پھر تکبیر کہتے۔"

نماز سنت کے مطابق پڑھائیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ"[2] مجھے جس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھو۔

نیز فرمایا قیامت کے دن آدمی کے اعمال میں سب سے پہلے نماز کا حساب

[1] موطا امام مالک، الصلوٰۃ، باب ماجاء فی تسویۃ الصفوف: ۱۴۲

[2] البخاری، الاذان، باب من قال لیؤذن فی السفر: ۱/۸۸

ہوگا۔[1] اگر نماز ٹھیک نکلی تو وہ آدمی کامیاب اور بامراد ہوگا اور اگر نماز خراب نکلی تو وہ آدمی نامراد اور ناکام ہوگا......[2]

حضرت مولانا رفعت قاسمی صاحب نے مسائل امامت پر ایک بہترین کتاب تصنیف فرمائی ہے، ماشاء اللہ ائمہ کرام کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔

اس میں مولانا فرماتے ہیں:

"نماز پڑھانے والوں کو اس کا بہت اہتمام کرنا چاہیے کہ نماز سنت کے مطابق پڑھائیں۔ اس لیے کہ قبولیت کے لیے اولین شرط سنت کے ساتھ مطابقت ہے۔ اسی طرح ائمہ کرام مقتدیوں کو نماز کے مسائل سمجھائیں اور ان سے کہیں کہ ایک آدمی نماز پڑھے، محنت کرے، وقت بھی خرچ کرے، لیکن وہ نماز فاسد ہو یا اس میں واجب چھوٹ رہا ہو یا سنت ادا نہ ہو رہی ہو، جس کی وجہ سے غیر مقبول ہو تو یہ بڑے خسارہ کی بات ہے۔ مذکورہ بالا حدیث میں خسارہ اور ناکامی کی وعید نماز نہ پڑھنے پر نہیں ہے بل کہ نماز کے درست اور ٹھیک نہ ہونے پر ہے۔ اس لیے نمازیوں کو اس کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ ان کی نماز رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے مطابق ہے یا نہیں۔"[3]

تجویدِ قرآن کی ضرورت

نماز کی حفاظت میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کے تمام ارکان فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کا اہتمام کیا جائے۔ نماز کا ایک رکن قراءت قرآن بھی ہے۔ قرآن کو تجوید سے پڑھنا ضروری ہے۔ اس لیے نماز مکمل نہیں ہوسکتی جب تک نماز میں پڑھا جانے والا قرآن درست اور صحیح نہ ہو، اس لیے ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ جتنا قرآن نماز میں پڑھنا ہے اس کو تجوید کے ساتھ پڑھنا سیکھے۔ حروف کو ان کے

[1] ابوداؤد، الصلوٰۃ، باب قول النبی کل صلاۃ لا یتمھا صاحبھا رقم: ۸۶۴
[2] فیض القدیر: ۹۶/۳ [3] ماخوذ از مسائل امامت ص ۱۶۸، ۱۶۹

مخارج سے صفات کے ساتھ ادا کرے۔ جو شخص کوشش نہیں کرے گا اور غلط پڑھتا رہے گا وہ گناہ گار ہوگا، اس کی نماز بھی مکمل نہیں کہلائی جاسکتی۔ عربی زبان بہت نازک زبان ہے۔ ذرا حرف بدلنے سے معنی بدل جاتے ہیں اور معنی کے بدلنے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے۔[1]

متقدمین فقہائے احناف کا اسی پر فتوی تھا (کہ فحش غلطی سے معنی بدلنے پر نماز فاسد ہوجاتی ہے) اگرچہ متاخرین نے اس میں سہولت کے خیال سے توسیع کی ہے اور جواز کا فتوی دیا ہے، لیکن آدمی کوشش نہیں کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔

مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ لکھتے ہیں کہ تصحیح حروف بقدر امکان اور رعایت وقوف بایں معنی کہ جہاں وقف کرنے سے معنی میں فساد واختلال (خلل ونقصان) ہو یہ دونوں امر تو واجب علی العین ہیں (یعنی ہر مسلمان پر ان کی رعایت کرنا ضروری ہے)۔[2]

ضاد اور ظاء میں فرق کرنا ایک بہت ہی مشکل امر ہے اس کے بارے میں بھی حضرت تھانوی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ لکھتے ہیں کہ:

جو لوگ مشق وریاضت نہ ہونے کے ان میں تمایز (تمیز) نہیں کرسکتے ان کی نماز صحیح ہوجاتی ہے اور بایں معنی معذور ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ بمعنی عدم اثم معذور ہوں، بل کہ تصحیح میں سعی کرنا واجب ہے۔[3]

یعنی ضاد اور ظاء میں فرق کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو غلط پڑھنے پر گناہ ہوگا اگرچہ نماز ہوجائے گی۔ تو طاء اور تاء میں سین اور شین اور صاد میں ذال اور زاء میں عین اور ہمزہ میں ق اور ک میں اگر فرق کرنے کی کوشش نہ کی جائے باوجودیکہ فرق آسان ہے تو بدرجہ اولی گناہ ہوگا۔ فتاوی شامی صفحہ ۳۶۲ میں ہے کہ العظیم کی بجائے

[1] شامی، الصلوٰۃ، باب ما یفسد الصلوٰۃ زلۃ القاری: ۶۳۰/۱
[2] فتاوی امدادیہ، الصلوٰۃ: ۲۰۰/۱ [3] فتاوی امدادیہ، الصلوٰۃ: ۲۴۴/۱

العزیم زادے کوئی پڑھ لے تو نماز نہیں ہوگی۔ اس مسئلہ پر بہت توجہ کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ مساجد میں کسی قاری سے بڑے لوگوں کو تجوید سیکھنے کا انتظام ہو، اللہ تعالیٰ امت کو اس کی توفیق نصیب فرمائے۔ حرمین شریفین میں ایسے حلقے رکھے جاتے ہیں۔ خدا کرے یہ سلسلہ ہر مسجد میں قائم ہو۔

ایسے ہی جو دعائیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں ان کا بھی تلفظ صحیح ہونا چاہیے۔ قرآن سے یہ مقصد بھی حاصل ہوگا۔ نماز میں جو قرآن پڑھا جاتا ہے اور دعائیں مانگی جاتی ہیں اجمالی طور پر ان کا مفہوم بھی جاننا چاہیے۔ تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ اس سے خشوع وخضوع میں مدد ملے گی جو نماز کی روح اور جان ہے۔ جس کے بغیر نماز صرف ایک ڈھانچہ ہے جس میں کچھ جان نہیں۔

لہٰذا اپنی نماز کی تصحیح کے لیے کسی معتبر کتاب کا مطالعہ اور تعلیم نہایت ضروری ہے اس جگہ ہم چند امور کی طرف توجہ دلاتے ہیں جن میں عام طور سے غلطی ہوتی ہے۔

قرأت میں ترتیل

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن پاک پڑھنے کا کیا طریقہ تھا اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن مجید کا یہ فرمان مدنظر رکھنا چاہیے ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾[1]

جس کا منشاء یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترتیل اور ٹھہر ٹھہر کر صاف صاف پڑھنے کا حکم تھا، جس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری پوری پیروی فرماتے تھے۔ تیز پڑھنا کبھی بھی آپ کا معمول نہیں ہوتا تھا جس سے قرآن پاک کے کلمات پورے طور پر ادا نہ ہو سکیں یا سننے والا اچھی طرح کلمات نہ سمجھ سکے۔

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے:

[1] المزمل: ۴

﴿كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَرَأَ يُقَطِّعُ قِرَاءَتَهُ آيَةً آيَةً بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ۝ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ۝﴾[1]

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تلاوت فرماتے تھے تو ایک ایک آیت علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھتے تھے۔ "بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ" پھر "الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ" پھر "الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ" (ایک آیت کو دوسری میں نہیں ملاتے)۔"

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت اعتدال کے ساتھ تھی، نہ پست تھی نہ بلند، رک رک کر پڑھتے اور ترتیل کا پورا لحاظ فرماتے تھے۔

ایک ایک حرف الگ الگ کر کے پڑھتے۔[2]

قرأت اور تکبیرات میں جہر کی مقدار

امام کو قرأت اور تکبیرات جہر میں درمیانی طریقہ کو اختیار کرنا چاہیے اور قدرِ حاجت کے موافق جہر کرنا چاہیے۔ اور یہ فرق اور تفاوت تکبیرات کے درمیان کہ بعض کو جہر مفرط سے ادا کرنا اور بعض کو قدرِ حاجت سے بھی کم کر دینا مذموم اور بے اصل ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

صرف سلام میں تو فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ دوسرے سلام کو پہلے سلام سے کچھ پست آواز سے کہے اور اس کے علاوہ اور کسی جگہ جہر میں تفاوت درجات نہیں ہے۔[3]

افضل یہ ہے کہ امام جہری نمازوں میں بلا تکلف اس قدر زور سے پڑھے کہ

[1] ابو داود، کتاب الحروف والقراءات: ۲/۲۰۰

[2] قیام اللیل، باب الترتیل فی القرآن: ۱۵۱ نقلاً عن اسلام کا نظام مساجد: ۱۳۲

[3] رد المحتار، فصل فی القراءۃ: ۱/۴۹۷ و باب صفۃ الصلوٰۃ: ۱/۴۴۳

مقتدی قرأت سن سکیں۔ اس سے زیادہ تکلف کرکے پڑھنا مکروہ اور منع ہے ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا﴾[1]

ترجمہ: ''اور نہ تم اپنی نمازوں میں زیادہ زور سے پڑھو اور نہ بالکل آہستہ پڑھو اس کے بیچ والی درمیانی راہ اختیار کرو۔''

مفسرین فرماتے ہیں کہ نماز میں درمیانی آواز سے قرأت کرنی چاہیے اس سے قلب پر اثر ہوتا ہے نہ اس قدر زور سے پڑھے کہ قاری اور سامع دونوں کو تکلیف ہو کہ اس سے حضور قلب میں خلل آجائے۔[2]

مولانا ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''یعنی نماز میں نہ تو قرأت کو اتنی بلند آواز سے کرو کہ مشرکین سن کر قرآن کو اور قرآن کے اتارنے والے کو اور اس کے لانے والے کو گالیاں دیں اور نہ اتنا آہستہ پڑھو کہ آپ (ﷺ) کے اصحاب بھی نہ سن سکیں۔ درمیانی راہ اختیار کرو۔ یہ مضمون حدیث میں آیا ہے معلوم ہوا کہ امام کا کام سنانے کا ہے اور مقتدی کا کام سننے کا ہے نہ کہ پڑھنے کا۔''[3]

امام قرطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ اپنی تفسیر ''قرطبی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''اَلْمُخَافَتَةُ خَفْضُ الصَّوْتِ وَالسُّكُوْنُ''[4]

ترجمہ: ''مخافتۃ آواز کو پست کرنے اور سکون واطمینان کو کہا جاتا ہے۔''

[1] بنی اسرائیل: ۱۱۰ [2] خلاصۃ التفسیر: ۲/۶۷، تفسیر فتح المنان: ۵/۹۶

[3] معارف القرآن، لمولانا ادریس کاندھلوی: ۵/۵۵۸، بنی اسرائیل: ۱۱۰

[4] تفسیر قرطبی: ۵/۳۴۲، بنی اسرائیل: ۱۱۰

فقہائے کرام زور سے پڑھنے میں دو باتیں ضروری قرار دیتے ہیں۔

اول یہ کہ پڑھنے والا اپنے اوپر غیر معمولی زور نہ ڈالے (یہ مکروہ ہے)

دوسرے یہ کہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو مثلاً تہجد کے وقت کوئی سو رہا ہے یا کچھ لوگ اپنے کام میں مصروف ہیں۔ آپ ان کے پاس کھڑے ہو کر اتنی بلند آواز سے قرأت کرنے لگے کہ ان کے کام میں خلل ہو تو یہ بھی مکروہ ہے، ان دونوں باتوں کے بعد تیسری بات یہ ہے کہ جماعت کی کمی زیادتی کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے بموجب قرأت کریں مثلاً مقتدیوں کی تین صفیں ہیں، آپ اتنی بلند آواز سے پڑھیں کہ تیسری صف تک آواز پہنچتی رہے۔ اس سے زیادہ زور سے نہ پڑھیں کہ باہر تک آواز پہنچے۔ راجح یہی ہے کہ بقدر ضرورت آواز بلند کرے۔ یعنی صرف اتنی آواز بلند کرے کہ تیسری صف تک آواز پہنچے۔ البتہ اگر صفیں زیادہ ہوں تو آواز کو اس سے بھی بلند کرسکتے ہیں۔ بشرطیکہ اپنے اوپر زیادہ زور نہ پڑے۔[1]

امام کو تکبیرات کس طرح کہنی چاہئیں

حضرت سعید بن حارث کہتے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیں نماز پڑھائی:

''فَجَهَرَ بِالتَّكْبِيْرِ حِيْنَ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُوْدِ وَحِيْنَ سَجَدَ وَحِيْنَ رَفَعَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ وَقَالَ هٰكَذَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ''[2]

ترجمہ: ''چناں چہ جب انہوں نے سجدہ سے اپنا سر اٹھایا اور جب سجدہ میں گئے نیز جب دو رکعتیں پڑھ کر اٹھے تو بلند آواز سے اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہا اور فرمایا کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کو اسی طرح (آواز بلند

[1] در مختار فصل فی القراءۃ: ۱/۵۳۲

[2] بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب یکبر وھو ینهض: ۱/۱۱۴

تکبیر کہتے) دیکھا ہے۔"

اس حدیث کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ امام کو چاہیے کہ وہ دورانِ نماز تمام تکبیرات بآواز بلند کہے۔ یہاں صرف ان تین موقعوں کی تکبیرات کا ذکر اتفاقاً کیا گیا ہے یا پھر کچھ لوگوں نے ان اوقات کی تکبیرات کا انکار کیا ہوگا اس لیے راوی نے صرف انہیں تکبیرات کو ذکر کیا۔ ویسے اسمٰعیل کی روایت میں بقیہ تکبیرات کا ذکر بھی موجود ہے چناں چہ ان کی روایت کے ابتداء میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں کہ "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار ہو گئے تھے یا کہیں چلے گئے تھے تو (ان کی عدم موجودگی میں) حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز پڑھائی۔ چناں چہ انہوں نے نماز شروع ہونے اور رکوع میں جانے کے وقت تکبیرات بآواز بلند کہیں۔" اس کے بعد بقیہ حدیث بیان کی گئی ہے۔[1]

اکثر و بیشتر اماموں کو دیکھا جاتا ہے کہ نماز پڑھاتے وقت تکبیرات "انتقالِ حرکتِ انتقالیہ" کے ساتھ ساتھ نہیں کہتے۔ بل کہ کبھی تو منتقل ہونے کے بعد تکبیر کہتے ہیں اور کبھی دوسرے رکن تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں۔ مثلاً قیام کی حالت سے منتقل ہو کر رکوع میں جاتے ہیں تو بعض امام جھکنے کے بعد "اللّٰہُ اَکْبَر" کہتے ہیں۔ اور بعض امام اس قدر جلد "اللّٰہُ اَکْبَر" کہتے ہیں کہ رکوع میں پورے طور پر پہنچنے سے پہلے ہی "اللّٰہُ اَکْبَر" کی آواز ختم ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح سجدہ میں جاتے وقت اور سجدہ سے دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہوتے وقت بھی کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ ان دونوں صورتوں میں تکبیر کی سنت کامل ادا نہیں ہوئی، کامل سنت اس وقت ہی ادا ہوتی ہے جب کہ ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ تکبیرات شروع کرے۔ اور جوں ہی دوسرے رکن میں پہنچ

[1] مشکوٰۃ، باب صفۃ الصلوٰۃ ۷۷

تکبیر ختم کرے۔ بعض امام اللّٰہُ اَکْبَر کو اس طرح کھینچتے ہیں کہ دوسرے رکن میں پہنچ جانے کے بعد بھی کچھ دیر تک ان کی تکبیر کی آواز آتی رہتی ہے اس درجہ تکبیر کو کھینچنا مکروہ ہے۔[1]

بعض امام تکبیر کہنے میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں اور اللّٰہُ اَکْبَر کہنے کے بجائے "اللّٰہُ اَکْبَار" کہتے ہیں یعنی "با" اور "را" کے درمیان الف بڑھا دیتے ہیں۔

اسی طرح بعض ائمہ حضرات سے شروع میں بے احتیاطی ہو جاتی ہے اور آللّٰہ اَکْبَر کہتے ہیں یہ دونوں صورتیں بالکل غلط ہیں ان دونوں صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے اور اگر تکبیر تحریمہ میں اس طرح کہہ دیا تو نماز کا شروع کرنا ہی صحیح نہ ہوگا۔[2]

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حلیہ وغیرہ سے نقل فرمایا ہے کہ تکبیر میں اسم ذات "اللّٰہ" اور "اکبر" کے الف کو کھینچ کر پڑھنا مفسد نماز ہے۔ اور "لام" کو اتنا کھینچنا کہ "الف" مزید پیدا ہو جائے مکروہ ہے۔ مفسد نہیں۔ اسی طرح "ہاء" کو کھینچنا مکروہ ہے "با" کی مد کے مفسد ہونے میں اختلاف ہے۔ اور "را" پر پیش کھینچ کر پڑھنا مفسد ہے۔

مگر غلبہ جہل کی وجہ سے متاخرین کا یہ فیصلہ ہے کہ اعراب اور مد کی غلطی مفسد نہیں۔ البتہ اگر کوئی تنبیہ کے باوجود اصلاح کی کوشش نہیں کرتا تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اور غلط خواں کو امام بنانا بہر صورت ناجائز ہے۔ بجز اس مجبوری کے کہ کوئی صحیح پڑھنے والا موجود نہ ہو۔[3]

[1] فتاویٰ رحیمیہ، الطہارۃ، متفرق مسائل: ۱/۲۳۳، بحوالہ کبیری ص ۳۱۳
[2] فتاویٰ دار العلوم دیوبند، الباب الرابع، صفۃ الصلوٰۃ، سنن و کیفیات نماز: ۲/۱۷۶
[3] احسن الفتاویٰ، باب مفسدات الصلوٰۃ والمکروہات: ۳/۴۲۹

تکبیرِ تحریمہ اور قیام کی اصلاح

بعض ائمہ تکبیرِ تحریمہ کو اتنا لمبا کر دیتے ہیں کہ مقتدی امام سے پہلے تکبیر (تحریمہ) کہہ کر ہاتھ باندھ لیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔[1]

تکبیرِ تحریمہ کے وقت سر کو نہیں جھکانا چاہیے سر سیدھا رکھنا چاہیے اور دونوں ہاتھوں کو کانوں کے مقابل تک اٹھانا چاہیے۔ بعض لوگ (ادھورا ہاتھ اٹھا کر) صرف ذرا سا اشارہ کر دیتے ہیں یہ خلافِ سنت ہے۔[2]

✲ ہاتھوں کو اٹھائیں تو دونوں ہتھیلیاں قبلہ کی طرف متوجہ ہوں۔ بعض لوگ ہتھیلیوں کا رخ قبلہ کی طرف کرنے کے بجائے کانوں کی طرف کر لیتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔

✲ تکبیرِ تحریمہ کے وقت ہاتھوں کو اٹھائیں تو انگلیوں کو نہ بالکل ملائیں، نہ دور دور رکھیں بل کہ بین بین اپنی (درمیانی) حالت پر رکھیں۔[3]

✲ "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" کہنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو بغیر گرائے ہوئے ناف کے نیچے باندھ لیں۔ بعض لوگ پہلے دونوں ہاتھوں کو گراتے ہیں پھر باندھتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔

✲ داہنی ہتھیلی بائیں ہتھیلی پر رکھیں پھر انگوٹھے اور چھوٹی انگلی سے کلائی کو پکڑ لیں اور بقیہ تینوں انگلیوں کو ذراع کلائی پر پھیلا لیں۔ اس طرح کئی حدیثوں پر عمل ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ بائیں ہتھیلی کو لٹا لیتے ہیں اور بائیں ذراع کو انگلیوں سے پکڑ رکھتے

[1] احسن الفتاویٰ، باب الامامۃ والجماعۃ: ۳/۳۰۵
[2] شامی، مطلب سنن الصلوۃ: ۱/۴۷۵
[3] شامی، باب الامامۃ والجماعۃ: ۱/۴۷۴، ۴۷۵
[4] الترمذی، الصلوۃ، باب ماجاء فی وضع الیمین علی الشمال فی الصلوۃ: ۱/۵۹

ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔

✲ بہتر ہے کہ دونوں پاؤں قریب قریب ہوں۔ چار انگل کا فصل ہو۔ یہ اقرب الی الخشوع ہے۔ اور سجدہ کی حالت میں دونوں ایڑیوں کو ملانے میں زیادہ حرکت نہیں کرنی پڑے گی۔ ایڑیوں کا ملانا سنت ہے۔[1]

✲ قیام کی حالت میں حرکت نہیں کرنی چاہیے۔

✲ جسم کا زور دونوں پاؤں پر برابر ہو تو بہتر ہے۔ اگر ایک پر زیادہ ہو تو دوسرے پر خم اور ٹیڑھا پن نہیں آنا چاہیے۔

✲ دونوں پاؤں قبلہ کی طرف متوجہ ہوں۔ منحرف نہ ہوں۔ اور دونوں پاؤں ایک لائن میں ہوں آگے پیچھے نہ ہوں۔

✲ قیام کی حالت میں نگاہ سجدہ گاہ میں ہو، ادھر ادھر نہ دیکھیں حتی الوسع کھجانے سے پرہیز کریں۔ اگر سخت ضرورت ہو تو صرف ایک ہاتھ استعمال کریں اور وہ بھی کم سے کم۔[2]

رکوع کی اصلاح

✲ رکوع کی حالت میں دونوں ہتھیلیوں کو گھٹنوں پر رکھ کر انگلیوں کو پھیلا کر گھٹنوں کو پکڑیں۔ صرف ہتھیلیوں کو رکھ دینا سنت طریقہ نہیں۔[3]

✲ سر پشت اور سرین کو برابر رکھے نہ سر کو نیچا کرے نہ اونچا۔ بازو کو بغل سے جدا رکھے۔ بغل میں گھسا ہوا نہ ہو۔ ہاتھ تنا ہوا ہو۔ اس میں خم نہ ہو۔[4]

✲ پاؤں کو بھی سیدھا رکھے۔ گھٹنے کے پاس خم نہیں ہونا چاہیے۔[5]

[1] الشامی، مطلب قراءۃ البسملۃ بین الفاتحۃ والسورۃ: ۱/۴۹۳
[2] ماخوذ از "نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے"
[3] الشامی، مطلب القراءۃ البسملۃ بین الفاتحۃ والسورۃ: ۱/۴۹۳
[4] ایضاً　[5] ایضاً

اطمینان سے تین مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم" پڑھے۔ اس سے کم کرنا مکروہ ہے، اس سے زیادہ بہتر ہے۔ ہمارے بعض علماء رکوع وسجدہ میں تین مرتبہ تسبیح پڑھنے کو واجب کہتے ہیں۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ پوری تسبیح کی ادائیگی صحیح کرے۔ خصوصاً ظا کو۔[1]

* رکوع کی حالت میں بھی پاؤں قبلہ کی طرف متوجہ ہوں اور دونوں ٹخنے بالمقابل ہوں۔ اور نظریں پاؤں پر ہوں۔[2]

* بعض لوگوں کی یہ عادت ہے کہ رکوع سے اٹھنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے اپنے کرتے کے پیچھے دامن کو چھوتے ہیں یا یوں کہیے کہ اس کو برابر کرتے ہیں۔ یہ ایک بری عادت ہے۔ بلا ضرورت محض عادت ہونے کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ اس کے مکروہ ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں۔ اس سے آگے یہ خطرہ ہے کہ کہیں یہ مفسد صلوٰۃ نہ ہو۔ کیوں کہ عمل کثیر اس کو کہتے ہیں جس میں دونوں ہاتھ لگائے جائیں اور یہ عمل ایسا ہے کہ اس میں دونوں ہاتھ لگائے جاتے ہیں اس لیے اس سے پرہیز بہت ضروری ہے۔ جس کو بھی ایسا کرتے دیکھیں اکرام واحترام کے ساتھ اس پر تنبیہ کریں۔

سجدہ کی اصلاح

قومہ سے سجدہ میں جاتے ہوئے سینہ کو آگے کی طرف نہ جھکائیں بل کہ اس کو سیدھا رکھیں۔ صرف پاؤں موڑ کر نیچے کی طرف جائیں۔ بعض لوگ پہلے سینہ جھکا دیتے ہیں جس سے ایک زائد رکوع پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ منع ہے۔[3]

جب تک گھٹنے زمین تک نہ پہنچ جائیں اوپر کے حصہ کو جھکانے سے حتی الامکان

[1] ایضاً　　[3] ماخوذ از: "نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے"

[2] شامی: ۱/۴۹۷

پرہیز کریں۔

* سجدہ میں جاتے ہوئے پہلے ہاتھ گھٹنے پر رکھیں پھر گھٹنے زمین پر رکھیں۔ پھر ہاتھ پھر سر، سر میں پہلے ناک زمین پر رکھیں پھر پیشانی۔[1]

* سجدہ میں دونوں ہاتھ رکھیں تو انگلیاں بند ہوں ملی ہوئی ہوں۔ ان کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔[2]

* سب انگلیاں قبلہ کی طرف متوجہ ہوں حتی کہ انگوٹھا بھی۔ اس کا خاص خیال رکھیں۔[3]

* سجدہ کھل کر کریں یعنی بازو بغل سے دور ہوں، بغلیں کھلی ہوئی ہوں، رانیں پیٹ سے جدا رکھیں، پیٹ ران پر نہ ہو۔[4]

* کہنیاں زمین پر نہ رکھیں، صرف ہتھیلیاں رکھیں۔[5]

* فرض نماز میں دونوں کہنیوں کو اتنا نہ پھیلائیں کہ دونوں طرف کے مصلیوں کو تکلیف ہو جتنی گنجائش ہو اتنا ہی کھولیں۔

* چہرہ کو دونوں ہاتھوں کے درمیان اس طرح رکھیں کہ انگوٹھوں کے سرے کانوں کی لو کے سامنے ہوں۔

* سجدہ میں جائیں تو دونوں گھٹنے قریب قریب رکھیں۔[6]

* دونوں پاؤں کی انگلیوں کو موڑ کر قبلہ کی طرف متوجہ کریں۔ صرف سیدھی انگلیاں زمین پر رکھ دینا خلاف سنت ہے۔ انگلیوں کو قبلہ کی طرف متوجہ ہونا

[1] شامی، باب آداب الصلوٰۃ، مطلب فی اطالۃ الرکوع للجائی: ۱/۴۹۷، ۴۹۸

[2] شامی، مطلب فی اطالۃ الرکوع للجائی: ۱/۴۹۸

[3] ایضاً

[4] شامی، مطلب فی اطالۃ الرکوع للجائی: ۱/۵۰۳

[5] ترمذی، الصلوٰۃ، باب ماجاء فی الاعتدال فی السجود: ۱/۶۳

[6] صحیح ابن خزیمۃ: ۱/۳۲۸

چاہیے۔[1]

* بعض لوگ انگلیوں کو قبلہ کے خلاف کی طرف موڑ کر پاؤں کی پشت کو زمین پر رکھتے ہیں یہ بہت غلط بات ہے۔
* بعض تو سجدہ کی حالت میں پاؤں کو اٹھا کر رکھتے ہیں۔ زمین پر نہیں رکھتے اگر پورا سجدہ اس طرح کیا تو نماز ہی نہیں ہوگی۔ خوب خیال سے سنت کے مطابق سجدہ کرنا چاہیے۔
* ایک سنت یہ بھی ہے کہ پاؤں کی دونوں ایڑیوں کو ملا لیا جائے۔[2]
اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ دونوں پاؤں قریب کر لیے جائیں اور ٹخنے اور ایڑیاں مل جائیں۔ دونوں پاؤں سیدھے کھڑے ہوں۔ انگلیاں قبلہ کی طرف متوجہ ہوں۔
* دونوں سجدوں میں بھی رکوع کی طرح تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلٰی پڑھنا سنت ہے۔[3] زیادہ مرتبہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس سے کم نہ کریں۔

امام رکوع وسجدہ میں کتنی بار تسبیح پڑھے

مستحب یہ ہے کہ امام پانچ بار تسبیح پڑھے اگر تین بار کہے تو اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کہے کہ مقتدیوں کو تین بار تسبیح کہنے کا موقع میسر آئے۔

چناں چہ ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

"اَسْتَحِبُّ لِلْاِمَامِ اَنْ یُّسَبِّحَ خَمْسَ تَسْبِیْحَاتٍ لِکَیْ یُدْرِكَ

[1] بخاری، الصلوٰۃ، باب فضل استقبال القبلۃ یستقبل باطراف رجلیہ القبلۃ: ۱/۵۶ وکتاب الاذان: ۱/۱۱۴

[2] صحیح ابن خزیمہ: ۱/۳۲۸، اعلاء السنن، باب طریق السجود: ۳/۳۲

[3] شامی، باب آداب الصلوٰۃ، مطلب فی إطالۃ الرکوع للجائی: ۱/۵۰۴

مَنْ خَلْفَهٗ ثَلَاثَ تَسْبِیْحَاتٍ"[1]

ترجمہ: "امام کے لیے میں پسند کرتا ہوں کہ وہ پانچ مرتبہ تسبیحات پڑھے تاکہ مقتدیوں کو تین تسبیحات پڑھنے کا موقع میسر آ جائے۔"

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقام کتنا اونچا ہے اور پھر ترمذی شریف کتاب کا مقام ..... اس مبارک کتاب میں حضرت کا ارشاد ہے کہ امام پانچ مرتبہ رکوع وسجدہ میں تسبیحات پڑھے، امام پانچ مرتبہ پڑھے گا تو مقتدی کم از کم تین مرتبہ پڑھ سکے گا۔

قومہ اور جلسہ اطمینان سے کریں

سوال: ہمارے امام صاحب رکوع کے بعد قومہ میں سیدھے کھڑے ہوئے بغیر سجدہ میں چلے جاتے ہیں اور "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کے ساتھ ہی "اَللّٰهُ اَکْبَرُ" کہتے ہیں درمیان میں ذرا نہیں ٹھہرتے نہ سانس توڑتے ہیں۔ اسی طرح سجدہ کے بعد جلسہ کی حالت میں، اور یہی حالت ہے سجدہ میں جانے اور سجدہ سے اٹھنے کی تکبیرات کی، ان تکبیرات میں وقفہ نہیں کرتے، ان کو دیکھ کر مقتدی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسی نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اس طرح عادت کر لینا غلط ہے، نماز مکروہ ہوتی ہے اور قابل اعادہ ہو جاتی ہے۔ قومہ اور جلسہ کو اطمینان سے ادا کرنا ضروری ہے "(وَیَقُوْمُ مُسْتَوِیًا) لِمَا مَرَّ مِنْ اَنَّهٗ سُنَّةٌ اَوْ وَاجِبٌ اَوْ فَرْضٌ (ثُمَّ یُکَبِّرُ) مَعَ الْخُرُوْرِ (وَیَسْجُدُ وَاضِعًا رُکْبَتَیْهِ اَوَّلًا لِقُرْبِهِمَا مِنَ الْاَرْضِ (قَوْلُهٗ ثُمَّ یُکَبِّرُ)"

"اَتٰى بِثُمَّ لِلْاِشْعَارِ بِالْاِطْمِیْنَانِ فَاِنَّهٗ سُنَّةٌ اَوْ وَاجِبٌ عَلٰى مَا

[1] ترمذی، الصلوٰۃ، باب ماجاء فی التسبیح فی الرکوع والسجود: ۱/۶۰

اختارہٗ الکمالُ (قولُہٗ معَ الخُرُوْرِ) بِاَنْ یَکُوْنَ اِبْتِدَاءُ التَّکْبِیْرِ عِنْدَ اِبْتِدَاءِ الْخُرُوْرِ وَانْتِھَاؤُہٗ عِنْدَ اِنْتِھَائِہٖ شرح المنیۃ وَیَخِرُّ لِلسُّجُوْدِ قَائِمًا مُسْتَوِیًا۔"[1]

"وَیَجْلِسُ بَیْنَ السَّجْدَتَیْنِ مُطْمَئِنًّا قولُہٗ (مُطْمَئِنًّا) اَیْ بِقَدْرِ تَسْبِیْحَۃٍ کَمَا فِیْ مَتْنِ الدُّرَرِ وَالسِّرَاجِ۔"[2]

ان عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہو۔ کیوں کہ یہ قومہ سنت ہے۔ اور اس کو واجب اور فرض بھی کہا گیا ہے پھر زمین کی طرف جھکتے ہوئے "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہے اور دونوں گھٹنے زمین پر رکھے۔ عبارت میں لفظ "ثم" آیا ہے، جس کا مطلب یہی ہے کہ وقفہ کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیر کہتے ہوئے جھکنا شروع کریں۔ یہ تکبیر اس وقت ختم ہو جب جھکنا ختم ہو (اور پیشانی زمین پر رکھی جائے) پھر دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان سے بیٹھے۔ یعنی اتنی دیر بیٹھے کہ سُبْحَانَ اللّٰہ کہا جا سکے۔ آں حضرت ﷺ کے قومہ اور جلسہ کا طریقہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس طرح بیان فرماتی ہیں کہ جب رکوع سے اپنا سر مبارک اٹھاتے تو اطمینان سے سیدھے کھڑے ہوتے پھر سجدہ میں جاتے۔ اسی طرح سجدہ کے بعد سر مبارک اٹھا کر برابر سیدھا بیٹھ جاتے تب دوسرا سجدہ فرماتے۔[3]

اسی طرح حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آں حضرت ﷺ کے قومہ کا طریقہ بیان فرماتے ہیں "فَاِذَا رَفَعَ رَاْسَہٗ اِسْتَوٰی حَتّٰی یَعُوْدَ کُلُّ فَقَارٍ مَکَانَہٗ" یعنی: جب آں حضرت ﷺ رکوع سے اپنا سر اٹھاتے تو برابر سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ یہاں تک کہ کمر مبارک کا ہر ایک جوڑ اپنی جگہ ٹھہر جاتا۔[4]

---

[1] در مختار مع الشامی، باب آداب الصلوٰۃ، مطلب فی اطالۃ الرکوع للجائی: ۴۹۷/۱

[2] در مختار مع الشامی، باب آداب الصلوٰۃ، مطلب فی اطالۃ الرکوع للجائی: ۵۰۵/۱

[3] مسلم، الصلاۃ، باب ما یجمع صفۃ الصلاۃ وما یفتتح بہ ویختم بہ رقم: ۴۹۸

[4] بخاری، الاذان، باب سنۃ الجلوس فی التشھد، رقم: ۸۲۸

آں حضرت ﷺ کی نماز کے مطابق اپنی نماز ہونی ضروری ہے۔ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

"صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ"[1]

ترجمہ: "مجھے جس طرح نماز پڑھتے دیکھ رہے ہو اسی طرح تم نماز پڑھو۔"

بنا بریں اگر ہم ائمہ خود اپنی نماز آں حضرت ﷺ کی نماز کے مطابق ادا کرنے کی کوشش نہ کریں اور آں حضرت ﷺ کے طریقے کے خلاف ادا کرتے رہیں تو پھر مقتدیوں سے کیسے کہیں گے کہ نماز سنت کے مطابق پڑھیں اور یا اللہ تعالیٰ کے دربار عالی میں کیسے قبول ہوگی۔

بل کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایسی نماز قیامت کے دن ایک پرانے کپڑے کی صورت میں لپیٹ کر نمازی کے منہ پر ماری جائے گی۔[2] الْاَمَان وَالْحَفِیْظ

لہٰذا ہمیں خشوع وخضوع اور اطمینان وسکون کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیے، نماز میں جلدی ہرگز نہ کرنی چاہیے کہ ایسی نماز پڑھنے والے ایک شخص کو آں حضرت ﷺ نے دوبارہ اور سہ بارہ نماز پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔[3]

فقہ اور حدیث کی تصریحات کو دیکھیے ان میں بار بار اطمینان کی ہدایت کی گئی ہے۔ (پھر بھی) امام صاحب اگر اطمینان کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر رکوع، سجدہ وقومہ وجلسہ نہیں کرتا "سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" اور "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" ملا کر کہتا رہتا ہے تو حدیث اور فقہ کی تصریحات کے خلاف کرتا ہے۔ جو سراسر بے ادبی اور مکروہ ہے کہ مخبر صادق

---

[1] بخاری، الاذان، باب من قال لیؤذن فی السفر: ۸۸/۱

[2] الترغیب والترھیب، الصلوٰۃ، (باب) الترھیب من عدم اتمام الرکوع والسجود: ۲۰۱/۱

[3] بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب القراءۃ للامام والماموم رقم: ۷۵۷

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "أَسْوَأُ النَّاسِ سَرِقَةً الَّذِي يَسْرِقُ مِنْ صَلٰوتِهٖ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَكَيْفَ يَسْرِقُ مِنْ صَلٰوتِهٖ، قَالَ: لَا يُتِمُّ رُكُوْعَهَا وَلَا سُجُوْدَهَا." [1]

ترجمہ: "یعنی بدتر اور سب سے برا چور وہ ہے جو اپنی نماز میں چوری کرے ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! نماز میں کس طرح چوری کرتا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (نماز میں چوری یہ ہے کہ) رکوع و سجود کو ٹھیک طور پر ادا نہیں کرتا۔"

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا کہ اس آدمی کی نماز قبول نہیں ہوتی جو رکوع و سجود میں اپنی پیٹھ کو ثابت نہیں رکھتا۔ (نہیں ٹھہرتا) [2]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ رکوع اور سجدہ پورا ادا نہیں کر رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

"لَوْ مَاتَ هٰذَا لَمَاتَ عَلٰى غَيْرِ مِلَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ." [3]

ترجمہ: "کہ اگر یہ اپنی اسی حالت پر مر گیا تو دین محمدی پر اس کی موت نہیں ہوگی۔"

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کی کیفیت بیان فرماتے ہوئے فرمایا:

"فَإِذَا رَكَعْتَ فَاجْعَلْ رَاحَتَيْكَ عَلٰى رُكْبَتَيْكَ، وَمَكِّنْ لِرُكُوْعِكَ وَامْدُدْ ظَهْرَكَ فَإِذَا رَفَعْتَ رَأْسَكَ فَأَقِمْ صُلْبَكَ

---

[1] مسند احمد ۵/۳۱۰، رقم: ۲۲۱۳۶

[2] ترمذی، الصلوۃ، باب ماجاء فیمن لا یقیم صلبہ فی الرکوع والسجود رقم: ۲۶۵

[3] الترغیب والترھیب، الصلوۃ، (باب) الترھیب من عدم اتمام الرکوع والسجود ۱/۱۹۹، مجمع الزوائد، الصلاۃ، باب فیمن لا یتم صلاتہ ۲/۲۵۰، رقم: ۲۷۲۹

حَتّٰى تَرْجِعَ الْعِظَامُ إِلٰى مَفَاصِلِهَا." [1]

ترجمہ: "اور جب تم رکوع میں جاؤ تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے زانوؤں پر رکھو، رکوع میں (اطمینان سے) قائم رہو اور اپنی پشت کو ہموار رکھو۔ اور جب تم (رکوع سے) سر اٹھاؤ تو اپنی پشت کو سیدھا کرو اور سر اٹھاؤ (یعنی بالکل سیدھے کھڑے ہو جاؤ) یہاں تک کہ تمام ہڈیاں اپنی اپنی جگہ آ جائیں۔"

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ إِلٰى صَلَاةِ عَبْدٍ لَا يُقِيْمُ فِيْهَا صُلْبَهٗ بَيْنَ رُكُوْعِهَا وَسُجُوْدِهَا." [2]

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز کو نہیں دیکھتے جو اپنی پیٹھ کو رکوع اور سجدہ کے درمیان درست نہیں رکھتا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ ایک شخص ساٹھ سال تک نماز پڑھتا رہتا ہے اور اس کی ایک نماز بھی قبول نہیں ہوتی۔ ایسا وہ شخص ہے جو رکوع و سجود کو بخوبی ادا نہیں کرتا۔ [3]

حضرت زید بن وہب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہا ہے اور رکوع و سجود بخوبی ادا نہیں کرتا۔ اس شخص کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ تو کب سے اس طرح کی نماز پڑھ رہا ہے؟ اس نے کہا چالیس سال سے۔ فرمایا کہ اس چالیس سال کے عرصہ میں تیری کوئی نماز نہیں ہوئی۔ اگر تو مر گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر نہ مرے گا۔ [4]

---

[1] مسند احمد ۴/۳۴۰، رقم: ۱۸۵۱۶ [2] مسند احمد: ۴/۲۲، رقم: ۱۵۸۴۸

[3] الترغیب والترھیب، الصلوۃ، (باب) الترھیب من عدم اتمام الرکوع والسجود ۱/۱۹۹

[4] حلیۃ الاولیاء، ذکر طبقۃ من تابعی المدینۃ ۴/۱۹۲، رقم: ۵۲۲۱

منقول ہے کہ جب بندۂ مومن نماز کو اچھی طرح ادا کرتا ہے اور اس کے رکوع وسجود کو بخوبی بجالاتا ہے۔ اس کی نماز بشاش اور نورانی ہوتی ہے۔ فرشتے اس نماز کو آسمان پر لے جاتے ہیں۔ وہ نماز اپنے نمازی کے لیے دعا کرتی ہے اور کہتی ہے "حَفِظَكَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ كَمَا حَفِظْتَنِيْ" (اللہ تعالیٰ تیری حفاظت کرے جس طرح تو نے میری حفاظت کی) اور اگر نماز کو اچھی طرح ادا نہیں کرتا (اور اس کے رکوع، سجود، قومہ وجلسہ کو بجانہیں لاتا) وہ نماز سیاہ رہتی ہے۔ فرشتوں کو اس نماز سے کراہت آتی ہے۔ اور فرشتے اس نماز کو آسمان پر نہیں لے جاتے اور وہ نماز اس نمازی کے لیے بددعا کرتی ہے، اور کہتی ہے

"ضَيَّعَكَ اللّٰهُ كَمَا ضَيَّعْتَنِيْ" (اللہ تعالیٰ تجھے ضائع کرے جس طرح تو نے مجھے ضائع کیا۔ (اللہ تعالیٰ تیرا ناس مارے جیسا تو نے میرا ناس مارا)۔[1]

قومہ اور جلسہ میں عدمِ اطمینان ایک بڑی کوتاہی

ایک بڑی کوتاہی جو آج عام طور سے دیکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ قومہ اور جلسہ میں اطمینان نہیں کیا جاتا۔ حالاں کہ یہ واجب ہے۔

رکوع اور سجدہ کی طرح قومہ اور جلسہ میں بھی احناف کے ہاں راجح قول کے مطابق اعتدال اور اطمینان واجب ہے۔ اگرچہ ایک روایت سنت ہونے کی بھی ہے لیکن حدیثوں کا تقاضا وجوب ہے، اسی لیے محقق علامہ کمال الدین ابن الہمام اور ان کے شاگرد علامہ ابن امیر حاج نے وجوب کو ترجیح دی ہے، بل کہ ابن امیر حاج نے اسی کو درست قرار دیا ہے یعنی دوسرا قول صحیح نہیں ہے جیسا فتاویٰ شامی میں ہے:

"وَالْقَوْلُ بِوُجُوْبِ الْكُلِّ هُوَ مُخْتَارُ الْمُحَقِّقِ ابْنِ الْهُمَامِ وَتِلْمِيْذِهٖ ابْنِ أَمِيْرِ حَاجٍّ حَتّٰى قَالَ إِنَّهُ الصَّوَابُ وَاللّٰهُ

[1] مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی، مکتوب: ۹۹، ۲/۱۳۸، ۱۳۹

الْمُوَفِّقُ لِلصَّوَابِ"[1]

علامہ حصکفی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ درمختار میں واجبات کے بیان میں لکھتے ہیں:

"وَتَعْدِيْلُ الْأَرْكَانِ أَيْ تَسْكِيْنُ الْجَوَارِحِ قَدْرَ تَسْبِيْحَةٍ فِي الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ وَكَذَا فِي مَاقَامَ مِنْهُمَا عَلٰى مَااخْتَارَهُ الْكَمَالُ"[2]

ترجَمہ: "یعنی نماز کے واجبات میں سے تعدیل ارکان بھی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ نیز دونوں سے اٹھ کر (قومہ اور جلسہ میں) اعضاء کو ایک تسبیح کے بقدر ساکن رکھنا چاہیے۔ یہی کمال ابن الہمام رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کا پسندیدہ قول ہے۔"

علامہ ابن عابدین شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ بحر رائق میں ہے کہ دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ ان چاروں یعنی رکوع، سجدہ، قومہ اور جلسہ میں اطمینان واجب ہو اور خود قومہ اور جلسہ بھی واجب ہو اس لیے کہ آپ حضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ان تمام پر ہمیشہ عمل فرمایا اور جن صحابی نے اچھی طرح نماز نہیں پڑھی تھی ان کو ان تمام کا حکم دیا۔ اور قاضی خان نے ذکر کیا ہے کہ اگر بھول کر کوئی رکوع سے نہ اٹھے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ محیط میں بھی ایسا ہی ہے۔ اور جلسہ بین السجدتین کا بھی یہی حکم ہوگا، کیوں کہ قومہ اور جلسہ کا معاملہ ایک ہی ہے۔[3]

علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ آگے لکھتے ہیں کہ شرح منیہ میں ہے۔

دلیل کو نہیں چھوڑا جائے گا جب کہ کوئی (فقہی) روایت اس کے موافق ہو (لہٰذا وجوب ہی کو اختیار کریں گے) نیز لکھتے ہیں، قاضی صدر نے اپنی شرح میں تمام ارکان کی تعدیل کے بارے میں سخت تاکید کی ہے، اور کہا ہے کہ ہر رکن کو مکمل کرنا،

[1] شامی، الصلوٰۃ، باب فی واجبات الصلوٰۃ: ۱/۴۶۴

[2] در مختار، الصلوٰۃ، باب واجبات الصلوٰۃ: ۱/۴۶۴

[3] ایضاً

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں واجب ہے، اور
امام ابو یوسف اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فرض ہے۔ اس لیے رکوع سجدے
اور ان دونوں کے درمیان قومہ میں اتنا ٹھہرنا چاہیے کہ ہر عضو مطمئن ہو جائے، اتنا
ٹھہرنا امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے یہاں واجب ہے۔ اگر کسی نے
ان کو بھول کر چھوڑ دیا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ اور اگر عمداً چھوڑا تو سخت مکروہ ہوگا اور
نماز کا اعادہ ضروری ہوگا الخ۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: حاصل یہ ہے کہ روایت و دلیل کے
لحاظ سے تعدیل ارکان واجب ہے۔ قومہ اور جلسہ اور ان کی تعدیل کے بارے میں
مشہور بات مذہب میں یہ ہے کہ سنت ہیں۔ لیکن وجوب کی بھی ایک روایت ہے۔
اور یہی دلائل کے موافق ہے۔ اور اسی کو ابن الہمام اور ان کے بعد متاخرین نے
اختیار کیا ہے۔ اور ان کے شاگرد ابن امیر حاج کا قول آپ جان چکے ہیں کہ یہی
صواب ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ ان تمام کی فرضیت کے قائل ہیں۔
اسی کو مجمع اور عینی میں اختیار کیا ہے۔ اور امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہی قول
ہمارے تینوں اماموں سے نقل کیا ہے۔ فیض الباری میں کہا کہ یہی احوط ہے۔ یہی
امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی مذہب ہے۔[1]

مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ "معارف السنن" میں لکھتے ہیں کہ امام
ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے تعدیل ارکان کی فرضیت جو منقول ہے اس سے مراد
عملی فرضیت ہے۔ ابن الہمام محقق نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے۔ اس طرح ہمارے
ائمہ کے درمیان اختلاف ختم ہو جاتا ہے (اس لیے کہ واجب پر بھی عمل کرنا ضروری
ہوتا ہے)۔

نیز لکھتے ہیں: تحقیق یہ ہے کہ ہمارے یہاں بھی اتنی دیر ٹھہرنا کہ حرکت بند

[1] رد المحتار، مطلب لا ینبغی ان یعدل عن الدرایۃ: ۴۶۴/۱

ہو جائے، فرض ہے۔ پھر ایک تسبیح کی مقدار ٹھہرنا واجب ہے۔ اور تین تسبیح کے بقدر
سنت۔ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہی تحقیق پیش کی ہے۔ اور اسی کو امام ابوحنیفہ،
امام مالک، سفیان ثوری، امام اوزاعی، صاحبین اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب
قرار دیا ہے اور امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے استدلال کیا ہے۔[1]

ملاحظہ: غور فرمایئے محدث عصر شیخ بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
"تین تسبیح کی مقدار سنت ہے اب جو شخص سنت کے موافق نماز پڑھنا چاہے تو
اس کو چاہیے کہ تین تسبیح کی مقدار قومہ و جلسہ کرے۔"

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے تینوں اماموں کی طرف تعدیل ارکان
کی فرضیت کو منسوب کیا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کی تقریر میں
ہے کہ امام طحاوی ہمارے مذہب کے سب سے بڑے عالم ہیں جب انہوں نے کوئی
اختلاف نہیں ذکر کیا، اس لیے میرے نزدیک بھی اختلاف ثابت نہیں۔

نیز فرماتے ہیں کہ بدائع میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ جو
شخص تعدیل کو ترک کر دے اس کے بارے میں فرمایا کہ مجھے ڈر ہے کہ اس کی نماز
جائز نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تعدیل کا بہت اہتمام
فرماتے ہیں۔ تو جس نے ہم احناف کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ یہ لوگ
تعدیل کی پرواہ نہیں کرتے اس نے ہم پر بڑا بہتان لگایا۔

مجھ پر یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ اس مسئلہ میں بالکل اختلاف نہیں۔ اس لیے کہ
تعدیل اتنی مقدار میں کہ حرکت انتقالیہ منقطع ہو جائے ہمارے یہاں بھی فرض ہے۔
اور شوافع اسی کو رکن کہتے ہیں اور ایک تسبیح کے بقدر واجب ہے اور اس سے زائد سنت
ہے۔ اب ہمارے اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہا۔[2]

[1] معارف السنن، الصلوٰۃ، باب ماجاء فی التسبیح فی الرکوع والسجود: ۹/۲
[2] فیض الباری، الأذان، باب المکث بین السجدتین: ۳۸۹/۲، رقم: ۸۲۱

جمہور نے تعدیل کو جن روایات کی وجہ سے ضروری قرار دیا ان میں سے ایک خلاد بن رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ والی روایت ہے جو بخاری شریف میں اس طرح مذکور ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے کہ ایک آدمی (خلاد بن رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ) آئے۔ نماز پڑھی پھر حضرت کے پاس آکر سلام کیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا "اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ" جاؤ پھر پڑھو تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ چناں چہ انہوں نے پھر نماز پڑھی اور آکر سلام کیا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی بات ارشاد فرمائی کہ جاؤ پھر نماز پڑھو تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اسی طرح تین بار ہوا پھر ان صاحب نے کہا۔

اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا!

میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا۔ آپ مجھ کو سکھا دیجیے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب نماز کے لیے کھڑے ہو تو تکبیر کہو پھر جو قرآن میسر ہو پڑھو پھر رکوع کرو تو رکوع کی حالت میں اطمینان کرو "ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَعْتَدِلَ قَائِمًا ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ جَالِسًا ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا ثُمَّ افْعَلْ ذٰلِكَ فِىْ صَلٰوتِكَ كُلِّهَا" یعنی پھر رکوع سے سر اٹھاؤ یہاں تک کہ کھڑے ہو کر معتدل ہو جاؤ۔ (یعنی کھڑے ہو کر اطمینان کرو)۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں جو مسلم کی سند سے مروی ہے "حَتّٰى تَطْمَئِنَّ قَائِمًا" یعنی کھڑے ہو کر اطمینان کرلو آیا ہے۔

پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ سجدہ کی حالت میں اطمینان کرو پھر سجدہ سے اٹھو حتی کہ اطمینان کے ساتھ بیٹھو (یعنی جلسہ میں اطمینان کرو) پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ سجدہ

کی حالت میں اطمینان کرو پھر پوری نماز میں ایسا ہی کرو۔[1]

ترمذی میں حضرت رفاعہ بن رافع زرقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی قصہ مروی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ایک صاحب آئے دیہاتی کی طرح (یہ خلاد بن رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے) اور نماز پڑھی اور ہلکی نماز پڑھی "اِلٰى اٰخِرِ الْحَدِيْثِ"۔[2]

دیہاتی کی طرح اس لیے فرمایا کہ ان کو نماز کا طریقہ اچھی طرح نہیں آتا تھا۔ جیسے عام طور سے دیہات کے لوگ مسائل سے ناواقف ہوتے تھے ایسے ہی یہ بھی تھے۔ ورنہ دیہات کے رہنے والے نہیں تھے۔[3]

دیکھیے اس واقعہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ مرتبہ اطمینان کا لفظ یعنی "حَتّٰى تَطْمَئِنَّ" استعمال فرمایا، کہ نماز کے ہر رکن کی ادائیگی میں اطمینان ہو، ہر رکن سے دوسرے رکن کی طرف انتقال میں اطمینان ہو۔ جس طرح رکوع اور سجدہ میں اطمینان کا حکم دیا اسی طرح قومہ اور جلسہ میں بھی اطمینان کا حکم دیا۔ تو اگر رکوع اور سجدہ میں اطمینان فرض یا واجب ہے تو قومہ اور جلسہ میں بھی فرض یا واجب ہوگا۔ دونوں میں تفریق صحیح نہیں ہوگی۔ اسی لیے ابن امیر حاج نے فرمایا کہ یہی صحیح ہے۔ یعنی دوسرا قول سنیت کا صحیح نہیں۔

ائمہ کرام کو چاہیے کہ تعدیل ارکان کا بہت ہی زیادہ اہتمام فرمائیں، مقتدیوں کا بھی آہستہ آہستہ ذہن بنائیں تا کہ وہ بھی اطمینان سے رکوع سجدہ اور قومہ و جلسہ کو ادا کرنے والے بن جائیں ...... اس لیے کہ تعدیل ارکان نہ کرنے والے کے لیے بہت ہی سخت وعید وارد ہوئی ہے۔

[1] بخاری، الاذان، باب امر النبی الذی لا یتم رکوعہ بالاعادۃ ۱۰۹/۱
[2] ترمذی مع عرف الشذی، الصلوٰۃ، باب ماجاء فی وصف الصلوٰۃ ۶۶/۱
[3] فتح الباری

ان حدیثوں میں جس اطمینان کو واجب بتایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام مقامات پر اعضاء کو سکون ہوجائے۔ اس کی کم سے کم حد ہمارے فقہاء رَحِمَہُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے ایک تسبیح مقرر فرمائی کہ جتنی دیر میں ایک مرتبہ تسبیح پڑھی جائے اتنی دیر ٹھہرا جائے تاکہ سکون اور توقف کا تحقق محسوس ہوسکے۔

جو لوگ اس طرح نماز پڑھتے ہیں کہ ان کے قومہ اور جلسہ میں ایک تسبیح کے بقدر سکون اور توقف نہیں ہوتا۔ اگر قصداً ایسا کرتے ہیں، تو ان کی نماز واجب الاعادہ ہوتی ہے۔ یعنی پھر سے دوبارہ پڑھنا واجب ہے (اور عام طور سے لوگ قصداً ہی جلدی کرتے ہیں۔ جہالت اور نہ جاننا بھی قصداً ہی کی ایک صورت ہے)۔

اور جو لوگ سہواً ایسا کرتے ہیں، ان پر سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ اگر سجدۂ سہو نہیں کیا تو اس واجب کے چھوڑنے کی وجہ سے نماز کو دہرانا ضروری ہوگا۔[۱]

ذیل میں ہم تعدیلِ ارکان کی اہمیت کے پیشِ نظر علامہ محمد آفندی البرکلی کی کتاب "مُعَدِّلُ الصَّلٰوۃ" سے کچھ اقتباسات نقل کرتے ہیں جو کہ ایک عظیم المنفعت کتاب ہے، اس کے مصنف علامہ برکلی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ایک معتبر حنفی عالم ہیں، ان کی اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے سینہ میں ایک درد بھرا دل رکھتے تھے، مسلمانوں کی نمازوں میں کوتاہیوں کو دیکھ کر بڑے دردمند دل کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے، مسائل کو احادیثِ مبارکہ اور فقہاء احناف کی عبارتوں سے مدلل کیا ہے۔ ترکی کے رہنے والے ہیں جو حنفیہ کا مرکز رہا ہے، بے شمار علماء یہاں سے اٹھے اور علم دین کی خدمات انجام دیں، انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں، جیسا کہ ان کے تذکرہ سے معلوم ہوگا۔

علامہ شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے تعدیلِ ارکان کی بحث میں ان کی کتاب کے مطالعہ کی طرف اہلِ علم کو ان الفاظ کے ساتھ متوجہ کیا ہے جس سے اس کتاب کی

[۱] ایضاً

اہمیت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے چناں چہ علامہ شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

"وَلِلْعَلَّامَةِ الْبِرْكَلِيِّ رِسَالَةٌ سَمَّاهَا (مُعَدِّلُ الصَّلٰوةِ) أَوْضَحَ الْمَسْأَلَةَ فِيهَا غَايَةَ الْإِيضَاحِ وَبَسَطَ فِيهَا أَدِلَّةَ الْوُجُوبِ وَذَكَرَ مَا يَتَرَتَّبُ عَلَى تَرْكِ ذٰلِكَ مِنَ الْآفَاتِ وَأَوْصَلَهَا إِلَى ثَلٰثِينَ آفَةً، وَمِنَ الْمَكْرُوهَاتِ الْحَاصِلَةِ فِي صَلٰوةِ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ وَأَوْصَلَهَا إِلَى أَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثِ مِائَةٍ وَخَمْسِينَ مَكْرُوهًا فَيَنْبَغِي مُرَاجَعَتُهَا وَمُطَالَعَتُهَا."[۱]

ترجمہ: "علامہ برکلی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا ایک رسالہ ہے اس کا نام رکھا ہے "مُعَدِّلُ الصَّلٰوۃ" اس میں مسئلہ کی بہت تفصیل کی ہے اور وجوب کے دلائل پھیلا کر ذکر کیے ہیں اور تعدیل کے ترک پر جو آفات مرتب ہوتی ہیں ان کو بتایا ہے کہ تیس (۳۰) ہیں اور رات دن کی نمازوں میں جو مکروہات لازم آتے ہیں ان کو بتایا ہے کہ تین سو پچاس (۳۵۰) ہیں، مناسب ہے کہ اس رسالہ کو دیکھا جائے اور مطالعہ کیا جائے۔"

اس کتاب کا اردو ترجمہ عربی عبارت کے ساتھ مولانا فضل الرحمٰن اعظمی (مقیم آزادول جنوبی افریقہ) نے کیا ہے[۲] امید ہے کہ اس کی اشاعت سے علماء کرام اور عام مسلمان مستفید ہوں گے، خاص طور سے قومہ اور جلسہ اور ان دونوں میں اطمینان و اعتدال پر مصنف نے بہت زور دیا ہے، اس بحث کو خاص طور سے توجہ سے دیکھنا چاہیے اور جو کوتاہی اپنے اندر یا دوسروں کے اندر دیکھیں اس کی اصلاح کی فکر کریں، غلطی کی اصلاح بہت مشکل ہوتی ہے، ایک عادت پڑجانے کے بعد اس کو بدلنا کافی مشکل ہے، جب تک خصوصی توجہ نہیں دی جائے گی پرانی عادت نہیں بدل سکتی، اس

[۱] رد المحتار، باب صفة الصلوة، مطلب لا ينبغي ان يعدل …… ۱/۴۶۵

[۲] زمزم پبلشرز کراچی نے اس کو شائع کیا ہے۔

کوتاہی کی وجہ سے بہت نقصان ہے، بہت سے لوگوں کی نمازیں ضائع ہورہی ہیں، اہلِ علم اس کی طرف توجہ فرمائیں اور مسلمانوں کو تنبیہ فرمائیں تو امید ہے کہ اصلاح ہو جائے گی، اور کوشش کرنے والے اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔ ہمارے فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی عبارت پر غور فرمائیں کہ انہوں نے سخت وعید ذکر فرمائی ہے۔

وَقَالَ ابْنُ الْهُمَامِ رَحِمَهُ اللّٰهُ: سُئِلَ مُحَمَّدٌ عَنْ تَرْكِ الْاِعْتِدَالِ فِي الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ فَقَالَ: أَخَافُ أَنْ لَا تَجُوْزَ صَلَاتُهُ، وَكَذَا فِي الْخُلَاصَةِ، وَكَذَا رُوِيَ عَنْ أَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى، ذَكَرَهُ فِيْ شَرْحِ الْمُنْيَةِ.

وَفِي الظَّهِيْرِيَّةِ: قَالَ الْقَاضِي الْإِمَامُ صَدْرُ الْإِسْلَامِ أَبُو الْيُسْرِ: إِنَّ مَنْ تَرَكَ الْاِعْتِدَالَ فِي الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ يَلْزَمُهُ الْإِعَادَةُ، وَإِذَا عَادَ يَكُوْنُ الْفَرْضُ الثَّانِيْ دُوْنَ الْأَوَّلِ، وَذَكَرَ الشَّيْخُ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ السَّرَخْسِيُّ: أَنْ يَلْزَمَهُ الْإِعَادَةُ، وَلَمْ يَتَعَرَّضْ أَنَّ الْفَرْضَ هُوَ الثَّانِيْ أَوِ الْأَوَّلُ، انتهى.[1]

ترجمہ: ”محقق ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا کہ رکوع وسجود میں اطمینان چھوڑ دے تو کیا حکم ہے؟ فرمایا: مجھے ڈر ہے کہ اس کی نماز جائز نہیں، اور اسی طرح خلاصہ میں بھی ہے، اور اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی مروی ہے، شرح منیہ میں اس کا ذکر ہے۔

اور فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ قاضی امام صدر الاسلام ابو الیسر (متوفی ۴۹۳ھ) نے فرمایا: جو رکوع وسجود میں اطمینان چھوڑ دے اس پر دوبارہ پڑھنا ضروری ہے، اور دوسری نماز فرض ادا ہوگی نہ کہ اول۔ اور امام شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] معدل الصلوۃ: ۲۴، ۲۵

بھی یہ ذکر فرمایا کہ دوبارہ پڑھنا لازم ہے، لیکن یہ نہیں ذکر فرمایا کہ پہلی نماز فرض ہے یا دوسری۔“

قَالَ الشَّيْخُ أَكْمَلُ الدِّيْنِ فِيْ شَرْحِ الْمَشَارِقِ: قَوْلُهُ (ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَعْتَدِلَ قَائِمًا) يَدُلُّ عَلٰى أَنَّ تَعْدِيْلَ الْأَرْكَانِ فِيْهَا وَاجِبٌ، انتهى.

وَفِيْ كَلَامِهٖ دَلَالَةٌ عَلٰى شُمُوْلِ تَعْدِيْلِ الْأَرْكَانِ لِطُمَانِيْنَةِ الْقَوْمَةِ عَلٰى مَا نَقَلْنَاهُ مِنَ الْمُغْرِبِ وَالْاِخْتِيَارِ وَعَلٰى رِوَايَةِ الْوُجُوْبِ فِيْهَا.

وَمِنْهَا: مَا رَوَى الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ عَنِ الْبَرَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رُكُوْعُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسُجُوْدُهٗ وَبَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ مَا خَلَا الْقِيَامَ وَالْقُعُوْدَ قَرِيْبًا مِنَ السَّوَاءِ.[1]

ترجمہ: ”شیخ اکمل الدین مشارق کی شرح میں لکھتے ہیں: کہ حضور ﷺ کا ارشاد کہ ”پھر اٹھو یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ“ یہ بتاتا ہے کہ تعدیل ارکان واجب ہے۔

ان کے کلام سے معلوم ہوا کہ تعدیل ارکان کا لفظ قومہ کے اطمینان کو بھی شامل ہے جیسا کہ ہم نے مغرب اور اختیار سے نقل کیا ہے اور اس سے وجوب کی روایت کا بھی پتہ چلا۔

❶ ایک حدیث براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے، جس کو امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا، وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کا رکوع اور سجدہ، اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور رکوع سے سر اٹھا کر کھڑے رہنا یہ سب تقریباً برابر تھا قیام اور قعود کو چھوڑ کر۔“

يَقُوْلُ الْعَبْدُ الضَّعِيْفُ عَصَمَهُ اللّٰهُ: ”فِيْ هٰذَا الْحَدِيْثِ الشَّرِيْفِ

---

[1] بخاري، الأذان، باب حد اتمام الركوع والاعتدال فيه: ١٠٩/١، نقلاً عن معدل الصلوة: ١٠

دَلَالَةٌ عَلٰى أَعْلٰى مَرَاتِبِ طُمَأْنِيْنَةِ الْقَوْمَةِ وَالْجَلْسَةِ، وَهُوَ مَا يَسَعُ فِيْ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ تَقْرِيْبًا، إِذًا لَا بُدَّ فِي الْقِيَامِ مِنْ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ وَثَلَاثِ آيَاتٍ، وَالظَّاهِرُ أَنْ يَقْرَأَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ ...... وَالتَّعَوُّذَ وَالْبَسْمَلَةَ، وَأَقَلُّ مَرَاتِبِ الْقُرْبِ مِنْ مُسَاوَاتِهَا أَنْ يَزِيْدَ عَلٰى نِصْفِهَا."

وَمِنْهَا: مَا رَوَاهُ أَيْضًا عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "أَتِمُّوا الرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَ."[1] وَالْإِتْمَامُ إِنَّمَا يَكُوْنُ بِالطُّمَأْنِيْنَةِ، فَيَدُلُّ عَلٰى وُجُوْبِهَا.[2]

ترجمہ: "بندۂ ضعیف۔ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے۔ کہتا ہے کہ اس حدیث شریف میں قومہ اور جلسے کے اعلیٰ درجے کے اطمینان کی دلیل ہے، اور وہ یہ کہ اتنی دیر ٹھہریں جس میں سورۂ فاتحہ تقریباً پڑھ سکیں اس لیے کہ قیام میں سورۂ فاتحہ اور تین آیتوں کا پڑھنا تو ضروری ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ" اور تعوذ تسمیہ پڑھتے ہوں گے، اور مساوات کا سب سے کم درجہ یہ ہے کہ نصف سے زائد ہو۔

❷ دوسری دلیل حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے، جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ رکوع وسجود پورا کرو، اور پورا کرنا اطمینان ہی سے ہوگا، لہٰذا اطمینان واجب ہوا۔

یہ حدیثیں بتاتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہمیشہ کرتے تھے۔"

تعدیلِ ارکان کو چھوڑنے کی آفتوں پر تنبیہ

إِعْلَمْ أَنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ تَرَكُوا الْقَوْمَةَ وَالْجَلْسَةَ فَضْلًا عَنِ الطُّمَأْنِيْنَةِ فِيْهِمَا فَإِنَّهَا صَارَتْ كَالشَّرِيْعَةِ الْمَنْسُوْخَةِ.

[1] بخاري، الأيمان والنذر، باب كيف كانت يمين النبي رقم: ٦٦٤٤

[2] نقلاً عن معدل الصلوة: ٤١، ٥٦

فَنَقُوْلُ: فِيْهِ آفَاتٌ كَثِيْرَةٌ ظَاهِرَةٌ لَا يَحْتَاجُ إِلٰى ذِكْرِهَا إِلَّا جَاهِلٌ مَغْرُوْرٌ بِعَادَةِ الْعَوَامِ، أَوْ عَالِمٌ سَكْرَانُ بِحُبِّ الْجَاهِ وَكَثْرَةِ الْحُطَامِ، أَوْ غَافِلٌ مَشْغُوْلٌ بِمَصَالِحِ الْأَنَامِ، وَالَّتِيْ تَحْضُرُ الْآنَ بِبَالِيْ مِنْ ضَرَرِ تُعَوِّدُ تَرْكَ تَعْدِيْلِ الْأَرْكَانِ وَآفَاتِهِ ثَلَاثُوْنَ:

اَلْأَوَّلُ: إِيْرَاثُ الْفَقْرِ، فَإِنَّ تَعْدِيْلَ أَرْكَانِ الصَّلَاةِ وَتَعْظِيْمَهَا مِنْ أَقْوَى الْأَسْبَابِ الْجَالِبَةِ لِلرِّزْقِ، وَالتَّرْكُ وَالتَّهَاوُنُ مِنَ الْأَسْبَابِ السَّالِبَةِ لَهُ، كَذَا ذَكَرَهُ فِيْ تَعْلِيْمِ الْمُتَعَلِّمِ.[1]

وَالثَّانِيْ: إِيْرَاثُ الْبُغْضِ لِمَنْ يُرٰى مِنْ عُلَمَاءِ الْآخِرَةِ، وَسُقُوْطُ الْحُرْمَةِ عِنْدَهُمْ، فَيَهُوْنُ فِيْ دِيْنِهِ، وَلَا يَعْتَمِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي الْأَقْوَالِ وَالْأَفْعَالِ.

وَالثَّالِثُ: إِضَاعَةُ حُقُوْقِ النَّاسِ بِسُقُوْطِ الشَّهَادَةِ، وَأَنَّ مَنِ اعْتَادَ تَرْكَ الْقَوْمَةِ وَالْجَلْسَةِ وَالطُّمَأْنِيْنَةِ فِيْ أَحَدِهِمَا صَارَ مُصِرًّا عَلَى الْمَعْصِيَةِ فَلَا يُعَدَّلُ وَلَا يُزَكّٰى.[2]

ترجمہ: "معلوم ہونا چاہیے کہ اکثر لوگوں نے سرے سے قومہ اور جلسہ ہی کو چھوڑ رکھا ہے ان میں اطمینان کی بات کو جانے دیجیے، اس کی کیا بات کرتے ہیں، یہ اطمینان تو منسوخ شریعت کی طرح ہو گیا، (اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ)

ہم کہتے ہیں کہ اطمینان کو چھوڑنے میں بہت سی آفتیں ہیں جو ظاہر ہیں، ان کی ضرورت صرف اس جاہل کے لیے ہے جو عوام کی عادت سے دھوکہ میں ہے، یا اس عالم کے لیے ہے جو حبِ جاہ اور دنیا کی کثرت کے نشہ میں ہے، یا اس عالم کے لیے ہے جو مخلوق کی مصلحتوں میں مشغول ہے۔

[1] تعليم المتعلم، فصل في ما يجلب الرزق وما يمنعه: ٧٣

[2] نقلاً عن معدل الصلوة: ٥٠، ٥١

ترکِ تعدیل کا عادی ہونے سے جو نقصانات اور آفتیں لازم آتی ہیں ان میں سے تیس (۳۰) اس وقت میرے ذہن میں ہیں (مضمون کی طوالت کی وجہ سے یہاں پر صرف تین کو نقل کیا جاتا ہے)۔

❶ فقر اور محتاجی: نماز کے ارکان کی تعدیل وتعظیم روزی لانے والے قوی تر اسباب میں سے ہے، اور اس کو چھوڑنے اور اس میں سستی کرنے سے روزی گھٹ جاتی ہے، ایسا ہی تعلیم المتعلم میں مذکور ہے (یہ صاحب ہدایہ کے شاگرد برہان الاسلام زرنوجی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی تصنیف ہے)۔

❷ جو شخص تعدیل نہیں کرتا وہ علماء آخرت کی نگاہ میں مبغوض ہو جاتا ہے، محترم نہیں رہتا، دین میں بے عزت ہو جاتا ہے، اس کے اقوال وافعال پر اعتماد نہیں کرتے۔

❸ اس کی شہادت رد کر دی جاتی ہے، اس طرح لوگوں کے حقوق ضائع ہو جاتے ہیں، جو شخص قومہ اور جلسہ کو اور ان میں سے کسی کے اندر اطمینان کو ترک کرنے کا عادی ہے وہ معصیت پر اصرار رہنے والا ہے، اس کا تزکیہ اور تعدیل نہیں کی جا سکتی، (اس لیے گواہی قبول نہیں ہوگی)۔"

تنبیہ عظیم

ثُمَّ اعْلَمْ أَيُّهَا الْمُصَلِّي التَّارِكُ لِلْقَوْمَةِ وَالْجَلْسَةِ وَالطُّمَأْنِيْنَةِ فِيْهِمَا أَنِّي أَذْكُرُ لَكَ نُكْتَةً مُؤَثِّرَةً لَعَلَّكَ تَتَّعِظُ وَتَتَنَبَّهُ إِنْ كَانَ بِكَ إِنْصَافٌ وَمَيْلٌ إِلَى الْحَقِّ وَعَلَامَةُ صَلَاحٍ.

وَهِيَ: أَنَّكَ إِنِ اقْتَصَرْتَ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ عَلَى الْفَرَائِضِ وَالْوَاجِبَاتِ وَالسُّنَنِ الْمُؤَكَّدَةِ يَكُوْنُ عَدَدُ رَكَعَاتِكَ ثِنْتَيْنِ وَثَلَاثِيْنَ وَفِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ قَوْمَةٌ وَجَلْسَةٌ.

فَلَوْ تَرَكْتَ طُمَأْنِيْنَةَ كُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهَا يَصِيْرُ أَرْبَعَةً وَسِتِّيْنَ إِثْمًا وَذَنْبًا.

وَلَوْ تَرَكْتَ أَنْفُسَهُمَا أَيْضًا يَصِيْرُ مِائَةً وَثَمَانِيَةً عِشْرِيْنَ ذَنْبًا،

وَإِذَا تَرَكْتَ الْقَوْمَةَ صَارَ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ أَرْبَعُ مَكْرُوْهَاتٍ:

أَوَّلُهَا: تَرْكُ سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ عَنْ مَوْضِعِهِ وَهُوَ رَفْعُ الرَّأْسِ إِلَى الْقَوْمَةِ،

وَثَانِيْهَا: إِتْيَانُهُ فِيْ غَيْرِ مَوْضِعِهِ، وَهُوَ الْهُوِيُّ إِلَى السَّجْدَةِ،

وَثَالِثُهَا: تَرْكُ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ عَنْ مَوْضِعِهِ، وَهُوَ طُمَأْنِيْنَةُ الْقَوْمَةِ،

وَرَابِعُهَا: إِتْيَانُهُ فِيْ غَيْرِ مَوْضِعِهِ، وَهُوَ الْهُوِيُّ إِلَى السَّجْدَةِ،

فَيَلْزَمُ تَرْكُ أَرْبَعِ شَيْءٍ:

أَحَدُهَا: إِتْيَانُ سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ حِيْنَ الرَّفْعِ،

وَثَانِيْهَا: عَدَمُ إِتْيَانِهِ حَالَ الْهُوِيِّ،

وَثَالِثُهَا: إِتْيَانُ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ حَالَ طُمَأْنِيْنَةِ الْقَوْمَةِ.[1]

تَرْجَمَہ: "جو لوگ اس طرح نماز پڑھتے ہیں کہ قومہ اور جلسہ اور ان میں اطمینان کو چھوڑتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے میں ان کو ایک موثر نکتہ کی طرف متوجہ کرتا ہوں، اگر ان میں کچھ انصاف اور حق کی طرف میلان اور اصلاح کی کوئی علامت موجود ہے تو وہ ضرور اس نکتہ سے نصیحت حاصل کر لیں گے۔

وہ یہ ہے کہ آپ اگر صرف فرائض، واجبات اور سنت موکدہ پر اکتفاء کرتے ہیں تو بھی دن اور رات میں آپ کی نماز کی رکعات بتیس (۳۲) ہوئیں، اور ہر رکعت میں قومہ اور جلسہ ہے:

[1] عن معدل الصلوة ٦٢ تا ٦٤

تو اگر آپ ان میں سے ہر ایک کے اطمینان کو ترک کرتے ہوں تو چونسٹھ (۶۴) گناہ ہوئے۔ اور اگر قومہ اور جلسہ کو بھی چھوڑتے ہوں تو ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) گناہ ہوئے۔

اور اگر قومہ کو چھوڑتے ہیں تو ہر رکعت میں چار مکروہ ہوئے:

1. "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کو اس کی جگہ سے ہٹانا، اس کی جگہ قومہ کی طرف سر کا اٹھانا ہے۔ (اس سے مؤخر کرنا)۔
2. اس کی جگہ کے سوا میں اس کو کہنا، وہ ہے سجدہ کی طرف جانا۔
3. "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" جس کی جگہ قومہ کا اطمینان ہے اس کو اس کی جگہ سے ہٹانا۔
4. اور سجدہ میں جانے کے وقت کہنا جو اس کی جگہ نہیں ہے۔

اس طرح چار سنتیں چھوٹیں:

1. "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کو رکوع سے سر اٹھانے کے وقت پڑھنا۔
2. سجدہ میں جانے کے وقت نہ کہنا۔
3. "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" کو قومہ کی اطمینان کی حالت میں کہنا۔
4. سجدہ میں جانے کے وقت نہ کہنا۔

وَلَوْ نَزَلْنَا إِلَى سُنَّةِ الْقَوْمَةِ وَالْجَلْسَةِ وَالطُّمَأْنِينَةِ فِيهِمَا صَارَ تَارِكًا عَدَدًا كَثِيرًا مِّنْ سُنَّةٍ مُؤَكَّدَةٍ فِي كُلِّ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ وَفِي تَرْكِ كُلِّ سُنَّةٍ عِتَابٌ وَحِرْمَانُ الشَّفَاعَةِ.

فَهَلْ تَرْضَى أَيُّهَا الْأَخُ الْعَاقِلُ أَنْ تَحْرِمَ شَفَاعَةَ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَحَبِيْبِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الَّتِي يَرْجُوْهَا وَيَطْلُبُهَا كُلُّ الْخَلَائِقِ حَتَّى النَّبِيِّيْنَ وَالْأَوْلِيَاءِ؟ وَأَيُّ عَمَلٍ مَقْبُوْلٍ لَكَ يُنْجِيْكَ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ تَعَالَى وَسَخَطِهِ وَيُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ إِنْ لَمْ يَنَلْكَ شَفَاعَةُ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. فَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا.

وَنَسْأَلُ وَنَتَضَرَّعُ إِلَيْهِ أَنْ يُرِيَنَا وَإِيَّاكُمْ أَيُّهَا الْإِخْوَانُ الْحَقَّ حَقًّا وَيَرْزُقَنَا وَإِيَّاكُمُ اتِّبَاعَهُ، وَيُرِيَنَا وَإِيَّاكُمُ الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَيَرْزُقَنَا وَإِيَّاكُمُ اجْتِنَابَهُ، إِنَّهُ كَرِيْمٌ رَحِيْمٌ، جَوَادٌ حَكِيْمٌ.[1]

تَرجَمَۃ: "(یہ تو اس صورت میں ہے کہ قومہ وجلسہ میں اطمینان کو واجب مانا جائے) اور اگر ہم نیچے اتریں اور قومہ وجلسہ اور ان دونوں میں اطمینان کو سنت کہیں تو پھر اتنی ڈھیر ساری مؤکدہ سنتوں کا تارک ہوگا، اور ہر سنت کے ترک میں عتاب اور حضور ﷺ کی شفاعت سے محرومی ہے۔ "أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا"۔

تو اے سمجھ دار بھائی کیا تو اس پر راضی ہے کہ سید المرسلین حبیب رب العالمین کی شفاعت سے محروم رہے جب کہ اس کو تمام مخلوق حتی کہ انبیاء اور اولیاء بھی مانگتے اور امید رکھتے ہیں، اگر یہ شفاعت تم کو نہیں ملی تو تیرا کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوگا جو تم کو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور ناراضگی سے بچائے گا اور تم کو جنت تک پہنچائے گا۔

ہم اپنے نفس کی برائیوں اور برے اعمال سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں، اور دعا اور التجاء کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو اے بھائیو حق دکھلادے اور اس کے اتباع کی توفیق دے اور باطل کو باطل دکھادے اور اس سے بچالے بے شک وہ کریم ورحیم، سخی اور حکیم ہے۔

تعدیل کی کوتاہی کا علاج

اس کوتاہی کا علاج یہ ہے کہ ان دونوں مقامات پر بھی مسنون اذکار جو حدیثوں

---

[1] نقلاً عن معدل الصلوٰۃ: ۶۵، ۶۶

میں وارد ہوئے ہیں ان کا اہتمام کیا جائے۔ رکوع سجدہ میں چوں کہ مسنون تسبیح کا اہتمام کیا جاتا ہے اس لیے تعدیل اور اطمینان کا تحقق اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ بہت ہی کم لوگ ایسے نظر آتے ہیں جو رکوع اور سجدہ میں تعدیل نہیں کرتے۔ یہ لاابالی اور جلد باز لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بکثرت ملیں گے جو قومہ اور جلسہ میں اطمینان نہیں کرتے باوجودیکہ رکوع اور سجدہ اچھی طرح اطمینان سے ادا کرتے ہیں اور دین دار لوگ ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قومہ اور جلسہ کے اذکار کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں میں اس کا ذکر ہی نہیں۔ بعض لوگ اس سے آگے بڑھ کر اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو مسئلہ کی اچھی طرح تحقیق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شریعت مطہرہ نے فرائض کی تکمیل کے لیے واجبات مشروع کیے اور واجبات کی تکمیل کے لیے سنن کو مشروع کیا خارج میں بھی اور اندر میں بھی۔ فقہ کی اصطلاح میں کہا گیا ہے "تَکْمِیْلُ الْفَرْضِ وَاجِبٌ" "وَتَکْمِیْلُ الْوَاجِبِ سُنَّۃٌ" یعنی فرض کی تکمیل واجب سے ہوتی ہے اور واجب کی سنت سے۔ اس جملہ کا صحیح مطلب یہی ہے۔

اس لیے جو سنت کو نظر انداز کرے گا خطرہ ہے کہ واجب کو بھی چھوڑ بیٹھے گا۔ "اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْہُ"

قومہ اور جلسہ میں اذکار کا ثبوت

اب ملاحظہ فرمایئے کہ قومہ اور جلسہ میں اذکار صحیح حدیثوں سے فرائض و نوافل دونوں میں ثابت ہیں آں حضرت ﷺ کا ان دونوں جگہوں پر ایک تسبیح سے زیادہ توقف کرنا، مقتدی کا رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ سے زیادہ ذکر کرنا، اور آں حضرت ﷺ کا اس کی تحسین کرنا، یہ سب صحیح حدیثوں میں مذکور ہیں۔ محققین فقہاء

احناف اور علماء دیوبند نے اس طرح توجہ دلائی ہے۔

❶ "عَنِ الْبَرَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ کَانَ رُکُوْعُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَسُجُوْدُہٗ وَبَیْنَ السَّجْدَتَیْنِ وَاِذَا رَفَعَ رَاْسَہٗ مِنَ الرُّکُوْعِ مَا خَلَا الْقِیَامَ وَالْقُعُوْدَ قَرِیْبًا مِّنَ السَّوَاءِ"[1]

ترجمہ: "یعنی آں حضرت ﷺ کا رکوع اور سجدہ، اور جب رکوع سے سر اٹھاتے (قومہ) اور دونوں سجدوں کے درمیان (بیٹھنا یعنی جلسہ) قیام اور قعدہ کو چھوڑ کر قریب قریب برابر تھا۔"

قیام اور قعدہ کا استثنا اس لیے ہے کہ ان دونوں میں بنسبت رکوع سجدہ، قومہ اور جلسہ کے دیر لگتی ہے۔ غور فرمایئے قومہ اور جلسہ کو رکوع اور سجدہ کے قریب قریب برابر بتایا جا رہا ہے۔ یہ اسی وقت ہوگا جب کہ قومہ اور جلسہ میں بھی رکوع اور سجدہ کی طرح کچھ (نہ کچھ) ذکر کیا جائے۔

تنبیہ: صحیح مسلم کی ایک روایت میں رکوع، سجدہ، قومہ اور جلسہ کے ساتھ قیام کا لفظ بھی آ گیا ہے۔ یہ راوی کا وہم ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فتح الملہم میں لکھتے ہیں:

"وَالَّذِیْ یَغْلِبُ عَلَی الظَّنِّ وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ ھُوَ مَا قَالَہٗ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ مِنْ کَوْنِ ذِکْرِ الْقِیَامِ فِیْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ وَھْمًا وَاسْتِثْنَاءُ الْقِیَامِ وَالْقُعُوْدِ ھُوَ اَصَحُّ وَاَقْرَبُ اِلٰی مَا ھُوَ الْمَنْقُوْلُ مِنْ صِفَۃِ صَلٰوتِہٖ اَکْثَرَ الْاَحْیَانِ ......"[2]

ترجمہ: "ظن غالب یہ ہے، جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا کہ اس

---

[1] البخاری، الاذان، باب حد اتمام الرکوع والاعتدال فیہ: ۱۰۹/۱

[2] فتح الملہم، الصلوۃ، باب اعتدال ارکان الصلوۃ ...... ۳/۹۹، رقم: ۱۰۶۷

حدیث میں قیام کا ذکر وہم ہے۔ قیام و قعود کا استثناء ہی آں حضرت ﷺ کی نماز کی عام منقول صفت سے زیادہ قریب ہے۔"

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی فیض الباری میں اس کو راوی کا تسامح قرار دیا ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں: "اَلظَّاهِرُ أَنَّهُ مُسَامَحَةٌ وَالتَّسْوِيَةُ رَاجِعَةٌ إِلَى الْأَرْبَعَةِ" فقط۔[1]

(۲) "عَنْ أَنَسٍ (رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ) قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ قَامَ حَتّٰى نَقُوْلَ قَدْ أَوْهَمَ ثُمَّ يَسْجُدُ وَيَقْعُدُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ حَتّٰى نَقُوْلَ قَدْ أَوْهَمَ"[2]

ترجمہ: "آں حضرت ﷺ جب "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ" کہتے تو کھڑے رہتے حتی کہ ہم کہتے کہ آپ کو وہم ہو گیا۔ آپ سجدہ میں جانا بھول گئے۔ پھر سجدہ کرتے اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھتے تو ہم سمجھتے کہ بھول گئے۔"

اس روایت میں "حَتّٰى نَقُوْلَ قَدْ أَوْهَمَ أَوْ نَسِيَ" کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ ایسا آپ کبھی کبھی کرتے تھے۔ ورنہ بھولنے اور وہم ہونے کا گمان کیوں ہوتا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ کہ قومہ اور جلسہ میں یہ تطویل آپ کی عام عادت شریفہ سے...... (جس کے دیکھنے کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم عادی تھے) زیادہ نہ تھی۔ بل کہ بہت ہی قلیل اور کبھی کبھی تھی۔ ورنہ اگر یہ تطویل سنت

[1] فیض الباری، الأذان، باب حد إتمام الركوع ...... ۲/۳۷۲، رقم ۷۹۲

[2] مسلم، الصلوٰة، باب اعتدال أركان الصلوٰة ۱/۱۸۹، بخاری، الأذان، باب الطمأنينة حين يرفع رأسه من الركوع ۱/۱۱۰ بلفظ نسی

مستمرہ معروف مانی جائے تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نسیان کا گمان کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوگا۔ جب کہ آں حضرت ﷺ کی قرأت اور رکوع و سجود کی تطویل پر جو اکثر اوقات میں ہوتی تھی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو کبھی وہم و نسیان کا گمان نہیں ہوا۔ ہاں مطلق اطمینان اور اتنی دیر تک رکوع، قومہ، دونوں سجدے اور جلسہ میں ٹھہرنا اور جتنا جس کا اعتبار کیا جائے یہ معروف معتاد اور یقینی امر ہے جس کے مؤکد اور حتمی ہونے سے انکار ممکن نہیں۔ اور لوگ اس سے اس زمانہ میں غافل ہیں۔ "وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَيْهِ التُّكْلَانُ۔"[1]

قاضی شوکانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مذکورہ حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رکوع اور سجدہ میں جو تسبیح مشروع ہے اس سے زیادہ اذکار اعتدال کی حالت میں مشروع ہیں اس لیے یہ کہنا (جیسا کہ بعض شوافع نے کہہ دیا) کہ قومہ اور جلسہ کی تطویل موالات اور اتصال کے خلاف ہے غلط ہے۔ اس لیے کہ موالات کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ارکان کے درمیان کسی ایسے فعل سے جو اس میں سے نہیں طویل فصل نہ ہو اور شریعت میں جو چیز ثابت ہے اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اس میں سے نہیں یہ صحیح نہیں۔ "وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ۔"[2]

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے قاضی شوکانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام بغیر رد وقدح کے نقل کیا ہے اور اس کے بعد معاً شیخ الہند کا مذکورہ کلام، اس سے ظاہر ہے کہ مولانا بھی لوگوں کی اس عام غفلت پر اظہار افسوس کر رہے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پہلی حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا قومہ...... اور جلسہ...... رکوع اور سجدہ کے قریب تھا۔ اگر یہ مانا جائے کہ رکوع اور سجدہ میں تین مرتبہ تسبیحات پڑھتے تھے تو قومہ اور جلسہ میں دو مرتبہ تسبیح پڑھنے کے بقدر ٹھہرتے

[1] فتح الملهم، الصلوٰة، باب اعتدال أركان الصلوٰة ...... ۳/۶۹، رقم ۱۰۷۱

[2] نیل الأوطار: ۲/۲۹۳

ہوں گے اور اگر رکوع اور سجدہ میں تین سے زیادہ تسبیح مانئے تو قومہ اور جلسہ میں اس کے قریب توقف مانئے۔ اور دوسری حدیث سے بھی کبھی طویل توقف کا جواز معلوم ہوا ہے۔

اب آیئے ایسی روایات دیکھئے جن میں اذکار مذکور ہیں اور ظاہر ہے کہ نماز جب تسبیح، ذکر اور قرأت کا نام ہے تو قومہ اور جلسہ کے توقف میں خاموش کیوں رہیں گے۔ ضرور کچھ ذکر کرتے رہے ہوں گے۔

قومہ کی دعا

❸ عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پشت جب رکوع سے اٹھاتے تو فرماتے:

"سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْءَ الْاَرْضِ وَمِلْءَ مَاشِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ" [1]

"یعنی اے اللہ! تیرے لیے حمد ہو آسمانوں کو بھر کر اور زمینوں کو بھر کر اور ان کے علاوہ جس چیز کو تو چاہے اس کو بھر کر۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

"سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمِلْءَ مَا بَيْنَهُمَا مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ" [2]

پھر یہی روایت تقریباً اسی سند سے جلد ثانی میں کتاب الدعوات میں ذکر کی ہے۔ اور وہاں "اِذَا قَامَ الصَّلٰوةَ الْمَكْتُوْبَةَ" کا لفظ بھی ہے۔ جس سے معلوم ہوا

[1] مسند احمد: ۴/۳۵۳، رقم: ۱۸۶۲۵ بروایت ابن ابی اوفی

[2] ترمذی، الصلوٰۃ، باب ما یقول الرجل اذا رفع رأسہ من الرکوع: ۱/۶۱ مع العرف الشذی

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز میں بھی اس کو پڑھتے تھے ترمذی نے دونوں جگہوں پر اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔[1]

ابوداؤد میں بھی یہ روایت مذکور ہے[2] اور کوئی کلام نہیں کیا۔

❹ حضرت رفاعہ زرقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک روز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے سر اٹھایا تو "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ" کہا۔ اس وقت آپ کے پیچھے ایک صاحب (خود حضرت رفاعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے یہ کلمات کہے۔ "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ" جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا۔ کس نے یہ کلمات کہے۔ متکلم نے کہا میں نے۔ آپ نے فرمایا۔ میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا کہ ان کلمات کی طرف بڑھتے تاکہ سب سے پہلے ان کو لکھیں۔[3]

اس سے مقتدی کا امام کے پیچھے "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" سے زیادہ ذکر کرنا ثابت ہوا۔ یہ اس وقت ہوگا جب امام "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ" سے زیادہ توقف کرے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اگر کوئی کہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں امام کو فقط "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ" کہنا چاہیے اس سے زیادہ نہیں تو پھر ابن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ کی حدیثوں میں جو ذکر آیا ہوا ہے اس کو ایک حنفی کس طرح کہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا مشہور قول یہی ہے۔ لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول یہی ہے کہ امام

[1] ترمذی، الدعوات عن رسول اللہ: ۲/۱۸۰

[2] ابوداؤد، الصلوٰۃ، باب ما یستفتح بہ الصلوٰۃ من الدعاء: ۱/۱۱۰

[3] بخاری، الاذان، باب فضل اللّٰھم ربنا ولک الحمد: ۱/۱۱۰

"رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" بھی کہے یہ امام صاحب کی بھی ایک روایت ہے۔ اسی قول کی طرف فضلی، طحاوی اور متاخرین رحمہم اللہ تعالیٰ کی ایک جماعت کا میلان ہے۔ حاوی قدسی میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ نور الایضاح میں بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن متون میں امام صاحب کا قول مذکور ہے۔[1]

دلیل کے لحاظ سے صاحبین اور ان کے موافق امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہی قوی ہے۔ اس لیے کہ آں حضرت ﷺ سے امامت کی حالت میں "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کے بعد "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" اور اس سے زیادہ پڑھنا ثابت ہے۔ اور فقہ کی کوئی روایت اگر دلیل کے مطابق ہو تو اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ "وَلَا يَنْبَغِيْ اَنْ يُّعْدَلَ عَنِ الدِّرَايَةِ اَيِ الدَّلِيْلِ اِذَا وَافَقَتْهَا رِوَايَةٌ"۔[2]

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح معانی الآثار (طحاوی شریف) میں اس قول کو دلیل سے ثابت کیا ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحقیق

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے طحاوی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایات سے یہ ثابت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ امامت کی حالت میں "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کے ساتھ "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" بھی کہتے تھے اور لکھا ہے ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں اور یہی امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔[3]

"بَابُ الْاِمَامِ يَقُوْلُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ هَلْ يَنْبَغِيْ لَهٗ اَنْ يَّقُوْلَ

[1] شامی، آداب الصلوٰۃ، مطلب فی إطالۃ الرکوع للجائی: ۱/۴۹۷
[2] شامی باب صفۃ الصلوٰۃ، مطلب لا ینبغی ان یعدل ......: ۱/۳۴۳
[3] طحاوی: ۱/۱۷۲

بَعْدَهَا رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ اَمْ لَا"[1] بخاری شریف میں بھی ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ رکوع سے سر اٹھا کر "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہتے تھے اور کھڑے کھڑے "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" بھی کہتے تھے۔[2]

جلسہ کی دعا

⑤ آں حضرت ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا مانگتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاجْبُرْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ"[3]

ترجمہ: "اے اللہ! میری مغفرت فرما اور رحم فرما اور میری شکستگی دور فرما۔ مجھے ہدایت دے اور روزی عطا فرما۔"

ابوداؤد میں یہ الفاظ ہیں:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَارْحَمْنِيْ وَعَافِنِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ"[4]

معارف السنن جلد ۳ صفحہ ۳۵۳ میں ہے کہ ذکر چھ جگہوں پر ثابت ہے ان میں قومہ اور جلسہ بھی ہیں فیض الباری جلد ۲ صفحہ ۲۸۲ میں ایسا ہی ہے بل کہ چھ جگہوں سے زیادہ کا ذکر ہے۔

دو سجدوں کے درمیان اس مختصر سی دعا میں کتنی اہم چیزیں مانگی گئی ہیں، پانچ مختصر سے جملوں میں کافی حاجتیں اور ضرورتیں مانگ لی گئی ہیں، کاش! ہم لوگ اہتمام سے دل لگا کر ترجمہ کا دھیان رکھتے ہوئے اس دعا کو مانگیں، کہ اے اللہ معاف کر دے، اور مجھ پر رحم فرما دے، جس کے کاموں میں اللہ کی رحمت شامل ہوگی

[1] طحاوی: ۱/۱۷۰
[2] بخاری، کتاب الاذان، باب ما یقول الامام ومن خلفه اذا رفع رأسه من الركوع: ۱/۱۰۹
[3] ترمذی، الصلوٰۃ، باب ما یقول بین السجدتین: ۱/۶۳
[4] ابو داؤد، الصلوٰۃ، باب الدعاء بین السجدتین: ۱/۱۲۳

اس کا بیڑا پار ہے۔

اور اے اللہ! مجھے عافیت عطا فرما، یقین کے بعد سب سے بڑی دولت عافیت کی ہے۔

اور پھر ہدایت طلب کی گئی ہے، ہم تو ہر کام میں ہر وقت ہر آن اور ہر گھڑی ہدایت کے محتاج ہیں، اس کے بعد رزق کی دعا مانگی گئی ہے اے اللہ! مجھے رزق عطا فرما۔

ایک سنت کو زندہ کیجیے

امام طحاوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے اپنی دوسری کتاب (مشکل الآثار) میں یہ باب قائم کیا۔ "بَابُ بَیَانِ مَا کَانَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْمَا بَیْنَ سَجْدَتَیْہِ فِیْ صَلَاتِہٖ ھَلْ ھُوَ ذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی اَوْ سُکُوْتٌ بِلَا ذِکْرٍ"[1]

ترجمہ: "یہ باب ہے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے دو سجدوں کے درمیان ذکر کرنے کے بیان میں، کیا اس میں ذکر کیا جائے گا یا خاموش رہا جائے گا۔"

پھر اس باب میں حضرت علی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا فعل ذکر کیا کہ وہ بین السجدتین "رَبِّ اغْفِرْلِیْ رَبِّ اغْفِرْلِیْ" کہتے تھے۔ اور لکھا ہے کہ صرف بعض محدثین اس کے قائل ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کا یہ قول اچھا ہے اور اس میں آں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی ایک سنت کو زندہ کرنا ہے ہم اس کی طرف جاتے ہیں اور اسی پر عمل کرتے ہیں۔ "وَھٰذَا عِنْدَنَا مِنْ قَوْلِہٖ حَسَنٌ، وَاسْتِعْمَالُہٗ اِحْیَاءٌ لِسُنَّۃٍ مِنْ سُنَنِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، وَ اِلَیْہِ نَذْھَبُ وَ اِیَّاہُ نَسْتَعْمِلُ"[2] پھر اپنی عادت کے مطابق نظر سے اس کو مؤید کیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

[1] مشکل الآثار: ۱۸۹/۲ [2] مشکل الآثار: ۱۹۱/۲

نماز میں تکبیر ہے۔ اور نماز میں قیام، رکوع، قومہ، سجدہ، قعدہ ہے، ان تمام ہیئتوں پر ذکر ہے۔ نماز میں دونوں سجدوں کے درمیان جلسہ بھی ہے تو جیسے اور تمام ہیئتوں پر ذکر ہے جلسہ میں بھی ذکر ہونا چاہیے۔[1]

علامہ ابن عابدین شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی تحقیق

علامہ شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے لکھا ہے کہ بین السجدتین مغفرت کی دعا کرنا (یعنی اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ کہنا) مستحب ہونا چاہیے اس لیے کہ امام احمد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی عمداً استغفار کو ترک کرنے سے نماز کو فاسد کہتے ہیں اور اختلاف کی رعایت کرنا ہمارے یہاں مستحب ہے۔ تاکہ اختلاف سے نکل جائیں۔ اس اصول کے تحت استغفار کو مستحب ہونا چاہیے اگرچہ یہ جزئیہ میں نے صراحۃً کہیں نہیں دیکھا۔[2]

نیز علامہ شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے حلیہ شرح منیہ سے ابن امیر حاج محقق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو اذکار قومہ اور جلسہ میں وارد ہوئے ہیں اگر فرض میں ان کا ثبوت ہو تو اس کو منفرد پر محمول کریں گے، یا پھر ایسی جماعت پر جس میں مقتدی متعین معلوم ہوں جن کو ان اذکار سے گرانی تو نہیں ہوتی جیسا کہ شوافع نے اس کی تصریح کی ہے۔ اگرچہ ہمارے مشائخ نے اس کی تصریح نہیں کی لیکن اس کو ماننے میں کوئی حرج نہیں اس لیے کہ قواعد شرعیہ اس سے انکار نہیں کرتے۔ نماز تسبیح، تکبیر، قراءت ہی کا نام ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔[3]

در مختار میں اگرچہ یہ لکھا ہے کہ قومہ اور جلسہ میں ہمارے یہاں ذکر مسنون نہیں اور جو اذکار حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں وہ نفل پر محمول ہیں۔

لیکن علامہ شامی نے وہیں لکھ دیا ہے کہ مسنون نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا

[1] مشکل الآثار: ۳۰۸/۱، ۳۰۹
[2] شامی، آداب الصلوٰۃ: ۵۰۵/۱ [3] ایضاً

کہ جائز بھی نہ ہو جیسے سورۂ فاتحہ اور سورۃ کے درمیان بِسْمِ اللّٰہِ پڑھنا...... [illegible] اختلاف سے نکلنے کے لیے دونوں سجدوں کے درمیان مغفرت کی دعا مستحب ہونی چاہیے الخ۔[1]

ہمارے خیال میں سنت کی نفی اور اس سے انکار بھی نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ ترمذی میں مکتوبہ اور فرائض کی تصریح موجود ہے۔ اور ترمذی نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بخاری اور مسلم کی حدیث جس میں لفظ "اَوْهَمَ يَانْسِیَ" آیا ہے[2] وہ بھی بتاتی ہے کہ کبھی کبھی قومہ اور جلسہ میں آپ طویل ذکر کرتے تھے۔ اور براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی متفق علیہ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قومہ اور جلسہ رکوع اور سجدہ کے قریب ہوتا تھا یا اسی وقت ہو جب کہ ان دونوں جگہوں پر ذکر کو سنت اور ثابت مانا جائے۔

اس لیے محقق بات وہی ہے جو محقق ابن امیر حاج نے فرمائی اور جس کو علامہ شامی جیسے محقق حنفی نے تائید کے لیے پیش کیا کہ جو اذکار حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں وہ ہمارے یہاں بھی جائز ہیں البتہ حدیثوں میں امام کو ہلکی نماز پڑھانے کا حکم ہے اس لیے جو اذکار گرانی کا باعث ہوں ان کو امام نہ پڑھے۔ ہم نے اوپر جو اذکار نقل کیے ہیں ان کو اختیار کرنے سے کوئی گرانی نہیں ہوگی بآسانی لوگ اس کا تحمل کر لیں گے۔ اور اس سنت کو اختیار کرنے سے قومہ اور جلسہ میں ایک تسبیح کی مقدار واجب اطمینان خوب اچھی طرح ادا ہوگا جس کے چھوٹنے کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی نماز واجب الاعادہ رہتی ہے۔ جو بہت بڑا نقصان ہے۔ ان اذکار کا بالکل انکار کر دینے سے یا صرف نوافل پر محمول کر کے فرصت لینے سے یہ نقصان ہوا کہ انفرادی نماز اور سنن و نوافل سے بھی یہ اذکار غائب ہو گئے۔ کتنے لوگ ہیں جو سنن و نوافل میں ان اذکار پر عمل کرتے ہیں؟

[1] ایضاً [2] یہ حدیث صفحہ ۴۹۰ پر گزر چکی ہے۔

باوجودیکہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے سنن و نوافل میں اس کو سنت مانا ہے۔ لکھتے ہیں:

"لِقَوْلِهِمْ اِنَّ مُصَلِّی النَّافِلَةِ وَلَوْ سُنَّةً يُسَنُّ لَهٗ اَنْ يَّاْتِیَ بَعْدَ التَّحْمِيْدِ بِالْاَدْعِيَةِ الْوَارِدَةِ نَحْوَ مِلْءَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ"[1]

ترجمہ: "یعنی فقہاء نے فرمایا کہ نفل پڑھنے والے کے لیے خواہ سنت ہی کیوں نہ ہو مسنون ہے کہ "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" کے بعد جو دعائیں آئی ہوئی ہیں ان کو پڑھے جیسے "مِلْأُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" والی دعا۔ اور دونوں سجدوں کے درمیان "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ" والی دعا۔"

صاحب درمختار نے بھی کہا کہ یہ اذکار نوافل پر محمول ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوافل میں سنت ہیں۔ لیکن اس طرح کی تعبیر سے یہ نقصان ہوا کہ یہ اذکار بالکل متروک ہو گئے۔ اس لیے صحیح بات وہی ہے جو محقق ابن امیر بن الحاج نے کہی۔

ایک طرف بہت سے ائمہ کرام قرأت میں ترتیل (ترتیل اصطلاحی) کی وجہ سے گرانی پیدا کرتے ہیں۔ زیادہ وقت صرف ہونے کے باوجود سنت قرأت نہیں ہو پاتی۔ جب کہ بہت (ہی زیادہ) اطمینان کے ساتھ قرأت کی کوئی ضرورت نہیں، بس تجوید کے ساتھ صاف صاف قرأت کافی ہے جو روانی سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس طرح قرأت کرنے سے مسنون قرأت کی مقدار بھی پوری ہو جائے گی۔

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے، اخلاص کی علامت یہ ہے کہ جس طرح فجر میں قرأت کرتا ہے اسی طرح ظہر میں بھی کرے اور جس طرح عشا میں اسی طرح عصر میں کیوں کہ دونوں میں اللہ ہی کے لیے پڑھ

[1] شامی، آداب الصلوٰۃ، مطلب فی بیان المتواتر والشاذ: ۱/۴۸۸

رہا ہے۔ اور دونوں میں مسنون قرأت کی مقدار برابر ہے۔ لہٰذا ایسا نہ ہو کہ جہری نماز میں تو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے اور سری میں جلدی جلدی...... اسی طرح ایسا بھی نہ ہو کہ جہری میں حد سے زیادہ ٹھہر کر پڑھے کہ جہاں چالیس آیات کی مقدار تک پڑھنا مسنون ہو وہاں دس ہی پڑھی جاسکیں۔

دوسری طرف قومہ اور جلسہ کا اطمینان بالکل ناقابل اطمینان درجہ کا کرتے ہیں۔ اس کو بقدر ایک تسبیح کہنا بھی مشکل ہے۔ ایک طرف وہ افراط تو دوسری طرف یہ تفریط۔ اگر مسنون اذکار کی عادت ڈال لی جائے اور قرأت روانی کے ساتھ کی جائے تو اتنے ہی وقت میں نماز سنت کے مطابق ہوگی۔

علامہ انور شاہ کشمیری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی تحقیق

ہمارے محققین علماء دیوبند نے بھی عام لوگوں کی اس غفلت پر تنبیہ فرمائی ہے۔ حضرت شیخ الہند رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی بات پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ لوگ اس زمانہ میں اس سے غافل ہیں۔

علامہ انور شاہ کشمیری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے ترمذی شریف کی تقریر میں تنبیہ ضروری کے عنوان سے یہ مسئلہ ذکر کیا کہ محقق ابن امیر حاج رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی (تلمیذ ابن الہمام) نے حلیہ میں یہ ذکر کیا ہے کہ جو اذکار احادیث میں وارد ہوئے ہیں وہ ہمارے یہاں فرض میں اور نفل دونوں میں جائز ہیں بشرطیکہ فرض میں لوگوں کی گرانی کا باعث نہ ہوں ہمارے عام مصنفین نے اس کو گوشۂ خمول میں ڈال دیا ہے جس سے ناظرین یہ سمجھتے ہیں کہ احناف کو اذکار سے مطلب نہیں۔ اور نوافل میں پڑھنے کی بات جو احناف نے ذکر کی ہے اس کا منشاء یہی ہے کہ قوم کو گرانی نہ ہو۔[1]

شاہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے صحیح بخاری کی تقریر میں اس کو اور تفصیل سے

[1] العرف الشذی مع جامع الترمذی: ۶۲/۱

ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: محقق ابن امیر حاج رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی سے ہم نے یہ نقل کیا ہے کہ تمام دعائیں اور اذکار مرویہ تمام نمازوں میں جائز ہیں، فرائض میں بھی بشرطیکہ قوم کو گرانی نہ ہو۔ فرائض کی بناء چوں کہ تخفیف پر ہے (جیسا کہ فرائض میں ان پر عمل نہیں حتیٰ کہ کتابوں میں اس کو لوگوں نے ذکر بھی نہیں کیا)۔ برخلاف نوافل کے کہ وہ مصلی کی رائے پر ہے جتنی چاہے طویل کرے۔ مبسوط سے معلوم ہوتا ہے کہ نوافل میں ناجائز ہے۔[1]

دوسری جگہ رقم طراز ہیں۔ شمس الائمہ کی مبسوط میں جو یہ مذکور ہے کہ فرائض میں اذکار جائز نہیں یہ میرے نزدیک متروک ہے۔ پسندیدہ بات وہ ہے جو ابن امیر الحاج رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے بیان فرمائی ہے۔

تیسری جگہ فرماتے ہیں۔ قومہ کی دعائیں صحیحین میں وارد ہوئی ہیں اور جلسہ کی سنن میں مذکور ہیں کچھ مناقشہ کے ساتھ۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان کا معاملہ جلسہ میں قومہ کی بنسبت خفیف ہے۔ امام احمد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے یہاں جلسہ میں دعا کرنا فرض ہے۔ کم از کم ایک مرتبہ "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ" کہنا چاہیے۔ میں (یعنی حضرت شاہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی) کہتا ہوں کہ حنفی کو بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے اس لیے کہ رکوع اور سجدہ میں ان تسبیحات کی وجہ سے جو ان میں پڑھی جاتی ہیں کوتاہی نہیں ہوتی۔ لیکن قومہ اور جلسہ میں کثرت سے کوتاہی واقع ہوتی ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ان دونوں میں بھی اذکار کا اہتمام کرنا چاہیے۔ فیض الباری کی عبارت یہ ہے:

"قُلْتُ وَيَنْبَغِي الْإِعْتِنَاءُ بِهَا لِلْحَنَفِيِّ أَيْضًا لِأَنَّ الرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَ لَا يَأْتِي فِيْهِمَا التَّقْصِيْرُ لِمَكَانِ تِلْكَ الْأَذْكَارِ الْمَوْضُوْعَةِ فِيْهِمَا، بِخِلَافِ الْقَوْمَةِ وَالْجَلْسَةِ، فَإِنَّ

[1] فیض الباری، الاذان، باب التسبیح والدعاء فی السجود: ۲/ ۳۸۸، رقم: ۸۱۷

التقصیر یأتی فیھما کثیرا، ولذا أقول باعتناء الأذکار فیھما أیضا."[1]

ترجمہ: "میں کہتا ہوں" احناف کو بھی قومہ وجلسہ میں اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔" جہاں تک رکوع وسجدہ کا تعلق ہے وہاں متعین تسبیحات کے پڑھنے کی بناء پر کوتاہی (جلد بازی) نہیں ہوتی جبکہ قومہ وجلسہ میں اعضاء کے اطمینان میں اکثر کوتاہی برتی جاتی ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ قومہ وجلسہ میں اذکار مذکورہ کا اہتمام نہایت ضروری ہے۔"

ظاہر ہے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بات فرض نمازوں ہی سے متعلق ہے۔ ورنہ سنن ونوافل میں احناف بھی اذکار کو تسلیم کرتے آرہے ہیں۔ علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہ بات ہمارے خیال میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ آپ نے عام احناف کی نمازوں کو دیکھ کر احادیث صحیحہ کی روشنی میں یہ نصیحت فرمائی ہے۔ اسے ہمیں ضرور قبول کرنا چاہیے۔

علامہ یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ "معارف السنن" میں لکھتے ہیں:

"وَذَكَرَ الْقَاضِیْ ثَنَاءُ اللّٰهِ الْفَانِیْ فَتِیْ فِیْ كِتَابِهٖ "مَا لَا بُدَّ مِنْهُ" أَنَّهٗ يَقُوْلُ فِی الْجِلْسَةِ:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَاهْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَارْفَعْنِیْ.

قَالَ الشَّيْخُ: وَهُوَ حَسَنٌ عِنْدِیْ خُرُوْجًا عَنِ الْخِلَافِ وَبِالْأَخَصِّ فِیْ هٰذَا الْعَصْرِ الَّذِیْ قَلَّمَا يُعْتَنٰى فِيْهِ بِالْاِطْمِئْنَانِ فِی الْجِلْسَةِ."[2]

---

[1] فیض الباری، الأذان، باب المکث بین السجدتین: ٣٨٩/٢، رقم: ٨٢١

[2] معارف السنن: ٦٨/٣، مستدرک للحاکم، الصلاۃ: ٣٩٥/١، رقم: ١٠٠٦

ترجمہ: "قاضی ثناء اللہ پانی پتی (جن کو بیہقی وقت کہا گیا ہے) نے اپنی کتاب "مالا بد منہ" میں لکھا ہے کہ جلسہ میں "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَاهْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَارْفَعْنِیْ" کہے۔ شیخ (علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ) نے فرمایا۔ اس کا پڑھنا میرے نزدیک حسن ہے تا کہ اختلاف سے نکل جائیں (امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے اختلاف کی طرف اشارہ ہے) خاص طور سے اس زمانہ میں جب کہ جلسہ میں بہت کم اطمینان کا اہتمام کیا جاتا ہے۔"

غور کیجیے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا اختلاف فرض ہی میں ہے۔ نفل میں تو سب کے نزدیک اذکار ہیں۔ علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ فرض ہی سے متعلق ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی نفل کی قید نہیں لگائی جس سے ظاہر ہے کہ فرض میں بھی وہ پڑھنے کو فرما رہے ہیں۔[1]

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم نے قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کا کلام تقریر ترمذی میں نقل فرمایا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ وہ بھی ان اذکار کے پڑھنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔[2]

خلاصۂ کلام از مولانا فضل الرحمٰن اعظمی صاحب

اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ سنن ونوافل اور انفرادی ہر نماز میں قومہ اور جلسہ میں جتنی دعائیں معتبر حدیثوں میں آئی ہوئی ہیں ان تمام کو پڑھ سکتے ہیں۔ ان کا پڑھنا مستحب اور سنت ہوگا، اس سے نماز کا لطف دوبالا ہوگا۔

ہاں فرض نماز میں امام ہونے کی صورت میں چوں کہ امام کو ہلکی نماز پڑھانے کا حکم ہے اس لیے احتیاط کی ضرورت ہے۔ قومہ اور جلسہ میں طویل دعاؤں سے پرہیز

---

[1] مالا بد منہ مترجم: ٦٢

[2] درس ترمذی، الصلوٰۃ، باب ما یقول بین السجدتین: ٥٤/٢

کرنا چاہیے اس لیے کہ عام طور سے لوگ تحمل نہیں کر سکیں گے۔ البتہ مختصر دعائیں وہ جو اوپر نقل کی گئیں ان کو پڑھنے میں کوئی حرج نہیں وہ جائز ہیں۔ بل کہ موجودہ زمانہ میں چوں کہ عام طور سے اس میں کوتاہی پائی جاتی ہے اور جلسہ میں امام احمد بن حنبل رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ کے یہاں ایک مرتبہ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ" پڑھنا واجب ہے ساتھ ہی اختلاف کی رعایت مستحب ہے اس لیے مذکورہ بالا دعاؤں کا پڑھنا بہتر اور مستحب ہوگا اور اس سے واجب مقدار کی ادائیگی یقینی طور پر ہوسکے گی۔

امام طحاوی، علامہ ابن عابدین شامی اور علامہ انور شاہ کشمیری رَحِمَهُمُ اللهُ تَعَالَىٰ وغیرہ کا یہی فیصلہ ہے اور آں حضرت ﷺ کا ان دعاؤں کا فرض میں پڑھنا منقول اور ثابت ہے، اس لیے ان کو سنت کہنا بھی صحیح ہے، گو مؤکدہ نہ کہا جائے۔ اس لیے اس کو زندہ کرنا ایک سنت کا زندہ کرنا ہے۔

امام طحاوی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے کہا ہے:

"وَاسْتِعْمَالُهُ إِحْيَاءٌ لِسُنَّةٍ مِنْ سُنَنِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَإِلَيْهِ نَذْهَبُ، وَإِيَّاهُ نَسْتَعْمِلُ"[1]

اور مردہ سنت کو زندہ کرنے سے سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔[2]

اس لیے اس سنت کو زندہ کرنے کی سعادت حاصل کیجیے اور دوسروں کو مناسب طریقہ سے اس کی ترغیب دیجیے۔[3]

تجربہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہمارے مقتدیوں میں سے جو عمرہ اور حج کے لیے جاتے ہیں۔ جب وہ وہاں کے ائمہ کرام کے قومہ اور جلسہ کی دعاؤں کا اہتمام اور رکوع وسجدہ میں اطمینان دیکھتے ہیں تو ان مقتدیوں کی بھی رکوع، سجدہ،

---

[1] مشکل الآثار: ۲/ ۱۹۱

[2] مشکوٰۃ، الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ: ۱/ ۳۰

[3] ماخوذ از "قومہ اور جلسہ میں اطمینان کا وجوب اور ان دونوں میں اذکار کا ثبوت" از ص ۲۲ تا ۳۴

قومہ اور جلسہ اطمینان سے کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔

ہم ائمہ کی جماعت ابھی سے آہستہ آہستہ مقتدیوں کو بھی یہ دعائیں یاد کروا دیں تو پھر کوئی گرانی بھی نہیں ہوگی، اور سب کی نماز اس مبارک سنت کے ساتھ ادا ہوتی جائے گی، اور جب سب کی سنتیں زندہ کرنے کا ذریعہ امام بنا تو امام کو سب کی سنتیں زندہ کرنے کا ثواب ملے گا۔

اسی طرح مسجد میں مکتب / یا مدرسہ ہو تو بچوں کو ابھی سے قومہ اور جلسہ کی دعائیں یاد کروا لیں تا کہ بچپن سے قومہ اور جلسہ مسنون طریقے کے موافق ادا کرنے کی مبارک عادت پڑ جائے۔

اسی طرح قومہ اور جلسہ کے اذکار کو نہ پڑھنے کے ان کے نقصان پر بھی غور کر لیں

① کہ آج ہمارے معاشرہ میں اکثر نمازیوں کی عادت یہ ہوگئی ہے کہ رکوع سے اٹھنے کے بعد سیدھا سجدہ میں چلے جاتے ہیں۔

② بل کہ یہ جلدی کی عادت بسا اوقات امام صاحب سے جلدی کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ایسے لوگوں کو محبت اور شفقت کے ساتھ اکیلے میں سمجھا کر یہ دعا یاد کروائی جائے اور امام صاحب یہ دونوں ارکان کی دعائیں چھوٹے کارڈ میں بڑے حروف کے ساتھ لکھ کر مقتدیوں میں یہ کارڈ تقسیم کر دیں کہ اس کو خوب یاد کر لیں اور اس کا ترجمہ سمجھ لیں تو پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنے میں لطف دوبالا محسوس ہوگا، اور نماز میں استحضار کی کیفیت پیدا ہوگی اور بین السجدتین دعائیں مانگتے ہوئے مانگنے کی کیفیت بھی پیدا ہوگی۔

دونوں سجدوں کے درمیان اور قعدہ میں بیٹھنے کا طریقہ

دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان کرنے کی تاکید گزر چکی ہے اس کا خیال

رکھیں۔ جلسہ کی بھی دعا پڑھیں۔ اس سے اطمینان بخوبی ادا ہوگا۔

❁ بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھیں اور داہنا پاؤں کھڑا کر کے انگلیوں کو قبلہ کی طرف متوجہ رکھیں۔[1]

❁ بعض لوگ دونوں ایڑیاں کھڑی کر کے اس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ بعض لوگ دونوں پاؤں ایک دوسرے پر رکھ کر اس پر بیٹھتے ہیں۔ یہ سب خلاف سنت ہے۔

❁ قعدہ اولیٰ اور اخیرہ میں بھی بیٹھنے کا مسنون طریقہ وہی ہے جو دونوں سجدوں کے درمیان ہے۔ اس موقع پر بھی بہت سے لوگ غلطی کرتے ہیں۔

❁ قعدہ میں اور بین السجدتین ہاتھوں کے رکھنے کا مشہور طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ رانوں پر اس طرح رکھے جائیں کہ انگلیاں گھٹنے کی طرف لٹکی ہوئی نہ ہوں، بل کہ قبلہ کی طرف متوجہ ہوں۔ یعنی انگلیوں کے آخری سرے گھٹنوں کے ابتدائی کنارہ تک پہنچ جائیں۔[2] لیکن مسلم میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھٹنہ مبارک کو بائیں ہاتھ کا لقمہ بناتے تھے۔ اس لیے بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو گھٹنوں پر لگائے۔[3]

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہی مذہب ہے۔[4]

❁ داہنے ہاتھ کو بھی شروع میں ران پر یا گھٹنے پر رکھ لیں گے۔ اور التحیات پڑھیں گے جب "اَشْهَدُ اَنْ" پر پہنچیں گے تو بیچ کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر حلقہ بنا لیں گے۔ اور چھوٹی انگلی اور اس کے بعد والی کو بند کر لیں گے۔ اور شہادت کی

---

[1] بخاری، الأذان، باب سنة الجلوس فی التشہد: ۱/۱۱۴، شامی: ۱/۵۰۸

[2] شامی، مہم فی عقد الأصابع عند التشہد: ۱/۵۰۸

[3] مسلم، المساجد، باب صفة الجلوس فی الصلوٰة: ۱/۲۱۶

[4] شامی، مہم فی عقد الأصابع عند التشہد: ۱/۵۰۸

انگلی سے قبلہ کی طرف اٹھا کر اشارہ کریں گے۔ "اَشْهَدُ اَنْ لَّا" پر اٹھائیں گے اور "اِلَّا اللّٰهُ" پر جھکا دیں گے۔ باقی انگلیوں کی ہیئت آخر تک اسی طرح برقرار رکھیں گے۔[1]

❁ شہادت کی انگلی کو آسمان کی طرف نہیں اٹھائیں گے۔ صرف قبلہ کی طرف اٹھائیں گے۔[2]

سلام ودعا کی اصلاح

سلام پھیرتے وقت دونوں طرف اتنی گردن موڑیں کہ پیچھے کے لوگوں کو رخسار نظر آجائیں۔[3]

❁ داہنی طرف سلام پھیر کر چہرہ قبلہ کی طرف متوجہ کریں، پھر یہاں سے بائیں طرف سلام پھیریں، بعض لوگ داہنی طرف چہرہ رکھتے ہوئے ہی سلام کی ابتداء کرتے ہیں اور بائیں طرف لاتے ہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔

❁ دونوں طرف سلام پھیرتے ہوئے اس طرف کے انسانوں اور فرشتوں کو سلام کرنے کی نیت کریں۔[4]

❁ دعا کے وقت دونوں ہاتھ اتنے اٹھائیں کہ وہ سینے کے سامنے آجائیں دونوں ہاتھوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ ہو۔ دونوں ہاتھوں کو بالکل ملائیں نہیں۔ نہ ایک دوسرے پر رکھیں۔ نہ منہ پر رکھیں۔[5]

---

[1] رفع التردد فی عقد الأصابع عند التشہد لابن عابدین الشامی: ۱/۵۰۹

[2] الطحطاوی: ۲۱۸

[3] أبو داود، الصلوٰة، باب فی السلام، رقم: ۹۹۶

[4] شامی، مطلب فی ادراک فضیلة الافتتاح: ۱/۵۲۶، ۵۲۷

[5] فتاوی عالمگیری، الباب الرابع فی الصلوٰة والتسبیح وقراءة القرآن: ۵/۳۱۸، ماخوذ از "نماز کی پابندی اور اس کی حفاظت": ۱۹ تا ۲۱

نماز کے بعد انحرافِ امام کی ہیئت

حضرات فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ فرائض سے فارغ ہونے کے بعد امام کا اسی ہیئت پر قائم رہنا بدعت ہے، اس لیے امام اپنی ہیئت تبدیل کرے، جس کی مختلف صورتیں ہیں۔ یعنی یا تو مصلے سے اٹھ کر چلا جائے، یا دائیں بائیں یا مقتدیوں کی طرف مڑ کر بیٹھے۔

اگر نماز کے بعد سنتیں ہوں تو ان کو ادا کرنے کے لیے مصلے سے آگے پیچھے دائیں یا بائیں ہٹ کر پڑھے۔ امام کے اسی ہیئت پر قبلہ کی طرف رہنے میں آنے والوں کو جماعت باقی رہنے کا اشتباہ ہو سکتا ہے، خطرہ ہے کہ کوئی اقتداء کرے اور اس کی نماز صحیح نہ ہو اس لیے امام کا ہیئت نہ بدلنا مکروہ ہے۔

امام کو فجر اور عصر کی نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھنا سنت ہے۔ البتہ اگر امام کے سامنے پہلی صف میں کوئی مسبوق ہو تو اس کے سامنے بیٹھنا مکروہ ہے۔ لہٰذا اس صورت میں دائیں بائیں ہو کر بیٹھے۔ اگر پہلی صف کے پیچھے والی کسی صف میں مسبوق ہو تو اس کا سامنا کرنے کے جواز میں اختلاف ہے۔ علامہ شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے جواز کو ترجیح دی ہے۔[1]

لہٰذا جن نمازوں کے بعد سنت مؤکدہ نہیں ہیں ان میں امام کو تینوں طرح بیٹھنا درست ہے۔ یعنی دائیں جانب یا بائیں جانب یا مقتدیوں کی طرف۔ البتہ کسی ایک کا التزام درست نہیں، داہنی جانب متوجہ ہونا کہ قبلہ بائیں جانب ہو اولیٰ ہے۔[2]

حدیث سے ثابت ہے کہ زیادہ تر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ داہنی طرف پھرتے تھے۔[3]

---

[1] مأخذه احسن الفتاوی، باب الإمامة والجماعة انصراف الإمام إلى جهة الأنام: ۳/ ۳۷۳
[2] فتاوی محمودیہ، کتاب الصلٰوۃ، جن نمازوں کے بعد نوافل نہیں ۲/ ۱۳۹
[3] مسلم، صلاة المسافرين، باب جواز الانصراف من الصلاة عن اليمين والشمال، رقم: ۷۰۸

حضرت عبداللہ بن مسعود رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص یہ سمجھے کہ داہنی طرف ہی پھرنا ضروری ہے، میں نے بارہا رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو دیکھا ہے کہ بائیں طرف کو پھرے۔

پس معمول یہ رکھنا چاہیے کہ اکثر داہنی طرف کو پھرے اور کبھی کبھی بائیں طرف کو پھر جایا کرے۔[1]

ظہر، مغرب اور عشاء کے فرضوں کے بعد مقتدیوں کی طرف رخ کر کے دعا کرنا خلافِ سنت ہے۔[2]

نماز کے بعد دعا

آہستہ دعا کرنا افضل ہے اگر نمازیوں کو حرج نہ ہوتا ہو تو کبھی کبھی ذرا آواز سے دعا کرلے تو جائز ہے۔ ہمیشہ زور سے دعا کی عادت بنانا مکروہ ہے۔ روایات میں جہراً دعا مانگنا ثابت نہیں ہے۔[3]

اگر دعا کی تعلیم مقصود ہو تو بلند آواز میں بھی مضائقہ نہیں۔ مگر اس بلند آواز سے جس سے دوسرے نمازیوں کی نماز میں خلل نہ ہو۔ نماز سلام پر ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد دعا نماز کا جز نہیں۔[4]

اسی طرح امام دعا کے الفاظ کو اپنے ساتھ مخصوص نہ کرے اگر وہ دعا زور سے کر رہا ہے۔ اس قسم کی دعا کرنا خیانت ہے۔ احادیث میں جو منفرد الفاظ آئے ہیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں، کیوں کہ مقتدی بھی اپنے لیے دعا کر رہے ہیں اس طرح

---

[1] فتاوی دارالعلوم دیوبند الباب الرابع، صفة الصلٰوة، سنن وکیفیات نماز: ۲/ ۱۹۲، بحوالہ غنیۃ المصلی: ۱/ ۳۳
[2] احسن الفتاوی، باب الامامۃ والجماعۃ: ۳/ ۳۱۵
[3] فتاوی رحیمیہ، متفرق مسائل، نماز کے بعد دعا ۱/ ۱۸۳
[4] فتاوی محمودیہ، کتاب الصلٰوۃ، دعا زور سے مانگنا: ۲/ ۱۷۳

نفس دعا میں سب شریک ہو جائیں گے۔[1]

بعض جگہ دستور ہے کہ ختم دعا پر جب منہ پر ہاتھ پھیرتے ہیں تو اس وقت کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں، حالاں کہ یہ بدعت ہے، کیوں کہ دعا کے آخر میں درود شریف اور آمین کے سوا کچھ اور پڑھنا ثابت نہیں۔[2]

ائمہ کرام اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ بسا اوقات مقتدی آپ سے دعا کی درخواست کرتے ہیں کہ حضرت! آپ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری حاجت پوری فرما دیں تو ان سے پوچھنا چاہیے کہ آپ کی کیا حاجت ہے، فوراً دعا نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ وہ حاجت ناجائز بھی ہو سکتی ہے، چناں چہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ اس آیت ﴿يٰنُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۚ﴾[3] کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دعا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دعا کرنے والا پہلے یہ معلوم کرلے کہ جس کام کی دعا کر رہا ہے وہ جائز و حلال ہے یا نہیں، مشتبہ حالت میں دعا کرنے سے منع فرمایا گیا، تفسیر روح المعانی میں بحوالہ قاضی بیضاوی نقل کیا ہے کہ جب اس آیت سے مشتبہ الحال کے لیے دعا کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی تو جس معاملہ کا ناجائز حرام ہونا معلوم ہو اس کے لیے دعا کا ناجائز ہونا بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا اس سے معلوم ہوا کہ آج کل کے مشائخ میں جو یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ جو شخص کسی دعا کے لیے آیا اس کے واسطے ہاتھ اٹھا دیے اور دعا کر دی حالاں کہ اکثر ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس مقدمہ کے لیے یہ دعا کر رہا ہے اس میں یہ خود ناحق پر ہے یا ظالم ہے، یا کسی ایسے مقصد کے لیے دعا کرا رہا ہے جو اس کے لیے حلال نہیں، کوئی ایسی ملازمت اور منصب ہے، جس میں یہ حرام میں مبتلا ہوگا یا کسی کی حق تلفی کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ ایسی دعائیں حالت معلوم ہونے کی صورت میں تو حرام و ناجائز ہیں ہی، اگر حالت اشتباہ کی

---

[1] مسائل امامت: ۲۳۳ [2] مسائل امامت: ۲۳۵ [3] ھود: ۴۶

حالت بھی ہو تو حقیقت حال اور معاملہ کا جائز ہونے کا علم حاصل کیے بغیر دعا کے لیے اقدام کرنا بھی مناسب نہیں۔[1]

خشوع و خضوع

مولانا محمد منظور نعمانی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ ملفوظات میں لکھتے ہیں:

”مولانا الیاس رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے ایک موقع پر فرمایا کہ اقامت صلوٰۃ ساری زندگی کو درست کرنے والی شئ ہے لیکن اقامتِ صلوٰۃ کی تکمیل ہوگی ان اوصاف کے پیدا کرنے سے جن کا ذکر نماز کے سلسلہ میں قرآن مجید میں متفرق طور پر کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا گیا:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝﴾[2]

اور سورۂ بقرہ کے پہلے رکوع میں:

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ ......﴾ کے بعد فرمایا گیا ہے ﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾[3]

ان دونوں آیتوں کو ملانے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ”خشوع فی الصلوٰۃ“ بھی ”اقامت صلوٰۃ“ میں داخل ہے اور بغیر خشوع کے نماز پڑھنے والے ”مقیمین الصلوٰۃ“ نہیں ہیں اور نمازوں میں خشوع پیدا کرنے کی ترکیب و تدبیر کی طرف دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حضوری کے یقین کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔

﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ۝ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلٰقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ ۝﴾[4]

فرمایا کہ ”مُلٰقُوا رَبِّهِمْ“ کو آخرت سے مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اللہ کے

---

[1] معارف القرآن: ۶۳۱/۴ [2] المؤمنون: ۲،۱ [3] البقرۃ: ۳ تا ۵ [4] البقرۃ: ۴۶،۴۵

بندوں کو نماز کی حالت میں جو حضوری نصیب ہوتی ہے وہ بھی اس کی مصداق ہے۔

فرمایا کہ ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اور ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ میں جس فلاح اور کامیابی کا وعدہ ہے اس کو صرف فلاحِ اُخروی ہی میں منحصر کرنے کی کوئی وجہ نہیں، بل کہ دنیا میں کامیابی وکامرانی بھی اس میں داخل ہے اور مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ ایمانی اوصاف ہوں ہماری غیبی مدد دنیا میں بھی ان کا راستہ صاف کرنے اور فلاح وکامرانی تک ان کو پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔"[1]

آج ہماری نماز میں سب سے زیادہ کمی خشوع وخضوع کی ہے، حالاں کہ فلاح اور کامیابی کا وعدہ اسی کے لیے ہے جو نماز میں خشوع وخضوع کرے۔ خشوع پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ہر نماز کو آخری نماز سمجھیں نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کے پوچھنے پر فرمایا "فَصَلِّ صَلٰوۃَ مُوَدِّعٍ"[2] رخصت کرنے والے کی نماز پڑھو۔ یہ سوچو کہ معلوم نہیں اس کے بعد زندگی میں نماز پڑھنے کا موقع ملے گا یا نہیں۔

یہ سوچے کہ رب ذوالجلال کے سامنے کھڑا ہوں اسے میرے دل ودماغ کے خیالات کا بھی علم ہے۔ وہ ﴿عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ہے اگر میں اس کی طرف دل سے متوجہ نہ ہوں گا تو اس کی توجہ مجھے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ میں اس کا محتاج ہوں وہ میرا محتاج نہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

خشوع سکون کا نام ہے۔ نماز میں اعضا کا سکون بھی مطلوب ہے اور وہ یہ ہے کہ ارادہ سے ہاتھ پاؤں عبث نہ ہلائے، ادھر اُدھر گردن یا نظر سے التفات نہ کرے، سر کو اوپر نہ اٹھائے، بالوں اور کپڑوں کو بار بار نہ سنوارے اور بلا ضرورت بدن نہ کھجلائے نہ کھنکھارے۔

قلبی خشوع یہ ہے کہ ارادہ سے کسی بات کو نہ سوچے اور خود خیال آجائے تو

[1] ملفوظات مولانا الیاس: ۱۱۹ [2] مسند احمد: ۵/۴۱۲، رقم: ۲۲۹۸۷

خشوع کے منافی نہیں۔ معلوم ہوا کہ خشوع اختیاری فعل ہے عادتاً محال نہیں ہے۔ اس ارادہ اور توجہ کی ضرورت ہے۔

خشوع حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ نماز میں منہ سے جو الفاظ نکلے محض یاد سے نہ نکلے، بل کہ ہر ہر لفظ پر مستقل ارادہ کرکے اس کو منہ سے نکالے۔ جب ہر لفظ پر خاص توجہ رہے گی تو لامحالہ دوسرے خیالات بند ہو جائیں گے۔ اس مراقبہ کو اول سے آخر تک بالالتزام کرے۔ اول تو ان شاء اللہ کوئی خیال نہیں آئے گا اگر بالفرض آجائے تو پھر اس سوچ میں نہ پڑے کہ ارے یہ تو پھر خطرات آنے لگے یہ سوچ بھی خیالِ غیر ہے، بل کہ اسی طریقہ مذکورہ کو دوبارہ زندہ کرے۔ ان شاء اللہ خطرات رفع ہو جائیں گے۔[1]

ائمہ کرام لوگوں کو بھی سمجھائیں کہ اگر خشوع وخضوع نماز میں پیدا نہ ہو تو بھی نماز نہیں چھوڑنی چاہیے۔ خشوع وخضوع کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اگر نماز چھوڑ دی تو فرض کا ذمہ سر پر رہے گا۔ شیطان ہر طرح سے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ کبھی یہی سمجھاتا ہے کہ تمہاری نماز ہی کیا۔ ایسی نماز نہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ حاشا وکلا نماز ہر حال میں پڑھنا فرض ہے خواہ دل لگے یا نہ لگے۔ خشوع وخضوع ہو یا نہ ہو، ہاں کوتاہی ہو جائے ادھر اُدھر ذہن منتقل ہو جائے تو توبہ اور استغفار کرے اور اچھی نماز پڑھنے کا ارادہ کرے ان شاء اللہ اصلاح ہوتی جائے گی۔

ہم میں سے ہر ایک کی چاہت ہے کہ میری زندگی اچھی ہو جائے میرے مقتدیوں اور شاگردوں کی تربیت ہو جائے، میری اولاد کی تربیت ہو جائے ان کی حاجتیں پوری ہو جائیں۔

ان سب باتوں کا حاصل یہ ہے کہ ہم اپنی نماز کو خوب احسن وبہتر طریقے سے ادا کرنے کی کوشش کریں اور اپنے مقتدیوں شاگردوں کی بھی نماز پر محنت کریں۔

[1] اصلاح انقلاب: ۱۱۲

بسا اوقات مدرسہ اسکول میں ہم بچوں کی شرارتوں سے تنگ آجاتے تھے، لیکن نمازوں پر محنت شروع کی، جو طالب علم اپنی نماز اچھی بنا لیتا تھا، وہ بہت سی برائیوں سے بچ جاتا تھا اور نماز کی خاصیت ہی یہی ہے کہ وہ برائیوں سے بچانے کا سبب بنتی ہے، اسی لیے بزرگوں کا مقولہ ہے۔

"نماز بقدر زندگی اور زندگی بقدر نماز"

جس کی جتنی نماز اچھی ہوگی اسی قدر زندگی اچھی ہوگی، اور نماز خشوع وخضوع سے پڑھنے کے لیے نماز سے پہلے کی سنتوں کا بھی خوب اہتمام کیا جائے۔ مثلاً رات کو اٹھے تو اٹھنے کی دعا، پھر گھر سے نکلنے کی دعا، مسجد جانے کی دعا، الغرض مسنون اعمال اور مسنون دعاؤں کا اہتمام معاون اور مساعد ہوگا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی مانگتے رہیں:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْئَلُكَ تَمَامَ الْوُضُوْءِ وَتَمَامَ الصَّلٰوةِ وَتَمَامَ رِضْوَانِكَ وَتَمَامَ مَغْفِرَتِكَ."[1]

ترجمہ: "اے اللہ! میں تجھ سے پورا وضو کرنے، پوری نماز ادا کرنے، پوری رضامندی اور تیری پوری بخشش کا سوال کرتا ہوں۔"

خشوع وخضوع پیدا کرنے کا طریقہ

ہم ائمہ کو چاہیے کہ ہم اپنی نمازوں پر خوب محنت کریں۔ اچھی سے اچھی اور بہتر سے بہتر نماز بنانے کی فکر کریں۔ اس کے لیے ہمیں تین باتوں کا اہتمام کرنا ہوگا۔

❶ لمبی لمبی نمازیں پڑھ کر مشق کرنی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ نوافل پڑھنے ہوں گے۔ جس میں قیام بھی لمبا ہو اور رکوع وسجود بھی طویل ہوں۔ مثلاً مغرب کے بعد اوابین کا اہتمام اور اذان ہوتے ہی نوافل اور دعاؤں کا اہتمام، ویسے بھی جو اپنی

[1] کنز العمال، الخامس، الطهارة، أذكار الوضوء، رقم: ۲۶۹۸۸

حاجت اور ضرورت ہو تو اذان اور اقامت کے درمیان اللہ تعالیٰ سے مانگ لینا چاہیے کہ حدیث میں آتا ہے۔ "لَا يُرَدُّ الدُّعَاءُ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ."[1] اور ہماری سب سے بڑی حاجت اور ضرورت اپنی نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنا ہے۔

❷ آپ ﷺ سے جو دعائیں نماز کے اندر منقول ہیں ان دعاؤں کو نماز میں اہتمام سے مانگا جائے کہ نماز مناجات کا نام ہے اور مناجات باب مفاعلہ سے ہے جس کے معنی سرگوشی کرنے کے ہیں۔ سرگوشی کہتے ہیں کہ دو آدمیوں کا آپس میں اس طرح بات کرنا کہ کسی تیسرے کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

ہدایہ میں ایک روایت ہے۔ "لَوْ عَلِمَ الْمُصَلِّيْ مَنْ يُنَاجِيْ مَا الْتَفَتَ"[2]

ترجمہ: "اگر نمازی یہ جان لے کہ میں کس کے ساتھ سرگوشی کر رہا ہوں تو وہ (اللہ) کے سوا کسی اور کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔"

لہٰذا نمازوں کے اندر دعائیں خوب مانگی جائیں، بعض دعائیں ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے اور ایک روایت میں ہے کہ جب نماز شروع کرتے تو (پہلے) تکبیر (تحریمہ) کہتے پھر یہ دعا پڑھتے:

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّيْ وَأَنَا عَبْدُكَ، ظَلَمْتُ نَفْسِيْ، وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ،

[1] ابوداود، الصلوٰۃ، باب فی الدعاء بین الاذان والاقامۃ: ۷۷/۱

[2] ہدایہ اولین، الصلاۃ، فصل: ۱۴۰

فَاغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ جَمِیْعًا، إِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ، وَاهْدِنِیْ لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ، لَا یَهْدِیْ لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَهَا لَا یَصْرِفُ عَنِّیْ سَیِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ، لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ، وَالْخَیْرُ كُلُّهٗ فِیْ یَدَیْكَ، وَالشَّرُّ لَیْسَ إِلَیْكَ، أَنَا بِكَ وَ إِلَیْكَ، تَبَارَكْتَ وَتَعَالَیْتَ، وَأَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَیْكَ."[1]

ترجمہ: "میں نے اپنا منہ اس ذات کی طرف متوجہ کیا جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے، میں حق کی طرف متوجہ ہونے والا بے زار ہوں اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو شرک کرتے ہیں، میری نماز، میری عبادت میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی کا مجھے حکم کیا گیا ہے اور میں مسلمانوں (یعنی فرماں برداروں) میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو بادشاہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تو ہی میرا رب ہے اور میں تیرا ہی بندہ ہوں، میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں (چوں کہ تو نے فرمایا ہے کہ جو بندہ اپنے گناہوں کا اعتراف واقرار کرتا ہوا میری بارگاہ میں آئے میں اسے بخش دوں گا) لہٰذا تو میرے تمام گناہوں کو بخش دے، کیوں کہ تیرے علاوہ اور کوئی گناہ نہیں بخش سکتا اور بہترین اخلاق کی طرف میری راہنمائی کر، کیوں کہ بجز تیرے اور کوئی بہترین اخلاق کی طرف راہنمائی نہیں کرسکتا اور بدترین اخلاق کو مجھ سے دور کردے، کیوں کہ تیرے سوا اور کوئی بداخلاقی سے مجھے نہیں بچاسکتا، میں تیری خدمت میں حاضر ہوں اور تیرا حکم بجالانے پر تیار ہوں، تمام بھلائیاں تیرے ہاتھ میں ہیں اور برائی تیری جانب سے منسوب نہیں کی جاتی، میں تیرے ہی سبب سے ہوں اور تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں، تو بابرکت ہے اور اس بات سے بلند ہے (کہ تیری ذات وصفات کی

---

[1] مسلم، صلوۃ المسافرین وقصرها، باب صلاۃ النبی ودعائه باللیل: ۲۶۳/۱

حقیقت وکنہ تک کسی عقل کی رسائی ہوسکے) میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تیرے ہی سامنے توبہ کرتا ہوں۔"

اور جب آپ ﷺ رکوع میں جاتے تو یہ (دعا) پڑھتے۔

"اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ، وَبِكَ اٰمَنْتُ، وَلَكَ أَسْلَمْتُ، خَشَعَ لَكَ سَمْعِیْ وَبَصَرِیْ، وَمُخِّیْ وَعَظْمِیْ وَعَصَبِیْ."[1]

ترجمہ: "اے اللہ! میں نے تیرے ہی لیے رکوع کیا اور تجھ پر ایمان لایا اور تیرے ہی لیے اسلام لایا اور میری سماعت، میری پیشانی، میرا مغز میری ہڈی اور میرے پٹھے تیرے ہی لیے جھکے ہوئے ہیں۔"

اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو یہ (دعا) پڑھتے۔

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوٰتِ وَ مِلْءَ الْأَرْضِ وَمِلْءَ مَا بَیْنَهُمَا وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَیْءٍ بَعْدُ."[2]

ترجمہ: "اے اللہ! رب ہمارے! تیرے ہی لیے حمد ہے آسمانوں اور زمینوں کے برابر اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کے برابر اور اس چیز کے برابر جو بعد کو تو پیدا کرے یعنی آسمانوں اور زمین وغیرہ کے بعد جو معدوم چیزیں تو پیدا کرنا چاہے۔"

اور جب سجدہ میں جاتے تو یہ (دعا) پڑھتے۔

"اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ، وَبِكَ اٰمَنْتُ، وَلَكَ أَسْلَمْتُ، سَجَدَ وَجْهِیْ لِلَّذِیْ خَلَقَهٗ وَصَوَّرَهٗ، وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ، تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ."

ترجمہ: "اے اللہ! میں نے تیرے لیے سجدہ کیا، تجھ پر ایمان لایا اور تیرے ہی لیے اسلام سے بہرہ ور ہوا، میرے منہ نے اسی ذات کو سجدہ

---

[1] ایضاً: ۲۶۳/۱، رقم: ۷۷۱

[2] ایضاً: ۲۶۳/۱، رقم: ۷۷۱

کیا جس نے اس کو پیدا کیا اس کو صورت دی، اس کے کان کھولے اور اس کی آنکھ کھولی۔ اللہ بہت بابرکت اور بہترین پیدا کرنے والا ہے۔“

اور پھر رسول اللہ ﷺ کی سب سے آخری دعا جو ”التحیات“ اور سلام پھیرنے کے درمیان ہوتی یہ ہے۔

”اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ، وَمَا أَسْرَفْتُ، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ، أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ.“[1]

تَرجَمَہ: ”اے اللہ! میرے اگلے پچھلے تمام گناہ بخش دے اور ان گناہوں کو بخش دے جو میں نے پوشیدہ اور علانیہ کیے ہیں اور (اس) زیادتی کو بخش دے (جو میں نے اعمال اور مال خرچ کرنے میں کی ہیں) اور ان گناہوں کو بھی بخش دے جن کا علم مجھ سے زیادہ تجھ کو ہے اور تو اپنے بندوں میں جس کو چاہے عزت و مرتبہ میں آگے کرنے والا اور جس کو چاہے پیچھے ڈالنے والا ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔“[2]

— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان مکمل خاموشی اختیار کرتے تھے (یعنی بآواز بلند نہ پڑھتے تھے، چناں چہ میں نے (ایک دن) عرض کیا: ”یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، آپ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان خاموش رہتے ہوئے کیا پڑھا کرتے ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں یہ (دعا) پڑھا کرتا ہوں:

”اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ

---

[1] ایضاً: ۱/۲۶۳، رقم: ۷۷۱

[2] مظاہر حق جدید، باب ما یقرأ بعد التکبیر، الفصل الأول: ۱/۵۵۸

وَالْمَغْرِبِ، اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِيْ مِنْ خَطَايَايَ بِالثَّلْجِ وَالْمَاءِ وَالْبَرَدِ.“[1]

تَرجَمَہ: ”اے اللہ! مجھ میں اور میرے گناہوں میں اتنی دوری پیدا کر دے جیسا کہ تو نے مشرق و مغرب کے درمیان بعد پیدا کر رکھی ہے (یعنی میرے گناہوں کو کمال بخشش عطا کر) اے اللہ! مجھے گناہوں سے اس طرح پاک کر دے جیسے سفید کپڑے سے میل (کچیل) دور کیا جاتا ہے (یعنی مجھے گناہوں سے کمال پاکی عطا کر، اے اللہ! میرے گناہ پانی، برف اور اولوں سے دھو ڈال۔“

”دعا کے آخری جملہ (اے اللہ میرے گناہوں، برف اور اولوں سے دھو ڈال) سے یہ مراد ہے کہ اللہ العالمین! میرے گناہوں کو اپنے فضل و کرم کے مختلف طریقوں سے بخش دے۔“

لباس کی اصلاح

اکثر مقتدی حضرات روزمرہ زندگی میں شرعی لباس کی رعایت نہیں کرتے اور یہ عادت ان کی اتنی پختہ ہو جاتی ہے کہ نماز میں بھی شرعی لباس کی رعایت کا اہتمام اور اس کا خیال تک نہیں آتا، لہٰذا امام صاحب کی یہ ذمہ داری ہے کہ (حکمت اور پیار محبت کے ساتھ) وہ مقتدیوں کو اس کا باقاعدگی سے پابند کرائیں اور بتائیں کہ:

نماز میں ستر عورت تو شرط ہی ہے۔ ستر عورت کے بعد بھی کچھ چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔ مردوں کا کپڑا ریشمی نہ ہو۔ جان دار کی تصویر والا نہ ہو اتنا چست نہ ہو کہ اعضاء کی ساخت نمایاں ہو۔ کرتا یا پاجامہ یا لنگی ٹخنے سے نیچے نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی کپڑا اگر ٹخنے سے نیچے ہوا تو نماز مکروہ ہوگی۔

---

[1] مسلم، المساجد، باب ما یقال بین تکبیر الإحرام والقراءة: ۱/۲۱۹

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے نماز پڑھی ان کا پاجامہ یا لنگی ٹخنے سے نیچے تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز اور وضو دونوں کے لوٹانے کا حکم دیا۔ پوچھا گیا: ''حضرت آپ نے وضو لوٹانے کا حکم کیوں دیا؟'' فرمایا: ''اس نے لنگی نیچے کر کے نماز پڑھی اور جو ایسا کرتا ہے اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔''[1]

معلوم ہوتا ہے کہ وضو لوٹانے کا حکم بطور سزا کے دیا تا کہ پھر ایسی غلطی نہ کریں۔ نماز کے لوٹانے کا حکم تو ظاہر ہے کہ اس لیے دیا کہ ایسی نماز مکروہ ہوتی ہے، بارگاہ الٰہی میں قبول نہیں ہوتی۔

اور یہ مضمون تو بہت سی حدیثوں میں آیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، جو تکبر کے ساتھ لنگی پانجامہ ٹخنے سے نیچے کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف (ناراضگی کی وجہ سے نظرِ رحمت سے) نہیں دیکھیں گے۔[2]

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے۔

اگر بالفرض مان لیا جائے کہ یہ لوگ ایسا تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے تو کم از کم متکبرین کے ساتھ مشابہت تو پائی جاتی ہے۔ یہی کیا کم ہے؟

حدیث شریف میں یہ بھی تو آیا ہے: ''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ''[3] کیا متکبرین سے مشابہت اچھی بات ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے اور آدمی کو اس بیماری کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں آیا ہے ایک صحابی سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وَ إِيَّاكَ وَ إِسْبَالَ الْإِزَارِ فَإِنَّهَا مِنَ الْمَخِيلَةِ وَ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

[1] ابوداؤد، الصلوٰۃ، باب الاسبال فی الصلاۃ، رقم: ۶۳۸

[2] بخاری، اللباس، باب من جر ثوبہ من الخیلاء، رقم: ۵۷۸۸

[3] ابوداؤد، اللباس، باب فی لبس الشهرة: ۲۰۳/۲

الْمَخِيلَةَ''[1]

یعنی لنگی نیچی کرنے سے پرہیز کرو اس لیے کہ یہ تکبر کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں فرماتے۔ ایک اور حدیث میں ہے ''مَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الْإِزَارِ فَفِي النَّارِ''[2]

یعنی جو کپڑا ٹخنے سے نیچے ہے وہ جہنم میں جائے گا۔ کپڑا تو دنیا ہی میں اتار لیا جاتا ہے مطلب یہ کہ کپڑے والا جہنم میں جائے گا۔

حدیث شریف میں آیا ہے:

''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ''[3]

جس کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جاسکتا۔ اس کی طرف بہت توجہ کی ضرورت ہے اس میں عام طور سے غفلت برتی جاتی ہے۔

یہ ممانعت مطلقاً ہے۔ نماز کے اندر بھی اور باہر بھی، جب یہ حالت اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں تو ایسی حالت میں نماز کیسے قبول ہوگی۔ بہت سے لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ نماز کے وقت تو پائجامہ یا پینٹ موڑ لیتے ہیں۔ پھر جب نماز سے فارغ ہوتے ہیں تو نیچے کر لیتے ہیں۔ یا کام کرنے کے وقت ٹخنے سے نیچے رکھتے ہیں۔ ائمہ کرام ایسے لوگوں کو سمجھائیں کہ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کو ہر وقت ناپسند ہے۔ پھر ہم نماز کے باہر بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کیوں مول لیتے ہیں۔ اسی حال میں موت آجائے تو کیا ہوگا۔ ''اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُمْ''[4]

بعض ائمہ کرام کا بھی بے احتیاطی سے پائجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا ہے۔

بعض میں وضع قطع کے اعتبار سے کمی پائی جارہی ہوتی ہے، تو بعض ائمہ کرام

[1] ابوداؤد، اللباس، باب ما جاء فی اسبال الازار، رقم: ۴۰۸۴

[2] بخاری، اللباس، باب ما أسفل من الکعبین، رقم: ۵۷۸۷

[3] ترمذی، البر والصلة، باب ما جاء فی الکبر: ۲۰/۲

[4] نماز کی پابندی اور اس کی حفاظت: ۲۱ تا ۲۳

نماز سکون واطمینان سے نہیں پڑھتے۔

اور یہ ایسی عادات ہیں کہ جن کو مقتدی ائمہ کے حق میں کسی حال میں بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، کیوں کہ ہر مقتدی یہ چاہتا ہے کہ میں جس امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھوں اس کا لباس، اخلاق، نماز، وضع قطع غرض ہر کام شریعت اور سنت کے عین مطابق ہو۔

لہٰذا ائمہ کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ ایسی صفات ہرگز اختیار نہ کریں جن کو دیکھ کر مقتدی غلط تاثر لیں اور مقتدیوں کے دلوں میں امام کے لیے نفرت پیدا ہوں۔

تصویر اور نقش ونگار والے کپڑوں میں نماز پڑھنا

بعض لوگ ایسے کپڑوں میں نماز پڑھتے ہیں جس پر جان دار کی تصویریں ہوتی ہیں، بعض لوگوں کے شرٹ کے اگلے یا پچھلے حصے پر فلمی اداکاروں کی تصویریں وغیرہ ہوتی ہیں اور وہ لوگ بے احتیاطی میں اس میں نمازیں پڑھتے ہیں، لہٰذا ائمہ مساجد لوگوں کو پیار ومحبت اور حکمت کے ساتھ انفرادی طور پر سمجھائیں کہ ایسے پینٹ شرٹ اور ایسے کپڑوں میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، جس پر جان دار کی تصویر بنی ہو۔[1]

اسی طرح ایسے کپڑے پہن کر نماز پڑھنا بھی ناپسندیدہ ہے، جس پر جاذب نقش ونگار بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے کی خود یا کسی دوسرے کی اس پر نگاہ پڑے گی اور اس کے دیکھنے میں مشغول ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے توجہ ہٹ جائے گی جو خشوع وخضوع کے خلاف ہے۔

ایک مرتبہ ایک صحابی نے آں حضرت ﷺ کو ایک منقش چادر ہدیہ کی، آپ ﷺ نے اس میں نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہوتے ہی اس کو نکال دیا اور فرمایا: ''قریب تھا کہ یہ مجھے نماز سے غافل کر دیتی یہ ابوجہم کو (جنہوں نے دی تھی)

[1] شامی، باب ما یفسد الصلوة وما یکرہ فیہا: ۶۴۷/۱

واپس کر دو اور ان کی انبجانی چادر (جو سادی تھی اس پر نقش ونگار نہیں تھے) لاؤ۔''[1]

اس سے معلوم ہوا کہ جو کپڑا یا مصلّی ایسا جاذب نظر ہو جو مصلّی کی توجہ کو ہٹا دے اس کو استعمال کرنا نماز کی حالت میں مناسب نہیں بل کہ مکروہ ہے۔[2]

اپنی مسجد میں قالین بچھانا ہو تو ایسا سادہ قالین بچھائیں، جس پر منقش ڈیزائن نہ بنی ہوئی ہو، ایک ہی رنگ کا سادہ قالین ہو۔

اسی طرح مسجد کے سامنے کی دیوار بھی سادی ہو، بہتر ہے کہ سفید رنگ لگا ہوا ہو، تاکہ نمازیوں کی توجہ رنگین پتھروں میں یا قالین کے پھولوں اور ڈیزائن میں نہ لگ جائے۔

عورتوں کی نماز

اس کے بعد خواتین کی نماز کا مختصر طریقہ لکھا جاتا ہے، تاکہ ائمہ کرام اپنے وعظ و درس میں مرد حضرات کو بتائیں اور پھر وہ اپنی محرم عورتوں کو سکھا کر ان کی نمازوں کو درست فرمائیں۔

مرد حضرات تو اپنی نماز کے بارے میں ائمہ کرام سے مجمع کے وعظ اور درس وغیرہ میں سنتے رہتے ہیں اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو براہ راست ان سے پوچھ سکتے ہیں، لیکن خواتین براہ راست ائمہ کرام سے نہیں پوچھ سکتیں اور اگر اپنے محرم مرد یا شوہر سے پوچھتی ہیں تو ان کو خواتین کی نماز کا طریقہ آتا نہیں، لہٰذا ائمہ کرام اس بارے میں مرد حضرات کو فکر مند فرمائیں اور مندرجہ ذیل طریقے پر ان کو نماز پڑھنا سکھائیں۔

عورتوں کی نماز مردوں سے بعض جگہوں پر ذرا مختلف ہے:

1. عورتوں کو نماز شروع کرنے سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لینا چاہیے کہ ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں کے سوا تمام جسم کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے۔ بعض عورتیں اس طرح نماز پڑھتی ہیں کہ ان کے بال کھلے ہوتے ہیں۔ بعض کے کان بعض کی

[1] بخاری، الصلاة، باب اذا صلی فی ثوب له اعلام ونظر إلی علمها، رقم: ۳۷۳

[2] شامی، باب ما یفسد الصلوة وما یکرہ فیہا: ۶۴۸/۱

کلائیاں کھلی ہوتی ہیں۔ بعض کے دوپٹے اتنے باریک ہوتے ہیں کہ بال نظر آتے ہیں۔ یہ سب طریقے ناجائز ہیں۔ نماز کے دوران عورت کا کوئی عضو چہرہ، ہاتھ، پاؤں کے سوا اگر اتنی دیر کھلا رہے جس میں تین مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" پڑھا جاسکے تو نماز نہیں ہوگی۔ اور اگر اس سے کم کھلا رہا تو نماز ہو جائے گی، مکروہ ہوگی اور گناہ ہوگا۔

۲ عورتیں جتنا گھر کے اندر نماز پڑھیں بہتر ہے۔ کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں پڑھنے سے بہتر ہے۔ اور برآمدے میں پڑھنا صحن میں پڑھنے سے افضل ہے۔

۳ عورتوں کو نماز شروع کرنے کے وقت ہاتھ کانوں تک نہیں بلکہ صرف کندھوں تک اٹھانے چاہیے اور وہ بھی دوپٹے کے اندر۔ ہاتھ باہر نہ نکالیں۔[1]

۴ عورتیں ہاتھ صرف سینہ پر اس طرح باندھیں کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ دیں۔ انگلیاں خوب ملی ہوئی ہوں (عورتوں کے لیے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی کلائی کو پکڑنا نہیں ہے۔ یہ مردوں کا طریقہ ہے)۔[2]

۵ عورتیں اس طرح کھڑی ہوں کہ دونوں پاؤں ملے ہوں، پاؤں کے درمیان فصل نہ ہو۔ رکوع میں بھی یہی حالت رہنی چاہیے۔[3]

۶ نماز کی نیت کرکے "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہہ کر، ہاتھوں کو سینہ پر رکھنے کے بعد ثنا پڑھے پھر "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ" اور "بِسْمِ اللّٰہِ" پڑھ کر "اَلْحَمْدُ شریف" پڑھے۔ "وَلَا الضَّآلِّیْنَ" کے بعد آمین کہے۔ پھر "بِسْمِ اللّٰہِ" پڑھ کر کوئی سورت پڑھے پھر "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہہ کر رکوع میں جائے۔

۷ عورت رکوع میں صرف اتنا جھکے کہ ہاتھوں کو گھٹنے پر رکھ دے۔ (مردوں کی

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، الصلاۃ، فی المرأۃ اذا افتتحت الصلاۃ: ۱/۲۷۰

[2] طحطاوی علی المراقی: ۱۵۰، سعایۃ: ۲/۱۵۶

[3] بہشتی زیور: ۱۱/۳۳

طرح کمر اور پیٹھ کو برابر نہیں کرتا ہے۔ یعنی مردوں سے کم جھکتا ہے) دونوں ہاتھ کی انگلیاں ملا کر گھٹنوں پر رکھ دے، انگلیاں پھیلی ہوئی نہ ہوں۔[1]

۸ دونوں بازو پہلو سے خوب ملائے رکھے اور دونوں پیر کے ٹخنے ملائے رکھے۔[2]

۹ عورتوں کو رکوع میں اپنے پاؤں بالکل سیدھے نہ رکھنے چاہئیں، بلکہ گھٹنوں کو آگے کی طرف ذرا سا خم دے کر کھڑا ہونا چاہیے۔[3]

۱۰ رکوع میں تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" پڑھے۔ [illegible] کرے اور "سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" کہہ کر سر اٹھائے اور اطمینان سے کھڑی ہو۔ اور "رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا فِیْہِ" پڑھے[4] یا یہ پڑھے "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ مِلْءُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَمِلْءُ مَا شِئْتَ مِنْ شَیْءٍ بَعْدُ" (رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" پڑھنا بھی کافی ہے)۔[5]

۱۱ عورتوں کو سجدہ اس طرح کرنا چاہیے کہ پیٹ رانوں سے بالکل مل جائے اور بازو بھی پہلو سے ملے ہوئے ہوں۔ دونوں بازو (ذراعین) زمین پر بچھا دے۔[6]

۱۲ دونوں ہاتھوں کو سینے کے برابر میں رکھے۔ ناک اور پیشانی دونوں رکھے۔ ہاتھ کی انگلیاں بند ہوں اور قبلہ کی طرف متوجہ ہوں۔ انگوٹھا بھی قبلہ کی طرف متوجہ ہو۔[7]

۱۳ دونوں پاؤں داہنی طرف کو نکال دے، کھڑا نہ رکھے۔ البتہ انگلیاں قبلہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اور تین یا پانچ بار "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" پڑھے۔

[1] طحطاوی: ۱۵۰، بہشتی زیور: ۱۱/۳۳

[2] طحطاوی: ۱۵۰، بہشتی زیور مدلل: ۱۱/۳۳

[3] شامی، آداب الصلوٰۃ: ۱/۴۹۴

[4] بخاری، الاذان، باب فضل اللّٰہم ربنا ولک الحمد: ۱/۱۱۰

[5] مسلم، صلوٰۃ المسافرین وقصرها باب صلوٰۃ النبی ......: ۱/۲۶۳

[6] مصنف ابن ابی شیبہ الصلاۃ، المرأۃ کیف تکون فی سجودها: ۱/۳۰۲

[7] معجم الطبرانی: ۲۲/۱۸

۱۴ پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر اٹھے اور اطمینان سے بیٹھے۔ بائیں سرین کو زمین پر رکھ دے۔ دونوں پاؤں داہنی طرف کو نکال دے۔ اور داہنی ران کو بائیں ران پر رکھ دے۔ اور داہنی پنڈلی کو بائیں پنڈلی پر رکھے۔[1]

۱۵ دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ دے۔ اور انگلیاں خوب ملا کر رکھے۔ عورتوں کے لیے یہی طریقہ ہے کہ رکوع، سجدہ، دو سجدوں کے درمیان اور قعدوں میں انگلیاں بند رکھے ان میں فاصلہ نہ ہو۔ (جب کہ مردوں کے لیے حکم یہ ہے کہ رکوع میں انگلیاں کھول کر رکھیں۔ سجدے میں بند رکھیں۔ اور بقیہ افعال میں اپنی حالت پر رکھیں نہ بند نہ کھلی مل کہ بین بین)۔

۱۶ دو سجدوں کے درمیان جلسہ میں یہ دعا بھی پڑھے:

"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاھْدِنِيْ وَعَافِنِيْ وَارْزُقْنِيْ"[2] آپ حضرت ﷺ یہ دعا پڑھتے تھے۔ فرض نفل ہر نماز میں پڑھے۔

۱۷ پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر دوسرا سجدہ کرے۔ اس میں بھی پہلے سجدہ کی طرح کرے۔ پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر کھڑی ہو جائے زمین پر ہاتھ ٹیک کر نہ اٹھے۔ پھر "بِسْمِ اللّٰہِ" اور سورۂ فاتحہ پڑھے۔ سورۂ فاتحہ کے اختتام پر پہلی رکعت کی طرح آمین کہے۔ اور "بِسْمِ اللّٰہِ" پڑھ کر کوئی سورۃ پڑھے۔[3]

۱۸ دو رکعت پوری ہونے پر قعدہ کرے۔ اس میں بیٹھنے کا وہی طریقہ ہے جو دونوں سجدوں کے درمیان بتایا گیا ہے۔ اور ہر قعدہ میں وہی طریقہ ہے پھر قعدہ میں التحیات پڑھے۔ جب "اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ" پر پہنچے تو داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور اس سے ملی ہوئی انگلی بند کرے (اس کو عقد کہتے ہیں) اور بیچ کی انگلی اور انگوٹھے کا

[1] طحطاوی علی المراقی: ۱۴۶، بہشتی زیور مدلل: ۳۳/۱۱

[2] مسلم، الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب فضل التھلیل والتسبیح رقم: ۲۶۹۷

[3] ماخذہ بہشتی زیور: ۱۳۷

حلقہ بنالے اور شہادت کی انگلی اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف اشارہ کرے۔ اور "اِلَّا اللّٰہُ" پر گرادے۔ لیکن عقد وحلقہ کو آخر تک باقی رکھے۔[1]

۱۹ اگر دو رکعت والی نماز ہے تو سلام تک یہی ہیئت باقی رکھے درود شریف اور دعا وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرے۔ اور اگر تین یا چار رکعت والی نماز ہے تو التحیات پڑھ کر فوراً اٹھ جائے۔

۲۰ تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ پڑھے۔ فرض نماز ہو تو سورۂ فاتحہ کے بعد رکوع کرے۔ وتر، سنت اور نفل میں بِسْمِ اللّٰہِ پڑھ کر سورت بھی پڑھے۔

۲۱ قعدۂ اخیرہ (جس میں سلام پھیرتا ہے) میں اس طرح سلام پھیرے کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ کہتے ہوئے منہ داہنی طرف پھیرے۔ قبلہ کی طرف سے شروع کرے۔ داہنی طرف منہ کرکے ختم کرے۔ پھر منہ قبلہ کی طرف اور اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ کہتے ہوئے بائیں طرف منہ پھیرے۔ اور دونوں طرف سلام کرتے ہوئے، فرشتوں کو سلام کرنے کی نیت کرے۔ بائیں طرف سلام پھیرنے کی ابتدا منہ کو قبلہ کی طرف کرنے کے بعد کریں گے، داہنی طرف سے نہیں۔

عورتوں کے لیے جماعت کرنا مکروہ ہے۔ ان کو اکیلی نماز پڑھنی چاہیے۔ البتہ اگر گھر کے محرم افراد گھر میں جماعت کر رہے ہوں تو ان کے ساتھ جماعت میں شریک ہو جانے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ایسے میں مردوں کے بالکل پیچھے کھڑا ہونا ضروری ہے برابر میں ہرگز کھڑی نہ ہوں۔

عورتوں کو چاہیے کہ پنجگانہ نماز، نماز تراویح اور وتر منفردا (تنہا تنہا) پڑھیں۔ ان کے لیے جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔[2]

[1] ماخذہ بہشتی زیور: ۱۳۸

[2] فتاویٰ رحیمیہ، تراویح اور وتر کے متعلق متفرق مسائل: ۳۴۷/۸، شامی، باب الامامۃ: ۵۶۵/۱، نماز کی پابندی اور اس کی حفاظت: ۲۹ تا ۳۳

باب ہفتم

اتفاق کی اہمیت

حضرت مولانا حاجی محمد شریف رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ فرماتے ہیں کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ کا واقعی بڑا کمال تھا کہ صحیح مسلک سے ذرہ بھر نہ ہٹے اور کسی کی کبھی دل آزاری تک نہ کی۔ ایسا کرنا بڑا مشکل کام ہے پل صراط کی طرح نازک معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب حق بات ایسے پیارے عنوان سے فرماتے تھے کہ اختلافِ مسلک رکھنے والوں کو بھی ناگوار نہ گزرتا۔ حق پرستی و حق جوئی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی مخالف بھی ایسی بات کہتا کہ شرعاً معمولی بھی گنجائش ہوتی تو فوراً بلا تامل قبول فرما لیتے اور اپنی رائے پر اصرار نہ فرماتے۔ بڑے دکھ سے فرمایا کرتے تھے کہ "اکابر دیوبند میں مختلف مشربوں کے نام سے جو تفریق پیدا ہو گئی ہے۔

دینی مقاصد کی بہتری کا تقاضا یہ ہے کہ اسے حتی الامکان مٹایا جائے۔ مذاقِ سلیم کو مثبت انداز میں پھیلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کسی مسلک کا نام لیے بغیر یوں بات کہنی چاہیے کہ ہمارے اکابر کا طرز یہ تھا ان کا مزاج و مذاق یہ تھا اور اسی کو ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔

فرمایا کرتے تھے: تحزب سے بچتے ہوئے دوسرے مزاج و مذاق کے حضرات میں گھلا ملا جائے اور مناسب موقع پر انہیں اکابر کے صحیح مذاق کی دعوت دی جائے۔ صرف اس حیثیت سے کہ وہ ایسی تعبیر ہے، جسے ہمارے اکابر نے اوفق بالسنۃ سمجھ کر

[illegible] ہو گیا ہے۔ قدیم اکابر اسی کے حامل تھے۔ اس طرح امید ہے کہ ان شاء اللہ رفتہ رفتہ لوگوں کا تفرق ختم ہوگا اور مل جل کر خدمتِ دین کا جذبہ بیدار ہوگا۔[1]

شیخ عبداللہ بن حسین الموجان اپنی کتاب "تحاسد العلماء" میں لکھتے ہیں:

وقد امتلأ القرآن الكريم بالدعوة إلى الإجتماع والإئتلاف، والوحدة والإخاء، وحذر أشد التحذير من الفرقة والشقاق والتنازع والخصام فقال سبحانه:

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا﴾[2]

وقال جل شانه:

﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾[3]

﴿وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾[4]

وقد بين الله عزوجل أن تقسيم الناس إلى طوائف متناحرة وشيع متخاصمة إنما هو من خطة الظالمين، ومكائد الأعداء الفاسقين ...... قال سبحانه وتعالى ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ﴾[5]

كما بين سبحانه أن المختلفين من المؤمنين هم يبعدون عن الله، وأن غير المختلفين هم المرحومون القريبون منه عزوجل، فقال: ﴿وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ۝ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾[6]

قال المزني -رحمه الله تعالى- ذم الله الإختلاف وأمر عنده بالرجوع إلى الكتاب والسنة، فلو كان الإختلاف من دينه ما ذمه،

---

[1] "اصلاح دل": ۲۵۷ [2] آل عمران: ۱۰۳ [3] الانفال: ۴۶

[4] الروم: ۳۱ [5] القصص: ۴ [6] هود: ۱۱۸، ۱۱۹، تحاسد العلماء: ۴۴۲

ولو كان التنازع من حكمه ما أمرهم بالرجوع عنده إلى الكتاب والسنة.

وغضب عمر بن الخطاب من اختلاف أبي بن كعب وابن مسعود في الصلاة في الثوب الواحد إذ قال أبي: "الصلاة في الثوب الواحد حسن جميل" وقال ابن مسعود: "إنما كان ذلك والثياب قليلة." فخرج عمر مغضبا فقال: "اختلف رجلان من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ممن ينظر إليه ويؤخذ عنه، وقد صدق أبي، ولم يأل ابن مسعود ولكني لا أسمع أحدا يختلف فيه بعد مقامي هذا إلا فعلت به كذا وكذا."[1]

وقد عملت عدة أمور على وقوع التنافر والخصام بين المتمذهبين بالمذاهب الأربعة، واستحكام العداوة والبغضاء، من ذلك "التعصب المذهبي، والجهل والجمود، وعمل أهل كل مذهب على نشر مذهبهم فقد أدت هذه الأمور إلى طعن المذهبيين في بعض، وانتقاص بعضهم بعضا."[2]

لقد كان من نتيجة هذه الحملات العدائية انتشار الكراهية الشديدة، بل والعداء المستحكم البعيد جدا عن هدي الإسلام وسماحته، وغلبة هذا الجو الذي باض فيه التعصب وفرخ ولا نبعد إذا قلنا: "إن ذلك كان من الأسباب الكبرى لسقوط المسلمين وغلبة أعدائهم عليهم."[3]

اسی طرح مولانا ایک اور جگہ رقم طراز ہیں کہ مذہبی تعصب کی وجہ سے لوگوں

[1] بدعة التعصب المذهبي: ۲۰۱، ۲۰۲، نقلاً عن تحاسد العلماء: ۲۴۳
[2] تحاسد العلماء: ۲۴۳ [3] تحاسد العلماء: ۲۴۷

میں فتنوں اور خرابیوں کا ظہور ہوتا ہے۔

"فمن ذلك ما ذكره الحافظ ابن كثير أن عزيز مصر وهو الملك الأفضل بن صلاح الدين كان قد عزم في السنة التي توفي فيها وهي سنة ۵۹۵ھ على إخراج الحنابلة من بلده وأن يكتب إلى بقية إخوته بإخراجهم من البلاد ومنها ما ذكره أيضا من وقوع فتنة كبيرة ببلاد خراسان، بسبب وفود فخر الدين الرازي إلى ملك هراة، الذي أكرمه وبنى له مدرسة في هراة، ولكن أهل البلاد الذين كانوا على مذهب ابن كرام أبغضوه وسعوا به، وناظروه، وانتهت المناظرة إلى السب والشتم، وخطب أحدهم في الجامع مستنكرا أقوال الرازي وأثار الناس، فأمر الملك بإخراج الرازي من بلاده.

كما روى ابن كثير فتنة أخرى وقعت في دمشق بسبب عبد الغني المقدسي الذي كان يدرس في مقصورة الحنابلة بالجامع الأموي، فتعرض لمسألة صفات الله، فغضب أتباع المذاهب الأخرى وعقد له الأمير صارم الدين برغش مجلسا وناظره الفقهاء فلم يتفقوا فأمر الأمير بنفيه من البلد، وأرسل الأسارى من القلعة، فكسروا منبر الحنابلة وتعطلت يومئذ صلاة الظهر في محراب الحنابلة، وأخرجت الخزائن والصناديق التي كانت هناك وجرت خبطة شديدة."[1]

ومن ذلك أن الخليفة العباسي القادر بالله ...... نقل القضاء عن الحنفية إلى الشافعية فاشتهر ذلك وصار أهل بغداد حزبين فارت

[1] تحاسد العلماء: ۲۴۹

بينهما الفتن، فاضطر الخليفة إلى جمع الأشراف وأخرج إليهم رسالة خلاصتها أن الأسفراييني قد أدخل على أمير المؤمنين مدخلا وأوهمه فيها النصح والأمانة ......[1]

ومنها ما رواه ابن الأثير في حوادث سنة ۳۲۳ھ قال: وفيها عظم أمر الحنابلة ببغداد وقويت شوكتهم وصاروا يكبسون من دور القواد والعامة، وإن وجدوا نبيذا أراقوه، وإن وجدوا مغنية ضربوها وكسروا آلة الغناء، واعترضوا في البيع والشراء، وفي مشي الرجال مع النساء والصبيان، فإذا رأوا ذلك سألوه عن الذي معه من هو؟ فإن أخبرهم وإلا ضربوه وحملوه إلى صاحب الشرطة وشهدوا عليه بالفاحشة، فأرهجوا بغداد، فركب بدر الخرشني -وهو صاحب الشرطة- عاشر جمادى الآخرة ونادى في جانبي بغداد في أصحاب أبي محمد البربهاري الحنابلة لا يجتمع منهم اثنان، ولا يتناظرون في مذهبهم، ولا يصلي منهم إمام إلا إذا جهر "بسم الله الرحمن الرحيم" في صلاة الصبح، والعشائين- فلم يفد فيهم وزاد شرهم وفتنتهم، واستظهروا بالعميان الذين كانوا يأوون المساجد، وكانوا إذا مر بهم شافعي المذهب أغروا به العميان فيضربونه بعصيهم، حتى يكاد يموت، فخرج توقيع الراضي بما يقرأ على الحنابلة ينكر عليهم فعلهم ويوبخهم باعتقاد التشبيه وغيره ......[2]

---

[1] نظرة تاريخية في حدوث المذاهب وانتشارها: ۹، ۱۰ نقلا عن المقريزي تحفة العلماء: ۲۵۰

[2] الكامل لابن الأثير ذكر فتنة الحنابلة ببغداد: ۱۱۴/۶

ترجمہ: "مذہبی تعصب ہی کی بناء پر اس امت میں حسد، بغض اور کینہ آگیا ہے، حالاں کہ قرآن کریم اتفاق واتحاد اور اجتماعیت کے احکام سے بھرا پڑا ہے، اور دوسری طرف بڑی سختی کے ساتھ آپس میں تفرق، اختلاف اور لڑنے جھگڑنے سے ڈرایا اور منع کیا ہے۔

چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور پھوٹ مت ڈالو۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: "اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: "اور شرک کرنے والوں میں سے مت رہو۔"

اور اللہ عزوجل نے فرمایا کہ (اگر) آپ، لوگوں کو خون خرابہ کرنے والے گروہوں اور لڑنے جھگڑنے والی ٹولیوں میں کھڑا کر دیں تو یہ ظالم لوگوں کا کام اور دشمنوں کا مکر و فریب اور چال ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یقیناً فرعون سرزمین (مصر) میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسموں میں بانٹ رکھا تھا کہ ان (باشندوں) میں سے ایک جماعت (یعنی بنی اسرائیل) کا زور گھٹا رکھا تھا۔"

جیسا اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ جو مومنین آپس میں اختلاف کرتے ہیں تو وہ اللہ سے دور ہیں، اور جو اختلاف نہیں کرتے تو وہ اللہ کی رحمت کے قریب اور اللہ کے قریب ہیں۔

چناں چہ ارشاد ربانی ہے: "اور (آئندہ بھی) ہمیشہ اختلاف (ہی) کرتے رہیں گے، مگر جس پر آپ کے رب کی رحمت ہو اور اللہ نے ان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے۔"

چناں چہ امام مزنی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اختلاف کی مذمت کی ہے اور اختلاف کے وقت قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا

ہے، پس اگر یہ اختلاف کرنا دین کا حصہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کی مذمت نہ کرتے اور یہ لڑنا جھگڑنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ لوگوں کو اختلاف کے وقت قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرنے کا حکم نہ کرتا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک موقع پر بہت غصہ ہوئے اور یہ موقع تھا، جب حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان ایک کپڑے میں نماز پڑھنے پر اختلاف ہوا۔

لہٰذا حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "ایک کپڑے میں نماز پڑھنا اچھا اور مستحسن ہے" جب کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "یہ تو اس وقت ہے جب کسی کے پاس کپڑے کم ہوں" اتنے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ غصے کی حالت میں نکلے اور فرمایا:

"افسوس! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں ایسے دو شخص باہم جھگڑ رہے ہیں جن کی طرف لوگوں کی نظریں ہیں اور جن سے لوگ دین کا استفادہ کرتے ہیں (پھر فرمایا) صحیح بات تو ابی بن کعب کی ہے، مگر اجتہاد میں ابن مسعود نے بھی کوتاہی نہیں کی، لیکن آج کے بعد اگر میں نے کسی کو ایسے مسائل میں اختلاف کرتے ہوئے دیکھا تو اس کو بہت سخت سزا دوں گا۔"

چند مذموم صفات کی بناء پر مذاہب اربعہ میں انتہائی نفرت اور تنازع پایا جاتا ہے اور جن کی بناء پر ان میں دشمنی اور بغض مستحکم ہو گیا ہے۔

ان صفات مذمومہ میں سے ایک صفت مذموم مذہبی تعصب، جہالت اور اپنی غلط بات پر ڈٹ جانا ہے، جس پر ان لوگوں نے عمل کر کے اپنے اپنے مذہب کو عام کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ بات ایک دوسرے پر طعن وتشنیع اور ایک دوسرے کی تنقیص کرنے تک پہنچ گئی۔

ان کے اس مذہبی تعصب کی وجہ سے ان پر بغض اور حسد غالب آ گیا۔ اور یہی

مذہبی تعصب اور اختلاف ماضی میں مسلمانوں کے سقوط اور ان پر دشمنوں کے غالب آنے کے بڑے اسباب میں سے ہے۔

ان مذہبی تعصبات میں سے ایک تعصب کا وہ واقعہ ہے جو حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ عزیز مصر بادشاہ افضل بن صلاح الدین نے اپنے ملک سے حنابلہ کو نکالنے کا عزم کر لیا، یہ وہ سن تھا جس میں ان کا انتقال ہو گیا تھا یعنی سن ۵۹۵ھ اور انہوں نے یہ بھی عزم کر لیا کہ وہ اپنے دوسرے بھائیوں (بادشاہوں) کو لکھ دے کہ وہ بھی ان کو اپنے اپنے ملک سے نکال باہر کریں۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ بلاد خراسان میں جو بڑے بڑے فتنے برپا ہوئے تھے، وہ امام فخر الدین رازی کے وفد کے سبب سے واقع ہوئے تھے جو غزنہ کے بادشاہ کے پاس آیا تھا، غزنہ کے بادشاہ نے ان کا بڑا اکرام کیا اور ان کے لیے ہرات میں ایک مدرسہ بنوایا، لیکن ہرات کے رہنے والے سارے کے سارے ابن کرام کے مسلک پر تھے۔

چناں چہ وہ امام فخر الدین رازی سے بغض کرنے لگے، یہاں تک کہ ان سے مناظرہ کیا اور آخر کار مناظرہ گالی گلوچ پر جا کر ختم ہوا، اہل ہرات میں سے ایک نے جا کر جامع مسجد میں ان کے خلاف تقریر کر کے ان کے اقوال کا انکار کیا اور لوگوں کو ان کے خلاف برانگیختہ کیا، تو بادشاہ نے امام رازی کی جلاوطنی کا حکم صادر کر دیا۔

جیسا حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ دمشق میں دوسرا بڑا فتنہ عبدالغنی مقدسی کے سبب سے برپا ہوا، جو بنو امیہ کی جامع مسجد میں درس دیا کرتے تھے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق کوئی مسئلہ چھیڑ دیا، جس سے دوسرے مذاہب کے متبعین مشتعل ہو گئے اور جب انہوں نے ان کے ساتھ اختلاف شروع کر دیا تو امیر صارم الدین نے فقہاء کو بلا کر ان کے ساتھ مقام رفش میں مناظرے کی ایک مجلس منعقد کر دی اور جب یہ کسی بات پر متفق نہیں ہوئے یعنی مناظرے سے ہار

جیت کا کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا تو امیر نے شہر سے عبدالغنی مقدسی کی جلاوطنی کا حکم جاری کر دیا اور انہوں نے قلعہ سے قیدیوں کو بھیج دیا تو قیدیوں نے حنابلہ کے منبروں کو توڑ ڈالا اور اس دن حنابلہ کی محراب میں ظہر کی نماز نہ پڑھی جا سکی اور وہاں کے سارے خزانوں اور صندوقوں کو نکال لیا گیا، یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔

ان مذہبی تعصبات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عباسی خلیفہ قادر باللہ نے قضاء کا عہدہ احناف سے لے کر شوافع کو دے دیا، تو اس بات کی پورے بغداد میں شہرت ہو گئی، جس سے اہل بغداد دو ٹولیوں اور جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔

ان میں سے ایک وہ واقعہ بھی ہے، جس کو ابن اثیر نے سن ۳۲۳ھ کے حوادثات میں روایت کیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب بغداد میں حنابلہ کا معاملہ بڑا دشوار اور سنگین ہو گیا اور اہل بغداد کی شان و شوکت اپنے عروج پر آ گئی تو وہ حنابلہ کے ہر خاص و عام کے گھر میں گھس جاتے، اگر وہ ان گھروں میں نبیذ (کھجور کا عرق) پا لیتے تو اس کو بہا دیتے اور اگر کسی گانے والی (گلوکارہ) کو دیکھ لیتے تو اس کو مارتے اور گانے بجانے کے آلات کو توڑ دیتے، خرید و فروخت میں نکتہ چینی کرتے، ان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ مرد چلتے اور جب وہ یہ پوچھتے کہ وہ کون تھا اگر وہ بتا دیتے (تو چھوڑ دیتے) ورنہ اس کی پٹائی کرتے اور پولیس کے حوالے کر دیتے اور اس کے خلاف فحاشی کی گواہی دیتے۔ انہوں نے بغداد میں بڑا فساد کیا، یہاں تک کہ دس جمادی الاخری کو بدر خرشنی پولیس نے سوار ہو کر بغداد کے دونوں اطراف "ابو محمد بربھاری حنبلی" کے ساتھیوں کے بارے میں یہ آواز لگائی کہ ان میں سے نہ دو شخص اکٹھے ہوں، اور نہ اپنے مسلک کے بارے میں مناظرہ کریں گے، اور ان میں سے کوئی امام نماز بھی نہ پڑھائے، مگر اس صورت میں پڑھا سکتا ہے جب وہ فجر اور مغرب و عشاء کی نمازوں میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ جہر سے (با آواز بلند) پڑھے۔

مگر کچھ بھی فائدہ اس اعلان کا نہ ہوا بلکہ ان کا شر و فساد اور زیادہ پھیل گیا اور حنابلہ نے ان نابینا لوگوں سے جنہوں نے مساجد میں پناہ لی ہوئی تھی مدد حاصل کی، چنانچہ جب ان نابینا لوگوں پر کسی شافعی المذہب کا گزر ہوتا تو وہ سب اکٹھے ہو کر اس پر حملہ کرتے اور اپنی لاٹھیوں سے اس کی پٹائی کرتے یہاں تک کہ وہ مرنے کے قریب ہو جاتا، پھر خلیفہ راضی کی طرف سے مہر لگا ہوا ایک خط آیا جو حنابلہ کو سنایا گیا جس میں ان کے اس "اعتقادِ تشبیہ" کے فعل کو ناپسند کرتے ہوئے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کی گئی تھی۔"

تفرق کے نقصانات

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں:

قرآن و حدیث میں تجاوز عن الحدود کا نام تفرق ہے، جو جائز اختلاف رائے سے الگ ایک چیز ہے۔ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [1]

ترجمہ: "اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو۔"

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وصیت کا ذکر ہے جو تمام انبیاء سابقین کو کی گئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ [2]

ترجمہ: "کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔"

امام تفسیر ابو العالیہ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے فرمایا کہ اقامتِ دین سے مراد اخلاص ہے اور "لَا تَتَفَرَّقُوْا" کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں عداوت نہ کرو، بھائی بھائی بن

[1] آل عمران: ۱۰۳ [2] الشوریٰ: ۱۳

گر رہو۔

اس وصیت کے بعد قرآن میں بنی اسرائیل کے تفرق کا بیان کر کے اہل اسلام کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ان کے طریقہ پر نہ جائیں۔ اس بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا تَفَرَّقُوْا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾[1]

ترجمہ: ”ان لوگوں نے اپنے پاس علم آجانے کے بعد ہی اختلاف کیا (اور وہ بھی) باہمی ضد (وبحث) سے۔“

حضرت ابوالعالیہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ لفظ ”بَغْيًا بَيْنَهُمْ“ میں اشارہ ہے کہ ایسے اختلاف کا عداوت اور جنگ وجدل تک پہنچنا بھی دین کے سبب سے نہیں ہوتا بلکہ ”بَغْيًا عَلَى الدُّنْيَا وَمُلْكِهَا وَزُخْرُفِهَا وَزِيْنَتِهَا وَسُلْطَانِهَا۔“[2]

یعنی یہ عداوت جب بھی غور کرو تو اس کا سبب دنیا...... حب مال...... یا حب جاہ ہوتا ہے، جس کو نفس وشیطان خدمت دین کا عنوان دے کر مزین کر دیتا ہے۔ ورنہ اس طرح کے مسائل میں اختلاف رائے کی حد وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ مثبت طور پر اپنے عمل کے لیے ایک جانب کو اصلح سمجھ کر اختیار کر لیں۔ اور اس سے مختلف مسلک رکھنے والوں سے لڑتے نہ پھریں۔ جس طرح دنیا میں انسان جب بیمار ہوتا ہے اپنے معالجہ کے لیے کسی ایک حکیم یا ڈاکٹر کا انتخاب کر کے صرف اسی کے قول پر بھروسہ کرتا ہے اور اسی کی ہدایات پر عمل کرتا ہے، مگر دوسرے ڈاکٹروں کو برا بھلا کہتا نہیں پھرتا۔ ایک مقدمہ آپ کسی ایک شخص کو وکیل بنا کر اس کے سپرد کر دیتے ہیں مگر دوسرے وکلاء سے نہیں لڑتے پھرتے، مجتہدانہ مختلف فیہ مسائل میں بھی ٹھیک یہی آپ کا طرز عمل ہونا چاہیے۔

[1] الشوریٰ: ۱۴ [2] جامع العلم: ۲/ ۸۸

امت کی پریشانی کا علاج

حضرت اقدس مولانا محمد یوسف بنوری نَوَّرَ اللّٰهُ مَرْقَدَهٗ کا ماہنامہ ”بینات“ کراچی کے لیے تحریر کردہ ایک فکر انگیز اداریہ ہے، جو آپ نے پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد تحریر فرمایا تھا۔

چناں چہ آپ فرماتے ہیں:

تمام امت اسلامیہ کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے، ہر جگہ اضطراب ہے۔ نہ حکمرانوں کو چین نصیب ہے، نہ محکوم آرام کی نیند سو سکتے ہیں، مصیبت یہ کہ کوئی بھی صحیح علاج نہیں سوچ رہا ہے، جو زہر ہے اس کو تریاق سمجھ لیا گیا ہے، جو تباہی و بربادی کا راستہ ہے اس کو نجات کا راستہ سمجھا جا رہا ہے، جو تدبیریں شقاوت کو دعوت دے رہی ہیں، ان ہی کو ذریعہ سعادت خیال کیا جا رہا ہے، ماسکو ہو یا واشنگٹن، تمام جہنم کے راستے ہیں، کوئی بھی سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ کا راستہ جو سراسر نجات و سعادت کا اعلیٰ ترین وسیلہ ہے، نہیں سوچ رہا ہے، جو صراط مستقیم جنت کو جا رہا ہے، اس سے بھٹک گئے ہیں، نہ معلوم کہ ارباب عقول کی عقلیں کہاں چلی گئیں؟ ارباب فکر آخرت سے کیوں عاری ہو گئے، آخر تاریخ کی یہ عبرتیں کس کے لیے ہیں؟ حقائق سے کیوں چشم پوشی کی جا رہی ہے؟ خاکم بدہن ایسا تو نہیں کہ تکوینی طور پر امت پر تباہی و بربادی کی مہر لگ چکی ہے؟ اس امت کا زوال مقرر ہو چکا ہے؟ عروج کا دور ختم ہو گیا ہے؟ حق تعالیٰ نے تو اسلام اور صرف اسلام کی نعمت کو آخری نعمت فرمایا تھا اور یہ صاف اور صریح اعلان ہو چکا تھا کہ اس کے سوا کوئی رشتہ و رابطہ کوئی دین و مسلک قابل قبول نہ ہوگا، نجات اسی دین اور اسلام میں ہے اور اسی دینی رابطہ میں فلاح وسعادت ہے، باقی تمام راستے شقاوت وہلاکت اور تباہی و بربادی کے راستے ہیں، اور یہ ابدی اعلان آج بھی حق تعالیٰ کے آخری پیغام میں کیا

جا رہا ہے کہ:

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ﴾[1]

ترجمہ: "اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو چاہے تو اسے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔"

اور سورۂ عصر میں تاریخ عالم کو گواہ بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ جن لوگوں میں ایمان باللہ، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، یہ چار باتیں نہیں ہوں گی، ان کا انجام تباہی و بربادی ہے۔ کیا اسی اسلام سے روگردانی کی اتنی بڑی سزا پاکستان اور پاکستانیوں کو نہیں ملی کہ چند لمحوں میں بارہ کروڑ آبادی کا عظیم ملک پانچ کروڑ آبادی کا چھوٹا سا ملک بن گیا؟

کیا بنگلہ دیش کے قضیے سے دونوں طرف کے مسلمان عذاب الٰہی میں مبتلا نہیں ہوئے؟ اسلامی روابط، اتحاد و اخوت ختم کر کے کیا دولت کمائی؟ آخرت سے پہلے دنیا کی رسوائی اور خسران و تباہی بھی دیکھ لی۔

افسوس! کہ وہی غیر اسلامی سبق پھر یہاں مغربی پاکستان میں دہرایا جا رہا ہے، وہی سندھی ......، پنجابی ......، بلوچ اور پٹھان ...... کے ملعون نعرے یہاں بھی ابھر رہے ہیں، ارحم الراحمین کے غضب کو دعوت دینے والی صورتیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ طاغوتی طاقتیں جن کا ڈورا باہر کے شیاطین کے ہاتھ میں ہے، اسلام اور مسلمانوں پر ایک اور کاری ضرب لگانے کی فکر میں لگ گئی ہیں۔ "فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ"

گزشتہ چند سالوں کے تجربات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جو طریقہ علاج کا سوچا گیا اور عملاً اس کو اختیار بھی کیا گیا، وہ صحیح قدم نہ تھا، اخبارات بھی جاری کیے گئے ......، جلوس بھی نکالے گئے ......، مظاہرے بھی کیے گئے ......، جھنڈے بھی

[1] آل عمران: ۸۵

لہرائے گئے ......، نعرے بھی لگائے گئے ......، الیکشن بھی لڑے گئے ......، کچھ ترمیمیں بھی پاس ہوئیں ......، لیکن یہ سب نقار خانے میں طوطی کی آوازیں بن کر رہ گئے۔ قوم سے چندے کیے گئے کروڑوں روپے خرچ بھی کیے، لیکن قوم جہاں تھی وہیں رہی، ہزاروں میل پیچھے ہٹ گئی، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تدابیر اختیار نہ کی جاتیں اور یہ بالکل عبث اور ضیاع وقت ہے، لیکن اتنا تو واضح ہو گیا کہ یہ پورا علاج نہیں اور یہ کچھ مفید ثابت نہ ہوا، مرض کا ازالہ اس سے نہیں ہو سکا۔

بہر حال ان سیاسی تدبیروں کے ساتھ اب دینی سطح پر کام کی ضرورت ہے، اگر آپ کا شوق اس بات کا متقاضی ہے کہ سیاسی تدبیریں اختیار کی جائیں اور سیاسی ذرائع بھی استعمال ہوں اور آپ کی طبیعت اور ذوق ان وسائل کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں، اگرچہ ہماری دیانتدارانہ رائے یہی ہے کہ ان کی حقیقت ایک سراب سے زیادہ نہیں اور "کوہ کندن، کاہ برآوردن"[1] والی مثال صادق آتی ہے، وقتی اور سطحی فوائد ہیں لیکن تاہم اگر آپ کا ذوق تسلیم نہیں کرتا تو ترک نہ کیجیے لیکن اصلی اور حقیقی و بنیادی کام اصلاح معاشرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس مخلوق کو بھولا ہوا سبق یاد دلائیں اور انبیاء کرام اور مصلحین امت کے طریقوں پر آسمانی ہدایات کی روشنی میں اصلاح کا بیڑہ اٹھائیں اور اپنی پوری طاقت انفرادی و اجتماعی اصلاح امت پر خرچ کریں، گھر گھر بستی بستی پہنچ کر "دعوت الی الخیر" کا ربانی پیغام پہنچائیں، اجتماعات ہوں تو اسی مقصد کے لیے، جلسے اگر ہوں تو اسی بنیاد پر، رسائل ہوں تو اسی کام کے لیے اخبارات کے صفحات ہوں تو اسی مقصد کے لیے اور کاش! اگر حکومت کے وسائل حاصل ہوں اور ریڈیو وغیرہ کی پوری طاقت بھی اس پر خرچ ہو تو چند مہینوں میں یہ فضا تبدیل ہو سکتی ہے۔

بہر حال اس وقت یہ آرزو تو قبل از وقت ہے کہ حکومت کی سطح پر جو وسائل نشر و

[1] یعنی ایسا کام کرنا جس میں مشقت زیادہ اور فائدہ کم ہو۔

اشاعت ہیں، وہ ایمان کی روح سے آراستہ ہوں اور ایمانی حرارت اور نور ان میں جلوہ گر ہو، ان کے ذریعہ اصلاح ہو، اب ضرورت اس کی ہے کہ آج کی نسل خدا ترس بن جائے، ان کی اصلاح ہو، آج کی یہی نسل کل حکمران ہو، تو تمام وسائل نشر و اشاعت اور خبر رساں ایجنسیاں سب کے سب اشاعتِ اسلام و تزکیہ اخلاق کے سرچشمے ہوں، پوری قوم نہ سہی اکثریت یا قابلِ اعتبار اہم اقلیت کی ہی اصلاح ہو جائے، تو کل کرسی صدارت یا کرسی وزارت، یا منصبِ سفارت ہو یا وسائل نشر و اشاعت ہوں، یہ سب کے سب تعلیم اسلام و تعلیم دین کے مراکز بن سکیں گے۔

خلاصہ یہ کہ اس وقت دین کی اہم ترین پکار یہی ہے کہ اللہ کے لیے اٹھو..... اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ..... اور سفینۂ حیات کو ساحلِ مراد تک پہنچانے کی پوری جد و جہد کرو۔

خدارا یہ جو آگ لگ چکی ہے جلد سے جلد بجھانے کی کوشش کرو، ورنہ تمام قوم و ملک اس کے شعلوں کی نذر ہو جائے گا۔ افسوس و تعجب سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر کسی کے گھر میں آگ لگ جاتی ہے تو وہ اسے فوراً بجھانے کی تدبیر میں لگ جاتا ہے، کوئی کوتاہی نہیں کرتا، لیکن دینِ اسلام کے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے، صدیوں کا جمع کیا ہوا ذخیرہ نذرِ آتش ہونے کے قریب ہے لیکن ہم اطمینان سے بیٹھ کر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے ملک میں جو بحران عرصہ سے چل رہا ہے، وہ مشرقی پاکستان کو موت کی نیند سلا دینے کے بعد بھی تھمنے نہیں پایا بلکہ اس کا سارا زور سمٹ کر اب نیم جان مغربی پاکستان پر لگا ہوا ہے۔ مریض کے حالات اتنے غیر یقینی اور مستقبل اتنا بھیانک ہے کہ اسے ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں، ہم علماء سے، طلباء سے، حکام سے، صحافیوں سے، وکلاء سے، کسانوں سے، مزدوروں سے، اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ سے خدا کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ اگر اس ملک کی اور خود اپنی زندگی کچھ دن اور مطلوب ہے،

اگر ہمارے دل پتھر، ہمارے ذہن مفلوج، ہمارے دماغ ماؤف اور ہمارے اعضاء شل نہیں ہو گئے ہیں۔

اور ہمارے بدن میں زندگی کی کوئی رمق اور ہماری آنکھ میں عبرت و غیرت کا کچھ پانی ابھی موجود ہے تو سارے دھندے چھوڑ کر، سارے کام ملتوی کر کے اور سارے مشاغل سے ہٹ کر چند دن کے لیے دعوت الی اللہ کا کام کرنا ہوگا، اس کے لیے سب کو نکلنا ہوگا، سب کے پاس جانا ہوگا، در بدر کی ٹھوکریں کھانی ہوں گی۔

اگر ملک کا معتد بہ حصہ اس فرض کو انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا تو حق تعالیٰ شانہ اس ملک کی اور اس کے ساتھ ہماری بقاء کا فیصلہ فرما دیں گے اور پھر بھارت اور روس بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور اگر ہم بدستور اپنی اپنی لے میں مست اور اپنے اپنے کام میں مگن رہے اور دعوت الی اللہ کے کام کے لیے اپنے اوقات، اپنے مال اور اپنی جان کو خرچ کرنے کی ہمت نہ کی تو خدا ہی جانتا ہے کہ اس فرض ناشناسی کی پاداش کن کن شکلوں میں ظاہر ہوگی، ہماری تدبیریں، ہماری حکومتیں، ہماری اسمبلیاں، ہمارے وسائل خدا کے فیصلے کو نہیں بدل سکتے۔

میٹنگیں بلانے..... عمائدین کو جمع کرنے..... اتحاد کے نعرے لگانے..... اور مشترکہ لائحہ عمل تیار کرنے..... پر بہت وقت ضائع کیا جا چکا ہے۔ اب وقت ہمیں ایک لمحہ کی مہلت دینے کو تیار نہیں۔ نہ دعوت و اصلاح کے خاکے مرتب کرنے پر مزید ضائع وقت کی ضرورت ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ والی تبلیغی تحریک ہی بس امید کی آخری کرن ہے، اپنے ذوق، اپنے تقاضوں اور اپنے اختلافات کو ایک طرف رکھ دیجیے، ملت کی شکستہ کشتی کے ڈوبتے ہوئے اس تختہ کو، جس پر سات کروڑ نفوس سوار ہیں، اگر بچانا ہے تو بس یہی ایک تدبیر ہے کہ ہم سب اخلاص کے ساتھ اس کام کو کریں اور سیکھیں، ہم ایک بار علماء اور دانشور طبقہ سے عرض کریں گے کہ خدارا مقتضائے حال کو سمجھو۔

ہمارے موجودہ مشاغل ہمارے پاؤں کی زنجیر بن جائیں گے۔ اگر محمد ﷺ کی امت کے لیے دعوت و اصلاح کی محنت والا کام نہ سنبھالا گیا اور ہماری بے اتفاقی، لاپرواہی اور بے اعتنائی کی یہی کیفیت رہی جو اب تک ہے تو وقت بڑا ہی شدید اور بھیانک ہوگا۔ مشرق (یعنی سابقہ مشرقی پاکستان) والوں کو اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور ہمیں اسی سے عبرت پکڑنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں اور ملت بیضاء کی حفاظت کی توفیق امت کو نصیب فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، ہمارے گناہوں کو معاف فرمائیں اور پوری امت کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین) [1]

افتراقِ امت کے اسباب

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مسلمانوں کے طبقات اہل دین و اصلاح اور دینی خدمات انجام دینے والوں کے مابین جو تفرق آج پایا جاتا ہے وہ عموماً انہیں حقائق کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔

اب میں ان اسباب و عوامل کو پیش کرتا ہوں جو میرے غور و فکر کی حد تک مسلمانوں میں باہمی آویزش اور شقاق و جدال کا سبب بنے ہوئے ہیں اور افسوس اس کا ہے کہ اس کو خدمت دین سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔

غلو: میرے نزدیک اس جنگ و جدال کا ایک بہت بڑا سبب فروعی اور اجتہادی مسائل میں تحزب و تعصب اور اپنی اختیار کردہ راہِ عمل کے خلاف کو عملاً باطل اور گناہ قرار دینا اور اس پر عمل کرنے والوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا ہے جو اہل باطل اور گمراہوں کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔ اس پر تمام امت کا اتفاق بھی ہے اور عقلاً اس کے سوا کوئی صورت بھی دین پر عمل کرنے کی نہیں ہے کہ جو لوگ خود درجہ اجتہاد کا نہیں

[1] از رسالہ ختم نبوت ۱۸ تا ۲۴ جولائی ۲۰۰۲ء

رکھتے وہ اجتہادی مسائل میں کسی امام مجتہد کی اتباع کریں۔ اور جن لوگوں نے اپنے نفس کو آزادی اور ہوا پرستی سے روکنے کے لیے دینی مصلحت سمجھ کر کسی ایک امام مجتہد کا اتباع اختیار کر لیا ہے وہ قدرتی طور پر ایک جماعت بن جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے مجتہد کا اتباع کرنے والے ایک دوسری جماعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر جماعت بندی مثبت انداز میں صرف اجتہادی مسائل کی حد تک اپنی تعلیمی اور عملی آسانیوں کے لیے ہو تو نہ صرف اس میں کوئی مضائقہ ہے نہ کوئی تفرق اور نہ دین کے لیے اس میں مضرت۔

(۱) مضرت رساں اور تباہ کن ایک منفی پہلو تو اس کا یہ ہے کہ اپنی رائے اور اختیار سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ جنگ و جدال ...... اور دوسرے ان فروعی مسائل کی بحثوں میں غلو ...... کہ سارا علم و تحقیق کا زور ...... اور بحث و تمحیص کی طاقت ...... اور عمر کے اوقات عزیز ...... ان ہی بحثوں کی نذر ہو جائیں۔ اگرچہ ایمان و اسلام کے بنیادی اور قطعی اجماعی مسائل مجروح ہو رہے ہوں، کفر و الحاد دنیا میں پھیل رہا ہو۔ سب سے صرفِ نظر کر کے ہمارا علمی مشغلہ یہی فروعی بحثیں بنی رہیں، جن کے متعلق مذکورۃ الصدر تفصیل میں ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان میں ہزار تحقیقات کے بعد بھی بات اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ یہ راجح ہے اور اس کے خلاف مرجوح اور اس راجح مرجوح کا بھی یقینی فیصلہ نہ دنیا میں ہو سکتا ہے نہ برزخ میں ان کا سوال ہوگا نہ محشر میں اس راجح مرجوح کا اعلان ہوگا۔

(۲) اسی طرح نہ ان مسائل میں اختلاف رکھنے والوں پر نکیر کرنا درست ہے نہ ان کو خطا کار و مجرم ٹھہرانا صحیح ہے۔ اس وقت ہماری قوم کا برگزیدہ ترین طبقہ علماء، فقہاء کا مخصوصاً جو تعلیم و تصنیف میں مشغول ہیں، ان کی شبانہ روز مشغولیت کا جائزہ لیا جائے تو ان حضرات کی علمی تحقیقات اور سعی و عمل کی ساری توانائی ان ہی فروعی بحثوں میں محدود نظر آئے گی۔

لمحۂ فکریہ

ان میں بعض حضرات کا غلو تو یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ اپنے سے مختلف رائے رکھنے والوں کی نماز کو فاسد اور ان کو تارک قرآن سمجھ کر اپنے مخصوص مسلک کی اس طرح دعوت دیتے ہیں، جیسے کسی منکرِ اسلام کو اسلام کی دعوت دی جارہی ہو اور اسی کو دین کی سب سے بڑی خدمت سمجھے ہوئے ہیں۔

معلوم نہیں کہ یہ حضرات اسلام کی بنیادوں پر چاروں طرف سے حملہ آور طوفانوں سے باخبر نہیں یا جان بوجھ کر اغماض کرتے ہیں۔ اس وقت جب کہ ایک طرف تو کھلے ہوئے کفر، عیسائیت اور کمیونزم نے پورے اسلامی ممالک اور اسلامی حلقوں پر گھیرا ڈالا ہوا ہے۔ اور یہ دونوں کفر طوفانی رفتار کے ساتھ اسلامی ممالک میں پھیل رہے ہیں۔ صرف پاکستان میں ہزاروں کی تعداد ہر سال مرتد ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف کفر نفاق اور الحاد خود اسلام کا نام لینے والوں میں کہیں قادیانیت اور مرزائیت کے لباس میں، کہیں پرویزیت اور انکار حدیث کے عنوان سے کہیں مغرب سے لائی ہوئی اباحیت اور تمام محرمات شرعیہ کو حلال کرنے کے طریقوں سے ہمارے ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ اور یہ الحاد، کفر و نفاق پہلے کفر سے اس لیے زیادہ خطرناک ہے کہ اسلام اور قرآن کے عنوان کے ساتھ آتا ہے، جس کے دام میں سیدھے سادھے جاہل عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے، ہمارے نو تعلیم یافتہ نوجوان بہ کثرت اس لیے آجاتے ہیں کہ نئی تعلیم اور نئی معاشرت نے ان کو دینی تعلیم اور اسلامی اصول سے اتنا دور پھینک دیا ہے کہ وہ مادی علوم و فنون کے ماہر کہلانے کے باوجود مذہب اور دین کی ابتدائی معلومات سے بھی محروم کر دیے گئے ہیں۔ اور کھلے چھپے کفر کی ان ساری اقسام سے بھی اگر کچھ خوش نصیب مسلمان بچ جائیں تو فحاشی، عریانی، ننگے ناچ، رقص و سرور کی محفلوں اور گھر گھر ریڈیو کے ذریعہ فلمی گانوں اور سینماؤں کی

زہریلی فضاؤں سے کون ہے جو بچ نکلے؟

اسلام اور قرآن کا نام لینے والے مسلمان آج سارے جرائم اور بداخلاقیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، ہمارے بازار جھوٹ، فریب، سود، قمار سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور ان کے چلانے والے کوئی یہودی نہیں، ہندو نہیں، اسلام کے نام لیوا ہیں۔ ہمارے سرکاری محکمے رشوت، ظلم و جور، کام چوری، بے رحمی اور سخت دل کی تربیت گاہیں بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کے کارفرما بھی نہ انگریز ہیں نہ ہندو، محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام لینے والے۔ روزِ آخر پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والے ہیں۔ ہمارے عوام دین سے کورے، جہالتوں میں ڈوبے ہوئے دین کے فرائض و واجبات سے بے [illegible] مشرکانہ رسموں اور کھیل تماشوں کے دلدادہ ہیں۔

ان حالات میں کیا ہم پر یہ واجب نہیں کہ ہم غور و فکر سے کام لیں اور سوچیں کہ اس وقت ہمارے آقا رسول کریم ﷺ کا مطالبہ اور توقع اہل علم سے کیا ہوگی؟ اور اگر محشر میں آپ نے ہم سے سوال کر لیا کہ میرے دین اور شریعت پر اس طرح کے حملے ہو رہے تھے۔ میری امت اس بدحالی میں مبتلا تھی۔ تم وراثتِ نبوت کے دعویدار کہاں تھے؟ تم نے وراثت کا کیا حق ادا کیا؟

کیا ہمارا یہ جواب کافی ہو جائے گا کہ ہم نے رفع یدین کے مسئلے پر ایک کتاب لکھی تھی، یا کچھ طلبا کو شرح جامی کی بحث حاصل و محصول خوب سمجھائی تھی، یا حدیث میں آنے والے اجتہادی مسائل پر بڑی دل چسپ تقریریں کی تھیں یا صحافیانہ زورِ قلم اور تحریر و بازی کے ذریعے دوسرے علماء و فضلاء کو خوب ذلیل کیا تھا؟

اصولِ اسلام کی حفاظت کی فکر کریں

فروعی اور اجتہادی مسائل میں بحث و تحقیق کوئی مذموم چیز نہیں۔ اگر وہ اپنی حد کے اندر اخلاص سے اللہ کے لیے ہوتی۔ لیکن جہاں ہم اسلام و ایمان کی بنیادیں

متزلزل کردینے والے فتنوں کی خبر سنتے ہیں۔ اللہ و رسول کے احکام کی خلاف ورزی
عمل کی استہزاء و تمسخر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں۔ مگر ہمارے
کان پر جوں تک نہیں رینگتی تو اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ فروعی بحثیں بھی
اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے کررہے ہیں۔

اگر ان میں کچھ للّہیت اور اخلاص ہوتا تو ہم ان حالات کے تحت اسلام اور دین
کے تقاضوں کو پہچانتے اور فروع سے زیادہ اصول اسلام کی حفاظت میں لگے
ہوتے۔ ہم نے تو گویا علمی اور دینی خدمات کو انہیں فروعی مباحث میں منحصر سمجھ
رکھا ہے اور سعی و عمل کی پوری توانائی اسی پر لگا رکھی ہے۔ اسلام کے اصولی اور بنیادی
مسائل اور ایمان کی سرحدوں کو دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی چھوڑ دیا ہے۔ لڑنا کس
محاذ پر چاہیے تھا اور ہم نے طاقت کس محاذ پر لگادی۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ
رٰجِعُوْنَ" یہ تو تحزب و تعصب کے غلو کا نتیجہ ہے۔

اسی کے ساتھ دوسری بھاری غلطی ان اجتہادی مسائل میں اختلاف کے حدود کو
توڑ کر تفرق و تشتت اور جنگ و جدل اور ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر و استہزاء تک پہنچ
جاتا ہے، جو کسی شریعت و ملت میں روا نہیں، اور افسوس ہے کہ یہ سب کچھ خدمت علم
دین کے نام پر کیا جاتا ہے اور جب یہ معاملہ ان علماء کے متبعین عوام تک پہنچتا ہے تو
وہ اس لڑائی کو ایک جہاد قرار دے کر لڑتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم کا جہاد خود
اپنے ہی دست و بازو سے ہونے لگے اس کو کسی غنیم کی مدافعت اور کفر و الحاد کے
ساتھ جنگ کی فرصت کہاں۔[1]

لہٰذا ائمہ حضرات آج سے یہ فیصلہ فرمالیں کہ فروعی مسائل میں غلو نہیں کریں گے
اور فقیہ اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کی اس تحریر کو پڑھ کر دو
رکعت پڑھ کر گڑگڑا کر دعا مانگیے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفس و شیطان کے شرور سے

[1] وحدت امت: ۲۹، ۳۰

حفاظت فرماکر فروعی مسائل میں حدود سے زیادہ الجھنے سے حفاظت فرمائے۔

ہر دینی کام کرنے والے کو اپنا شریکِ کار سمجھیں

ہماری دینی جماعتیں جو تعلیم دین یا ارشاد و تلقین یا دعوت و تبلیغ اور اصلاح
معاشرہ کے لیے قائم ہیں اور اپنی اپنی جگہ مفید خدمات بھی انجام دے رہی ہیں ان
میں بہت سے علماء و صلحاء اور مخلصین کام کررہے ہیں اگر یہی متحد ہوکر تقسیم کار کے
ذریعہ دین میں پیدا ہونے والے تمام رخنوں کے انسداد کی فکر اور امکانی حد تک باہم
تعاون کرنے لگیں اور اقامت دین کے مشترک مقصد کی خاطر ہر جماعت دوسری کو
اپنا دست و بازو سمجھے اور دوسروں کے کام کی ایسی ہی قدر کریں جیسی اپنے کام کی
کرتے ہیں تو یہ مختلف جماعتیں اپنے نظام میں الگ رہتے ہوئے بھی اسلام کی ایک
عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں اور تقسیم عمل کے ذریعہ اکثر دینی ضرورتوں کو پورا کر
سکتی ہیں۔

مگر عموماً یہ ہورہا ہے کہ ہر جماعت نے جو اپنے سعی و عمل کا ایک دائرہ نظام عمل
بنالیا ہے۔ عملی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدمتِ دین کو اسی میں منحصر سمجھ رہے
ہیں۔ گو زبان سے نہ کہیں دوسری جماعتوں سے اگر جنگ و جدل بھی نہیں تو بے
قدری ضرور دیکھی جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ان جماعتوں میں بھی ایک قسم کا تشتت
پایا جاتا ہے۔

غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقصد سب کا اگرچہ دین کی
اشاعت، حفاظت اور مسلمانوں کی علمی، عملی اخلاقی اصلاح ہی ہے لیکن اس مقصد کے
حاصل کرنے کے لیے کسی نے ایک دارالعلوم قائم کرکے تعلیم دین کی اہم خدمات
انجام دیں۔ کسی نے ایک تبلیغی جماعت بناکر رشد و ہدایت کا فرض ادا کیا۔ کسی نے
کوئی انجمن بناکر احکام دین کی نشر و اشاعت کا تحریری انتظام کیا۔ کسی نے فتویٰ کے

ذریعہ خلقِ خدا کو ضروری احکام بتانے کے لیے دارالافتاء قائم کیا۔ کسی نے اسلام کے مخالف ملحدانہ تلبیسات کے جواب کے لیے تصنیفات کا یا ہفتہ واری، ماہواری رسائل و اخبار کا سلسلہ جاری کیا۔ یہ سب کام اگرچہ صورت میں مختلف ہیں۔ مگر در حقیقت ایک ہی مقصد کے اجزاء ہیں۔ ان مختلف محاذوں پر جو مختلف جماعتیں کام کریں گی یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کا نظامِ عمل مختلف ہوگا۔ اس لیے ہر جماعت نے بجا طور پر سہولت کے لیے اپنے اپنے مزاج و مذاق اور ماحول کے مطابق ایک نظامِ عمل اور اس کے اصول و قواعد بنا رکھے ہیں۔ اور ہر جماعت ان کی پابند ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو منصوص اور قطعی اور قرآن و سنت سے ثابت ہے اس سے انحراف کرنا قرآن و سنت کی حدود سے نکلنا ہے۔ لیکن یہ اپنا بنایا ہوا نظامِ عمل اور اس کے تنظیمی اصول و قواعد نہ منصوص ہیں، نہ ان کا اتباع از روئے شرع ہر ایک کے لیے ضروری ہے۔ بل کہ جماعت کے ذمہ داروں نے سہولتِ عمل کے لیے ان کو اختیار کر لیا ہے۔ ان میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں وہ خود بھی کرتے رہتے ہیں۔ اور حالات اور ماحول بدلنے پر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظامِ عمل بنا لینا بھی کسی کے نزدیک ناجائز یا مکروہ نہیں ہوتا۔ مگر اس میں عملی غلو تقریباً ہر جماعت میں یہ پایا جاتا ہے کہ اپنے مجوزہ نظامِ عمل کو مقصدِ منصوص کا درجہ دے دیا گیا۔ جو شخص اس نظامِ عمل میں شریک نہیں اگرچہ مقصد کا کتنا ہی عظیم کام کر رہا ہو اس کو اپنا بھائی اپنا شریکِ کار نہیں سمجھا جاتا۔ اور اگر کوئی شخص اس نظامِ عمل میں شریک تھا پھر کسی وجہ سے اس میں شریک نہ رہا تو عملاً اسے اصل مقصد اور دین سے منحرف سمجھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو دین سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

اگرچہ وہ اصل مقصد یعنی اقامتِ دین کی خدمت پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگے اس غلو کے نتیجہ میں وہی تحزب و تعصب اور گروہ بندی کی آفتیں اچھے خاصے دین دار

لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں، جو جاہلی عصبیتوں میں مبتلا لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔[1]

ذمہ دار علماء سے حضرت مفتی اعظم رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ کی دردمندانہ گزارش

ذیل میں حضرت مفتی اعظم رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ کی ایک دردمندانہ گزارش درج کی جارہی ہے۔

ائمہ کرام سے عاجزانہ گزارش ہے کہ اس مضمون کو پڑھنے سے پہلے دو رکعت نفل پڑھ کر خوب گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ اے اللہ! حضرت مفتی اعظم رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ کے اس مضمون کو ہمارے دلوں کی گہرائی میں اتار دے اور عملی طور سے ہمیں عوام میں اس کو پھیلانے کا ذریعہ بنا دے اور ہماری مسجد کے آس پاس تمام گھروں میں پورا کا پورا دین زندہ فرما دے، فرمایا:

”سیاسی اور اقتصادی میدان اور اعزاز و منصب کی دوڑ میں بے اعتدالیوں کی روک تھام تو سردست ہمارے بس میں نہیں، لیکن خود دین و مذہب کے لیے کام کرنے والی جماعتوں کے نظریاتی اور نظامی اختلافات اشتراکِ مقصد کی خاطر معتدل کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ہم اسلام کے بنیادی اصول کی حفاظت اور الحاد بے دینی کے سیلاب کی مدافعت کے اہم مقصد کو صحیح معنوں میں مقصدِ اصلی سمجھ لیں تو یہ وہ نقطہ ہے کہ جس پر مسلمانوں کے سارے فرقے ساری جماعتیں جمع ہو کر کام کر سکتی ہیں اور اسی وقت اس سیلاب کے مقابلہ میں کوئی مؤثر انجام پا سکتا ہے۔

لیکن حالات کا جائزہ یہ بتاتا ہے کہ یہ مقصدِ اصلی ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اس لیے ہماری ساری توانائی اور علم و تحقیق کا زور آپس کے اختلافی مسائل پر صرف ہوتا ہے۔ وہی ہمارے وعظوں ...... جلسوں ...... رسالوں ...... اور

[1] وحدتِ امت، ص ۳۶، ۳۴

اخباروں کا موضوع بحث بنتے ہیں۔ ہمارے اس عمل سے عوام یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دین اسلام صرف ان دو چیزوں کا نام ہے اور جس رخ کو انہوں نے اختیار کر لیا ہے اس کے خلاف کو گمراہی اور اسلام دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ہماری وہ طاقت جو کفر والحاد اور بے دینی اور معاشرہ میں بڑھتی ہوئی بے حیائی کے مقابلہ پر خرچ ہوتی، آپس کی جنگ وجدل میں خرچ ہونے لگتی ہے۔

اسلام وایمان ہمیں جس محاذ پر لڑنے اور قربانی دینے کے لیے پکارتا ہے وہ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑا نظر آتا ہے۔ ہمارا معاشرہ سماجی برائیوں سے پر ہے۔ اعمال واخلاق برباد ہیں۔ معاملات ومعاہدات میں فریب ہے۔ سود، قمار بازی، شراب، خنزیر، بے حیائی، اور بدکاری ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر چھا گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے جائز وارث اور ملک وملت کے نگہبانوں کو آج بھی اپنے سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں پر جتنا غصہ آتا ہے، اس سے آدھا بھی ان خدا کے باغیوں پر کیوں نہیں آتا؟ اور آپس کے نظریاتی اختلاف کے وقت جس جوش ایمانی کا اظہار ہوتا ہے، وہ ایمان کے اس اہم محاذ پر کیوں ظاہر نہیں ہوتا؟

ہمارا زور زبان اور زور قلم جس شان سے اپنے اختلافی مسائل میں جہاد کرتا ہے اس کا کوئی حصہ سرحدات اور اصول ایمانی پر ہونے والی یلغار کے مقابلہ میں کیوں صرف نہیں ہوتا؟ مسلمانوں کو مرتد بنانے والی کوششوں کے بالمقابل ہم سب بنیان مرصوص کیوں نہیں بن جاتے؟

آخر ہم اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ بعثت انبیاء علیہم السلام اور نزول قرآن کا وہ مقصد عظیم جس نے دنیا میں انقلاب برپا کیا۔ اور جس نے غیروں کو اپنا بنایا جس نے اولاد آدم کو بہیمیت سے نکال کر انسانیت سے سرفراز کیا اور جس نے ساری دنیا کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا۔ کیا وہ صرف یہی مسائل تھے، جن میں ہم الجھ کر رہ گئے

ہیں؟ اور کیا دوسروں کو ہدایت پر لانے کا طریق اور پیغمبرانہ دعوت کا یہی عنوان تھا جو آج ہم نے اختیار کر رکھا ہے؟

﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ [1]

ترجمہ: ''کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ایمان والوں کے دل اللہ کے ذکر اور اس کے نازل کیے ہوئے حق کی طرف جھک جائیں۔''

آخر وہ کون سا وقت آئے گا، جب ہم اپنے نظریات اور نزاعی مسائل سے ذرا آگے بڑھ کر اصول اسلام کی حفاظت اور بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کو اپنا اصلی فرض سمجھیں گے۔ ملک میں عیسائیت اور کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی خبر لیں گے، قادیانیت کے، انکار حدیث اور تحریف دین کے لیے قائم شدہ اداروں کا پیغمبرانہ دعوت واصلاح کے ذریعے مقابلہ کریں۔

اور اگر ہم نے یہ نہ کیا اور محشر میں ہمارے ہادی اور ملجا رسول کریم ﷺ نے ہم سے یہ سوال فرما لیا کہ میری شریعت اور میرے دین پر یہ حملے ہو رہے تھے۔ اسلام کے نام پر کفر پھیلایا جا رہا تھا۔ میری امت کو میرے دشمنوں کی امت بنانے کی کوشش مسلسل جاری تھی۔ قرآن وسنت کی کھلے طور پر تحریف کی جا رہی تھی۔ خدا اور رسول کی نافرمانی اعلانیہ کی جا رہی تھی۔ تم مدعیان علم کہاں تھے؟ تم نے اس کے مقابلہ پر کتنی محنت اور قربانی پیش کی؟ کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستے پر لگایا۔ تو آج ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ ہمارا کیا جواب ہوگا؟

راہ عمل

اس لیے ملت کا درد اور اسلام وایمان کے اصول ومقاصد پر نظر رکھنے والے

[1] الحدید: ۱۶

حضرات علماء سے میری (یعنی حضرت مفتی اعظم پاکستان رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کی) دردمندانہ گزارش یہ ہے کہ مقصد کی اہمیت اور نزاکت کو سامنے رکھ کر سب سے پہلے اپنے دلوں میں اس کا عہد کریں کہ اپنی علمی و عملی صلاحیت اور زبان و قلم کے زور کو زیادہ سے زیادہ اس محاذ پر لگائیں، جس کی حفاظت کے لیے قرآن و حدیث آپ کو دے رہے ہیں۔

❶ علماء کرام اس بات کا عہد بھی کیجیے اور فیصلہ بھی کہ اس کام کے لیے اپنے موجودہ مشاغل میں سے زیادہ سے زیادہ وقت نکالیں گے۔

❷ دوسرے یہ کہ آپس کے نظریاتی اور اجتہادی اختلاف کو صرف اپنے اپنے حلقۂ درس...... اور تصنیف و تالیف...... اور فتوے تک محدود رکھیں گے۔ عوامی جلسوں...... اخباروں...... اشتہاروں...... باہمی مناظروں...... اور جھگڑوں کے ذریعہ ان کو نہ اچھالیں گے۔ ان حلقوں میں بھی پیغمبرانہ اصولِ دعوت و اصلاح کے تابع دل خراش عنوان اور طعن و تشنیع، استہزاء و تمسخر اور صحافیانہ فقرہ بازی سے گریز کریں گے۔

❸ تیسرے یہ کہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی بیماریوں کی اصلاح کے لیے دل نشین عنوان اور مشفقانہ لب و لہجے کے ساتھ کام شروع کردیں گے۔

❹ چوتھے یہ کہ الحاد و بے دینی اور تحریفِ قرآن و سنت کے مقابلے کے لیے پیغمبرانہ اصولِ دعوت کے تحت حکیمانہ تدبیروں...... مشفقانہ و ناصحانہ بیانوں...... اور دل نشین دلائل کے ذریعہ...... ”مُجَادَلَۃٌ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ“ کے ساتھ اپنے زورِ زبان اور زورِ قلم کو وقف کردیں گے۔“[1]

اختلافاتِ اُمت اور ان کا حل

شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ مالٹا کی جیل میں چار سالہ قید سے رہائی کے بعد دار العلوم دیوبند میں تشریف لائے تو علماء کے ایک مجمع کے سامنے

[1] وحدت امت: ۴۴،۴۵

ایک اہم بات ارشاد فرمائی۔

جو لوگ حضرت رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ سے واقف ہیں، وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ ان کی یہ قید و بند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگِ آزادی میں اس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہ وتعالیٰ کے لیے امت کی صلاح و فلاح کے گرد گھومتی تھیں۔ مسافرت اور انتہائی بے کسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جو جملہ ان کی زبان مبارک پر آیا تھا، ان کے عزم اور مقصد کا پتہ دیتا ہے۔ فرمایا:

”الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے، جیل کی تنہائی میں ایک روز مغموم دیکھ کر بعض رفقاء نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہے تو فرمایا:

اس تکلیف کا کیا غم ہے، جو ایک دن ختم ہوجانے والی ہے؟ غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف و محنت اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہے یا نہیں۔“

مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دار العلوم میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا۔ اس وقت فرمایا کہ ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں۔

یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسّی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں۔ فرمایا کہ میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے:

ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا۔

دوسرا آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔

اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم

کے مکاتب بستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے۔ اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے۔ اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

ناصحِ امت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایامِ زندگی میں ضعف وعلالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اس کے لیے سعی بلیغ فرمائی۔ بذاتِ خود درسِ قرآن شروع کرایا۔ جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ تعالیٰ جیسے علماء بھی شریک ہوتے تھے۔ عوام بھی۔ اس ناکارہ (یعنی حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے۔ مگر اس واقعہ کے بعد حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھے۔

اختلافِ رائے کی حدود

اختلافِ رائے کچھ مذموم نہیں۔ اگر اپنی حدود کے اندر رہو۔ انسان کی فطرت میں اس کے پیدا کرنے والے نے عین حکمت کے مطابق ایک مادہ غصہ اور مدافعت کا بھی رکھا ہے اور وہ انسان کی بقاء وارتقا کے لیے ضروری ہے۔ مگر یہ مادہ دشمن کی مدافعت کے لیے رکھا ہے۔ اگر اس کا رخ دوسری طرف ہوجائے، خواہ اس لیے کہ دشمن کو پہچاننے اور متعین کرنے میں غلطی ہوگئی ہو یا کسی دوسری وجہ سے۔ بہر حال جب دشمن کا رخ بدلے گا تو یہ خود اپنی تباہی کا ذریعہ بنے گا۔ اسی لیے قرآن کریم نے مؤمن کے لیے پوری وضاحت کے ساتھ اس کا رخ متعین فرمادیا ہے:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾[1]

شیطان تمہارا دشمن ہے، اس کو ہمیشہ دشمن سمجھتے رہو، جس کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن کے غصے اور لڑائی کا مصرفِ صحیح صرف شیطان اور شیطانی طاقتیں ہیں۔ جب

[1] الفاطر: ۶

اس کی جنگ کا رخ اس طرف ہوتا ہے تو وہ جنگ قرآن کی اصطلاح میں جہاد کہلاتی ہے، جو اعظم عبادات میں سے ہے۔ حدیث میں فرمایا ہے "ذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ"[1]

یعنی اسلام میں سب سے اعلیٰ کام جہاد ہے، لیکن اگر اس جنگ کا رخ ذرا اس طرف سے ہٹا تو یہ جہاد کے بجائے فساد کہلاتی ہے، جس سے بچانے ہی کے لیے اللہ کے سارے رسول اور کتابیں آئی ہیں۔ شکل وصورت کے اعتبار سے جہاد اور فساد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ کانٹا جہاں سے یہ لائنیں بدلتی ہیں، صرف یہ ہے کہ اس کا رخ شیطان اور شیطانی طاقتوں کی طرف ہے تو جہاد ہے ورنہ فساد۔

دو قومی نظریہ، جس نے پاکستان بنوایا اسی اجمال کی عملی تفصیل تھی کہ کلمۂ اسلام ماننے والے ایک متحدہ قوم ہیں اور نہ ماننے والے دوسری قوم۔ ان کے جہاد کا رخ اس طرف ہونا چاہیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے جہاد کے فرض ہونے کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی کہ قہر وغضب اور مدافعت کا مادہ جو انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے، جب جہاد کے ذریعے اپنا صحیح مصرف پالیتا ہے تو آپس کی خانہ جنگی اور فساد سے خود بخود نجات ہوجاتی ہے۔ ورنہ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے کہ جس چھت میں بارش کا پانی نکلنے کا راستہ پرنالوں کے ذریعے نہ بنایا جائے تو پھر یہ پانی چھت کو توڑ کر اندر آتا ہے۔

صلح اور جنگ کس سے

آج اگر غور کیا جائے تو پورے عالم اسلام پر یہی مثال صادق آتی ہے۔ شیطان اور شیطانی تعلیم، کفر والحاد، خدا اور رسول سے بغاوت، فحاشی وعیاشی سے طبیعتیں مانوس ہورہی ہیں۔ ان کی نفرت دلوں سے نکل چکی ہے۔ اس پر کسی کو غصہ نہیں آتا۔

[1] ترمذی، الایمان، باب ماجاء فی حرمۃ الصلاۃ رقم: ۲۶۱۶

انسانی رواداری، اخلاق، مروّت کا سارا زور کفر والحاد اور ظلم کی حمایت میں صرف ہو رہا ہے۔ نفرت، بغاوت، عداوت کا میدان خود اپنے اعضاء وجوارح کی طرف ہے۔ آپس میں ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا لڑائی ہے۔ چھوٹا سا نقطۂ اختلاف ہو تو اس کو بڑھا کر پہاڑ بنا دیا جاتا ہے۔ اخبارات ورسائل کی غذا یہی بن کر رہ گئی ہے۔ دونوں طرف سے اپنی پوری توانائی اس طرح صرف کی جاتی ہے کہ گویا جہاد ہو رہا ہے۔ دو متحارب طاقتیں لڑ رہی ہیں۔ اور کوئی خدا کا بندہ اپنی طرف نظر کر کے نہیں دیکھتا کہ

ع ظالم جو جل رہا ہے وہ تیرا ہی گھر نہ ہو

سیاست ممالک سے لے کر خاندانی اور گھریلو معاملات تک سب میں اسی کا مظاہرہ ہے، جہاں دیکھو ”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ“ کا سبق پڑھنے والے آپس میں گتھم گتھا ہیں، قرآن حکیم نے جہاں عفو ودرگزر اور حلم وبردباری کی تلقین کی تھی، وہاں جنگ ہو رہی ہے اور جس محاذ پر جہاد کی دعوت دی تھی وہ محاذ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑا ہے۔ ”فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكَى وَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“

اسمبلیوں، کونسلوں، میونسپل بورڈوں کی نشست، حکومت کے عہدوں اور ملازمتوں کی دوڑ، صنعت وتجارت میں مقابلہ اور کمپی ٹیشن، جائدادوں اور زمینداروں کی کش مکش جہاں خالص اپنے حقوق کی جنگ ہے، جس کو چھوڑ بیٹھنا سب کے نزدیک ایثار اور اعلیٰ اخلاق کا ثبوت ہے۔ وہاں کوئی ایک انچ اپنی جگہ سے سرکنے کو تیار نہیں۔ دین ومذہب کے نام پر کام کرنے والوں کی اول تو تعداد ہی کم ہے۔ اور جو ہے وہ عموماً قرآن وسنت کی بنیادی تعلیمات سے اغماض کر کے جزوی اور فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئی ہے چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ معرکہ جدال بنا ہوا ہے۔ جس کے پیچھے غیبت...... جھوٹ...... ایذائے مسلم...... افترا وبہتان...... تمسخر واستہزا...... جیسے متفق علیہ کبیرہ گناہوں کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی۔ دین کے نام پر خدا کے گھروں میں جدال وقتال اور لڑائیاں ہیں، نوبت پولیس اور عدالتوں تک پہنچی

ہوئی ہے۔

ان دین داروں کو خدا اور رسول پر استہزا کرنے والوں، شراب پینے والوں، سود اور رشوت کھانے والوں سے وہ نفرت نہیں، جو ان مسائل میں اختلاف رکھنے والوں سے ہے۔

کوئی خدا کا بندہ اس پر نظر نہیں کرتا کہ اس کے مثبت ومنفی دونوں پہلوؤں میں کوئی بھی کسی کے نزدیک ایسا نہیں ہے، جس کے لیے مسلمانوں سے جنگ کرنا جائز ہو اور جس کے لیے دوسروں کی غیبت وبہتان، تذلیل وتحقیر روا ہو۔

اصلاحِ حال کی ایک غلط کوشش

ہمارے نو تعلیم یافتہ روشن خیال مصلحین کی توجہ جب اس باہمی اختلاف کے مہلک نتائج کی طرف جاتی ہے اور اس کے علاج کی فکر ہوتی ہے تو ان کے خیال میں ساری خرابیاں صرف ان اختلافات میں نظر آتی ہیں، جو دین ومذہب کے نام پر سامنے آتے ہیں۔ اور وہ صرف اسی اختلاف کو مٹانے کے لیے علاج سوچتے ہیں۔ وہ اس وقت ان سب لڑائیوں کو بھول جاتے ہیں جو خالص نفسانی اور ذاتی غرض کے لیے لڑی جا رہی ہیں، جن کے لیے ایک دوسرے کی جان، آبرو اور مال سب کچھ حلال سمجھ لیا جاتا ہے۔ جس کے پیچھے پورے ملک میں باہمی منافرت کے سیلاب امنڈ آتے ہیں۔ مگر ان کو چوں کہ نئی تہذیب وشرافت کا نام دے دیا ہے۔

اس لیے نہ وہ قوم کے لیے کوئی مرض رہا نہ اس کا علاج سوچنے کی ضرورت رہی۔ اختلاف ولڑائی میں صرف ملا ہی بدنام ہے۔ اسی کا علاج زیر غور ہے۔ حالاں کہ دین ومذہب کے نام پر جو اختلافات ہیں، اگر غور کیا جائے تو ان کی خرابی صرف حدود سے تجاوز کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ وہ کوئی برادری کا نوتہ نہیں بن سکتے۔ وہ اپنے ذاتی حقوق نہیں جنہیں ایثار کیا جا سکے۔ بل کہ قرآن وسنت کی تعبیر کے

اختلافات ہیں۔ جن کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے بعض روشن خیال مصلحین نے سارا فساد ان ہی اختلافات میں منحصر سمجھ کر اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ فرقہ وارانہ اختلافات کو مٹا کر سب کا ایک نیا اور مشترک مذہب بنالیا جائے۔ پوری قوم کا وہی ایک مذہب ہوتا کہ اختلاف کی بنیاد ہی ختم ہوجائے۔

مگر یہ بات مذہبی مسائل میں عقلاً صحیح ہے نہ عملاً ممکن۔ ہاں خالص دنیوی معاملات جن میں جھگڑا ذاتی حقوق ہی کا ہو، وہاں اپنے اپنے مطالبات کو نظر انداز کرکے ایسی صلح کی جاسکتی ہے۔ اس لیے باہمی جنگ وجدل کا علاج یہ نہیں کہ اختلاف رائے کو مٹا کر سب کو ایک نظریے کا پابند کردیا جائے۔

اختلافِ رائے اور جھگڑے فساد میں فرق

اہل عقل وبصیرت پر مخفی نہیں کہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات میں بہت سے مسائل ایسے آتے ہیں، جن میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ ان میں اختلاف کرنا عقل ودیانت کا عین مقتضی ہوتا ہے۔ ان میں اتفاق صرف دو صورتوں سے ہوسکتا ہے۔ یا تو مجمع میں کوئی اہل بصیرت اور اہل رائے نہ ہو۔ ایک نے کچھ کہہ دیا سب نے مان لیا۔ اور یا پھر جان بوجھ کر کسی کی رعایت ومروت سے اپنے ضمیر اور اپنی رائے کے خلاف دوسرے کی بات پر فیصلہ صادر کردیا۔ ورنہ اگر عقل ودیانت دونوں موجود ہوں تو رائے کا اختلاف ضروری ہے۔ اور یہ اختلاف کبھی کسی حال پر مضر بھی نہیں ہوتا۔ بل کہ دوسروں کے لیے بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اسمبلیوں میں حزبِ اختلاف کو اسی بنیاد پر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قرآن وسنت کے مجملات اور مبہمات کی تشریح وتعبیر میں اسی طرح کے اختلافات کو رحمت کہا گیا ہے۔ جو اسلام کے عہد اول سے صحابہ وتابعین اور پھر ائمہ

مجتہدین میں چلے آئے ہیں۔ ان مسائل میں جو اختلافات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں پیش آچکے ہیں، ان کو مٹانے کے معنی اس کے سوا نہیں ہوسکتے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کسی ایک جماعت کو باطل پر قرار دیا جائے، جو نصوص حدیث اور ارشادات قرآنی کے بالکل خلاف ہے۔ اسی لیے حافظ شمس الدین ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس مسئلے میں اختلاف صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان ہوچکا ہے اس کو بالکل ختم کردینا ممکن نہیں۔

صحابہ کرام اور ائمہ مجتہدین کا طرزِ عمل

اس کے ساتھ صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور کی وہ تاریخ بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ تعبیر کتاب وسنت کے ماتحت جو ان میں اختلاف رائے پیش آیا ہے اس پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ اس نے جنگ وجدال کی صورت اختیار کی ہو۔ باہمی اختلاف مسائل کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا اور تمام برادرانہ تعلقات قائم رہنا اس پوری تاریخ کا اعلیٰ شاہکار ہے۔

سیاسی مسائل میں مشاجرات صحابہ کا فتنہ تکوینی حکمتوں کے ماتحت پیش آیا۔ آپس میں تلواریں بھی چل گئیں۔ مگر عین اسی فتنہ کی ابتدا میں جب امام مظلوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ باغیوں کے نرغے میں محصور تھے اور یہی باغی نمازوں میں امامت کراتے تھے تو امام مظلوم نے مسلمانوں کو ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ اور عام ضابطہ یہ بتادیا کہ:

"اِذَا هُمْ اَحْسَنُوْا فَاَحْسِنْ مَعَهُمْ وَاِنْ هُمْ اَسَاءُوْا فَاجْتَنِبْ اِسَاءَتَهُمْ"

یعنی جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں اس میں ان کے ساتھ تعاون کرو۔ اور جب کوئی برا کام اور غلط کام کریں اس سے اجتناب کرو۔ اس ہدایت کے ذریعے اپنی

جان پر کھیل کر مسلمانوں کو قرآنی ارشاد: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ [1] کی صحیح تفسیر بتادی۔ اور باہمی انتشار و افتراق کا دروازہ بند کر دیا۔

اور اسی فتنے کے آخر میں جب کہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان میدان جنگ گرم تھا۔ روم کی عیسائی سلطنت کی طرف سے موقع پا کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ساتھ ملانے اور ان کی مدد کرنے کا پیغام ملا تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب یہ تھا کہ ہمارے اختلاف سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ اگر تم نے مسلمانوں کی طرف رخ کیا تو علی کے لشکر کا پہلا سپاہی، جو تمہارے مقابلے کے لیے نکلے گا وہ معاویہ ہوگا۔ معلوم یہ ہوا کہ باہمی اختلاف جو منافقین کی گہری سازشوں سے تشدد کا رخ اختیار کر چکا تھا، اس میں بھی اسلام کے بنیادی حقائق کسی کی نظر سے اوجھل نہیں ہوئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تعبیر کتاب وسنت کے ماتحت اختلاف رائے جو صحابہ تابعین اور ائمہ مجتہدین میں رہا ہے تو وہ بلاشبہ رحمت ہی ہے۔ اس کا کوئی پہلو نہ پہلے مسلمانوں کے لیے مضر ثابت ہوا اور نہ آج ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ان ہی حدود کے اندر رہے، جن میں ان حضرات نے رکھا تھا کہ ان کا اثر نماز، جماعت، امامت اور معاشرت کے کسی معاملے پر نہ پڑتا تھا۔

جدال اور اصلاح

مذہب کے نام پر دوسرے اختلافات قرون اولیٰ کے بعد بدعت وسنت اور دوسرے عنوانات سے پیدا ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے قرآن وسنت کی تعبیر میں اصول صحیحہ کو چھوڑ کر ذاتی آراء کو امام بنالیا اور نئے نئے مسائل پیدا کر دیے۔ یہ

[1] المائدہ: ۲

اختلافات بلاشبہ تفریق وافتراق تھے، جن سے قرآن وسنت میں مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان کے ختم یا کم کرنے کی کوشش بلاشبہ مفید تھی۔ مگر قرآن حکیم نے اس کا بھی ایک خاص طریقہ بتادیا ہے۔ جس کے ذریعے تفریق کی خلیج کم ہوتی چلی جائے بڑھنے نہ پائے۔ یہ وہ اصول دعوت الی الخیر ہیں، جن میں سب سے پہلے حکمت و تدبیر ہے اور پھر خیر خواہی وہمدردی اور نرم عنوان سے لوگوں کو قرآن وسنت کے صحیح مفہوم کی طرف بلانا ہے۔ اور آخر میں "مُجَادَلَةٌ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" یعنی حجت و دلیل کے ساتھ افہام وتفہیم کی کوشش ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل عام اہل علم اور مصلحین نے ان اصول کو نظر انداز کر دیا۔ صرف جدال میں اور وہ بھی غیر مشروط انداز سے مشغول ہو گئے کہ اپنے حریف کا استہزاء و تمسخر اس کو زیر کرنے کے لیے جھوٹ، سچ، ناجائز ...... جائز ...... ہر طرح کے حربے استعمال کرنا اختیار کر لیا۔ جس کا لازمی نتیجہ جنگ وجدال اور جھگڑا فساد تھا۔

اختلافات کی خرابیوں کا وقتی علاج

آج جب کہ مسلمانوں کا تفرق انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اپنی مزعومات کے خلاف کوئی کسی کی بات ماننے، بل کہ سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ اور کوئی ایسی قوت نہیں کہ کسی فریق کو مجبور کر سکے۔ تو اس باہمی جنگ وجدال اور اس کے مہلک اثرات سے اسلام اور مسلمانوں کو بچانے کا صرف ایک راستہ ہے کہ فرقوں اور جماعتوں کے ذمے دار ذرا اس پر غور کریں کہ جن مسائل میں ہم جھگڑ رہے ہیں، کیا وہ اسلام کے بنیادی مسائل ہیں، جن کے لیے قرآن نازل ہوا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ان کے لیے وقف کر دی۔ اور ان کے پیچھے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ یا بنیادی مسائل اور قرآن اور اسلام کا اصلی مطالبہ کچھ اور ہے، جس ملک میں ایک طرف عیسائی

مشنریاں اپنی قوت اور دنیاوی چمک دمک کے ساتھ اس کو عیسائی ملک بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ ایک طرف کھلے بندوں خدا اور رسول اور ان کی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو قرآن اور اسلام کے نام پر وہ سب کچھ کیا جا رہا ہے، جس کو دنیا سے مٹانے ہی کے لیے قرآن اور اسلام آیا تھا۔ اس جگہ صرف فروعی مسائل اور ان کی تحقیق وتنقید اور ترویج کی کوششوں میں الجھ کر ان بنیادی مہمات سے غفلت برتنے والوں سے اگر اللہ تعالیٰ و رسول کریم ﷺ کی طرف سے یہ مطالبہ ہو کہ ہمارے دین پر یہ افتادیں پڑ رہی تھیں تم نے اس کے لیے کیا کیا؟ تو ہمارا کیا جواب ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ کوئی فرقہ، کوئی جماعت جب ذرا اپنے وقتی جھگڑوں سے بلند ہو کر اس کو سوچے گی تو اس کو اپنی موجودہ مصروفیات پر ندامت ہوگی۔

صحیح اور غلط طرزِ عمل

بہت سے حضرات مسائل میں علماء کے اختلافات سے پریشان ہو کر پوچھا کرتے ہیں کہ ہم کدھر جائیں، جس کی تہہ میں یہ پوشیدہ ہوتا ہے کہ اب ہم کسی کی نہ سنیں۔ سب سے آزاد ہو کر جو سمجھ میں آئے کیا کریں۔ اور بظاہر ان کا یہ معصومانہ سوال حق بجانب نظر آتا ہے۔ لیکن ذرا غور فرمائیں تو ان کو اس کا جواب اپنے گرد و پیش کے معاملات میں خود ہی مل جائے گا۔ ایک صاحب بیمار ہوئے۔ ڈاکٹروں، حکیموں کی آراء میں تشخیص وتجویز کے بارے میں اختلاف ہو گیا تو وہ کیا کرتے ہیں؟ یہی نا کہ وہ ان ڈاکٹروں، حکیموں کی ڈگریاں معلوم کرکے یا پھر ان کے مطب میں علاج کرانے والے مریضوں سے یا دوسرے اہل تجربہ سے دریافت کرکے اپنے علاج کے لیے کسی ایک ڈاکٹر کو متعین کر لیتے ہیں۔ اسی کی تشخیص وتجویز پر عمل کرتے ہیں مگر دوسرے ڈاکٹروں حکیموں کو برا بھلا کہتے نہیں پھرتے۔ یہاں کسی کا یہ خیال

نہیں ہوتا کہ معالجوں میں اختلاف ہے تو سب کو چھوڑ دو۔ اپنی آزاد رائے سے جو چاہو کرو۔ کیا یہی طرزِ عمل علماء کے اختلاف کے وقت نہیں کر سکتے؟۔

ایک مثال اور لیجیے۔ آپ کو ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنا ہے۔ قانون جاننے والے وکلاء سے مشورہ کیا۔ ان میں اختلاف رائے ہوا تو کوئی اور آدمی یہ تجویز نہیں کرتا کہ مقدمہ دائر کرنا ہی چھوڑ دے یا پھر کسی وکیل کی نہ سنے۔ خود اپنی رائے سے جو سمجھ میں آیا کرے۔ بلکہ ہوتا یہی ہے مختلف طریقوں سے ہر شخص اتنی تحقیق کر لیتا ہے کہ ان میں کون سا وکیل اچھا جاننے والا اور قابل اعتماد ہے۔ اس کو اپنا وکیل بنا لیتا ہے۔ اور دوسرے وکلاء کو باوجود اختلاف کے دشمن نہیں سمجھتا۔ برا بھلا نہیں کہتا۔ اس سے لڑتا نہیں پھرتا۔

یہی فطری اور سہل اصول اختلاف علماء کے وقت کیوں اختیار نہیں کیا جاتا؟

یہاں ایک بات یہ بھی سن لی جائے کہ بیماری اور مقدمے کے معاملات میں تو اگر آپ نے کسی غلط ڈاکٹر یا غیر معتمد وکیل پر اعتماد کرکے اپنا معاملہ اس کے حوالے کر دیا تو اس کا جو نقصان پہنچتا ہے، وہ آپ کو ضرور پہنچے گا۔ مگر علماء کے اختلاف میں اس نقصان کا بھی خطرہ نہیں۔

حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے اگر کسی عالم سے سوال کیا اور اس نے فتویٰ غلط دے دیا تو اس کا گناہ سوال کرنے والے پر نہیں، بلکہ فتویٰ دینے والے پر ہے۔[1]

شرط یہ ہے کہ سوال اس شخص سے کیا گیا ہو جس کا عالم ہونا آپ نے ایسی ہی تحقیق وجستجو کے ذریعے معلوم کیا ہو جو اچھے معالج اور اچھے وکیل کی تلاش میں آپ کیا کرتے ہیں۔ اپنی مقدور بھر صحیح عالم کی تلاش وجستجو کرکے آپ نے ان کے قول پر عمل کر لیا تو آپ اللہ کے نزدیک بری ہو گئے۔ اگر اس نے غلط بھی بتا دیا تو آپ پر اس کا کوئی نقصان یا الزام نہیں۔ ہاں یہ نہ ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر کی تلاش میں تو اس کا اہتمام۔

[1] ابو داؤد، العلم، باب التوقی فی الفتیا: ۲/۱۵۹

پی۔ بی۔ ایس ہونا بھی معلوم کریں اور یہ بھی کہ اس کے مطب میں کس طرح کے مریض زیادہ شفایاب ہوتے ہیں، مگر عالم کی تلاش میں صرف عمامے، کرتے اور داڑھی کو یا زیادہ سے زیادہ جلسے میں کچھ بول لینے کو معیار بنا لیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ اپنی ذمہ داری سے بری نہیں۔ اس نے جواب میں کوئی غلطی کی تو آپ بھی اس کے مجرم قرار پائیں گے۔

باہمی جنگ وجدال کے دو رکن

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آج مذہب کے نام پر جو جنگ وجدال کا بازار گرم ہے اس کے دو رکن ہیں۔ ایک ہر فرقہ اور ہر جماعت کے علماء، دوسرے وہ عوام جو ان کے پیچھے چلنے والے ہیں۔

علماء (وائمہ کرام) اپنی تحقیق وتنقید میں قرآنی اصول دعوت کے مطابق دوسرے کی تنقیص وتوہین سے پرہیز کریں۔ اور اسلام کے وہ بنیادی مسائل جن میں کسی فرقے کو اختلاف نہیں اور اسلام اور مسلمانوں پر جو مصائب آج آرہے ہیں وہ سب انہیں مسائل سے متعلق ہیں، اپنی کوششوں اور محنتوں کا رخ اس طرف پھیر دیں۔ اسی طرح عوام اپنی مقدور بھر پوری کوشش کر کے کسی صحیح عالم کا انتخاب کریں اور پھر اس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے رہیں۔ دوسرے علماء یا ان کے ماننے والوں سے لڑتے نہ پھریں تو بتائیے کہ ان میں اشکال کیا ہے؟

سارے فرقے اور ان کے اختلافات بدستور رہتے ہوئے بھی یہ باہمی جنگ وجدل ختم ہوسکتا ہے۔ جس نے آج مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ صرف ذرا سی توجہ دینے اور دلانے اور طرز عمل بدلنے کی ضرورت ہے۔

کاش میری یہ آواز ان بزرگوں اور دوستوں تک پہنچے جو اس راہ میں کچھ کام کر سکتے ہیں اور محض اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نام پر اس ہمدردانہ دعوت

کے لیے کھڑے ہوجائیں تو امت کی بہت سی مشکلات حل ہوجائیں اور ہمارا پورا معاشرہ جن مہلک خرابیوں کی غار میں جا چکا ہے ان سے نجات مل جائے۔

عام سیاسی اور شخصی جھگڑوں کا علاج

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ مذہبی معاملات میں جس شخص نے کوئی خاص رخ اختیار کر رکھا ہے وہ اسی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیم وتلقین سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہے۔ خواہ وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل غلط ہی ہو مگر اس کا نظریہ کم از کم یہی ہے کہ وہ اللہ کا دین ہے۔ ان حالات میں اس کو ہمدردی اور نرمی سے اپنی جگہ افہام وتفہیم کی کوشش تو بجائے خود جاری رکھنا چاہیے۔ لیکن جب تک اس کا نظریہ نہ بدلے اس کو یہ دعوت نہیں دی جاسکتی کہ تم ایثار کر کے اپنا نظریہ چھوڑ دو اور صحیح کرلو۔ ان سے تو صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ اختلاف رائے کو اپنی حدود کے اندر رکھیں اور افہام وتفہیم قرآنی اصول حکمت وموعظت "مُجَادَلَةٌ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ" کو نظر انداز نہ کریں۔ مگر جن معاملات کا تعلق صرف شخصی اور ذاتی حقوق اور خواہشات سے ہے، وہاں یہ معاملہ سہل ہے کہ جھگڑے سے بچنے کے لیے دوسرے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دے۔ اپنے حق سے دست بردار ہوجائے۔ اور جو شخص ایسا کرے دنیا میں بھی اس کی عزت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اور جس مقصد کو چھوڑا ہے وہ بھی دوسرے راستے سے حاصل ہوجاتا ہے۔ اور آخرت میں تو اس کے لیے ایک عظیم الشان بشارت ہے جس کا بدل پوری دنیا اور دنیا کی ساری حکومتیں اور ثروتیں بھی نہیں ہوسکتیں۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

"أَنَا زَعِيْمٌ بِبَيْتٍ فِيْ رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ إِنْ كَانَ

مُحِقًّا"[1]

ترجمہ: "میں ضامن ہوں اس شخص کو وسط جنت میں مکان دلانے کا جس نے حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دیا۔"

میں آخر میں پھر اپنے پہلے جملے کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ ہماری ساری خرابیوں کی بنیاد قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا ہے اور یہ آپس کی لڑائی بھی درحقیقت قرآنی تعلیمات سے ناواقفیت یا غفلت ہی کا نتیجہ ہے۔ گروہی تعصبات نے یہ حقائق نظروں سے اوجھل کر رکھے ہیں۔

دنیا میں صالحین کی اگرچہ قلت ضرور ہے۔ مگر فقدان نہیں۔ افسوس ہے کہ ایسے مصلحین کا سخت قحط ہے جو گرد و پیش کے چھوٹے چھوٹے دائروں سے ذرا سر نکال کر باہر دیکھیں اور اسلام اور قرآن ان کو کس طرف بلا رہا ہے ان کی صدا سنیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کے راستے پر چلنے کی توفیق کامل عطا فرمادیں۔

"اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ وَالْعَمَلِ وَالنِّیَّۃِ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ وَصَفْوَۃِ رُسُلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ"[2]

قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے

یہ ایک قسم کا عذاب ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام کی آیت نمبر ۶۵ میں عذاب الٰہی کی تین قسموں کا ذکر فرمایا ہے، اس میں تیسری قسم عذاب کی جو اس آیت میں ذکر کی گئی ہے وہ یہ ہے: "اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا" یعنی تمہاری مختلف پارٹیاں بن کر آپس میں بھڑ جائیں اور باہم ایک دوسرے کے لیے عذاب بن جائیں۔

---

[1] ابوداؤد، الادب، باب فی حسن الخلق: ۲/۳۰۵

[2] ماخوذ از اختلاف امت اور ان کا حل: ۶۰ تا ۶۳

اس میں لفظ "یَلْبِسَکُمْ" "لبس" کے مادہ سے بنا ہے، جس کے اصلی معنی چھپا لینے اور ڈھانپ لینے کے ہیں۔ اسی معنی سے لباس ان کپڑوں کو کہا جاتا ہے، جو انسان کے بدن کو ڈھانپ لے۔ اور اسی وجہ سے التباس بمعنی شبہ واشتباہ استعمال ہوتا ہے جہاں کسی کلام کی مراد مستور ہو صاف اور کھلی ہوئی نہ ہو۔

اور لفظ "شِیَعٌ، شِیْعَۃٌ" کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی کا پیرو اور تابع۔ قرآن مجید میں ہے "وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرٰھِیْمَ" "یعنی نوح علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں ابراہیم علیہ السلام۔"

اسی لیے عرف ومحاورہ میں لفظ شیعہ ایسی جماعت کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی خاص غرض کے لیے جمع ہوں۔ اور اس غرض میں ایک دوسرے کے معاون ہوں۔ جس کا بامحاورہ ترجمہ آج کل کی زبان میں فرقہ یا پارٹی ہے۔

اسی لیے آیت کا ترجمہ یہ ہوگیا کہ عذاب کی ایک قسم یہ ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے، اسی لیے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

"لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَّضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ"[1]

ترجمہ: "یعنی تم میرے بعد پھر کافروں جیسے نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔"

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے۔ ہمارا گزر مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی۔ ہم نے بھی دو رکعت ادا کی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء میں مشغول ہوگئے اور بہت دیر تک دعاء کرتے رہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا۔

---

[1] مسلم، الایمان، باب بیان معنی قول النبی لا ترجعوا بعدی: ۱/۵۸

ایک یہ کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ دوسرے یہ کہ میری امت کو قحط اور بھوک کے ذریعہ ہلاک نہ کیا جائے یہ بھی قبول فرمائی۔ تیسری دعا یہ کہ میری امت آپس کے جنگ وجدل سے تباہ نہ ہو، مجھے اس دعا سے روک دیا گیا۔[1]

اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے، جس میں تین دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے کہ میری امت پر کسی دشمن کو مسلط نہ فرمادے جو سب کو تباہ وبرباد کردے۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ اور آپس میں نہ بھڑ جائیں اس دعا کو منع کردیا گیا۔[2]

ان روایات سے ثابت ہوا کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر اس قسم کے عذاب تو نہ آئیں گے، جیسے پچھلی امتوں پر آسمان یا زمین سے آئے جس سے ان کی پوری قوم تباہ و برباد ہوگئی۔ لیکن ایک عذاب دنیا میں اس امت پر بھی آتا رہے گا۔ وہ عذاب آپس کی جنگ وجدل اور فرقوں اور پارٹیوں کا باہمی تصادم ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے امت کو فرقوں اور پارٹیوں میں منقسم ہوکر باہمی آویزش اور جنگ وجدل سے منع کرنے میں انتہائی تاکید سے کام لیا ہے۔ اور ہر موقع پر اس سے ڈرایا ہے کہ تم پر خدا تعالیٰ کا عذاب اس دنیا میں اگر آئے گا تو آپس ہی کی جنگ و جدل کے ذریعہ آئے گا۔

سورۂ ہود کی ایک آیت میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت سے آیا ہے:

﴿وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ﴾[3]

ترجمہ: ''وہ تو برابر اختلاف کرنے والے ہی رہیں گے سوائے ان کے جن پر آپ کا رب رحم فرمائے۔''

[1] مسند احمد: ۱/۱۷۵، رقم: ۱۵۱۹، بروایت سعد بن ابی وقاص
[2] ابن ماجہ، الفتن، باب ما یکون من الفتن رقم: ۳۹۵۱
[3] ھود: ۱۱۸

اس سے واضح ہوا کہ جو لوگ آپس میں (بلا وجہ شرعی) اختلاف کرتے ہیں، وہ رحمت خداوندی سے محروم یا بعید ہیں۔

ایک آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾[1]

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو۔''

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾[2]

ترجمہ: ''اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آجانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا۔''

ان تمام آیات وروایات کا حاصل یہ ہے کہ اختلاف بڑی منحوس اور مذموم چیز ہے۔ آج دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے مسلمانوں کی پستی اور بربادی کے اسباب پر غور کیا جائے تو اکثر مصائب کا سبب یہی آپس کا اختلاف اور تشتت نظر آئے گا۔ ہماری بداعمالیوں کے نتیجہ میں یہ عذاب ہم پر مسلط ہوگیا کہ وہ قوم جس کا مرکز اتحاد ایک کلمہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ تھا۔ اس کلمہ کو ماننے والا زمین کے کسی خطہ میں ہو...... کسی زبان کا بولنے والا ہو...... کسی رنگ کا ہو...... کسی نسل و نسب سے متعلق ہو...... سب بھائی بھائی تھے، کوہ و دریا کی دشوار گزار منازل ان کی وحدت میں حائل نہ تھیں۔ نسب و خاندان، رنگ و زبان کا تفاوت ان کی راہ میں رکاوٹ نہ تھا۔ ان کی قومی وحدت صرف اس کلمہ سے وابستہ تھی۔ عربی...... مصری...... شامی...... ترکی...... ہندی...... چینی...... کی تقسیمیں صرف شناخت اور

[1] آل عمران: ۱۰۳ [2] آل عمران: ۱۰۵

تعارف کے لیے تھیں اور کچھ نہیں۔ بقول اقبال مرحوم:

؎ درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی

گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

آج دوسری قوموں کی دسیسہ کاریوں اور مسلسل کوششوں نے پھر ان کو نسلی اور لسانی اور وطنی قومیتوں میں بانٹ دیا۔ اور پھر ان میں سے بھی ہر ایک قوم و جماعت اپنے اندر کی بھی تشتت اور انتشار کا شکار ہو کر مختلف پارٹیوں میں بٹ گئی۔

وہ قوم جس کا شعار غیروں سے بھی عفو و درگزر اور ایثار تھا اور جھگڑے سے بچنے کے لیے اپنے بڑے سے بڑے حق کو چھوڑ دیتی تھی۔ آج اس کے بہت سے افراد ذرا ذرا سی حقیر و ذلیل خواہشات کے پیچھے بڑے سے بڑے تعلق کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہی وہ اغراض و اہواء کا اختلاف ہے، جو قوم و ملت کے لیے منحوس اور اس دنیا میں نقد عذاب ہے۔

ہاں اس جگہ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ وہ اختلاف جس کو قرآن میں عذاب الٰہی اور رحمت خداوندی سے محرومی فرمایا گیا ہے وہ وہ اختلاف ہے جو اصول اور عقائد میں ہو یا نفسانی اغراض و اہواء کی وجہ سے ہو۔ اس میں وہ اختلاف رائے داخل نہیں جو قرآن وسنت کے بتلائے ہوئے اصول اجتہاد کے ماتحت فروعی مسائل میں فقہاء امت کے اندر قرن اول سے صحابہ و تابعین میں ہوتا چلا آیا ہے۔ جن میں فریقین کی حجت قرآن وسنت اور اجماع سے ہے اور ہر ایک کی نیت قرآن وسنت کے احکام کی تعمیل ہے۔ مگر قرآن وسنت کے مجمل یا مبہم الفاظ کی تعبیر اور ان سے جزوی فروعی مسائل کے استخراج میں اجتہاد اور رائے کا اختلاف ہے۔ ایسے ہی اختلاف کو ایک حدیث میں رحمت فرمایا گیا ہے۔

جامع صغیر میں بحوالہ نصر مقدسی و بیہقی و امام الحرمین یہ روایت نقل کی ہے کہ:

"اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَةٌ" [1]

ترجمہ: "میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔"

امت محمدیہ ﷺ کی خصوصیت اس لیے اختیار فرمائی گئی کہ اس امت کے علماء حق اور فقہاء محققین میں جو اختلاف ہوگا وہ ہمیشہ اصول قرآن وسنت کے ماتحت ہوگا اور صدق نیت اور للہیت سے ہوگا، کوئی نفسانی غرض جاہ و مال کی ان کے اختلاف کی محرک نہ ہوگی۔ اس لیے وہ کسی جنگ و جدل کا سبب بھی نہ بنے گا۔ بل کہ علامہ عبدالرؤف مناوی شارح جامع صغیر کی تحقیق کے مطابق فقہاء امت کے مختلف مسالک کا وہ درجہ ہوگا، جو زمانہ سابق میں انبیاء علیہم السلام کی مختلف شرائع کا تھا کہ مختلف ہونے کے باوجود سب کی سب اللہ ہی کے احکام تھے، اسی طرح مجتہدین امت کے مختلف مسلک اصول قرآن وسنت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے سب کے سب احکام خدا اور رسول ﷺ ہی کہلائیں گے۔ [2]

دو مذہبوں کے درمیان مناظرہ ومناقشہ کی کثرت

حضرت عبداللہ بن حسین الموجان مذہبی تعصب کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَمِنَ الْمَظَاهِرِ الْخَطِرَةِ لِذٰلِكَ الْجَوِّ الْمَشْحُوْنِ بِالْعَدَاءِ وَالْكَرَاهِيَةِ بَيْنَ الْمَذْهَبَيْنِ تِلْكَ الْمُنَاظَرَاتُ الْكَثِيْرَةُ الَّتِيْ كَانَتْ تُعْقَدُ بَيْنَ عُلَمَاءِ الْمَذَاهِبِ، وَشُيُوْعُهَا لِدَرَجَةٍ كَبِيْرَةٍ وَحُضُوْرُ الْكُبَرَاءِ وَالْوُزَرَاءِ مَجَالِسَهَا، وَمِنَ الْغَرِيْبِ وَالطَّرِيْفِ نَقْرَأُ فِيْ بَعْضِ كُتُبِ التَّرَاجِمِ أَنَّ الْعَادَةَ قَدْ جَرَتْ فِيْ بَعْضِ الْمُدُنِ كَبَغْدَادَ مَثَلًا عَلٰى اِنْعِقَادِ الْمُنَاظَرَاتِ بَيْنَ فُقَهَاءِ الْمَذْهَبَيْنِ فِيْ مَجَالِسِ الْعَزَاءِ، وَذٰلِكَ لِيَسْلُوْا الْمُصَابَ عَنْ مُصِيْبَتِهٖ، وَيُخَفِّفُوْا مِنْ لَوْعَتِهٖ!!

[1] جامع الصغیر: ۵۹/۱۰، رقم: ۲۸۶۸۲، فیض القدیر: ۲۷۰/۱، رقم: ۲۸۸ حرف الهمزة

[2] معارف القرآن: ۳۶۱/۳ تا ۳۶۴، الانعام: ۶۵

وَقَدِ اخْتَلَفَ أَمْرُ الْمُنَاقَشَاتِ الْفِقْهِيَّةِ عَمَّا كَانَ عَلَيْهِ الْحَالُ فِي زَمَنِ الْقُرُوْنِ الْأُوْلَى اِخْتِلَافًا كَبِيْرًا، إِذْ صَارَ دَافِعُ الْفُقَهَاءِ عَلَيْهَا هُوَ حُبُّ الظُّهُوْرِ وَالْغَلَبَةِ أَمَامَ الْأُمَرَاءِ وَالْوُجَهَاءِ وَلَيْسَ بِقَصْدِ الْوُصُوْلِ إِلَى الْحَقِّ.[1]

تَرجَمۃ: ”آپس کی دشمنی اور ناپسندیدگی کی فضا پیدا کرنے کے مظاہر پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو وہ مجالس نظر آئیں گی، جو علماء مذاہب کے درمیان مناظرہ کے لیے منعقد کی جاتی تھیں۔ یہ مجالس مناظرہ اس درجہ عام تھیں کہ ان میں وزراء اور طبقہ اشراف بھی شرکت کرتا۔ دور دراز اطراف سے لوگ اس میں حاضر ہوتے اور اس پر مزید یہ کہ بعض شہروں مثلاً بغداد وغیرہ میں تو یہ عادت جاری تھی کہ وہاں فقہاء مذاہب کے درمیان مناظرہ کے لیے بڑی بڑی مجالس کا انعقاد کیا جاتا جن میں معززین ومقربین شرکت کرتے اور ان مناظروں کا تو مقصود یہ تھا کہ وہ کسی مصیبت زدہ کو تسلی دیتے، اور کسی پریشان حال سے اس کا بوجھ ہلکا کرتے اور بعد میں تو یہ اختلاف قرونِ اولیٰ کے مناقشات ومناظرات سے بھی بڑا سنگین صورت حال اختیار کر گیا حتیٰ کہ فقہاء کا مقصد اس سے حصول جاہ اور امراء کے پیش نظر غلبہ کا حصول رہ گیا اور وصول الی الحق مقصد نہ رہا۔“

مروّجہ مجادلات کی دینی اور دنیوی مضرتیں

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں کہ اصل مقصود شرعاً دعوت الی اللہ ہے، جس کے دو اصول ہیں۔

1. حکمت......
2. موعظتِ حسنہ......

مجادلہ کی صورت بھی سر آپڑے تو اس کے لیے بھی احسن کی قید لگا کر اجازت

[1] تحاسد العلماء: ۲۴۷

دی گئی ہے، مگر وہ حقیقۃً دعوت کا کوئی شعبہ نہیں، بل کہ اس کے ضمنی پہلو کی ایک نوعیت ہے، جس میں قرآن کریم نے ”بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ“ کی قید لگا کر جس طرح یہ بتا دیا ہے کہ وہ نرمی...... خیر خواہی...... اور ہمدردی...... کے جذبے سے ہونا چاہیے اور اس میں دلائل واضحہ مخاطب کے مناسب حال بیان کرنا چاہیے، مخاطب کی توہین و تحقیر سے کلی اجتناب کرنا چاہیے، اسی طرح اس کے احسن ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود متکلم کے لیے مضر نہ ہو جائے، کہ اس میں اخلاق رذیلہ...... حسد بغض...... تکبر...... جاہ پسندی وغیرہ پیدا نہ ہو جائیں، جو باطنی گناہ وکبیرہ ہیں اور آج کل کے بحث ومباحثہ مناظرہ، مجادلہ میں شاذ ونادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ان سے نجات پائے تو ممکن ہے ورنہ عادۃً ان سے بچنا سخت دشوار ہے۔

امام غزالی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح شراب ام الخبائث ہے کہ خود بھی بڑا گناہ ہے اور دوسرے بڑے بڑے جسمانی گناہوں کا ذریعہ بھی ہے، اسی طرح بحث ومباحثہ میں جب مقصود مخاطب پر غالب پانا...... اور اپنا علمی تفوق لوگوں پر ظاہر کرنا ہو جائے...... تو وہ بھی باطن کے لیے اُمّ الخبائث ہے۔

جس کے نتیجہ میں بہت سے روحانی جرائم ہوتے ہیں، مثلاً حسد، بغض، تکبر، غیبت، دوسرے کے عیوب کا تجسس، اس کی برائی سے خوش اور بھلائی سے رنجیدہ ہونا...... قبول حق سے استکبار...... دوسرے کے قول پر انصاف واعتدال کے ساتھ غور کرنے کے بجائے جواب دہی کی فکر، خواہ اس میں قرآن وسنت میں کیسی ہی تاویلات کرنا پڑیں۔[1]

یہ تو وہ مہلکات ہیں جن میں باوقار علماء ہی مبتلا ہوتے ہیں اور یہ معاملہ جب ان کے متبعین میں پہنچتا ہے تو دست وگریبان اور جنگ وجدال کے معرکے گرم ہو جاتے ہیں، ”اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ“۔

[1] إحياء علوم الدين، العلم، بيان آفات المناظرة...... ۶۹/۱

حضرت امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے فرمایا:

"علم تو اہل علم وفضل کے مابین ایک رحم متصل (رشتہ اخوت وبرادری) ہے، تو وہ لوگ جنہوں نے علم ہی کو عداوت بنالیا ہے، وہ دوسروں کو اپنے مذہب کے اتباع کی دعوت کس طرح دیتے ہیں، ان کے پیش نظر دوسرے پر غلبہ پانا ہی ہے تو پھر ان سے باہمی انس ومودت اور مروت کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے اور ایک انسان کے لیے اس سے بڑھ کر شر اور برائی اور کیا ہوگی کہ وہ اس کو منافقین کے اخلاق میں مبتلا کردے اور مومنین ومتقین کے اخلاق سے محروم کردے۔"[1]

امام غزالی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے فرمایا کہ علم دین اور دعوت حق میں اشتغال رکھنے والا یا تو اصول صحیحہ کے تابع اور مہلک خطرات سے مجتنب رہ کر سعادت ابدی حاصل کرلیتا ہے یا پھر اس مقام سے گرتا ہے جو شقاوت ابدی کی طرف جاتا ہے، اس کا درمیان میں رہنا بہت مستبعد ہے، کیوں کہ جو علم نافع نہ ہو وہ عذاب ہی ہے، رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ عَالِمٌ لَّمْ يَنْفَعْهُ اللّٰهُ بِعِلْمِهٖ"[2]

تَرْجَمَہ: "سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے دن وہ عالم ہوگا جس کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نفع نہ بخشا ہو۔"

ایک دوسری صحیح حدیث میں ہے:

"لَا تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِتُبَاهُوْا بِهِ الْعُلَمَاءَ اَوْ لِتُمَارُوْا بِهِ السُّفَهَاءَ اَوْ لِتَصْرِفُوْا وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْكُمْ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَهُوَ فِى النَّارِ"[3]

[1] ایضاً: ۷۱/۱ [2] شعب الایمان، باب فی نشر العلم ...: ۲۷۴/۳، رقم: ۱۶۴۲

[3] ابن ماجہ، المقدمۃ، الانتفاع بالعلم والعمل بہ ص ۲۲

تَرْجَمَہ: "علم دین کو اس غرض سے نہ سیکھو کہ اس کے ذریعہ دوسرے علماء کے مقابلہ میں فخر وعزت حاصل کرو، یا کم علم لوگوں سے جھگڑے کرو، یا اس کے ذریعہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرلو اور جو ایسا کرے گا وہ آگ میں ہوگا۔"

اسی لیے ائمہ فقہاء اور اہل حق کا مسلک اس معاملے میں یہ تھا کہ علمی مسائل میں جھگڑا اور جدال ہرگز جائز نہیں سمجھتے تھے، دعوت حق کے لیے اتنا کافی ہے کہ جس کو خطا پر سمجھے، اس کو نرمی اور خیر خواہی کے عنوان سے دلائل کے ساتھ اس کی خطاء پر متنبہ کردے، پھر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے، جھگڑے اور بدگوئی سے کلی احتراز کرے۔

ائمہ کرام کا سنت پر عمل میں کوتاہی کے وقت طرزِ عمل

حضرت امام مالک رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا ارشاد ہے:

"كَانَ مَالِكٌ يَقُوْلُ الْمِرَاءُ وَالْجِدَالُ فِى الْعِلْمِ يَذْهَبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ عَنْ قَلْبِ الْعَبْدِ وَقِيْلَ لَهٗ رَجُلٌ لَهٗ عِلْمٌ بِالسُّنَّةِ فَهَلْ يُجَادِلُ عَنْهَا؟ قَالَ لَا وَلٰكِنْ يُخْبِرُ بِالسُّنَّةِ فَاِنْ قُبِلَ مِنْهُ وَاِلَّا سَكَتَ"[1]

تَرْجَمَہ: "امام مالک رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے فرمایا کہ علم میں جھگڑا اور جدال نورِ علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے کسی نے عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنت کا علم ہو، کیا وہ مخالفت سنت کے لیے جدال کرسکتا ہے؟ فرمایا نہیں، بل کہ اس کو چاہیے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کردے، پھر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے۔"

[1] اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالک: ۱۵/۱، معارف القرآن: ۴۳۰/۵

امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کے اس قول پر سب ائمہ کرام کو عمل کرنا چاہیے کہ اگر کسی مقتدی کو کوئی خلاف سنت کام کرتے ہوئے دیکھیں تو اس کو اچھی نصیحت اور حکمت وبصیرت کے ساتھ خلوت میں سمجھائیں کہ بھائی آپ جو کام کر رہے ہیں یہ خلاف سنت ہے، ہم اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ مسلمان ہیں اور ہمارے دین میں یہ گناہ ہے، اگر وہ قبول کریں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ ایک بندہ کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی وجہ سے ہدایت دے دی اور آپ کے لیے ذخیرۂ آخرت بن گیا اور اگر وہ آپ سے بحث و مباحثہ شروع کریں اور دلائل پوچھیں تو آپ ان سے کہیں کہ بھائی میں نے آپ کو مسئلہ بتا دیا باقی آپ کسی دار الافتاء سے رابطہ کریں جو فتویٰ وہ مفتیان کرام دیں گے اس پر میں بھی عمل کروں گا اور آپ بھی کریں۔[1]

اختلافی معاملات میں فضول بحثوں سے اجتناب کیا جائے

رسول کریم ﷺ کو جو تعلیم دی گئی ہے وہ در حقیقت علماء امت کے لیے اہم رہنما اصول ہیں، وہ یہ کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیش آئے تو جس قدر ضروری بات ہے اس کو واضح کر کے بیان کر دیا جائے۔ اس کے بعد بھی لوگ غیر ضروری بحث میں الجھیں تو ان کے ساتھ سرسری گفتگو کر کے بحث ختم کر دی جائے، اپنے دعوے کے اثبات میں کاوش اور ان کی بات کی تردید میں بہت زور لگانے سے گریز کیا جائے کیوں کہ اس کا کوئی خاص فائدہ تو ہے نہیں، مزید بحث وتکرار میں وقت کی اضاعت بھی ہے اور باہم تلخی پیدا ہونے کا خطرہ بھی۔

دوسری ہدایت یہ دی گئی ہے کہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے قصہ اصحاب کہف کی جتنی کافی معلومات آپ کو دی گئی ہیں ان پر قناعت فرما دیں زائد کی تحقیقات اور

[1] از راقم

لوگوں سے سوال وغیرہ میں نہ پڑیں۔ دوسروں سے سوالات کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی جہالت یا ناواقفیت ظاہر کرنے اور ان کو رسوا کرنے کے لیے سوال کیا جائے۔ یہ بھی اخلاق انبیاء کے خلاف ہے، اس لیے دوسرے لوگوں سے دونوں طرح کے سوال کرنا ممنوع کر دیا گیا، یعنی تحقیق مزید کے لیے ہو یا مخاطب کی تجہیل و رسوائی کے لیے ہو۔[1]

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے جملہ میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس لیے اپنے قبلہ کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے، اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہے کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگ جانا چاہیے اور وہ کام ہے...... نیک کاموں میں دوڑ دھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش اور چوں کہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور "مسابقت الی الخیرات" میں سستی کرنا، عموماً آخرت سے غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور انجام کی فکر در پیش ہو وہ کبھی فضول بحثوں میں نہیں الجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔[2]

نزاع سے بچنے کے لیے صبر ضروری ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا﴾[3]

اس میں مضر پہلوؤں پر تنبیہ کر کے ان سے بچنے کی ہدایت ہے اور وہ مضر پہلو جو جنگ کی کامیابی میں مانع ہوتا ہے باہمی نزاع واختلاف ہے۔ اس لیے فرمایا "وَلَا

[1] معارف القرآن: ۵/۵۷۹ [2] معارف القرآن: ۱/۳۸۹، البقرۃ: ۱۴۸ [3] الانفال: ۴۶

تَنَازَعُوْا" یعنی آپس میں نزاع اور کشاکش نہ کرو۔ ورنہ تم میں بزدلی پھیل جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

اس میں باہمی نزاع کے دو نتیجے بیان کیے گئے ہیں:

ایک یہ کہ تم ذاتی طور پر کمزور اور بزدل ہو جاؤ گے۔

دوسرا یہ کہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، دشمن کی نظروں میں حقیر ہو جاؤ گے۔

باہمی کشاکش اور نزاع سے دوسروں کی نظر میں حقیر ہو جانا تو بدیہی امر ہے لیکن خود اپنی قوت پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے کہ اس میں کمزوری اور بزدلی آ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باہمی اتحاد و اعتماد کی صورت میں ہر ایک انسان کے ساتھ پوری جماعت کی طاقت لگی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے ایک آدمی اپنے اندر بقدر اپنی جماعت کے قوت محسوس کرتا ہے اور جب باہمی اتحاد و اعتماد نہ رہا تو اس کی اکیلی قوت رہ گئی ہے۔ وہ ظاہر ہے جنگ و قتال کے میدان میں کوئی چیز نہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا "وَاصْبِرُوْا" یعنی صبر کو لازم پکڑو۔ سیاق کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نزاع اور جھگڑوں سے بچنے کا کامیاب نسخہ بتلایا گیا ہے اور بیان اس کا یہ ہے کہ کوئی جماعت کتنی ہی متحد الخیال اور متحد المقصد ہو مگر افراد انسانی کی طبعی خصوصیات اور ضروریات مختلف ہوا کرتی ہیں، نیز کسی مقصد کے حصول و کوشش میں اہل عقل و تجربہ کاروں کا اختلاف بھی ناگزیر ہے۔ اس لیے دوسروں کے ساتھ چلنے اور ان کو ساتھ رکھنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آدمی خلاف طبع امور پر صبر کرنے اور نظر انداز کرنے کا عادی ہو اور اپنی رائے پر اتنا جماؤ اور اصرار نہ ہو کہ اس کو قبول نہ کیا جائے تو لڑ بیٹھے اور اسی صفت کا دوسرا نام صبر ہے۔ آج کل یہ تو ہر شخص جانتا اور کہتا ہے کہ آپس کا نزاع بہت بری چیز ہے مگر اس سے بچنے کا جو گر ہے وہ یہ کہ آدمی خلاف طبع امور پر صبر کرنے کا خوگر بنے۔ اپنی بات منوانے اور چلانے کی فکر میں نہ پڑے۔ یہ بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اسی لیے اتحاد و اتفاق کے سارے

پند بے سود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ آدمی کو دوسروں سے اپنی بات منوانے پر تو قدرت نہیں ہوتی مگر خود دوسرے کی بات مان لینا اور اس کو نہ مانے تو کم از کم نزاع سے بچنے کے لیے سکوت کر لینا تو بہر حال اختیار میں ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے نزاع سے بچنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ صبر کی تلقین بھی ہر فرد جماعت کو کر دی تا کہ نزاع سے بچنا عملی دنیا میں آسان ہو جائے۔[1]

یاد رکھنے کی بات ہے کہ اختلاف کو ختم کر کے اتحاد قائم نہیں ہوتا۔ اتحاد ہمیشہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ کچھ لوگ اپنے اختلاف کو صبر کے خانے میں ڈالنے پر راضی ہو جائیں۔ کسی سے اختلاف، جھگڑا ختم کرنا چاہیں تو صبر، حکمت اور اعراض کا سہارا لینا ہوگا۔ شخصی مفاد اور وقتی جذبات سے اوپر اٹھ کر قربانی دینی ہوگی۔ اتحاد کی خاطر ہر ناگواری کو گوارہ کرنا پڑتا ہے۔ اختلافات اور جھگڑوں سے بچنے کے لیے ہر امام اور معلم کو اپنے ساتھ ایک مجازی قبرستان لے کر چلنا ہوگا جس میں جاہلوں کی جاہلانہ باتیں، طعن و تشنیع، شریر کے شر اور فتین کے فتنے کو حاسد مقتدی کے حسد کو دفنا دینا ہوگا اور دفنا کر بھول جانا ہوگا نہ اس کا تیجہ، نہ چالیسواں منانا ہوگا کہ فلاں مقتدی نے فلاں وقت مجھے یہ بات کہی تھی یا فلاں کو میرے بارے میں یہ کہا تھا، بل کہ ان کو اس طرح کر دیں کہ دفن کا اعلان بھی نہ ہو۔ امام کو چاہیے کہ اپنی میز پر یہ بات لکھ لے

آپس میں اختلافات دشمن کا ہتھیار ہے، آپس میں لڑنا گویا اپنا دشمن آپ بننا ہے، یہ اس تخریبی کام کو خود اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے، جس کو دشمن اپنے ہاتھوں سے انجام دینا چاہتا ہے۔

دوسروں سے نہ لڑنے کے لیے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے، چوں کہ لوگ اپنے آپ سے لڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس لیے دوسروں سے ان کی لڑائی بھی ختم نہیں

[1] معارف القرآن: ۴/۲۵۲، ۲۵۳، الانفال: ۴۶

ہوتی۔

اتحاد اور اتفاق کی قیمت اتنی سستی اور عام ہے کہ ہر شخص، مرد ہو یا عورت، عالم ہو یا جاہل اتحاد کو خرید سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو دبائے، شکایت اور تلخی کو برداشت کرلے، اپنے مفاد کی بربادی پر راضی ہوجائے، دوسروں کی ترقی پر خوش ہونے کا حوصلہ پیدا کرنا سیکھے، گھمنڈ اور کبر کے جذبات کو تواضع کے جذبات میں تبدیل کرلے، آدمی اگر ایسا کرے کہ وہ اتحاد کو توڑنے والے جذبات کو اپنے سینے میں دبالے تو وہ معاشرے کے اندر اتحاد کو باقی رکھے گا۔ اگر وہ ان جذبات کو قائم ہونے کے لیے کھلا چھوڑ دے گا اور نفس امارہ کی اطاعت کرتے ہوئے جذبات کو آزادی دے گا تو گھر سے لے کر مسجد، مدرسہ، بازار اور پورے معاشرے کا اتحاد برباد ہوجائے گا۔[1]

لہٰذا اہم ائمہ کو چاہیے کہ خود بھی اپنے آپس کے نزاع اور جھگڑوں سے بچیں اور اپنے مقتدیوں اور عوام الناس کو بھی اس بات کی تلقین کریں کہ سارے مسلمان اپنے آپس میں اخوت و وحدت اور محبت پیدا کریں اور ان کو یہ مشہور دعا سکھلائیں:

"اَللّٰھُمَّ اَلِّفْ بَیْنَ قُلُوْبِنَا وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَیْنِنَا وَاھْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ۔"[2]

ترجمہ: "اے اللہ تو ہمارے دلوں میں محبت پیدا کردے اور ہماری آپس کی رنجشوں کی اصلاح فرمادے اور ہم کو سلامتی کے راستے دکھا دے اور نور عطا فرما کر تاریکیوں سے نجات دے۔"

مسلمانوں کی جماعت میں اتحاد کی اہمیت

بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری کے وقت جو گوسالہ

[1] رازِ حیات: ص۲۴۱ [2] ابوداؤد، الصلوٰۃ، باب التشہد: ۱/۱۳۹

پرستی کا فتنہ پیدا ہوا اور ان کے تین فرقے ہوگئے حضرت ہارون علیہ السلام نے سب کو دعوت حق دی، مگر ان میں سے کسی فرقہ سے کلی اجتناب اور بیزاری و علیحدگی کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے تک اعلان نہیں کیا۔ اس پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ناراض ہوئے تو انہوں نے یہی عذر پیش کیا کہ میں تشدد کرتا تو بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہوجاتے ان میں تفرقہ پھیل جاتا ﴿اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ﴾[1] یعنی میں نے اس لیے کسی بھی فرقہ سے علیحدگی اور بیزاری کا شدت سے اظہار نہیں کیا کہ کہیں آپ واپس آکر مجھے یہ الزام نہ دیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کردیا اور میری ہدایت کی پابندی نہیں کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان کے عذر کو غلط قرار نہیں دیا، بلکہ صحیح تسلیم کرکے ان کے لیے دعاء واستغفار کیا۔ اس سے یہ ہدایت نکلتی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ سے بچنے کے لیے وقتی طور پر اگر کسی برائی کے معاملے میں نرمی برتی جائے تو درست ہے "وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ"[2]

مصائب اور آفات کا سب سے بڑا سبب

حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب فرماتے ہیں: اختلاف کا سب سے بڑا سبب کم ظرفی اور تنگ نظری ہے، سینے اور دل اتنے تنگ ہوچکے ہیں کہ کوئی گروہ بھی دوسرے گروہ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، ہر گروہ نے قرآن پر، حدیث پر، خدا پر، رسول پر، کعبے پر، جنت پر قبضہ جما رکھا ہے، ہر گروہ یہ کہتا ہے کہ:

خدا اور رسول ہمارے ہیں۔

قرآن ہمارا ہے۔

حدیث ہماری ہے۔

[1] طٰہٰ: ۹۴ [2] معارف القرآن: ۶/۱۱۹

مکہ مدینہ ہمارا ہے۔

صحابہ ہمارے ہیں۔

اولیاء ہمارے ہیں۔

جنت ہماری ہے۔

مغفرت اور شفاعت صرف ہمارے لیے ہے۔

تمہارے پاس کیا ہے؟ کنگلے کہیں کے!

اگر جنت میں جانا چاہتے ہو تو بریلوی بن جاؤ، دیوبندی بن جاؤ، اہلحدیث بن جاؤ، چشتی، نظامی اور قادری، سہروردی بن جاؤ۔ اس کے بغیر جنت میں جانا محال ہے۔ اسی قسم کی باتیں یہودی اور عیسائی ایک دوسرے کو کہتے تھے۔

قرآن حکیم میں ہے:

ترجمہ: ”اور یہود و نصاریٰ یوں کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پائے گا بجز ان لوگوں کے جو یہودی ہوں یا ان لوگوں کے جو نصاریٰ ہوں، یہ خالی دل بہلانے کی باتیں ہیں، آپ ان سے یہ تو کہیے کہ اچھا، اپنی دلیل لاؤ اگر تم اس دعوی میں سچے ہو، ضرور دوسرے لوگ جاویں گے کیوں کہ جو کوئی شخص اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکائے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچ کر اور نہ ایسے لوگوں پر قیامت میں کوئی اندیشہ ہے اور نہ ایسے لوگ اس روز مغموم ہونے والے ہیں، اور یہودی کہنے لگے کہ نصاریٰ کا مذہب کسی بنیاد پر قائم نہیں اور اسی طرح نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں حالاں کہ یہ سب لوگ آسمانی کتابیں بھی پڑھتے پڑھاتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ بھی جو کہ محض بے علم ہیں ان کا سا قول کہنے لگے سو اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان عملی فیصلہ کردیں گے قیامت کے روز ان

تمام مقدمات میں جن میں وہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔“[1]

فرقوں اور گروہوں کے نام جو ہم نے رکھے ہوئے ہیں اور ان کے لیے لڑ مر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان ناموں کی کوئی حیثیت نہیں۔

﴿اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ۝ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ۝﴾[2]

ترجمہ: ”یہ معبودات مذکور زے، نام ہیں جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ٹھہرا لیا ہے اللہ تعالیٰ نے تو ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل بھیجی نہیں، بل کہ یہ لوگ صرف بے اصل خیالات پر اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں حالاں کہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے (بواسطہ رسول) ہدایت آچکی ہے، کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے تو اللہ ہی کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا۔“

اللہ تعالیٰ نے ہمارا تو صرف ایک نام رکھا ہے:

﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ ھٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾[3]

ترجمہ: ”اس اللہ نے تمہارا لقب مسلمان رکھا نزول قرآن سے پہلے بھی اور اس قرآن میں بھی تاکہ تمہارے قابل شہادت اور معتبر ہونے کے لیے رسول ﷺ گواہ ہوں۔“[4]

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اہل نظر و فکر سے یہ

[1] البقرۃ: ۱۱۳
[2] النجم: ۲۳ تا ۲۵
[3] الحج: ۷۸
[4] ندائے منبر و محراب ۱/۲۰۹

"یا رسول اللہ" کی اور ایک کانفرنس ہو رہی ہے محمد رسول اللہ کی یہ جینے کی باتیں نہیں، اس موقع پر اقبال کا شعر مجھے یاد آ رہا ہے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی شاعر کی ناخوش اندیشی [۱]

ایمان اور اتحاد کی طاقت

حضرت مولانا اسلم شیخوپوری صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں:

تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمان متحد رہے، انہیں دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکی، مسلمانوں کو جب بھی شکست ہوئی آپس کی خانہ جنگیوں اور اختلافات کی وجہ سے ہوئی ہے۔

تمہاری قوم کی تو ہے بنا ہی دین و ایمان پر
تمہاری زندگی موقوف ہے تعمیل قرآن پر
تمہاری فتح یابی منحصر ہے فضل یزداں پر
نہ قوت پر نہ شوکت پر نہ کثرت پر نہ ساماں پر

چناں چہ جب تک مسلمانوں میں اخوت ومحبت اور اتفاق و اتحاد کا یہ رشتہ برقرار رہا، وہ ساری دنیا پر چھائے رہے، اور جب سے انہوں نے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے اور ایک دوسرے کو گرانے کا عمل شروع کیا ہے، وہ اقوامِ عالم میں ذلیل و خوار ہوتے جا رہے ہیں۔

افرادی اعتبار سے دیکھیے تو اس وقت مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے بھی زیادہ ہے، وسائل کے اعتبار سے دیکھیے تو پیٹرول جیسے سیال سونے کے کنویں زیادہ تر مسلمانوں کے قبضے میں ہیں، معدنیات کے ذخائر اور کانیں بھی اسلامی ممالک میں

[۱] خطبات علی میاں ۱/۷۸ تا ۸۲

زیادہ ہیں، مالی اعتبار سے نظر ڈالیں تو اکثر اقوامِ عالم سے مسلمان قوم زیادہ مال دار ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مسلمان کمزور اور مغلوب ہیں، آخر کیوں؟

اس کی بڑی وجہ ایمانی کمزوری اور آپس کے لڑائی اور جھگڑے ہیں۔

پہلے مسلمانوں کے پاس سونے چاندی کی دولت نہیں تھی، بل کہ ایمان کی دولت تھی۔

ان کے پاس پیٹرول اور معدنیات کے ذخائر نہیں تھے، البتہ اللہ کی ذات پر یقین اور اعتماد کا عظیم ذخیرہ ان کے پاس تھا۔

ان کے پاس جدید اسلحہ اور ساز وسامان کی طاقت نہیں تھی، لیکن آپس کے اتفاق واتحاد کی قوت ان کے پاس تھی۔

وہ نہتے تین سو تیرہ تھے، مگر انہوں نے ایک ہزار مسلح اور تجربہ کار لشکر کو شکست دے دی اور ایسا بھی ہوا کہ مسلمان تین ہزار تھے اور انہوں نے دو لاکھ کے لشکر کو شکست دے دی۔

آپ نے کبھی کسی دوسری قوم کی تاریخ میں سنا کہ اتنے چھوٹے سے لشکر نے اپنے سے چودہ گنا بڑے مسلح لشکر کو شکست دی ہو؟ مگر مسلمانو! تمہیں اپنی تاریخ پہ ناز بھی ہونا چاہیے اور سبق بھی حاصل کرنا چاہیے کہ جب تمہارے اندر اتفاق تھا تو تمہارے اکابر نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں شام کے میدانوں میں دو لاکھ رومیوں کو ان کے اپنے گھر میں جا کر شکست فاش دی۔

اللہ کے بندو! آج تمہاری کمزوری کی وجہ ساز وسامان کی کمی نہیں، تمہاری کمزوری کی وجہ توپ وتفنگ اور گولہ بارود کا فقدان نہیں۔ تمہاری کمزوری کی وجہ تربیت یافتہ فوجوں کی قلت نہیں۔

تمہاری کمزوری کی وجہ سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کا عدم حصول نہیں، تمہاری کمزوری کی وجہ مال و دولت اور سیم وزر کی قلت نہیں۔

بل کہ تمہاری کمزوری کی وجہ ایمان ویقین اور اتفاق واتحاد کا فقدان ہے۔ کفر کی بڑی بڑی طاقتیں صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم سے ان کے ساز وسامان اور اسلحہ کی وجہ سے نہیں ڈرتی تھیں، بل کہ ان کے یقین محکم اور بے مثال اتحاد کی وجہ سے ارزتی تھیں جب مسلمانوں میں یہ چیز باقی نہ رہی تو ان کا رعب اور دبدبہ بھی باقی نہ رہا۔

اندلس میں کیا ہوا!

اندلس جس کے ساحل پر مشہور اسلامی جرنیل طارق بن زیاد نے کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔

جہاں آٹھ سو سال تک مسلمانوں نے انتہائی شان وشوکت سے حکمرانی کی۔

جہاں کی جامع مسجد قرطبہ آج بھی مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر آنسو بہا رہی ہے۔

جہاں کی نہریں، باغات، محل اور کوٹھیاں آج بھی اپنے معماروں کو یاد کرتی ہیں، آپ جانتے ہیں وہاں کیسے اور کب زوال آیا!

وہاں اسی وقت زوال آیا جب مسلمانوں نے کلام اللہ کو پس پشت ڈال دیا تھا، اور وہ فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے تھے، وہ ایک دوسرے پر فتوے لگا رہے تھے اور اسلام کے بجائے اپنے خاندانوں اور قومیتوں پر فخر کرتے تھے، ایک مسلمان سردار دوسرے مسلمان سردار کو دیکھنا گوارہ نہیں کرتا تھا، بل کہ ایک دوسرے کے خلاف عیسائیوں سے بھی مدد طلب کر لیتے تھے، مسلمانوں نے خود عیسائیوں کے ہاتھوں سے خوشی خوشی مسلمانوں کو ذبح کرایا، جس کی وجہ سے عیسائیوں کے دل سے اسلام اور مسلمانوں کا وقار اور رعب ختم ہو گیا۔

غیر ضروری مسائل عوام کے سامنے لانے کے نقصانات

غیر مسلموں نے اور خصوصاً عیسائیوں نے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے

لیے جس قسم کے فروعی مسائل گھڑے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ سمجھانے کے لیے عرض کیا جاتا ہے، جس کو مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب نے اپنی کتاب ندائے منبر ومحراب میں ذکر فرمایا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک منظم سازش کے تحت ایک بہت بڑا عیسائی رئیس ایک مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کی خدمت میں کچھ اشرفیاں ہدیہ کے طور پر پیش کیں اور اس کے بعد مولانا کے تبحر علمی اور دینی خدمات کی تعریف کی، بہر حال ان سے دوستی لگائی، اس کے بعد کہنے لگا کہ حضرت ایک اہم مسئلہ ہے، جس کو آج تک کوئی عالم دین حل نہیں کر سکا، میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس مسئلے کا حل نکال سکتے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ اصحاب کہف کے کتے کا رنگ کیا تھا؟

اب ظاہر ہے کہ مولانا کے تبحر علمی کی بے انتہا تعریف ہو چکی تھی، انہوں نے انکل سے کہہ دیا کہ جناب اصحاب کہف کے کتے کا رنگ سفید تھا، عیسائی رئیس نے خوب داد دی کہ حضرت آپ نے تو ایسا مسئلہ حل کر دیا جو آج تک بڑے سے بڑا عالم دین بھی حل نہیں کر سکا تھا۔ پھر ان سے گزارش کی کہ حضرت، بہت سارے مسلمان اس مسئلے سے ناواقف ہیں اور ناواقفیت ہی کی حالت میں وہ مر رہے ہیں اس لیے کرم اگلے جمعہ کو یہ مسئلہ ذرا کھول کر بیان فرما دیں۔ حضرت نے فوراً وعدہ کر لیا اور کہا کہ ہمارا کام ہی حق بات کو بیان کرنا ہے۔

اس کے بعد وہ ایک دوسرے مشہور عالم کی خدمت میں حاضر ہوا ان کو بھی ہدیہ پیش کیا اور ان کی وسعت علمی اور دینی خدمات کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیے، ان پر بھی اپنی دوستی کا سکہ بٹھا دیا، پھر ان سے بھی مؤدبانہ دریافت کیا کہ حضرت اصحاب کہف کے کتے کا رنگ کیا تھا؟

انہوں نے انکل سے کہہ دیا کہ اس کا رنگ کالا تھا۔ عیسائی رئیس نے ان سے بھی مؤدبانہ گزارش کی جمعہ کے بیان میں اس اہم مسئلہ کی وضاحت فرما دیں تاکہ

جاہلوں کے علم میں اضافہ ہو۔

مولوی صاحب نے اس کو تسلی دلائی کہ جناب آپ مطمئن رہیں، میں اپنے خطبات جمعہ میں اس مسئلہ کے ہر گوشے کو واضح کروں گا۔

چناں چہ اپنے اپنے خطبات جمعہ میں دونوں علمائے کرام نے اس فضول مسئلے کو اپنے من گھڑت دلائل سے خوب واضح کیا، نماز جمعہ سے فارغ ہو کر دونوں علامہ صاحبان کے مقتدی جب ایک چوک میں اکٹھے ہوئے تو ایک گروہ نے کہا کہ ہمارے حضرت نے آج ایک ایسا مسئلہ حل کر دیا جسے اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود کوئی عالم حل نہیں کر سکا تھا، وہ یہ کہ اصحاب کہف کے کتے کا رنگ کالا تھا۔ دوسرا گروہ کہنے لگا کہ نہیں اس کا رنگ تو سفید تھا، بات بڑھتے بڑھتے گالم گلوچ تک جا پہنچی، پھر مناظرے ہونے لگے، دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر فتوے لگانے شروع کر دیے کہ جو شخص اصحاب کہف کے کتے کو کالا کہے گا اس کے پیچھے نماز نہیں ہوگی، ادھر سے جواب آیا کہ جو اس کتے کو گورا کہے گا اس کے پیچھے نماز نہیں ہوگی۔

یہ واقعہ محض ایک مثال ہے ورنہ حقیقت یہ ہے، جن مسائل نے مسلمانوں کو الجھا رکھا تھا، وہ اسی قسم کے تھے، اور انہیں مسائل میں الجھنے اور ٹکرانے کی وجہ سے مسلمانوں کی قوت کمزور ہو گئی تھی اور کفار کو غالب آنے کا موقع مل گیا تھا۔

رہا اندلس، جہاں اذانوں کی آوازیں بلند ہوتی تھیں، اب وہاں قصر حمراء پر چاندی کی صلیب بلند ہو رہی ہے۔

توحید کے پرستار افسردہ تھے اور تثلیث کے پجاری شاداں و فرحاں تھے، آٹھ سو سال تک پورے کر و فر (شان و شوکت) کے ساتھ حکومت کرنے والے ہزاروں مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

عام حکم جاری کر دیا گیا کہ ہر مسلمان عیسائی بن جائے ورنہ اس کو جہاں کہیں پایا گیا قتل کر دیا جائے گا۔

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اللہ واحد کا نام لینے والے پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپنے پر مجبور ہو گئے۔

جو مسلمان اللہ سے زیادہ کسی کو طاقت ور نہیں سمجھتے تھے، آج ان ہی کا سربراہ ابو عبد اللہ عیسائی بادشاہ کے سامنے جھک کر شہر کی کنجیاں پیش کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا "اے طاقت ور بادشاہ! اب ہم تیری رعایا ہیں۔ یہ شہر اور تمام ملک ہم تیرے سپرد کرتے ہیں، کیوں کہ اللہ جل جلالہ کی یہی مرضی تھی ہمارے آپس کے اختلافات نے ہم سے نصرت الٰہی کو دور کر دیا۔"

جس اندلس کو طارق بن زیاد نے تھوڑے سے لشکر کے ساتھ اجنبی ہونے کے باوجود فتح کیا تھا، اس اندلس کو ہزاروں مسلمان بے پناہ وسائل کے باوجود نہ بچا سکے۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟

صرف اور صرف ایمان کی کمزوری اور (مسلمانوں کے ذمہ جو دین پھیلانے کا کام تھا، اس کو چھوڑ دیا گیا) اور آپس کی نااتفاقی کی وجہ سے، عیسائی متحد تھے اور مسلمان ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے، عمال نے مرکز سے بغاوت کر کے اپنی چھوٹی چھوٹی منی خود مختار حکومتیں قائم کی ہوئی تھیں۔

بغداد میں کیا ہوا؟

آپ جانتے ہیں کہ بغداد مسلمانوں کا ایک بڑا علمی مرکز رہا ہے۔ وہاں بڑے بڑے فقہاء اور محدثین پیدا ہوئے۔

علم کلام، علم فقہ، منطق، ریاضی اور کیمیا پر اتنی کتابیں لکھی گئیں کہ کتب خانے بھر گئے، وہاں مسلمانوں کی بڑی مضبوط حکومت قائم تھی۔ لیکن جب مسلمان آپس میں لڑنے لگے اور ٹکڑیوں میں بٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر تاتاریوں کو مسلط کر دیا

اور فتنہ تاتار وہ فتنہ ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ہلاکو خان کی فوج کے ہاتھوں سے بغداد اور اس کے مضافات میں ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمان قتل ہوئے، انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا، شاہی کتب خانے کی کتابیں دجلہ میں پھینک دی گئیں۔

کتابیں اس قدر تھیں کہ دجلہ میں ایک بند سا بن گیا، اور دجلہ کا پانی کئی دن تک اتنا سیاہ رہا کہ دواتوں میں سیاہی ڈالنے کی ضرورت نہ رہی، کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ پر تاتاریوں کا اس وقت اتنا رعب چھا گیا تھا کہ اگر ایک تاتاری عورت مسلمان مرد کو بازار میں روک لیتی اور کہہ دیتی تم یہیں ٹھہرو میں گھر سے تلوار لے کر تمہیں قتل کرتی ہوں تو اس مسلمان پر اتنا خوف چھا جاتا کہ اسے وہاں سے ایک قدم اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی اور عورت اسے قتل کر دیتی۔

آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ ذلت کیوں اٹھانی پڑی؟ آپس میں لڑنے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے کی وجہ سے اور جو اصل کام اللہ جل جلالہ نے خیر الامت ہونے کی وجہ سے اس امت کے ذمہ لگایا تھا اس کام سے غفلت برتنے کی وجہ سے نہ کرنے کے کاموں میں یہ امت لگ گئی، بغداد کے خلیفہ نے اپنے حریف خوارزم شاہ کو کمزور کرنے کے لیے تاتاریوں کو خود مشورہ دیا کہ خوارزم شاہ پر حملہ کرو تو تاتاریوں نے خوارزم شاہ کی سلطنت تو ختم کر دی مگر اس کے بعد بغداد کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔[1]

اندازہ لگایئے ہمارے بھول پن اور سادگی کا کہ ہمیں اس بات کی تو فکر ہے کہ کوئی شخص اولیٰ کو چھوڑ کر غیر اولیٰ کام نہ کرے۔

شافعیت کو چھوڑ کر حنفی نہ بن جائے، حنفیت کو چھوڑ کر شافعی نہ بن جائے۔

رفع یدین کا انکار نہ کر دے یا اقرار نہ کر لے۔

[1] ندائے منبر و محراب ۱/۱۵۲ تا ۱۶۱

تراویح بیس نہ پڑھ لے۔

اذان بغیر صلوٰۃ کے نہ کہہ دے۔

لیکن اگر کوئی نماز ہی چھوڑ دے۔

وہ نہ بیس پڑھے، نہ آٹھ۔

وہ اذان ہی کا انکار کر دے۔

وہ ملحد بن جائے۔

وہ سوشلسٹ ہو جائے۔

وہ قادیانیت کی گود میں چلا جائے۔

وہ دشمنانِ صحابہ کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو جائے۔

وہ صیہونیوں کے جال میں پھنس جائے۔

جب کہ ان اختلافات کا حال تو یہ ہے کہ اکثر اختلافات راجح اور غیر راجح، افضل اور غیر افضل کے ہوتے ہیں، ان مباحثوں اور مناظروں میں حد سے زیادہ مصروفیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ فرقے اور گروہ جن کے عقائد صراحۃً کفریہ ہیں اور جو دن رات امت کو گمراہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں، ان کے خلاف ریسرچ اور مطالعہ کا نہ تو طلبہ کو موقع ملتا ہے، اور نہ ہی اس سے انہیں کوئی دلچسپی ہوتی ہے گویا ہم نے ان گمراہ فرقوں اور جماعتوں کو گمراہی پھیلانے کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔

ہمارے چند دوست تھے، وہ تبلیغی جماعت کے ساتھ ایک جگہ گئے، گشت پر نکلے تو چند مسلمانوں کو مسجد میں آنے کی دعوت دی، رمضان المبارک کا مہینہ تھا، غالباً ان ساتھیوں نے اپنے خطیب سے آٹھ اور بیس رکعت تراویح کا جھگڑا سنا ہوگا، انہوں نے ان تبلیغی دوستوں سے کہا:

''ہم مسجد میں تو بعد میں چلیں گے پہلے ہمارے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کرو کہ تراویح آٹھ رکعت ہیں یا بیس۔'' ان دوستوں نے بہت پیارا جواب دیا۔ کہنے لگے:

"بھائی جو بیس رکعتیں پڑھتے ہیں، وہ کچھ زیادہ پڑھ لیتے ہیں اور جو آٹھ رکعتیں پڑھتے ہیں وہ کچھ کم پڑھ لیتے ہیں، لیکن پڑھتے دونوں ہیں ہم آپس میں الجھنے اور وقت ضائع کرنے کے بجائے کیوں نہ ان بے نمازوں کے پاس چلیں جو نہ آٹھ پڑھتے ہیں نہ بیس پڑھتے ہیں، وہ تو سرے سے نمازہی سے محروم ہیں۔"

لاحاصل اختلاف

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ کا اس سلسلہ میں ایک عبرت انگیز واقعہ لکھا ہے فرماتے ہیں:

قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا، ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں، میں نے پوچھا: حضرت کیسے مزاج ہیں؟

کہا: ہاں ٹھیک ہی ہے میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کردی!

میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے، ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی۔

فرمایا: میں تمہیں صحیح کہتا ہوں، عمر ضائع کردی۔

میں نے عرض کیا، حضرت بات کیا ہے؟

فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کردیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ

کے مسائل کے دلائل تلاش کریں، یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔

اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں، ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل اور دوسرے مسالک کے فقہاء رحمۃ اللہ تعالیٰ جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطاء (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کردیں، اور دوسرے کے مسلک کو خطا محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں، اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔

پھر فرمایا: ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطاء، اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، دنیا میں بھی ہم، تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح یا یہ کہ یہ صحیح ہے، لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطاء ہو اور وہ خطاء ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو، دنیا میں تو یہ ہے ہی قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا، آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی، برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے الفاظ یہ تھے۔

اللہ تعالیٰ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کو رسوا کردے گا نہ امام ابو حنیفہ

رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کو، نہ امام مالک رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کو، نہ امام احمد بن حنبل رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنہوں نے ہدایت کو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں، اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدان حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے صحیح کہا تھا یا شافعی رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس، یہ نہیں ہوگا۔

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں اور نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی، اپنی قوت صرف کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفق تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرام عَلَیْهِمُ السَّلَامُ لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی، آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی، یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیے تھا وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آ رہا ہے، شرک و بت پرستی چل رہی ہے، حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فروعی بحثوں میں۔

حضرت شاہ صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے فرمایا: یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔

آپ اگر مسلمانوں کی پستی، تنزل اور ذلت کے اسباب پر غور فرمائیں گے تو آپ کو بڑے بڑے یہی دو اسباب نظر آئیں گے:[1] امت آپس میں دست و گریبان

[1] مراد حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا بیان ہے جو "اختلاف امت اور ان کا حل" کے تحت گزر چکا ہے۔

ہر شخص الگ جماعت بنانے کی فکر میں ہے، کئی جماعتیں ایسی ہیں کہ ان میں صدر اور سکریٹری کے علاوہ آپ کو تیسرا شخص نہیں ملے گا، مگر نعرے ایسے انقلابی لگائے جاتے ہیں، گویا یہی ایک جماعت ہے جو بگڑی ہوئی امت میں انقلاب برپا کر سکتی ہے، کام سے زیادہ پروپیگنڈہ اور تشہیر کی جاتی ہے۔

قرآن کو چھوڑ کر امت نے لینن، مارکس، ماؤزے تنگ اور نہ جانے کون کون سے لادینی لیڈروں کی کتابوں کو اپنا لیا ہے۔ اپنی معیشت، سیاست، حکومت غرضیکہ ہر چیز کے بارے میں ان ہی گمراہ کن کتابوں سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

قرآن کو خوب صورت غلافوں میں لپیٹ کر طاقچوں کی زینت بنا دیا گیا ہے۔

قرآن کا مقصد اب صرف یہ رہ گیا ہے:

کہ کبھی کبھار برکت کے لیے پڑھ لیا جائے۔

یا کوئی مر جائے تو قرآن سے ایصال ثواب کر دیا جائے۔

یا کبھی جھگڑا ہو جائے تو قرآن کی قسم اٹھالی جائے۔

تعویذات لکھ لکھ کر بیماروں کے گلے میں ڈال دیے جائیں۔[1]

مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ میں لائل پور کے جلسے میں اپنے وعظ "وحدت امت" میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا جو ہم سب کے لیے قابل عمل و قابل عبرت ہے، وہ یہ ہے کہ:

حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا میں ایک مسئلہ میں باہمی اختلاف ہو رہا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ نے سنا تو غضب ناک ہو کر باہر تشریف لائے اور فرمایا:

"اِخْتَلَفَ رَجُلَانِ مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّنْ يُنْظَرُ إِلَيْهِ وَيُؤْخَذُ عَنْهُ"

[1] ملفوظات منبر و محراب: ۱/۱۸۹ تا ۱۹۱

کہ افسوس رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں ایسے دو شخص باہم جھگڑ رہے ہیں، جن کی طرف لوگوں کی نظریں ہیں اور جن سے لوگ دین کا استفادہ کرتے ہیں۔ پھر ان دونوں کے اختلاف کا فیصلہ اس طرح فرمایا کہ:

"قَدْ صَدَقَ أُبَيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ وَلَمْ يَأْلُ ابْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ." [1]

"یعنی صحیح بات تو ابی ابن کعب کی ہے مگر اجتہاد میں کوتاہی ابن مسعود نے بھی نہیں کی۔"

پھر فرمایا کہ مگر میں آئندہ ایسے مسائل میں جھگڑا کرتا ہوا کسی کو نہ دیکھوں ورنہ سخت سزا دوں گا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ اجتہادی مسائل و اختلافات میں ایک قول صواب و صحیح ہوتا ہے اور دوسرا اگرچہ صواب نہیں، مگر ملامت اس پر بھی نہیں کی جاسکتی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایسے اجتہادی مسائل میں خلاف و اختلاف پر زیادہ زور دینا مقتدایانِ اہل علم کے لیے مناسب نہیں، جس سے ایک دوسرے پر ملامت یا نزاع وجدال کے خطرات پیدا ہو جائیں۔

"وَفِي هٰذَا مِنْ قَوْلِ الشَّافِعِيِّ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى تَرْكِ تَخَاطُئِ الْمُجْتَهِدِيْنَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ إِذْ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ قَدْ أَدّٰى مَا كُلِّفَ بِاجْتِهَادِهِ." [2]

ترجمہ: "امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس کی دلیل موجود ہے کہ کوئی مجتہد دوسرے مجتہد کو خطاوار نہ قرار دے کیوں کہ ان میں سے

[1] جامع العلم ۲/۸۹، تحلید العلماء: ۲۴۳

[2] ماخذ کتاب الأم ۷/۳۰۲، باب إبطال الاستحسان —

ہر ایک نے وہ فرض ادا کر دیا جو اس کے ذمہ تھا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ دو مختلف آراء کا یہ احترام کہ ان میں کسی کو منکر نہ کہا جائے اور اس کے کہنے ماننے والوں کو خطاوار نہ کہا جائے یہ صرف اس صورت میں ہے کہ اجتہاد صحیح اس کی شرائط کے مطابق ہو۔ آج کل کا سا جاہلانہ اجتہاد نہ ہو کہ جس کو عربی زبان بھی پوری نہیں آتی اور قرآن و حدیث سے اس کا رابطہ کبھی نہیں رہا۔ اردو، انگریزی ترجموں کے سہارے قرآن و حدیث پر مشق شروع کر دی۔ ایسا اجتہاد خود ایک گناہ عظیم ہے اور اس سے پیدا ہونے والی رائے دوسرا گناہ اور گمراہی اور خلاف و شقاق ہے، جس پر نکیر واجب ہے۔

سنت و بدعت کی کش مکش میں صحیح طرزِ عمل

ہمارے معاشرہ میں مذہب کے نام پر ایک اختلاف وہ بھی ہے، جو بدعت و سنت کے عنوان سے پیدا ہوا کہ بہت سے لوگوں نے قرآن و سنت کی تعبیر میں اصول صحیح کو چھوڑ کر ذاتی آراء کو امام بنالیا اور نئے نئے مسائل پیدا کر دیے اس قسم کے اختلافات بلاشبہ تفرق و افتراق ہیں، جن سے قرآن و سنت میں مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے ان کے ختم یا کم کرنے کی کوشش بلاشبہ مفید ہے، لیکن قرآن کریم نے اس کا بھی ایک خاص طریق بتلایا ہے، جس کے ذریعہ تفرق کی خلیج کم ہوتی چلی جائے، بڑھنے نہ پائے یہ وہی اصول دعوت الی الخیر ہیں، جن میں سب سے پہلے حکمت و تدبیر پھر خیر خواہی و ہمدردی اور نرم قابل قبول عنوان سے قرآن کریم کے صحیح مفہوم کی طرف بلایا ہے اور آخر میں "مُجَادَلَهُ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ" یعنی حجت و دلیل کے ساتھ افہام و تفہیم کی کوشش ہے۔ مگر افسوس کہ آج کل عام اہل علم اور مصلحین نے ان اصولوں کو نظر انداز کر دیا۔ صرف جدال میں اور وہ بھی ایسے غیر مشروع انداز سے مشغول ہو گئے کہ اپنے حریف کا استہزاء اور تمسخر اور اس کو زیر کرنے کے لیے

جھوٹے، سچے جائز وناجائز حربے استعمال کرنا اختیار کرلیا، جس کے نتیجہ میں جنگ وجدال کا بازار تو گرم ہو گیا مگر اصلاح خلق کا کوئی پہلو نہ نکلا۔[1]

اکابر کے صبر وضبط اور تحمل کا مظاہرہ

ہمارے اکابر رَحِمَہُمُ اللّٰہُ تَعَالیٰ جھگڑوں سے کس قدر دور رہتے تھے باوجود خود حق پر ہونے کے کس صبر وضبط سے کام لیتے تھے اَللّٰہُ اَکْبَرُ! اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے منور فرمائے اور ان کی سچی اتباع ہمیں بھی نصیب فرمائے۔ آمین

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ثانی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کو انتظامی صلاحیت اور سیاسی سوجھ بوجھ اس قدر غیر معمولی عطا فرمائی تھی کہ درحقیقت وہ وزیر بننے کے لائق انسان تھے، دارالعلوم دیوبند پر سخت سے سخت وقت آئے، بڑی بڑی شورشیں اٹھیں، لیکن میں نے اس بندہ خدا کو کبھی ہراساں یا پریشان نہیں دیکھا۔ سنگین سے سنگین حالات میں بھی ان کے اطمینان اور خود اعتمادی میں کبھی فرق نہیں آتا دیکھا، انہوں نے دارالعلوم میں خلاف اصول باتوں کو کبھی برداشت نہیں کیا اور اپنے حسن تدبیر سے مدرسے کو بڑے بڑے فتنوں سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی جس کا ایک واقعہ یاد آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو مثالی ضبط وتحمل عطا فرمایا تھا، دارالعلوم دیوبند کی زمین سے متصل کسی دیوبند کے رئیس کی زمین تھی، اس کا کچھ حصہ دارالعلوم کے لیے خرید لیا گیا تھا اس رئیس کے انتقال کے بعد اس کے ایک وارث نے ایک روز دارالعلوم کے صحن میں پہنچ کر اس زمین کی حق داری کا دعویٰ کیا اور حضرت مولانا

[1] وحدتِ امت: ۲۵

رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کو خطاب کرکے باآواز بلند بہت برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ اس کا وہ انداز اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ حضرت مولانا رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کے بعض خدام کو بھی فطری طور پر اشتعال ہوا اور انہوں نے بھی اس کو اسی زبان میں جواب دینے کا ارادہ کیا۔

لیکن حضرت مولانا رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے ان کو روکا اور ان صاحب سے فرمایا کہ:

"شیخ صاحب! آپ فضول ناراض ہوگئے ذرا اندر تشریف لائیے اطمینان سے بات کریں گے۔"

مگر وہ صاحب بدستور غیظ وغضب کا اظہار کرتے رہے۔ مولانا نے کچھ دیر بعد پھر فرمایا اندر چل کر بیٹھئے تو سہی، وہاں بات کریں گے اور پھر انہیں زبردستی دفتر اہتمام میں لے گئے، ان کی خاطر تواضع فرمائی اور جب وہ ذرا ٹھنڈے ہوگئے تو حضرت مولانا اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے ایک الماری کھولی، اس میں سے کچھ کاغذات لے کر آئے اور ان صاحب کے سامنے پھیلا دیئے کہ دیکھئے یہ زمین آپ کے مورث نے فلاں تاریخ کو دارالعلوم کے ہاتھ فروخت کردی تھی اور اس کی رجسٹری بھی ہو چکی ہے، ان صاحب نے کاغذات دیکھے تو بے حد شرمندہ ہوئے اور مولانا نے جس صبر وضبط اور تحمل کا مظاہرہ فرمایا اس سے بے حد متاثر ہوکر گئے۔[1]

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ﴾[2]

تَرجَمَہ: "اور جو لوگ کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں اور غصے کے وقت (بھی) معاف کردیتے ہیں۔"

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

[1] چند عظیم شخصیات: ۳۲ [2] الشوریٰ: ۳۷

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ﴾ [1]

ترجمہ: "اور جب ان پر ظلم (وزیادتی) ہو تو وہ صرف بدلہ لے لیتے ہیں۔"

حضرت اشرف المشائخ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیتوں میں مؤمنین، مخلصین اور صالحین کی دو خصوصیتیں ذکر فرمائی ہیں۔

"هُمْ يَغْفِرُوْنَ" میں تو یہ بتلایا کہ یہ غصہ میں مغلوب نہیں ہوتے بلکہ رحم، کرم ان کے مزاج میں غالب رہتا ہے معاف کر دیتے ہیں اور "هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ" میں یہ بتلایا کہ یہ بھی انہیں صالحین کی خصوصیت ہے کہ اگر کبھی ظلم کا بدلہ لینے کا داعیہ ان کے دل میں پیدا بھی ہوا اور بدلہ لینے لگیں تو اس میں حق سے تجاوز نہیں کرتے، اگرچہ معاف کر دینا ان کے لیے افضل ہے۔ [2]

لہٰذا ائمہ کرام کو چاہیے کہ ایسے جاہل لوگوں کی باتوں کا جواب نہ دیں ---- ان کے منہ نہ لگیں ---- اگرچہ وہ ذی علم ہی کہلاتے ہوں ---- کیوں کہ بسا اوقات شیطان ان ہی کی زبان سے ایسی باتیں کہلواتا ہے، جس سے امام صاحب کو غصہ آئے اور وہ تردید میں کچھ جواب دیں ---- پھر محلے میں یہ مشہور ہو جائے کہ امام صاحب نے یوں کہا ---- یوں کہا ---- پھر دونوں اہل علم لڑتے رہیں اور محلے کے بے دین عوام خوش ہوتے رہیں ---- اور شیطان کی خوشی کا تو کیا ہی کہنا ---- لہٰذا ایسے اوقات میں بہت ہی حکمت سے کام لیتے ہوئے اور "اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ" سے خوب مدد مانگتے ہوئے شیطان اور اس کے حواریں کے جال سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرے۔

یا تو اس مجلس سے چلا جائے ---- یا کہہ دے کہ کسی دار الافتاء سے اس مسئلہ میں رجوع فرمالیں ---- یا صاف کہہ دے یہ مسئلہ منبر و محراب پر بیان کرنے کا نہیں ہے جس کو جس قدر ضرورت ہو وہ کتابوں سے رجوع کرلے ---- یا کوئی صاحب بے جا

[1] الشوریٰ: ٣٩ [2] معارف القرآن: ٧/٧٠٨، الشوریٰ: ٤٠

بحث کر رہے ہیں تو صبر وضبط کرتے ہوئے ان کو سمجھائیں، یا کہہ دے کہ اس مسئلہ کے متعلق بعد میں بات کر لیں گے۔

مسلمانوں کی خون ریزی اور فتنہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان حضرات میں سے ہیں جو مشاجرات کے زمانے میں کسی فریق کی موافقت یا مخالفت سے یکسو رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد ان سے درخواست کی گئی کہ آپ میدان میں آئیے، ہم آپ کے ہاتھ پر لوگوں سے بیعت لیں گے، لیکن آپ نے باہمی خانہ جنگی کے خطرے سے انکار فرمایا، آپ کو دھمکیاں بھی دی گئیں، لیکن آپ اپنے موقف پر قائم رہے۔ ایک مرتبہ مشاجرات کے دوران لوگوں نے آپ سے آکر کہا کہ "آپ خلافت سنبھال لیجیے سب لوگ آپ کی خلافت پر راضی ہو جائیں گے۔" آپ نے فرمایا کہ "اگر مشرق کے کسی شخص نے مخالفت کی تو کیا ہوگا؟"

لوگوں نے کہا کہ ایسا شخص مار ڈالا جائے گا اور پوری امت کی بہتری کے لیے ایک شخص کا قتل کیا حیثیت رکھتا ہے؟

آپ نے فرمایا کہ: "اللہ کی قسم! اگر ساری امت کے ہاتھ میں نیزے کا قبضہ اور میرے ہاتھ میں اس کی نوک ہو تب بھی میں ساری دنیا و مافیہا کے بدلے کسی مسلمان کا قتل پسند نہیں کرسکتا۔" [1]

چناں چہ مشاجرات کے زمانے میں آپ نے فریقین کے ساتھ تعلقات رکھے، لیکن کسی کا ساتھ نہیں دیا، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں آپ ان کے اور ان کے مخالفین دونوں کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ "آپ دونوں فریقوں کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، حالاں کہ یہ ایک دوسرے کو قتل

[1] طبقات ابن سعد الطبقۃ الثانیۃ من المهاجرين والأنصار: ٤/١٠٥

کر رہے ہیں؟" آپ نے حکیمانہ جواب دیا فرمایا کہ: "جب کوئی شخص "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" (نماز کے لیے آؤ) کہہ کر مجھے بلاتا ہے تو میں اس کی دعوت قبول کر لیتا ہوں۔ جب کوئی شخص "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" (فلاح کی طرف آؤ) کہہ کر پکارتا ہے تو اس کی بات بھی مان لیتا ہوں لیکن جب کوئی شخص "حَیَّ عَلٰی قَتْلِ اَخِیْکَ الْمُسْلِمِ" (اپنے مسلمان بھائی کو قتل کرنے کے لیے آؤ) کہہ کر مجھے دعوت دیتا ہے تو میرا جواب ہوتا ہے کہ نہیں۔"[1]

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کو ان مشاجرات میں عملی حصہ لینے کی دعوت دی، قرآن کریم کے جہاد کے احکام یاد دلائے، آپ نے جواب میں فرمایا:

"اِنَّا قَاتَلْنَا حَتّٰی کَانَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ وَلَمْ تَکُنْ فِتْنَۃٌ وَّ اَنْتُمْ قَاتَلْتُمْ حَتّٰی کَانَ الدِّیْنُ لِغَیْرِ اللّٰہِ، وَحَتّٰی کَانَتْ فِتْنَۃٌ."[2]

تَرجَمَۃ: "ہم نے قتال کیا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا دین غالب ہو گیا اور فتنہ باقی نہ رہا اور تم لوگوں نے قتال کیا، یہاں تک کہ غیر اللہ کا دین غالب ہو گیا اور فتنہ پیدا ہو گیا۔"

جھگڑوں کے نقصانات

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"دَبَّ اِلَیْکُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَکُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَۃُ، لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰکِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ."[3]

تَرجَمَۃ: "تم سے پہلی امتوں کی بیماری تمہارے اندر سرایت کر گئی۔ وہ

---

[1] طبقات ابن سعد: ۱۷۰/۴ [2] ایضًا: ۱۰۵/۴

[3] الترمذی، صفۃ القیامۃ، باب فی فضل صلاح ذات البین رقم: ۲۵۱۰

بیماری حسد و بغض ہے، جو مونڈ دینے والی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈنے والی ہے بلکہ یہ دین کا صفایا کر دیتی ہے (کہ اس بیماری کی وجہ سے انسان کے اخلاق تباہ و برباد ہو جاتے ہیں)۔"

اگر کسی امام کے خاموش رہنے سے، استعفیٰ دینے سے، معافی مانگنے سے آپس کے اختلافات کا خاتمہ ہو سکتا ہو تو ضرور اپنے امام کو یہ کڑوا گھونٹ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی خاطر مسلمانوں کی شیرازہ بندی کو متحد و مجتمع کرنے اور اس کو بکھیرنے سے بچانے کے لیے پی لینا چاہیے۔

اندازہ لگایئے! اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھ کر ایک مصنف کی یہ عبارت جو اس نے اپنی کتاب "مذہب و سائنس" میں لکھی ہے، پڑھیے کہ:

"اسلام کی بڑھتی ہوئی فتوحات کو چارلس مارشل کی تلوار نے نہیں روکا، بل کہ ان کے باہمی اندرونی فساد سے یورپ کو ان کے ہاتھ سے نجات ملی۔"[1]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَا تُجَادِلُوْا فِی الْقُرْاٰنِ فَاِنَّ جِدَالًا فِیْهِ کُفْرٌ."[2]

تَرجَمَۃ: "قرآن میں مت جھگڑو کیوں کہ اس میں جھگڑنا کفر ہے۔"

یہی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ مبارک سے باہر تشریف لائے تو کچھ لوگ قرآن کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کے پاس باہم جھگڑ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو چہرۂ انور کا رنگ متغیر ہوا، پھر فرمایا:

"یَا قَوْمِ بِهٰذَا اُهْلِکَتِ الْاُمَمُ وَ اِنَّ الْقُرْاٰنَ یُصَدِّقُ بَعْضُهٗ

---

[1] سیرت مولانا محمد علی مونگیری: ۱۱۰ مثالی استاد: ۳۲۰/۱

[2] شعب الایمان، فصل فی ترک المماراة فی القرآن: ۵۲۶/۳، رقم: ۲۰۶۱

بعضًا فلا تکذّبوا بعضہ ببعضٍ"[1]

ترجمہ: "اے میری قوم! تم سے پہلے کی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ قرآن تو ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے تم کیوں اس کے ذریعے ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہو؟"

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

ہم حجرہ نبوی ﷺ کے دروازے کے پاس بیٹھ کر باہم الجھ رہے تھے کہ ایک کہہ رہا تھا یہ آیت اس طرح ہے اور دوسرا کہہ رہا تھا اس طرح، اتنے میں رسول اللہ ﷺ اس حال میں نکلے کہ گویا آپ کے چہرے پر انار کے دانے نچوڑ دیے گئے ہوں۔ (یعنی غصے کی وجہ سے آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہوگیا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا:

"یا هؤلاء، بهذا بُعثتم؟ أم بهذا أُمرتم؟ لا ترجعوا بعدي كفّارًا يضرب بعضُكم رقابَ بعضٍ"[2]

ترجمہ: "اے لوگو! کیا اسی لیے تم بھیجے گئے ہو یا اسی چیز کا تمہیں حکم دیا گیا ہے؟ میرے بعد تم کہیں کفر کی طرف نہ لوٹ جاؤ اور ایک دوسرے کی گردن مارنے نہ لگو۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن جبیر بن نفیر رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے والد اور دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لا تجادلوا بالقرآن ولا تبدّلوا كتابَ الله بعضَه ببعضٍ فواللهِ إنّ المؤمنَ ليجادلُ به فيُغلَب وإنّ المنافقَ ليجادلُ

[1] مجمع الزوائد، العلم، باب فی العمل بالکتاب والسنۃ: ۱/۲۳۱، رقم: ۷۹۳

[2] مجمع الزوائد، العلم، باب ماجاء فی المراء: ۱/۲۱۱، رقم: ۷۰۵

به فيَغلِب"[1]

کہ قرآن میں مت جھگڑو، اور کتاب اللہ کو بعض سے بعض کو مت بدلو، کیوں کہ مسلمان ایسا کرنے سے مغلوب ہوگا اور منافق ایسا کرنے سے غالب ہوگا۔ (یعنی ایسا کرنے میں ایمان خراب ہوگا تو اس صورت میں مؤمن کے لیے نقصان ہے منافق مؤمن کے ایمان کو خراب کرکے خوش ہوگا)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مَن طلب العلمَ ليجاريَ به العلماءَ، أو ليماريَ به السفهاءَ، ويصرفَ به وجوهَ الناس إليه أدخله اللهُ النارَ"[2]

ترجمہ: "جو علم اس لیے حاصل کرتا ہے تاکہ علماء سے مباحثہ کرے یا جاہلوں کی اہانت کرے اور اس (فساد) کے ذریعے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں داخل کرے گا۔"

اچھی خاصی ہدایت یافتہ قوم میں جب جھگڑا پیدا ہوجائے سمجھ لو کہ وہ گمراہی کے راستہ پر چل پڑی۔

ترمذی کتاب التفسیر میں ہے:

"ما ضلّ قومٌ بعد هدًى كانوا عليه إلا أوتوا الجدلَ"[3]

ترجمہ: "کوئی بھی ہدایت یافتہ قوم جب گمراہ ہوتی ہے تو سب سے پہلے ان میں جھگڑا وجود میں آتا ہے۔"

قال سليمانُ بنُ داودَ عليهما السلامُ لابنِه: دعِ المراءَ، فإنّ نفعَه قليلٌ، وهو يهيّجُ العداوةَ بين الإخوانِ.[4]

[1] کنز العمال، الأول، الأذکار: ۱/۳۰۷، رقم: ۲۸۵۶

[2] ترمذی، العلم، باب ماجاء فی من یطلب بعلمہ الدنیا: ۲/۹۴، رقم: ۲۶۵۴

[3] ترمذی، التفسیر سورۃ الزخرف: ۲/۱۶۱

[4] دارمی، باب من قال العلم الخشیۃ وتقوی اللہ: ۱/۱۰۲، رقم: ۳۰۳

ترجمہ: ''حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا'' اے بیٹے! جھگڑنا چھوڑ دے کیوں کہ اس کا فائدہ کچھ نہیں ہے اور اس سے دو بھائیوں کے درمیان عداوت پھیلتی ہے۔''

عَنْ زِيَادِ بْنِ حُدَيْرٍ قَالَ: قَالَ لِي عُمَرُ: هَلْ تَعْرِفُ مَا يَهْدِمُ الإِسْلَامَ؟ قَالَ: لَا قَالَ: يَهْدِمُهُ زَلَّةُ الْعَالِمِ، وَجِدَالُ الْمُنَافِقِ بِالْكِتَابِ، وَحُكْمُ الأَئِمَّةِ الْمُضِلِّينَ.[1]

ترجمہ: ''زیاد بن حدیر فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا'' جانتے ہو اسلام کو کس چیز نے سب سے زیادہ کمزور کیا؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا'' علما کی لغزش، منافق کا کتاب اللہ کے معاملے میں جھگڑنا اور گمراہ ائمہ کے احکامات نے۔''

اور فرمایا:

إِنَّهُ سَيَأْتِي نَاسٌ يُجَادِلُونَكُمْ بِشُبُهَاتِ الْقُرْآنِ فَخُذُوهُمْ بِالسُّنَنِ، فَإِنَّ أَصْحَابَ السُّنَنِ أَعْلَمُ بِكِتَابِ اللَّهِ.[2]

ترجمہ: ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ کچھ لوگ قرآن مجید کے مبہم اور غیر واضح احکامات لے کر تم سے جھگڑیں گے۔ تم ان کی تشریح احادیث سے کیا کرو۔ کیوں کہ حدیث کا جاننے والا قرآن کو زیادہ جانتا ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ایاس بن عمر رحمۃ اللہ تعالیٰ سے فرمایا کہ:

إِنَّكَ إِنْ بَقِيتَ سَيَقْرَأُ الْقُرْآنَ ثَلَاثَةُ أَصْنَافٍ: فَصِنْفٌ لِلَّهِ، وَصِنْفٌ لِلْجِدَالِ، وَصِنْفٌ لِلدُّنْيَا، وَمَنْ طَلَبَ بِهِ أَدْرَكَ.[3]

---

[1] نضرة النعيم، الجدال والمراء: ۹/۳۴۷۶
[2] سنن الدارمي، باب التورع عن الجواب ......: ۱/۶۲، الرقم: ۱۱۹
[3] دارمي، فضائل القرآن، باب فضل من قرأ القرآن: ۲/۵۲۶، رقم: ۳۳۲۹

ترجمہ: ''اگر آپ زندہ رہے تو تین قسم کے لوگوں کو قرآن مجید ... ہوئے دیکھیں گے۔

بعض ایسے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے پڑھیں ...

بعض لوگ لڑائی جھگڑوں کے لیے دلیل بنا کر پڑھیں گے اور ...

صرف دنیا حاصل کرنے کے واسطے پڑھیں گے اور جس نے ...

قرآن مجید کے ذریعے کوئی چیز طلب کی تو وہ اس کو مل جائے گی۔''

ویسے تو جھگڑا اتنی بری چیز ہے کہ جہاں یہ ہوتا ہے وہاں سے ... بھلائیاں دور ہو جاتی ہیں اور شرور کے کئی دروازے کھل جاتے ہیں۔ جیسے ... بھری ہوئی بالٹی کے اندر پیشاب و خون کا ایک قطرہ پورے پانی کو ناپاک ... کر دیتا ہے۔ اسی طرح جھگڑا سارے اسباب خیر کے اندر ... ان سارے ... بڑے لوگوں کو محروم کر دیتا ہے۔

ہمارے اکابر و اسلاف نے بہت سختی سے اہل علم کو جدال و خصومت ... تاکید کی ہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی رحمۃ اللہ ... رسالہ'' علمائے سلف'' میں لکھتے ہیں۔

پس ہمارا حال اور خیال اگر حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ ... خیال کے خلاف ہے تو ہم کو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم راہ صواب سے دور جا پڑے ... بات طریقہ سے بعید ہوگی کہ ہم ان کے شیوے کو اپنے مسلک کے ... اور از راہ تعصب خلاف حق سمجھیں اور اپنے ہی خیال باطل کو عین دین داری ...

حضرت جعفر بن محمد صادق رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''إِيَّاكُمْ وَالْخُصُومَةَ فِي الدِّينِ فَإِنَّهَا تَشْغَلُ الْقَلْبَ وَتُورِثُ النِّفَاقَ''[1]

---

[1] حلية الأولياء، ذكر طبقة تابعي المدينة ...: ۳/۲۳۰، رقم: ۳۷۹۹

ترجمہ: ”دین میں جھگڑا کرنے سے بچو اس واسطے کہ وہ دل کو کام کی باتوں سے باز رکھتا ہے اور نفاق پیدا کرتا ہے۔“

ملک شام کے مقتدا امام اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ شَرًّا اَلْزَمَهُمُ الْجَدَلَ وَمَنَعَهُمُ الْعَمَلَ“[1]

ترجمہ: ”جب کسی قوم کی بربادی اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتی ہے تو ان پر جھگڑا لازم کر دیتا ہے اور کام سے باز رکھتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے جس ادارے اور قوم میں ناحق جھگڑے ہوں ان پر شر کا دروازہ کھل گیا۔ اور اب کام کا دروازہ بند ہوتا جائے گا۔

امام حجاج بن ارطاۃ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”مَا خَاصَمْتُ قَطُّ وَلَا جَالَسْتُ اِلٰى قَوْمٍ يَخْتَصِمُوْنَ“[2]

ترجمہ: ”میں نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا اور نہ کبھی ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا جو جھگڑالو ہوں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت امام حجاج بن ارطاۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی شخص سے یا جماعت سے بیزاری اور ان کی مجلس سے متنفر ہونے کی وجہ جھگڑا ہے۔

شیخ عبداللہ بن حسین الموجان فرماتے ہیں:

فَالْمِرَاءُ وَالْجِدَالُ مِنْ نَتَائِجِ الْحَسَدِ وَيُؤَدِّيَانِ اَيْضًا اِلَى الْحَسَدِ، فَالْمِرَاءُ وَالْجِدَالُ مِنْ اَجْلِ اِثْبَاتِ الذَّاتِ وَاِعْلَاءِ النَّفْسِ، وَاِظْهَارِ الْحِنْكَةِ وَالذَّكَاءِ وَقُوَّةِ الْعِلْمِ وَتَقْدِيْمِ الْاَدِلَّةِ وَاِدْحَاضِ الْخَصْمِ.

فَقَدْ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اَبْغَضَ الرِّجَالِ اِلَى اللّٰهِ الْاَلَدُّ الْخَصِمُ.[3]

[1] نضرۃ النعیم، الجدال والمراء: ۹/۴۳۴۸
[2] علماء السلف: ۸۹
[3] اخرجه المسلم، العلم، باب فی الالد الخصم: ۲/۳۳۹

وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ جَادَلَ فِيْ خُصُوْمَةٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ لَمْ يَزَلْ فِيْ سَخَطِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْزِعَ.

قَالَ بَعْضُهُمْ: اِيَّاكَ وَالْخُصُوْمَةَ فَاِنَّهَا تَمْحَقُ الدِّيْنَ، وَيُقَالُ: مَا خَاصَمَ وَرِعٌ قَطُّ فِي الدِّيْنِ.

وَقَالَ ابْنُ قُتَيْبَةَ: مَرَّ بِيْ بِشْرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ بَكْرَةَ فَقَالَ: مَا يُجْلِسُكَ هٰهُنَا؟ قُلْتُ: خُصُوْمَةٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَ ابْنِ عَمٍّ لِّيْ، فَقَالَ: اِنَّ لِاَبِيْكَ عِنْدِيْ يَدًا وَاِنِّيْ اُرِيْدُ اَنْ اَجْزِيَكَ بِهَا وَاِنِّيْ وَاللّٰهِ مَا رَاَيْتُ شَيْئًا اَذْهَبَ لِلدِّيْنِ وَلَا اَنْقَصَ لِلْمُرُوْءَةِ وَلَا اَضْيَعَ لِلَّذَّةِ وَلَا اَشْغَلَ لِلْقَلْبِ مِنَ الْخُصُوْمَةِ، قَالَ: فَقُمْتُ لِاَنْصَرِفَ فَقَالَ لِيْ خَصْمِيْ: مَا لَكَ؟ قُلْتُ: لَا اُخَاصِمُكَ، قَالَ: اِنَّكَ عَرَفْتَ اَنَّ الْحَقَّ لِيْ، قُلْتُ: لَا وَلٰكِنْ اُكْرِمُ نَفْسِيْ عَنْ هٰذَا، قَالَ: فَاِنِّيْ لَا اَطْلُبُ مِنْكَ شَيْئًا هُوَ لَكَ.[1]

فَاَمَّا الْمَظْلُوْمُ الَّذِيْ يَنْصُرُ حُجَّتَهُ بِطَرِيْقِ الشَّرْعِ مِنْ غَيْرِ لَدَدٍ وَاِسْرَافٍ وَزِيَادَةِ لِجَاجٍ عَلٰى قَدْرِ الْحَاجَةِ وَمِنْ غَيْرِ قَصْدِ عِنَادٍ وَاِيْذَاءٍ، فَلَيْسَ بِحَرَامٍ وَلٰكِنَّ الْاَوْلٰى تَرْكُهُ مَا وَجَدَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا فَاِنَّ ضَبْطَ اللِّسَانِ فِي الْخُصُوْمَةِ عَلٰى حَدِّ الْاِعْتِدَالِ مُتَعَذِّرٌ، وَالْخُصُوْمَةُ تُوْغِرُ الصَّدْرَ وَتُهَيِّجُ الْغَضَبَ، وَاِذَا هَاجَ الْغَضَبُ بَقِيَ الْحِقْدُ بَيْنَ الْمُتَخَاصِمِيْنَ حَتّٰى يَفْرَحَ كُلُّ وَاحِدٍ بِمَسَاءَةِ صَاحِبِهٖ.[2]

ترجمہ: ”لڑائی جھگڑا یہ حسد کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسی سے حسد کا مستقل سلسلہ چل پڑتا ہے اور یہ لڑائی جھگڑا ہوتا ہی اسی لیے ہے کہ خود کو ظاہر کرے اور بڑا ثابت

[1] احیاء علوم الدین، آفات اللسان، الآفۃ الخامسۃ الخصومۃ: ۳/۱۶۱
[2] تحاسد العلماء: ۱۷۲ تا ۱۷۴

کرے۔ اپنے تجربے اور ذکاوت کا اظہار کرے، اپنا علم منوائے اور دلیل پیش کرے اور لڑائی میں کود پڑے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے مبغوض آدمی جھگڑالو ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلا وجہ جھگڑنے والا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو مول لیتا ہے، یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے۔ بعض نے یہ بھی فرمایا ہے کہ: جھگڑے سے اجتناب کرو، کیوں کہ یہ دین کو مٹا دیتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے جھگڑالو شخص میں دین داری قائم نہیں رہتی۔

ابن قتیبہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ بشر بن عبداللہ بن ابی بکرہ رحمہ اللہ تعالیٰ تشریف لائے اور فرمایا: آپ یہاں کیسے؟ میں نے کہا، میرے اور میرے چچا کے بیٹے کے درمیان ایک جھگڑے کا معاملہ ہے، اس وجہ سے بیٹھا ہوں۔ انہوں نے فرمایا: تمہارے والد کا مجھ پر ایک احسان ہے، میں تمہیں اس کا بدلہ دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ واللہ! میں نے دین سے دوری، مروت سے عاری، لطف سے بری، اور دل کی تنگی کا سبب، جھگڑے سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔ یہ سنتے ہی میں لوٹ کر چلنے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ میرے فریق نے مجھ سے کہا: بھائی کہاں چل دیئے اور تمہیں کیا ہوا؟

میں نے کہا: میں تم سے اب نہیں لڑوں گا۔ اس نے کہا (شاید) آپ سمجھ گئے کہ میرا حق آپ پر ہے۔ میں نے کہا: نہیں، ایسی بات نہیں ہے میں حق پر ہوں، تاہم اپنے نفس کے اکرام کے سبب اب آئندہ مخاصمت نہیں کروں گا۔ اور اپنے حق کو تجھ پر قربان کرتا ہوں اس نے کہا: میں بھی آپ سے اپنے حق کا آئندہ کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔''

بہرحال ہم جھگڑوں، جدال اور خصومت سے بچنے کی اس طرح کوشش کریں

جس طرح سانپ اور بچھو سے بچا جاتا ہے۔

جھگڑوں کے نتائج

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

آج ہمارا معاشرہ، جھگڑوں سے بھر گیا ہے، اس کی بے برکتی اور ظلمت پورے معاشرے میں اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ عبادتوں کے نور محسوس نہیں ہوتے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو رہے ہیں، کہیں خاندانوں میں جھگڑے ہیں تو کہیں میاں بیوی میں جھگڑا ہے، کہیں دوستوں میں جھگڑا ہے، کہیں بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہے، کہیں رشتہ داروں میں جھگڑا ہے، کہیں مسجدوں میں جھگڑا ہے، آپس میں مقتدیوں میں جھگڑا ہے مقتدی اور امام میں جھگڑا...... اور تو اور علماء کرام کے درمیان آپس میں جھگڑے ہو رہے ہیں، اہل دین میں جھگڑے ہو رہے ہیں، جس کے نتیجے میں دین اور علم کا نور ختم ہو چکا ہے۔

یہاں تک کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک جھگڑا تو جسمانی ہوتا ہے، جس میں ہاتھا پائی ہوتی ہے اور ایک جھگڑا پڑھے لکھوں کا اور علماء کا ہوتا ہے، وہ ہے مجادلہ...... مناظرہ...... اور بحث و مباحثہ......

ایک عالم نے ایک بات پیش کی۔ دوسرے نے اس کے خلاف بات کی۔ اس نے ایک دلیل دی۔ دوسرے نے اس کی دلیل کا رد لکھ دیا۔ سوال و جواب اور رد و قدح کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اس کو بھی بزرگوں نے کبھی پسند نہیں فرمایا، اس لیے کہ اس کی وجہ سے باطن کا نور زائل ہو جاتا ہے۔ چناں چہ یہی حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''المِراءُ یَذْهَبُ بِنُورِ العِلْمِ''[1]

[1] اوجز المسالک شرح موطا الامام مالک: ۱/۱۵

ترجمہ: "یعنی علمی جھگڑے علم کے نور کو زائل کر دیتے ہیں۔"

دیکھیے، ایک تو ہوتا ہے "مذاکرہ" مثلاً: ایک عالم نے ایک مسئلہ پیش کیا، دوسرے عالم نے کہا: اس مسئلے میں مجھے فلاں اشکال ہے۔ اب دونوں بیٹھ کر افہام و تفہیم کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ ہے "مذاکرہ" یہ بڑا اچھا عمل ہے، لیکن یہ جھگڑا کہ ایک عالم نے دوسرے عالم کے خلاف ایک مسئلے کے سلسلے میں اشتہار شائع کر دیا کوئی پمفلٹ یا کتاب شائع کر دی، اب دوسرے عالم نے اس کے خلاف کتاب شائع کر دی اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا یا ایک عالم نے دوسرے کے خلاف تقریر کر دی، دوسرے عالم نے اس کے خلاف تقریر کر دی اور یوں مخالفت برائے مخالفت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ یہ ہے "مجادلہ اور جھگڑا" جس کو ہمارے بزرگوں نے ائمہ دین نے بالکل پسند نہیں فرمایا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ نے قوت کلام میں ایسا کمال عطا فرمایا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی بھی مسئلے پر بحث و مباحثہ کے لیے آ جاتا تو آپ چند منٹ میں اس کو لاجواب کر دیتے تھے۔ بل کہ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ نے واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ آپ بیمار تھے اور بستر پر لیٹے ہوئے تھے، اس وقت آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

"الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بھروسے پر یہ بات کہتا ہوں کہ اگر ساری دنیا کے عقل مند لوگ جمع ہو کر آ جائیں اور اسلام کے کسی بھی معمولی سے مسئلے پر کوئی اعتراض کریں تو ان شاء اللہ یہ ناکارہ دو منٹ میں ان کو لاجواب کر سکتا ہے۔ پھر فرمایا کہ: میں تو ایک ادنیٰ طالب علم ہوں، علما کی تو بڑی شان ہے۔"

چناں چہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی آدمی کسی مسئلے پر بات چیت کرتا تو چند منٹ سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔[1]

[1] اصلاحی خطبات: ۶/۱۴۸، ۱۵۱

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میں دارالعلوم دیوبند سے درس نظامی کر کے فارغ ہوا تو اس وقت مجھے باطل فرقوں سے مناظرہ کرنے کا بہت شوق تھا، چناں چہ کبھی شیعوں سے مناظرہ ہو رہا ہے، کبھی غیر مقلدین سے تو کبھی بریلیوں سے کبھی ہندوؤں سے، اور کبھی سکھوں سے مناظرہ ہو رہا ہے۔ چوں کہ نیا نیا فارغ ہوا تھا۔ اس لیے شوق اور جوش میں یہ مناظرے کرتا رہا، لیکن بعد میں میں نے مناظرے سے توبہ کر لی۔

کیوں کہ تجربہ یہ ہوا کہ اس سے فائدہ نہیں ہوتا بل کہ اپنی باطنی کیفیت پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ بہر حال جب ہمارے بزرگوں نے حق و باطل کے درمیان بھی مناظرے کو پسند نہیں فرمایا تو پھر اپنی نفسانی خواہشات کی بنیاد پر یا دنیاوی معاملات کی بنیاد پر مناظرہ کرنے اور لڑائی جھگڑا کرنے کو کیسے پسند فرما سکتے ہیں۔ یہ جھگڑا ہمارے باطن کو خراب کر دیتا ہے۔[1]

جھگڑے کس طرح ختم ہوں

اس سلسلے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں:

اب سوال یہ ہے کہ یہ جھگڑے کس طرح ختم ہوں؟ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک ملفوظ آپ حضرات کو سناتا ہوں، جو بڑا زریں اصول ہے، اگر انسان اس اصول پر عمل کرے تو امید ہے کہ پچھتر (۷۵) فیصد جھگڑے تو وہیں ختم ہو جائیں، چناں چہ فرمایا کہ:

"ایک کام یہ کر لو کہ دنیا والوں سے امید باندھنا چھوڑ دو، جب امید چھوڑ دو گے تو ان شاء اللہ پھر دل میں کبھی بغض اور جھگڑے کا خیال نہیں آئے گا۔"

[1] اصلاحی خطبات: ۶/۱۴۹

دوسرے لوگوں سے جو شکایتیں پیدا ہوجاتی ہیں، مثلاً یہ کہ فلاں شخص کو ایسا کرنا چاہیے تھا، اس نے نہیں کیا، جیسی میری عزت کرنی چاہیے تھی، اس نے ایسی عزت نہیں کی، جیسی میری خاطر مدارت کرنی چاہیے تھی، اس نے ویسی نہیں کی، یا فلاں شخص کے ساتھ میں نے فلاں احسان کیا تھا، اس نے اس کا بدلہ نہیں دیا وغیرہ وغیرہ۔

یہ شکایتیں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ دوسروں سے توقعات وابستہ کر رکھی ہیں، اور جب وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں تو اس کے نتیجے میں دل میں گرہ پڑ گئی کہ اس نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا، اور دل میں شکایت پیدا ہوگئیں۔ ایسے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر تمہیں کسی سے کوئی شکایت پیدا ہوجائے تو اس سے جا کر کہہ دو کہ مجھے تم سے یہ شکایت ہے، تمہاری یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی، مجھے بری لگی، پسند نہیں آئی، یہ کہہ کر اپنا دل صاف کرلو، لیکن آج کل بات کہہ کر دل صاف کرنے کا دستور ختم ہوگیا، بل کہ اب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو اور اس شکایت کو دل میں لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی اور موقع پر کوئی اور بات پیش آگئی، ایک گرہ اور پڑ گئی۔

چناں چہ آہستہ آہستہ دل میں گرہیں پڑتی چلی جاتی ہیں، وہ پھر بغض کی شکل اختیار کرلیتی ہیں، اور بغض کے نتیجے میں آپس میں دشمنی پیدا ہوجاتی ہے۔

اس لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جھگڑے کی جڑ اس طرح کاٹو کہ کسی سے کوئی توقع ہی مت رکھو۔ کیا مخلوق سے توقعات وابستہ کیے بیٹھے ہو کہ فلاں یہ دے دے گا، فلاں یہ کام کردے گا۔ توقع تو صرف اس سے وابستہ کرو جو خالق اور مالک ہے۔ بل کہ دنیا والوں سے تو برائی کی توقع رکھو کہ ان سے تو ہمیشہ برائی ہی ملے گی۔ اور پھر برائی کی توقع رکھنے کے بعد اگر کبھی اچھائی مل جائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ! آپ کا شکر اور احسان ہے۔ اور اگر برائی ملے تو

پھر خیال کرلو کہ مجھے تو پہلے ہی برائی کی توقع تھی، تو اب اس کے نتیجے میں دل میں شکایت اور بغض پیدا نہیں ہوگا اور پھر دشمنی بھی پیدا نہیں ہوگی، نہ جھگڑا ہوگا۔ لہٰذا کسی سے توقع ہی مت رکھو۔[1]

بدلہ لینے کی نیت نہیں کرنی چاہیے

اسی طرح حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور اصول یہ بیان فرمایا کہ جب تم کسی دوسرے کے ساتھ کوئی نیکی کرو، یا اچھا سلوک کرو، تو صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کرو، مثلاً: کسی کی مدد کرو یا کسی شخص کی سفارش کرو، یا کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، یا کسی کی عزت کرو، یہ سوچ کر کرو کہ میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے یہ برتاؤ کر رہا ہوں، اپنی آخرت سنوارنے کے لیے یہ کام کر رہا ہوں۔ جب اس نیت کے ساتھ اچھا برتاؤ کروگے تو اس صورت میں اس برتاؤ پر بدلہ کا انتظار نہیں کروگے۔ اب اگر فرض کریں کہ آپ نے ایک شخص کے ساتھ اچھا سلوک کیا، مگر اس شخص نے تمہارے اچھے سلوک کا بدلہ اچھائی کے ساتھ نہیں دیا اور اس نے تمہارے احسان کرنے کو بھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ آپ کے دل میں ضرور یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں نے تو اس کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا، اور اس نے میرے ساتھ الٹا سلوک کیا، لیکن اگر آپ نے اس کے ساتھ اچھا سلوک صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کیا تھا تو اس صورت میں اس کی طرف سے برے سلوک پر بھی شکایت پیدا نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ آپ کا مقصد تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا تھی۔

اگر ان دو اصولوں پر ہم سب عمل کرلیں تو پھر آپس کے تمام جھگڑے ختم ہوجائیں۔ اور اس حدیث پر بھی عمل ہوجائے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] اصلاحی خطبات: ۹/۱۵۱، ۱۵۲

"مَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِيَ لَهُ فِيْ وَسَطِهَا (يَعْنِي الْجَنَّةِ)"[1]

جو شخص حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے تو اس شخص کے لیے جنت کے بیچوں بیچ گھر بنا دیا جائے گا۔[2]

اسی طرح حضرت ابودرداء، حضرت ابوامامہ، حضرت واثلہ بن اسقع اور حضرت انس بن مالک رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُم نے فرمایا کہ:

"خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا وَنَحْنُ نَتَمَارٰى فِيْ شَيْءٍ مِنْ اَمْرِ الدِّيْنِ فَغَضِبَ غَضَبًا شَدِيْدًا لَمْ يَغْضَبْ مِثْلَهُ ثُمَّ انْتَهَرَنَا فَقَالَ: مَهْلاً يَا اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِهٰذَا، ① ذَرُوا الْمِرَاءَ لِقِلَّةِ خَيْرِهِ، ② ذَرُوا الْمِرَاءَ فَاِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يُمَارِيْ، ③ ذَرُوا الْمِرَاءَ، فَاِنَّ الْمُمَارِيْ قَدْ تَمَّتْ خَسَارَتُهُ، ④ ذَرُوا الْمِرَاءَ فَكَفٰى اِثْمًا اَنْ لَّا تَزَالَ مُمَارِيًا، ⑤ ذَرُوا الْمِرَاءَ فَاِنَّ الْمُمَارِيْ لَا اَشْفَعُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ⑥ ذَرُوا الْمِرَاءَ فَاَنَا زَعِيْمٌ بِثَلَاثَةِ اَبْيَاتٍ فِي الْجَنَّةِ فِيْ رِبَاضِهَا -اَيْ اَسْفَلِهَا- وَاَوْسَطِهَا وَاَعْلَاهَا لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ صَادِقٌ، ⑦ ذَرُوا الْمِرَاءَ فَاِنَّ اَوَّلَ مَا نَهَانِيْ عَنْهُ رَبِّيْ بَعْدَ عِبَادَةِ الْاَوْثَانِ وَشُرْبِ الْخَمْرِ ......"[3]

ترجمہ: "ایک مرتبہ ہم باہم دین کے ایک معاملہ میں الجھ رہے تھے

---

[1] ترمذی، البر والصلۃ، باب ماجاء فی المراء: ۲/۲۰
[2] اصلاحی خطبات: ۶/۱۵۲
[3] مجمع الزوائد، العلم، باب ما جاء فی المراء: ۱/۳۰۹، رقم: ۷۰۴

اتنے میں رسول اللہ ﷺ کا گزر ہوا تو آپ ایسے غضب ناک ہو رہے تھے کہ اس سے پہلے ہم نے آپ کو کبھی اس طرح غضب ناک ہوتے نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ نے ہمیں ڈانٹا پھر فرمایا: اے چھوڑو اے امت محمدیہ! تم سے پہلے والے اسی سبب سے ہلاک ہوئے۔ ① جھگڑے کو چھوڑو اس میں بہتری کم ہے۔ ② جھگڑے کو چھوڑو کیوں کہ مؤمن لڑاکو نہیں ہے۔ ③ نزاع کو چھوڑو کیوں کہ نزاع کرنے والا ہمیشہ نقصان میں ہوتا ہے۔ ④ جھگڑے کو چھوڑو کیوں کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جو جھگڑنے والے کے ساتھ ہمیشہ رہتا ہے۔ ⑤ جھگڑے کو چھوڑو کیوں کہ جھگڑنے والے کی قیامت کے دن شفاعت نہیں ہوگی۔ ⑥ جھگڑے کو چھوڑو کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے پھر بھی جھگڑا چھوڑ دے تو میں اس کو جنت کے باغات کے تین درجے کے محلوں کی ضمانت دیتا ہوں۔ زیریں، درمیانی اور اعلیٰ کی۔ ⑦ جھگڑے کو چھوڑو کیوں کہ میرے رب نے سب سے پہلے جس گناہ سے روکا ہے وہ شرک اور شراب پینے کے بعد جھگڑے کے گناہ سے روکا ہے۔"

جھگڑے سے بچنے میں اکابر کا طرزِ عمل

شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب بیان فرماتے ہیں کہ:

ہم نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کی پوری زندگی میں اس حدیث پر عمل کرنے کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ جھگڑا کرنے کی خاطر بڑے سے بڑا حق چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ ان کا ایک واقعہ سناتا ہوں جس پر آج لوگوں کو یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہ دار العلوم جو اس وقت کورنگی میں قائم ہے۔ پہلے نانک واڑہ میں ایک چھوٹی سی عمارت میں قائم تھا، جب

زیادہ ہوا تو اس کے لیے وہ جگہ تنگ پڑ گئی، وسیع اور کشادہ جگہ کی ضرورت تھی۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کی ایسی مدد ہوئی کہ بالکل شہر کے وسط میں حکومت کی طرف سے ایک بہت بڑی اور کشادہ جگہ مل گئی۔

جہاں آج کل اسلامیہ کالج قائم ہے۔ جہاں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مزار بھی ہے۔ یہ کشادہ جگہ دار العلوم کراچی کے نام الاٹ ہو گئی، اس زمین کے کاغذات مل گئے، قبضہ مل گیا، اور ایک کمرہ بھی بنا دیا گیا، ٹیلیفون بھی لگ گیا، اس کے بعد دار العلوم کا سنگ بنیاد رکھتے وقت ایک جلسہ تاسیس منعقد ہوا، جس میں پورے پاکستان کے بڑے بڑے علماء کرام اور تمام اسلامی ممالک کے سفراء حضرات تشریف لائے۔

اس جلسے کے موقع پر کچھ حضرات نے جھگڑا کھڑا کر دیا کہ یہ جگہ دار العلوم کو نہیں ملنی چاہیے تھی، بل کہ فلاں کو ملنی چاہیے تھی۔ اتفاق سے جھگڑے میں ان لوگوں نے ایسی بزرگ ہستیوں کو بھی شامل کر لیا، جو حضرت والد صاحب کے لیے باعثِ احترام تھیں۔ والد صاحب نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ یہ جھگڑا کسی طرح ختم ہو جائے، لیکن وہ ختم نہیں ہوا۔ والد صاحب نے یہ سوچا کہ جس مدرسے کا آغاز ہی جھگڑے سے ہو رہا ہے، تو اس مدرسے میں کیا برکت ہوگی؟

چناں چہ والد صاحب نے اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ میں اس زمین کو چھوڑتا ہوں مجھے اس میں برکت نظر نہیں آتی۔

دار العلوم کی مجلس منتظمہ نے یہ فیصلہ سنا تو انہوں نے حضرت والد صاحب سے کہا: حضرت! یہ آپ کیسا فیصلہ کر رہے ہیں؟

اتنی بڑی زمین، وہ بھی شہر کے وسط میں، ایسی زمین ملنا بھی مشکل ہے۔ اب جب کہ یہ زمین آپ کو مل چکی ہے۔ آپ کا اس پر قبضہ ہے۔ آپ ایسی زمین کو چھوڑ کر الگ ہو رہے ہیں؟

حضرت والد صاحب نے جواب میں فرمایا: میں مجلس منتظمہ کو اس زمین کے چھوڑنے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس لیے کہ مجلس منتظمہ درحقیقت اس زمین کی مالک ہو چکی ہے۔ آپ حضرات اگر چاہیں تو مدرسہ بنا لیں۔ میں اس میں شمولیت اختیار نہیں کروں گا، اس لیے کہ جس مدرسے کی بنیاد جھگڑے پر رکھی جا رہی ہو اس مدرسے میں مجھے برکت نظر نہیں آتی۔ پھر حدیث سنائی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے میں اس کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔[1]

آپ حضرات یہ کہہ رہے ہیں کہ شہر کے بیچوں بیچ ایسی زمین کہاں ملے گی، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میں اس کو جنت کے بیچ میں گھر دلواؤں گا۔ یہ کہہ کر اس زمین کو چھوڑ دیا۔ آج کے دور میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ کوئی شخص اس طرح جھگڑے کی وجہ سے اتنی بڑی زمین چھوڑ دے، لیکن جس شخص کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر کامل یقین ہے، وہی یہ کام کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ چند ہی مہینوں کے بعد اس زمین سے کئی گنا بڑی زمین عطا فرما دی، جہاں آج دار العلوم قائم ہے۔ یہ تو میں نے آپ حضرات کے سامنے ایک مثال بیان کی۔ ورنہ حضرت والد صاحب کو ہم نے ساری زندگی حتی الامکان اس حدیث پر عمل کرتے دیکھا۔ ہاں البتہ جس جگہ دوسرا شخص جھگڑے کے اندر پھنسا ہی لے، اور دفاع کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو وہ الگ بات ہے۔ ہم لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں کہ فلاں موقع پر فلاں شخص نے یہ بات کہی تھی، فلاں نے ایسا کیا تھا۔ اب ہمیشہ کے لیے اس کو دل میں بٹھا لیا، اور جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

آج ہمارے پورے معاشرے کو اس چیز نے تباہ کر دیا ہے۔ یہ جھگڑا انسان کے دین کو مونڈ دیتا ہے، اور انسان کے باطن کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس لیے خدا کے لیے

[1] ابو داود، الأدب باب في حسن الخلق: ۲/۳۰۷

آپس کے جھگڑوں کو ختم کر دو، اور اگر دو مسلمان بھائیوں میں جھگڑا دیکھو تو ان کے درمیان صلح کرانے کی پوری کوشش کرو۔[1]

جھگڑوں سے بچنے کے لیے شیطان سے پناہ مانگنا

آپس کے جھگڑے مسلمان کو دین و دنیا دونوں کی بھلائیوں سے محروم کر دیتے ہیں، ساری برائیوں کے منبع بنتے ہیں، سارے فسادات کی ابتداء کا ذریعہ یہی آپس کے جھگڑے بنتے ہیں، سب وشتم...... لعن طعن...... قطع تعلق...... ناچاقیاں...... وغیرہ اسی سے شروع ہوتی ہیں۔ اور اس کا نتیجہ دو آدمیوں سے شروع ہو کر سو آدمیوں تک پہنچتا ہے۔ جھگڑوں سے بچنے کے لیے شیطان سے پناہ مانگنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾[2]

تَرجَمَہ: ”اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ سے پناہ مانگ لیں، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔“

درحقیقت یہ آیت بھی اپنے ماقبل آیت (نمبر ۱۹۹) کے مضمون کی تکمیل ہے، کیوں کہ اس میں جو ہدایت دی گئی ہے کہ ظلم کرنے والوں اور جہالت سے پیش آنے والوں کی خطا سے درگزر کریں، ان کی برائی کا جواب برائی سے نہ دیں، یہ بات انسانی طبیعت کے لیے سب سے زیادہ بھاری اور شاق ہے، خصوصاً ایسے مواقع میں شیطان اچھے بھلے انسان کو بھی غصہ دلا کر لڑنے جھگڑنے پر آمادہ کر ہی دیتا ہے، اس

[1] اصلاحی خطبات: ۱۵۳/۶ تا ۱۵۵
[2] الاعراف: ۲۰۰

لیے دوسری آیت میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ اگر ایسے صبر آزما موقع میں غصہ کے جذبات زیادہ مشتعل ہوتے نظر آئیں تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لو۔

حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے سامنے دو شخص لڑ جھگڑ رہے تھے اور ایک شخص غصہ میں بے قابو ہو رہا تھا، آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص وہ کلمہ کہہ لے تو اس کا یہ اشتعال جاتا رہے، فرمایا: وہ کلمہ یہ ہے: ”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ“۔[1]

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۝﴾[2]

امام تفسیر ابن کثیر رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے اس جگہ ایک عجیب بات یہ لکھی ہے کہ پورے قرآن میں تین آیتیں اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم و تلقین کے لیے جامع آئی ہیں اور تینوں کے آخر میں شیطان سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے۔ ایک تو یہی سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۲۰۰ ہے، دوسری سورۂ مؤمنون کی یہ آیت ہے:

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۗ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ﴾[3]

تَرجَمَہ: ”یعنی دفع کرو برائی کو بھلائی سے، ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ کہا کرتے ہیں اور آپ یوں دعا کیجیے کہ اے میرے پروردگار! میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے دباؤ سے اور اے میرے پروردگار! میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔“

[1] بخاری، الادب، باب الحذر من الغضب: ۹۰۳/۲، معارف القرآن ۱۶۸/۴
[2] الاعراف: ۱۹۹
[3] المؤمنون: ۹۶ تا ۹۸

تیسری آیت سورۂ حم سجدہ کی یہ ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝﴾[1]

ترجمہ: ”یعنی نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی۔ آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کریں، پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی، وہ ایسا ہو جائے گا، جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے۔ اور یہ بات انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، جو بڑے مستقل مزاج ہیں۔ اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے، جو بڑا صاحب نصیب ہے۔ اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کیجیے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔“

ان تینوں آیتوں میں غصہ دلانے والوں سے عفو و درگزر اور برائی کے بدلہ میں بھلائی کرنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو انسانی جھگڑوں سے خاص دلچسپی ہے۔ جہاں جھگڑے کا کوئی موقع پیش آتا ہے، شیاطین اس کو اپنی شکارگاہ بنالیتے ہیں۔ اور بڑے سے بڑے بردبار باوقار آدمی کو غصہ دلا کر حدود سے نکال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کا علاج یہ ہے کہ جب غصہ قابو میں نہ آتا دیکھیں تو سمجھ جائیں کہ شیطان مجھ پر غالب آرہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اس سے پناہ مانگیں۔ تب

[1] حم السجدۃ: ۳۴ تا ۳۶

مکارم اخلاق کی تکمیل ہو سکے گی۔ اسی لیے بعد کی تیسری اور چوتھی آیت میں بھی شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت دی گئی ہے۔[1]

کتاب ”حقائق الایمان بالملائکہ والجان“ میں شیخ خالد بن محمد علی الحاج نے شیطان سے پناہ مانگنے کی اہمیت کے بارے میں اور خصوصاً قرآن کریم کی قراءت سے پہلے شیطان سے پناہ مانگنے کی چھ وجوہات لکھی ہیں۔ اسی طرح امام ابن جوزی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے ”تلبیس ابلیس“ میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔

ائمہ کرام کو چاہیے کہ امام ابن جوزی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی اس تصنیف کا ضرور مطالعہ فرمائیں، اس کتاب کے بارے میں کسی نے کہا ہے:

”بِعِ الْقَمِيصَ وَاشْتَرِ التَّلْبِيسَ تَنْتَصِرْ عَلَى إِبْلِيسَ“[2]

ترجمہ: ”قمیص بیچ کر ”تلبیس“ خرید لو تو ابلیس کے مقابلے میں تمہاری مدد کی جائے گی۔“

یعنی یہ کتاب اتنی اہم ہے کہ اگر پیسہ نہ ہو تو اس کتاب کو قمیص بیچ کر بھی خرید لو تاکہ تم ابلیس کی چالوں اور مکر و کید سے واقف ہو کر اس سے بچ جائیں۔

اور بعض نے کہا:

”بِعِ الْغَالِيَ وَالنَّفِيسَ وَاشْتَرِ التَّلْبِيسَ تَقْتَلِعْ جُذُورَ الشَّرِّ وَتُطَهِّرِ الْأَرْضَ مِنْ رُسُلِ إِبْلِيسَ“[3]

ترجمہ: ”ہر مہنگی اور عمدہ چیز بیچ کر ”تلبیس“ خرید لو، برائی کو جڑ سے کاٹ کر زمین ابلیس کے نمائندوں سے پاک کر لو۔“

ائمہ کرام کو چاہیے کہ اس کتاب کا اور ”إِغَاثَةُ اللَّهْفَانِ مِنْ مَصَايِدِ

[1] معارف القرآن: ۴/ ۱۵۸، ۱۵۹، الاعراف: ۲۰۰ بحوالہ تفسیر ابن کثیر: ۵۶۲، الاعراف: ۱۹۹

[2] احکام الجان: ۳۳۵ [3] احکام الجان: ۳۳۵

الشیطان" ان دو کتابوں کا ہدایت واصلاح کی نیت سے ضرور مطالعہ فرمائیں۔

ائمہ حضرات کے لیے چند ضروری کتابیں

ہر امام کو چاہیے کہ کتاب دوست بننے کی کوشش کرے، کتابوں سے بے پناہ انس اور لگاؤ ہو، کتاب پڑھیں تو آسانی سے نیند آجائے، طبیعت ایسی بن جائے کہ مطالعہ کیے بغیر نیند نہ آئے۔

خوش بختی کے اسباب میں سے یہ چیزیں بھی ہیں کہ آدمی کو مطالعہ کے لیے یکسوئی، پڑھنے کا اہتمام اور اس کے ذریعے حاصل ہونے والے فائدوں سے دانش مندی حاصل ہو جائے۔

امام جاحظ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (جو کہ عربی ادب کی مشہور و معروف شخصیت ہیں) غم و پریشانی دور کرنے کے لیے کتابیں پڑھنے کی تاکید کرتے ہوئے کتاب کی خصوصیات اور فوائد پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"کتاب ایسی چیز ہے کہ نہ (حد سے زیادہ تعریف کرکے) خوش فہمی میں ڈالتی ہے ...... نہ کبھی دھوکہ دیتی ہے ...... نہ کبھی آدمی اس سے بے زار ہوتا ہے ...... ایسی بخت ہے کہ اپنے پڑھنے والے سے کچھ نہیں چاہتی ...... کبھی ٹال مٹول سے کام نہیں لیتی ...... چاپلوسی اور خوشامد نہیں کرتی ...... کہ مجھے کچھ (مال وغیرہ) مل جائے ...... نہ کبھی جھوٹ یا دوغلے پن سے پیش آتی ہے ...... کتاب کبھی سوتی نہیں اور نہ ہی جاگنے سے تھکتی ہے ...... کتاب ایسی معلم ہے کہ آپ جب فائدہ اٹھانا چاہیں یہ حاضر ہوگی ...... کتاب کے ہوتے ہوئے کسی کی ضرورت نہیں اور کتاب کی موجودگی کی وجہ سے تنہائی کی وحشت دور ہو جاتی ہے ...... آدمی تنہائی سے جان چھڑا کر بری صحبت کے عذاب میں گرفتار ہونے سے بچ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ کتابیں پڑھنے کے یہ فائدے ہیں:

1. صلاحیتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔
2. ذہن تیز ہو جاتا ہے۔
3. زبان کھل جاتی ہے (یعنی لوگوں کو سمجھانا آجاتا ہے)۔
4. ذخیرۂ الفاظ بڑھ جاتا ہے۔
5. مزاج معتدل اور خوش گوار ہو جاتا ہے۔
6. سینہ مختلف علوم سے بھر جاتا ہے۔
7. انسان عام لوگوں کی عزت کرنا اور بڑوں سے پکی بات کہنا سیکھ جاتا ہے۔
8. بعض چیزیں اور باتیں جو لوگوں کے ساتھ رہ کر بڑے عرصے میں سیکھی جاتی ہیں تو وہ انسان صرف چند دنوں میں مطالعہ سے حاصل کر لیتا ہے۔

لہٰذا زیادہ سے زیادہ وقت کتب خانہ میں گزاریں، اخبارات پڑھنے کے بجائے اکابر و اسلاف کی سوانح مطالعہ کرنے کی عادت ڈالیں۔ اکثر اخبارات غیبت اور جھوٹ کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ اخبار پڑھنے کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان پڑھنے کے بعد جب تک دوسروں کو نہ بتائے چین نہیں آتا، تو غیبت اور جھوٹ پھیلانے کا گناہ الگ سر پر ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے حالات معلوم کرکے اس پر رو رو کر دعائیں نہ کرنے کا وبال الگ، مخلوق سے ہونے کا تذکرہ پڑھ پڑھ کر آدمی کے ایمان و یقین میں کمزوری آتی ہے کہ فلاں ملک کے حاکم نے یوں کہا ہے اور یوں کہا ہے کہ میں یوں کردوں گا اور میں یوں کردوں گا ...... وغیرہ۔

اخبارات میں تصاویر ہوں تو اس کا الگ گناہ۔ لہٰذا اخبارات سے خوب بچیں، خود بھی کتاب دوست بنیے اور اپنے مقتدیوں کو بھی کتاب دوست بنائیے۔

ذیل میں چند کتب کے نام لکھے جاتے ہیں، وہ آپ اپنے مطالعے میں رکھیے اور مقتدیوں کے لیے بھی چند کتب کے نام لکھے جاتے ہیں، ائمہ کرام ان کو بھی

ترغیب دیں کہ وہ بھی یہ کتابیں اپنے مطالعے میں رکھیں۔

کتاب کا نام ــــ مولف کا نام ــــ مطبع

مجالس علم وذکر........ (شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب)..... (مکتبہ فاروقیہ کراچی)

اصلاحی خطبات............ (مفتی محمد تقی عثمانی)..... (میمن اسلامک پبلشرز کراچی)

آداب المتعلمین.............. (مولانا قاری صدیق احمد)........ (مجلس نشریات اسلام)

کتابوں کی درسگاہ میں .... (مولانا ابن الحسن عباسی)......... (مکتبہ عمر فاروق کراچی)

حیاۃ الصحابہ .... (مولانا محمد یوسف کاندھلوی)....... (کتب خانہ فیضی لاہور)

اشرف السوانح................ (خواجہ عزیز الحسن مجذوب)...... (مکتبہ سید احمد شہید لاہور)

تذکرۃ الخلیل.............. (سوانح مولانا خلیل احمد سہارنپوری).......... (مکتبہ شیخ کراچی)

آپ بیتی.................... (مولانا محمد زکریا کاندھلوی)........... (معہد الخلیل الاسلامی)

حیات طیبہ .... (سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری)...... (دارالاشاعت کراچی)

مثالی استاذ (مکمل دو حصے)...... (محمد حنیف عبدالمجید)........... (بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

البلاغ نمبر .... (مرتبہ مفتی محمد تقی عثمانی)........... (مکتبہ دارالعلوم کراچی)

پرانے چراغ .... (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی).. (مجلس نشریات اسلام کراچی)

تذکرۃ الرشید............... (سوانح مولانا رشید احمد گنگوہی)....... (دارالاشاعت کراچی)

سیرت مولانا محمد علی مونگیری .. (سوانح مولانا محمد علی مونگیری)......... (دارالاشاعت کراچی)

تراشے..................... (مفتی محمد تقی عثمانی)............. (ادارۃ المعارف کراچی)

شرح اسمائے حسنی............... (اساتذہ بیت العلم)............ (بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

تحفۃ العلماء................ (مولانا اشرف علی تھانوی) ... (ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

متاع وقت اور کاروان علم...... (مولانا ابن الحسن عباسی)......... (مکتبہ عمر فاروق کراچی)

سوانح مولانا محمد عمر پالن پوری (مفتی محمد پالن پوری)..................... (زمزم پبلشرز)

تاریخ دعوت وعزیمت........ (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی).. (مجلس نشریات اسلام کراچی)

منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین.... (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)............ ()

مقتدیوں کے لیے کتب

نقوش رفتگاں .... (مفتی محمد تقی عثمانی صاحب)........ (ادارۃ المعارف کراچی)

مثالی باپ........................ (محمد حنیف عبدالمجید)......... (بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

گھریلو جھگڑے اور ان کا حل........... (ابن فرید).................. (زمزم پبلشرز کراچی)

پریشانی کے بعد راحت .... (مترجم خلیل الرحمن).............. (مکتبہ بیت العلم کراچی)

اکابر کا مقام عبادت............. (مولانا محمد امداد اللہ انور)....... (مکتبہ دارالمعارف ملتان)

مظلوم کی آہ....!................ (مترجم خلیل الرحمن)............ (مکتبہ بیت العلم کراچی)

فضائل رمضان .... (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا)..... (مکتبہ شیخ بہادر آباد کراچی)

موت کی یاد .... (مولانا محمد زکریا)........... (مکتبہ شیخ بہادر آباد کراچی)

اللہ سے شرم کیجیے .... (مفتی محمد سلمان منصور پوری)........ (مکتبہ المصباح لاہور)

دنیا کی حقیقت (حصہ اول ودوم) .. (مولانا محمد یوسف لدھیانوی).... (مکتبہ لدھیانوی کراچی)

ملفوظات عارفی .... (ڈاکٹر عبدالحی عارفی کے ملفوظات)..... (مکتبہ لدھیانوی کراچی)

مقتدیوں کے گھر والوں کے لیے کتب

ایک منٹ کا مدرسہ .... (مولانا محمد حکیم اختر صاحب) .. (کتب خانہ مظہری، کراچی)

معرفت الٰہیہ .... (مولانا محمد حکیم اختر صاحب) .. (کتب خانہ مظہری، کراچی)

مثالی عورت........................ (مولانا محمد ارشاد صاحب)......... (زمزم پبلشرز، کراچی)

ہندوستان کی بیس بڑی خواتین ..... (مولانا محمد حسن صدیقی)............ (زمزم پبلشرز، کراچی)

مثالی ماں............................ (محمد حنیف عبدالمجید) .... (بیت العلم ٹرسٹ، کراچی)

اپنی نمازیں درست کیجیے .... (مولانا اشرف علی تھانوی)....... (ادارۃ المعارف، کراچی)

خواتین اسلام کے ایمان افروز واقعات.. (مولانا محمد حسین صدیقی). (زمزم پبلشرز، کراچی)

شرعی پردہ کیوں اور کیسے .... (مولانا محمد حسین صدیقی) .... (زمزم پبلشرز، کراچی)

ہدیہ خواتین .... (مولانا عثمان نوری والا) ...... (بیت العلم ٹرسٹ، کراچی)

مسنونہ معمولات صبح وشام .... (ابو محمد زھری صاحب) ...... (بیت العلم ٹرسٹ، کراچی)

تحفۂ دلہن .... (محمد حنیف عبدالمجید) ...... (بیت العلم ٹرسٹ، کراچی)

تحفۂ زوجین .... (مولانا اشرف علی تھانوی) .... (مکتبہ رشیدیہ، کراچی)

تحفۂ خواتین .... (مولانا محمد عاشق الٰہی) .... (دار الاشاعت، کراچی)

بہادر خواتین اسلام .... (مولانا سید سلیمان ندوی) ...... (بیت العلم ٹرسٹ، کراچی)

مقتدیوں کے بچوں کے لیے کتب

پرنور دعائیں .... (مفتی محمد تقی عثمانی) .... (ادارۃ المعارف، کراچی)

اصلاحی خطبات جلد ۱۳ .... (مفتی محمد تقی عثمانی) .... (میمن اسلامک پبلشرز)

اخلاق سلف .... (مولانا حکیم محمد اختر) .... (زمزم پبلشرز، کراچی)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں اور ان کا شکر. (مولانا عبدالعزیز صاحب) (زمزم پبلشرز، کراچی)

صحابہ کرام کے واقعات .... (محمد حنیف عبدالمجید) .... (دار الہدیٰ، کراچی)

تابعین کے واقعات .... (محمد حنیف عبدالمجید) .... (دار الہدیٰ، کراچی)

صحابہ کی زندگی .... (محمد حنیف عبدالمجید) ...... (بیت العلم ٹرسٹ، کراچی)

حافظ قرآن کا مقام ...... (مولانا عبدالرحمٰن کوثر صاحب) ...... (زمزم پبلشرز، کراچی)

حصول علم کے آداب .... (مولانا ارشاد احمد فاروقی) .... (زمزم پبلشرز، کراچی)

تحفۂ دی .... (مولانا مفتی محمد ارشاد قاسمی) .... (زمزم پبلشرز، کراچی)

اسٹوری ٹائم حصہ اول ودوم ...... (اساتذہ بیت العلم) ...... (بیت العلم ٹرسٹ، کراچی)

ذوق وشوق حصہ اول تا پنجم ...... (اساتذہ بیت العلم) ...... (بیت العلم ٹرسٹ، کراچی)

نورانی قاعدہ حصہ اول تا سوم (مولانا محمد عمران برنی) .... (مکتبہ دار الہدیٰ، کراچی)

کہانیوں کی دنیا .... (مولانا محمد سعد) .... (مکتبہ دار الہدیٰ، کراچی)

اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے مقتدیوں کے لیے

قرار دل .... (مولانا مفتی رضاء الحق صاحب) ...... (زمزم پبلشرز، کراچی)

اصلاح دل .... (مولانا حاجی محمد شریف صاحب) (ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان)

شیاطین سے حفاظت ...... (مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی صاحب) ...... (زمزم پبلشرز، کراچی)

بہترین جہیز .... (مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی) ...... (مکتبہ دار الہدیٰ، کراچی)

اسلامی آداب .... (مولانا محمد زبیر صاحب) .... (مکتبہ دار الہدیٰ، کراچی)

انگریزی جاننے والے مقتدیوں کے لیے

دو شہید (Two Martyr) .... (مفتی محمد شفیع صاحب) .. (زمزم پبلشرز، کراچی)

کتاب استغفار (انگریزی) .... (مولانا اشرف علی تھانوی) (زمزم پبلشرز، کراچی)

اخلاق سلف (انگریزی) .... (مولانا حکیم محمد اختر) .... (زمزم پبلشرز، کراچی)

جنت والے اعمال (انگریزی) ...... (مولانا محمد عبداللہ درخواستی) (زمزم پبلشرز، کراچی)

دروس العلم (انگریزی) .... (شیخ ابو الفتاح ابو غدہ) ... (زمزم پبلشرز، کراچی)

طریقۂ وصیت (The Will) .... (محمد حنیف عبدالمجید) ... (زمزم پبلشرز، کراچی)

ملفوظات مولانا محمد الیاس (انگریزی) (مولانا محمد منظور نعمانی) ...... (زمزم پبلشرز، کراچی)

اصلاحی خطبات (انگریزی) .... (مفتی محمد تقی عثمانی) .... (میمن پبلشرز، کراچی)

مثالی استاذ (حصہ اول انگریزی) ...... (محمد حنیف عبدالمجید) (بیت العلم ٹرسٹ، کراچی)

مثالی ماں (انگریزی) .... (محمد حنیف عبدالمجید) ...... (دار الہدیٰ، کراچی)

مثالی باپ (انگریزی) .... (محمد حنیف عبدالمجید) ...... (دار الہدیٰ، کراچی)

تحفۂ دلہن (انگریزی)........ (محمد حنیف عبدالمجید) (بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

شرح اربعین نووی........ (مولانا عاشق الٰہی صاحب)... (دار الہدیٰ کراچی)

استغفار کی ستر دعائیں (انگریزی)..... (محمد حنیف عبدالمجید) ..... (بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

مستند مجموعہ وظائف (انگریزی زیر طبع) .... (احباب بیت العلم ٹرسٹ) (بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

ائمہ حضرات کے لیے چند عربی کتب

كتاب الزهد والرقائق........ (عبدالله بن مبارك).... (دار الكتب العلمية بيروت)

زاد المعاد في هدي خير العباد . (علامه ابن قيم)..... (دار الكتب العلمية بيروت)

الفوائد........ (علامه ابن القيم)..... (دار الكتب العلمية بيروت)

قيمة الزمن عند العلماء .....(شيخ عبدالفتاح ابو غدة) .... (دار الكتب بيروت)

صفحات من صبر العلماء ..(شيخ عبدالفتاح ابو غدة) .... (دار الفكر بيروت)

اسرار الصلاة........ (علامه ابن القيم)........ (رياض سعودي)

مدارج السالكين........ (علامه ابن القيم)...... (مطابع القصيم بالرياض)

حياة الصحابه.... (مولانا محمد يوسف كاندهلوي) ... (كتب خانه فيضي لاهور)

تفسير ابن كثير .... (علامه ابن كثير)..... (دار السلام للنشر والتوزيع)

رسالة المسترشدين ....(شيخ محمد حارث المحاسبي) ...... (دار الفكر بيروت)

باب ہشتم

ائمہ کرام کی دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریاں

مسلمانوں کی جماعت وہ جماعت ہے، جو اللہ کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر دنیا میں آئی ہے، اس پیغام کو قائم رکھنا، اس کو پھیلانا اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا ویسے تو جماعت کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے، لیکن ائمہ کرام پر یہ ذمہ داری عوام کے بہ نسبت کچھ زیادہ ہی عائد ہوتی ہے، کیوں کہ ائمہ کرام وارثینِ انبیاء علیہم الصلاۃ ہیں۔

لہٰذا اس حال میں ائمہ کرام کا فرض زیادہ بنتا ہے کہ وہ مصلحین امت بن کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں، کیوں کہ حکیمانہ تبلیغ و دعوت امر بالمعروف، نہی عن المنکر اسلام کے جسم کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اس پر اسلام کی بنیاد، اسلام کی قوت کی وسعت اور اسلام کی کامیابی منحصر ہے اور آج سب زمانوں سے بڑھ کر اس کی ضرورت ہے اور غیر مسلمانوں کو مسلمان بنانے سے زیادہ اہم کام مسلمانوں کو کامل مسلمان، نام کے مسلمانوں کو کام کے مسلمان اور قومی مسلمانوں کو دینی بنانا ہے، حق یہ ہے کہ آج مسلمانوں کی حالت دیکھ کر قرآن کی یہ ندا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا﴾[1] اے مسلمانو! مسلمان بنو۔

کو پورے زور و شور سے بلند کیا جائے، شہر شہر گاؤں گاؤں اور در در پھر کر مسلمانوں کو مسلمان بنانے کا کام کیا جائے اور اس راہ میں وہ جفاکشی، وہ محنت کشی اور

[1] النساء: ۱۳۶

وہ ہمت اور وہ قوت مجاہدہ صرف کی جائے جو دنیا دار لوگ دنیا کے عزۃ و جاہ اور حصول طاقت میں صرف کر رہے ہیں، جس حصول مقصد کی خاطر ہر متاع عزیز کو قربان کرنے اور ہر مانع کو بیچ سے ہٹانے کے لیے نا قابل تسخیر طاقت پیدا ہوتی ہے کوشش سے کوشش سے، جان و مال سے ہر راہ سے اس میں قدم آگے بڑھایا جائے اور حصول مقصد کی خاطر وہ جنون کی کیفیت اپنے اندر پیدا کی جائے اس کے بغیر دین و دنیا کا نہ کوئی کام ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

علماء وارثِ انبیاء ہیں

انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے تھے تو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے جو نائبین ہیں ان کا کام بھی وہی ہے جو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا کام تھا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم ساری دنیا کے انسانوں کو مادی چیزوں سے ہٹا کر ان کا رخ اللہ کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں۔ ساری دنیا کے انسانوں کو دین کی طرف دعوت دینے والے بنیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کا دین سکھائیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ [1]

ترجمہ: ''ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہوتا ہے۔''

تفسیر ابن کثیر میں ہے ''أَيْ وَلِكُلِّ قَوْمٍ دَاعٍ'' [2]

آپ بھی اپنی قوم کو دعوت کے ذریعہ ہدایت پر لا سکتے ہیں۔ لہٰذا خود بھی داعی بنئے اور تمام مقتدیوں کو داعی بنائیے۔

خالد ابن عبداللہ القرشی اپنی کتاب......

''تَرْبِيَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَصْحَابِهٖ'' میں لکھتے ہیں:

[1] الرعد: ٧ [2] تفسیر ابن کثیر: ٧٠٠

''وَلَمْ يَكْتَفِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَنْ يَأْمُرَ أَصْحَابَهُ بِتَعْلِيمِ الْعِلْمِ دَاخِلَ الْمَدِينَةِ فَقَطْ. بَلْ كَانَ يَبْعَثُ بَعْضَهُمْ إِلَى خَارِجِ الْمَدِينَةِ لِكَيْ يَقُومُوا بِتَعْلِيمِ أُمُورِ دِينِهِمْ تَفْقِيهِهِمْ أَحْكَامَهُ. فَفِي السَّنَةِ الثَّالِثَةِ مِنَ الْهِجْرَةِ قَدِمَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ مَعْرَكَةِ أُحُدٍ، رَهْطٌ مِنْ عَضَلٍ وَالْقَارَةِ، فَقَالُوا: "يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ فِينَا إِسْلَامًا فَابْعَثْ مَعَنَا نَفَرًا مِنْ أَصْحَابِكَ يُفَقِّهُونَا فِي الدِّينِ وَيُقْرِئُونَا الْقُرْآنَ، وَيُعَلِّمُونَا شَرَائِعَ الْإِسْلَامِ" فَبَعَثَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَهُمْ نَفَرًا سِتَّةً.'' [1]

ترجمہ: ''نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو صرف مدینہ کے اندر ہی دین سیکھنے اور سکھانے (تعلیم و تعلم) کے حکم دینے پر اکتفا نہیں فرمایا، بل کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مدینہ سے باہر بھی بھیجتے تھے، تاکہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں اور ان کو دین کے احکام سمجھائیں۔

چناں چہ ٣ھ میں غزوۂ احد کے بعد قبیلۂ عضل والقارہ کے ایک وفد نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ اے اللہ کے رسول! ہم مسلمان ہیں آپ ہمارے ساتھ اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت بھیج دیجیے، جو ہمیں دین سمجھائیں، قرآن مجید پڑھائیں اور اسلام کے شرائع کی تعلیم دیں، تو نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ چھ آدمی بھیج دیے۔''

ہم نے اگر ہر آدمی کو اپنے مقتدیوں میں سے داعی بنا دیا تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم سو رہے ہوں گے، کھا رہے ہوں گے اپنے دوسرے تقاضوں میں ہوں گے یہاں تک کہ ہم انتقال کر جائیں گے، لیکن دعوت چلتی رہے گی، مثلاً آپ نے عشاء کے بعد ١٠ منٹ مقتدیوں کو درس دیا اور یہ ترغیب دی کہ ١٥ منٹ آپ لوگ دو ساتھی

[1] تربیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لأصحابہ: ١٨٩ ...... طبقات ابن سعد: ٢١/٢

امیر صاحب سے مشورہ کر کے فلاں فلاں کے گھر جائیں اور ان کو نماز میں آنے کی
اور درس میں بیٹھنے کی دعوت دے آئیں، اور یہ باتیں دوسروں تک پہنچائیں، اب آپ
گھر جا کر صبح کے لیے مطالعہ کر رہے ہیں اور دعوت چل رہی ہے، آپ صبح مدرسے میں
جا کر بچوں کو دین سکھا رہے ہیں، آپ کا ایک مقتدی کراچی سے حیدرآباد جا رہا ہے
اور وہ بس میں دعوت دے رہا ہے، اپنے پڑوسی کو پیار محبت سے دوستی کر کے اس بات
پر آمادہ کر لیتا ہے، بھائی امیری سورۂ فاتحہ سن لو اس نے سنی، پھر کہا تم بھی سنا دو اور پھر
اس کی سورۂ فاتحہ ٹھیک کروائی اور اس کو کہا کہ مزید اپنی مسجد کے امام صاحب سے ٹھیک
کروائیں اور اپنی اہلیہ کی بھی کسی ماہر معلّمہ سے سورۂ فاتحہ اور نماز ٹھیک کروائیں، اس
طرح لمبا سلسلہ بناتے جایئے۔

بچوں کے لیے دینی و اخلاقی تربیتی کورس

ہر قوم و نسل میں بچوں کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے، کیوں کہ یہی بچے بڑے
ہو کر اس قوم کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں۔ لہٰذا سمجھ دار قومیں اپنی نئی نسل پر خاص توجہ
دیتی ہیں۔ ہمیں اپنی نئی نسل پر خاص توجہ دینی ہوگی، کیوں کہ جو چیز بچے کے خالی
ذہن پر بچپن سے نقش کر دی جاتی ہے وہ بڑھاپے تک ذہن میں رہتی ہے۔ اگر بچپن
میں ان معصوم پھولوں کی تربیت صحیح دینی اور اخلاقی ماحول میں ہوگی تو وہ بڑے ہو کر
جب مختلف عہدوں پر فائز ہوں گے تو پھر ہر ادارہ ان کی برکت سے پاکیزہ و اسلامی
ماحول اور اخلاق کا بہترین نمونہ پیش کرے گا، ہر شعبے کے امور کو صحیح طور پر انجام
دیا جانے لگے گا اور پھر ساری دنیا کے لوگوں کے سامنے اسلام کی صحیح شکل آ سکے گی
اور اسے اپنے لیے قبول کرنا آسان ہو جائے گا۔

جس طرح چمن کی آبیاری میں چمن کا مالی نازک کونپلوں اور کومل کلیوں
کی نگہداشت پر زیادہ توجہ دیتا ہے اسی طرح سمجھ دار قومیں اپنی نئی نسل کی اخلاقی

تربیت پر خصوصی توجہ دیتی ہیں۔ اگر ان نرم و نازک کونپلوں کو ایمان و عمل، سیرت و
کردار اور اخلاق و گفتار کے صحیح رخ پر ڈال دیا جائے تو آگے چل کر یہ ایسا تناور
درخت بن جاتی ہیں جن پر ایمان سوز ہواؤں کے جھکڑ اور ماحول کی اخلاقی آلودگی
اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اگر ہماری نئی نسل میں بچپن ہی سے قرونِ اولیٰ کے مسلمان
بچوں جیسی صفات مثلاً: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت، مکمل اتباع، سچ
بولنے کی عادت، بڑوں کا ادب اور دین پھیلانے کا جذبہ پیدا ہو گیا تو کسی بھی شعبے
میں مادی اشیاء کی چکا چوند یا مصنوعی کشش ان کے کردار کو متزلزل نہ کر سکے گی۔

اس سلسلے میں مساجد کے ائمہ کرام کی خدمت میں نہایت ہی ادب سے عرض
ہے کہ ہر سال گرمیوں کی آمد پر عصری تعلیم گاہوں (اسکول و کالج) میں سالانہ تعطیل
ہوتی ہے اور یہ تعطیل تقریباً دو ماہ کی ہوتی ہے، ان دو ماہ میں بچوں کے فارغ اوقات
کو کسی اچھے مصرف میں لگا دیں، کیوں کہ محلّے کے بچے، نوجوان، مرد اور عورتیں ہماری
رعیت میں داخل ہیں، اس کے بارے میں ہم عند اللہ مسئول ہو سکتے ہیں، اس لیے
ہمیں اپنی رعیت کی تعلیم و تربیت کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے، ہر لمحہ اور
ہر موقع پر فکر ہو کہ میرے محلّے کے ہر شخص کی تربیت ہو جائے، اس کے لیے جو چند
تجربے ہمیں ہوئے اور جن مواقع سے فائدہ اٹھایا جا سکا وہ آپ کی خدمت میں پیش
کر رہے ہیں، آپ بھی اپنی مساجد میں حسبِ موقع اور حسبِ حال ایسے اسباق
شروع کریں تو ان شاء اللہ آپ کے محلّے کے ہر ایک بچے کو فائدہ ہوگا اور یہ بچے
لغویات، فضولیات اور معاصی سے بچ کر اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں شامل ہو
سکتے ہیں۔ بچے گھروں میں پابند تو رہ نہیں سکتے لازماً باہر نکلیں گے، جس کے نتیجے میں
ان کے بے دینی اور آلودگی کے ماحول سے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے کیوں کہ بچے یا
تو ویڈیو کی دکانوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں، یا فٹ پاتھ اور ہوٹلوں میں
بیٹھ کر، یا گیند بلا ہاتھ میں لے کر پڑوسیوں اور راہ گیروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ اپنے ماحول پر محنت نہیں کرو گے تو تمہاری اولاد بھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ہمارے بچے بھی محلے کے بچوں کے ساتھ ویسے ہی زبان بولنے لگ جائیں گے جو محلے کے آوارہ بچے بولتے ہیں۔ ان ہی کا لباس پسند کریں گے، ان ہی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند کریں گے۔

لہٰذا ہمیں اپنے بچوں اور محلے کے بچوں کی دین داری کی فکر کرنی ہوگی۔

حضرت مولانا عبید اللہ خالد صاحب مدظلہ العالی بچوں کی اصلاح کے لیے لکھی گئی کتاب ''ذوق وشوق'' کی تقریظ میں لکھتے ہیں:

''اس دور کا مشکل ترین کام اپنے بچوں کی صحیح اسلامی خطوط پر تربیت کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچے کھانے پینے کی چیز نہیں جنہیں خراب ہونے سے بچانے کے لیے فریج میں رکھا جائے یا دیگر انتظامات کیے جائیں۔ بچے فقط سونے چاندی کی طرح بھی نہیں کہ انہیں تجوری میں بند کر کے خطرات سے محفوظ کر دیا جائے۔

یہ امر ضروری ہے کہ بچوں کو تحصیل علم وتجربے کی خاطر گھروں سے باہر نکال کر درس گاہوں میں بھیجا جائے۔ ان کی جسمانی نشو ونما کے لیے انہیں باغات اور میدانوں میں بھیجا جائے۔ سماجی ضرورت کی خاطر ان کا رشتہ داروں اور احباب سے ملنا جلنا ابتدا ہی سے ہوتا رہے۔ ان کی ذہنی ترقی کے لیے ان کے ذاتی دوستوں کا وجود ضروری ہے۔ مگر یہ ضرورتیں ایسی ہیں جن کو پورا کرنے کے دوران بچوں کے بگڑ جانے کا پورا پورا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ کیوں کہ درس گاہوں میں، باغات میں اور سماجی تقریبات میں یہ بچے اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ گھلتے ملتے ہی ہیں اور برائی وبا کی مانند پھیلتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنی کم عمری اور نا سمجھی کے باعث یہ بچے ''اچھوں'' اور ''بروں'' میں تمیز بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا والدین کی ساری تربیتی کوششوں پر پانی پھر جانے کا امکان بہرحال موجود رہتا ہے۔

اس ساری صورت حال کے باعث سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیا کریں؟

اس سوال کا آسان اور قابل عمل جواب یہ ہے کہ اپنے بچوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرنے کے علاوہ عملی نمونہ اپنی سیرت وکردار سے پیش کیا جائے اور ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے بچوں پر اچھے اثرات پڑتے ہوں اور برے اثرات سے ان کی حفاظت ہوتی ہو اور بس! بظاہر قانون خداوندی یہی ہے کہ جو کچھ انسان کے بس میں ہو وہ کر ڈالے تو جو کچھ انسان کے بس میں نہیں ہوتا اس کا انتظام اللہ تعالیٰ فرما دیتے ہیں، لیکن یہ انتظام بقدر جذبہ وکاوش ہوا کرتا ہے۔ جتنی کوشش انسان نے کی ہوگی اور جتنا اخلاص انسان کے اندر ہوگا، اللہ تعالیٰ کی مدد بھی اسی کے بقدر آئے گی۔[1]

تربیتی کورس کے فوائد

1. اس کورس میں بچوں کو ضروری شرعی مسائل اور دیگر دینی معلومات سکھلائی جاتی ہیں، جو کہ نہ صرف ہماری اور ہماری اولاد کی شرعی ضرورت ہے، بل کہ ہمارے فرائض میں بھی داخل ہے۔
2. بچے جب کچھ عرصہ اپنے مذہبی مرکز (مسجد) سے جڑے رہیں گے تو ان کا دینی شعور برقرار و بیدار رہے گا، ورنہ خدانخواستہ وہ غیروں کی تعلیم وتربیت کا اثر لے کر ہمارے درمیان ان کے نمائندہ کا کردار ادا کریں گے اور دین سے بے زاری آہستہ آہستہ ان کا شعار بن جائے گی۔
3. فرائض و واجبات اور اعمال صالحہ کی عادت اور رجحان نصیب ہوگا، کیوں کہ اس ''کورس'' میں صحیح تلفظ کے ساتھ تلاوت قرآن اور نمازوں کی عملی مشق کا خاصا اہتمام کرایا جاتا ہے۔ اس اہتمام کی بدولت والدین اس ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ

[1] ذوق وشوق حصہ اول ''کہانی کہانی میں'': ۲۸۱ بیت العلم ٹرسٹ

ہو سکتے ہیں، جو بچوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے ان پر شریعت کی طرف سے عائد ہوتی ہے۔

۴ چالیس روز تک مسجد کے ماحول میں دینی باتوں کا مذاکرہ طبیعت اور مزاج میں فطری طور پر تبدیلی لانے اور دینی ذوق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، چناں چہ ہمارے سامنے ایسی کئی مثالیں ہیں کہ اس "کورس" میں شریک ہونے والے متعدد طلبا دینی مدارس میں باضابطہ داخلہ لے کر حفظِ قرآن اور دینی علوم کے زیور سے آراستہ ہو رہے ہیں۔

۵ تعلیم وتعلم سے تعلق رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ چند دنوں کا تعطل اور وقفہ تعلیمی مزاج پر کس قدر اثر انداز ہوتا ہے اور چھٹیوں کے بعد اس سلسلہ کے نشاط اور لگاؤ کے دوبارہ بحال ہونے میں کتنا وقت لگتا ہے، اگر ہمارے بچوں کی تعطیلات کا بیشتر حصہ اس "کورس" میں گزرے گا تو ان کا یہ مزاج برقرار رہے گا اور تعطیلات کے بعد تعلیمی ماحول سے وابستہ ہونے میں زیادہ گرانی بھی محسوس نہیں ہوگی۔

۶ اگر کسی بچے کو چالیس دن کے محدود وقت میں اس قدر فوائد اور برکات وثمرات نصیب ہو جائیں تو زہے نصیب! اور اگر خدانخواستہ کوئی اس عظیم نعمت کو حاصل نہ بھی کر سکا اور بظاہر محروم رہا، تو اچھی صحبت وپاکیزہ ماحول کی نعمت عظمیٰ سے ہم کنار رہنے والا تو بہر حال شمار ہوگا، ظاہر ہے کہ اچھی صحبت اپنا اثر رکھتی ہے، صالحین کا ہم نشین غیر ارادی طور پر بھی ان کی صحبت سے حصہ پا ہی لیتا ہے۔

۷ خیر کے ان تمام پہلوؤں سے قطع نظر مسجد کا ماحول ان تمام فضولیات، لغویات اور معاصی سے بچاؤ کا ذریعہ ہے جو اس ماحول سے باہر پائی جاتی ہیں، کیوں کہ بچہ اگر مسجد کے ماحول سے باہر ہوتا ہے تو نہ معلوم کن کن کاموں میں لگا رہتا، جتنی دیر

بچہ مسجد میں رہے گا کم از کم اتنی دیر تو ان برے کاموں سے محفوظ رہے گا جو اس جیسے دوسرے بچے مسجد سے باہر کر رہے ہوں گے۔

اس تربیتی کورس میں نصاب کی کوئی قید نہیں، ہر مسجد کے امام صاحب "کورس" کے شرکا کی تعلیمی وذہنی سطح کے مطابق کچھ بھی نصاب مقرر فرما سکتے ہیں کیوں کہ مقصد محض دینی شعور اور شوق بیدار کرنا ہے۔ یہ تعلیم وتربیت جس طرح بچوں کا حق ہے اسی طرح بچیوں کا بھی حق ہے، چناں چہ حتی الوسع بچوں اور بچیوں ہر دو کی تعلیم وتربیت کا انتظام ہونا چاہیے۔ بچیوں کے لیے گھر میں "چالیس روزہ کورس" امام صاحب اپنی اہلیہ یا محلہ کی دین دار عورتوں کے ذریعہ بنائیں تاکہ اسکول وکالج کی بچیوں میں دین داری پیدا ہو سکے کہ یہ امت کی مستقبل کی مائیں ہیں۔

ایک عورت کو تعلیم دینا گویا پورے خاندان کو تعلیم دینا ہے۔

اس کی ترتیب یہ ہے کہ یہ کورس دو گھنٹوں یا تین گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ صبح گیارہ (۱۱) تا دو (۲) بجے یا شام چار (۴) تا چھ (۶) بجے۔

اور اگر نصاب میں مندرجہ ذیل کتابیں اس ترتیب سے وضع کی جائیں تو ان شاء اللہ بڑا فائدہ ہوگا:

۱ پہلا گھنٹہ: نورانی قاعدہ یا ناظرہ اور حروف کی تصحیح مخارج کا اہتمام اس کے لیے کسی اچھے قاری کی خدمات یا تجربہ کار جمعیت تعلیم القرآن کا کورس کیے ہوئے شخص کی خدمات لی جائیں، جو اس طرح نورانی قاعدہ پڑھائے کہ غبی سے غبی بچہ بھی ناظرہ قرآن اچھی طرح پڑھ سکے۔

۲ دوسرا گھنٹہ: احادیث اور دعائیں، اس میں مندرجہ ذیل کتب لی جا سکتی ہیں۔

مسنون دعائیں (مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب)

پرنور دعائیں (مولانا محمد تقی عثمانی)

ہدیۃ الاطفال سیریز (مکمل پانچ حصے) (بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

۳ تیسرا گھنٹہ:

تعلیم الاسلام (مفتی کفایت اللہ صاحب)

آسان دینیات حصہ اوّل تا پنجم (بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

تعلیم الاسلام جدید (مرتبہ مدرسہ عثمانیہ کراچی)

۴ چوتھا گھنٹہ:

تعلیم اللغۃ العربیہ (مرتبہ دارالعلوم کراچی)

طریقۂ جدیدہ (مرتبہ دارالعلوم کراچی)

(یا آسان عربی)

سکنڈری کے بچوں کے لیے

اسی طرح اگر ائمہ مساجد سکنڈری کے بچوں کے تربیتی کورس کے لیے مندرجہ ذیل نصاب وضع کرلیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ محلے کے بچوں کو بڑا فائدہ ہوگا۔

۱ پہلا گھنٹہ:

تجوید (جمال القرآن) (مولانا اشرف علی تھانوی صاحب)

۲ دوسرا گھنٹہ:

آسان نیکیاں (مرتبہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب)

۳ تیسرا گھنٹہ:

عربی کا معلم حصہ اوّل (مؤلفہ مولانا عبدالستار خان) یا طریقۂ عصریہ حصہ اوّل (مطبوعہ بنوری ٹاؤن کراچی)

۴ چوتھا گھنٹہ:

اصلاحی خطبات (تیرہویں جلد) (مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب)

۵ پانچواں گھنٹہ:

فقہ، درسی بہشتی زیور (مرتبہ بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

(بنات کے لیے) (عام بہشتی زیور، یا خواتین کے فقہی مسائل) (مرتبہ بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

ہدیہ خواتین (مولانا محمد عثمان صاحب)

وضاحت: اپنے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ۴۵ منٹ کا گھنٹہ رکھیں یا کم وبیش کوشش کی جائے کہ ایک نماز کا وقت اس میں داخل ہو جائے تاکہ بچے نماز کے عادی بنیں اور ۴۰ احادیث اور ۴۰ دعائیں حفظاً یاد کروانے کی کوشش کی جائے۔ گھر میں مطالعہ کے لیے ایسی دل چسپ کتب جس کی وجہ سے مطالعہ کا بوجھ بھی نہ ہو اور ان کی تربیت کے لیے مفید بھی ہوں ایسی کتب کے ہم ذیل میں نام لکھتے ہیں وہ بھی ان کو دی جائیں:

۱ ذوق وشوق ..... حصہ ۱ تا ۵ (بیت العلم ٹرسٹ کراچی)

۲ اسٹوری ٹائم ..... (بیت العلم ٹرسٹ کراچی) یہ کتاب انگریزی میں بچوں کی اصلاح وتربیت کے لیے لکھی گئی ہے، انگریزی پڑھنے والے بچوں کو یہ کتاب دی جا سکتی ہے۔

الحمد للہ! ہمارے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے بعض اساتذہ نے اس کورس کو اپنی مساجد میں شروع فرمایا اور اس کا ایک نصاب بھی مرتب فرما دیا جو ”تعلیم وتربیت“ کے نام سے طبع ہو چکا ہے کراچی میں مجلس دعوت وتحقیق اسلامی، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے پتہ سے منگوایا جا سکتا ہے۔

مردوں کے لیے چار ماہ کا کورس

ہماری کراچی کی بعض مساجد میں عشاء کے بعد اور بعض میں فجر کے بعد یہ

کورس شروع ہوا، جس سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ لوگوں کو بہت فائدہ ہوا۔ بعض مساجد میں سو (۱۰۰) سو (۱۰۰) آدمیوں نے شرکت فرمائی۔ جس سے معلوم ہوا کہ عوام میں کافی طلب ہے، لیکن ہماری طرف سے کمی ہے، ماشاء اللہ دنیاوی اداروں کے پڑھے لکھے حضرات نے بھی بھرپور شرکت فرمائی۔ آپ عوام کی طلب کا حال دیکھیں کہ ہمارے ہاں بیت المکرم میں سال کا کورس شروع ہوا جس میں ہر اتوار کو آنا ہوتا تھا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اس میں بھی سو (۱۰۰) سے زیادہ آدمی شریک ہوتے تھے اور کئی حضرات سے معذرت کرنی پڑی اور اس کورس میں تو باقاعدہ فیس لی جاتی ہے، اس کے باوجود لوگ آرہے ہیں، حالاں کہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ان ملازم پیشہ لوگوں کی ہفتہ میں ایک ہی دن چھٹی ہوتی ہے یہ کیسے شریک ہو سکتے ہیں، لیکن یہ ملازم پیشہ حضرات بھی شریک ہوئے۔

مرد حضرات کے اس کورس کی ترتیب بھی اسی طرح ہوگی جس طرح پہلے دو کورسوں کی ہے، اس میں جو کتب آپ کے لیے معاون ہو سکتی ہیں وہ یہ ہیں۔

1. معارف الحدیث.......... (مولانا منظور نعمانی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی)
2. منہج الرجال.......... (زیر طبع مدرسہ ابن عباس گلستان جوہر کراچی)
3. تفسیر معارف القرآن .... (مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی)
4. لسان القرآن.......... (مطبع مدرسہ عائشہ صدیقہ گلستان جوہر کراچی)
5. اسوہ رسول اکرم ﷺ..... (مؤلفہ ڈاکٹر عبدالحی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی)
6. تعلیم الدین.......... (مؤلفہ مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی)

چوں کہ عوام کے اندر تفسیر کا شوق ہوتا ہے تو ایک گھنٹہ آپ تفسیر کا رکھ کر عوام کے اندر دین داری کی فضا پیدا کر سکتے ہیں۔

دین کی بات سمجھانے میں مخاطب کو شرمندگی سے بچانا چاہیے

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کو دعوت و اصلاح کے کام میں اس کا بھی بڑا اہتمام تھا کہ مخاطب کی سبکی یا رسوائی نہ ہو، اسی لیے جب کسی شخص کو دیکھتے کہ کسی غلط اور برے کام میں مبتلا ہے تو اس کو براہ راست خطاب کرنے کی بجائے مجمع عام کو مخاطب کر کے فرماتے تھے:

"مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَفْعَلُوْنَ كَذَا وَكَذَا."[1]

ترجمہ: "لوگوں کو کیا ہو گیا کہ فلاں فلاں کام کرتے ہیں؟"

اس عام خطاب میں جس کو سنانا اصل مقصود ہوتا وہ بھی سن لیتا، اور دل میں شرمندہ ہو کر اس کو چھوڑنے کی فکر میں لگ جاتا تھا۔

انبیاء عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کی عام عادت یہ تھی کہ مخاطب کو شرمندگی سے بچاتے تھے، اسی لیے بعض اوقات جو کام مخاطب سے سرزد ہوا ہے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے اصلاح کی کوشش فرماتے، سورۂ یٰسین میں ہے:

﴿وَمَا لِيَ لَآ أَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ﴾[2]

ترجمہ: "یعنی مجھے کیا ہو گیا کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت نہ کروں؟"

ظاہر ہے کہ یہ قاصد رسول تو ہر وقت عبادت میں مشغول تھے، سنانا اس مخاطب کو تھا جو مشغول عبادت نہیں ہے، مگر اس کام کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

اور دعوت کے معنی دوسرے کو اپنے پاس بلانا ہے، محض اس کے عیب بیان کرنا

[1] اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی: ۷/۲۹۱
[2] یٰسین: ۲۲

نہیں اور یہ بلانا اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ متکلم اور مخاطب میں کوئی اشتراک ہو، اسی لیے قرآن عزیز میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عنوان اکثر "یٰقَوْمِ" سے شروع ہوتا ہے، جس میں برادرانہ رشتہ کا اشتراک پہلے جتلا کر آگے اصلاحی کلام کیا جاتا ہے کہ ہم تم تو ایک برادری کے آدمی ہیں، کوئی منافرت نہیں ہونی چاہیے، یہ کہہ کر ان کی اصلاح کا کام شروع فرماتے ہیں۔

تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھیان دیا جائے تو ہر تعلیم ودعوت میں اسی کے آداب واصول ملیں گے، آج کل اول تو دعوت واصلاح اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی طرف دھیان ہی نہ رہا اور جو اس میں مشغول بھی ہیں انہوں نے صرف بحث ومباحثہ اور مخالف پر الزام تراشی، فقرے کسنے اور اس کی تحقیر وتوہین کرنے کو دعوت و تبلیغ سمجھ لیا ہے، جو خلافِ سنت ہونے کی وجہ سے کبھی مؤثر ومفید نہیں ہوتا، وہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم نے اسلام کی بڑی خدمت کی اور حقیقت میں وہ لوگوں کو متنفر کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔[1]

جس کو دین کی طرف بلایا جائے اس کا جائز اکرام مسنون ہے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت کا خط ہرقل شاہ روم کے نام بھیجا، اس میں تو شاہ روم کو "عظیم الروم" کے لقب سے یاد فرمایا،[2] جس میں اس کا جائز اکرام ہے، کیوں کہ اس میں اس کے عظیم ہونے کا اقرار بھی ہے، مگر رومیوں کے لیے، اپنے لیے نہیں، اس کے بعد ایمان کی دعوت اس عنوان سے دی گئی:

﴿یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا

[1] معارف القرآن ۵/۴۲۸، ۴۲۹، النحل: ۱۲۵
[2] بخاری، باب کیف کان بدء الوحی: ۱/۵

نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ﴾[1]

ترجمہ: "اے اہل کتاب! اس کلمہ کی طرف جلدی سے آجاؤ، جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔"

جس میں پہلے انہیں کا ایک مشترک نقطۂ وحدت ذکر کیا کہ توحید کا عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، اس کے بعد عیسائیوں کی غلطی پر متنبہ فرمایا۔[2]

اسی طرح جو خود دین سیکھنے آئے تو اس کا اکرام واحترام بھی مسنون ہے جیسے حضرت صفوان بن عسال المرادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس حال میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں ایک سرخ چادر کو ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما تھے۔

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں علم طلب کرنے حاضر ہوا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَرْحَبًا بِطَالِبِ الْعِلْمِ إِنَّ طَالِبَ الْعِلْمِ تَحُفُّهُ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا، ثُمَّ يَرْكَبُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا حَتّٰى يَبْلُغُوا السَّمَاءَ الدُّنْيَا مِنْ مَّحَبَّتِهِمْ لِمَا يَطْلُبُ."[3]

ترجمہ: "علم طلب کرنے والے کے لیے خوش آمدید۔ پھر فرمایا: طالب علم کے لیے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں، پھر اس کے علم کی طلب کرنے کی محبت میں فرشتے ایک دوسرے کے اوپر بیٹھ کر آسمان دنیا تک پہنچ جاتے ہیں۔"

[1] آل عمران: ۶۴　[2] معارف القرآن: ۵/۴۲۹، النحل: ۱۲۵
[3] الترغیب والترہیب، العلم، الترغیب فی العلم وطلبہ: ۱/۵۲، رقم: ۹

داعی حق کو کوئی ایذا پہنچائے تو بدلہ جائز، صبر، بہتر ہے

اگر داعی کو کسی سے تکلیف پہنچے، تو وہ اس پر صبر کرے اور برائی کا بدلہ برائی سے نہ دے۔

چناں چہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ﴾[1] یہاں سے دعوت الی اللہ کی خدمت انجام دینے والوں کو خاص ہدایات دی گئی ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیں بل کہ صبر اور احسان سے کام لیں ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾[2]

یعنی داعیانِ حق کی خصلت یہ ہونی چاہیے کہ وہ لوگوں کی برائی کو طریقِ احسن سے دور کریں۔ وہ یہ کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دینا اور معاف کر دینا تو عمل حسن ہے اور احسن یہ ہے کہ جس نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا تم اس کو معاف بھی کر دو اور اس کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو۔ حضرت ابن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُمَا نے فرمایا اس آیت میں حکم یہ ہے کہ:

''جو شخص تم پر غصہ کا اظہار کرے، تم اس کے مقابلہ میں صبر سے کام لو جو تمہارے ساتھ جہالت سے پیش آئے تم اس کے ساتھ حلم و بردباری کا معاملہ کرو اور جس نے تمہیں ستایا اس کو معاف کر دو۔''[3]

بعض روایات میں ہے کہ صدیق اکبر رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ کو کسی شخص نے گالی دی یا

[1] حٰم السجدۃ: ۳۴ [2] ایضاً

[3] تفسیر مظہری: ۲۹۶/۸، حٰم فُصِّلَتْ: ۳۴

برا کہا تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر تم اپنے کلام میں سچے ہو کہ میں مجرم وخطا وار اور برا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرما دے، اور اگر تم نے جھوٹ بولا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرما دے۔[1]

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں،

ایک سچے داعی اللہ کو جس حسنِ اخلاق کی ضرورت ہے، اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ یعنی خوب سمجھ لو نیکی، بدی کے اور بدی نیکی کے برابر نہیں ہو سکتی، دونوں کی تاثیر جدا گانہ ہے چوں کہ ایک نیکی دوسری نیکی سے اور ایک بدی دوسری بدی سے اثر میں بڑھ کر ہوتی ہے۔

لہٰذا ایک مؤمن قانت اور خصوصاً ایک (امام مسجد) داعی اللہ کا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ برائی کا جواب برائی سے نہ دے بل کہ جہاں تک گنجائش ہو برائی کے مقابلہ میں بھلائی سے پیش آئے۔ اگر کوئی اسے سخت بات کہے یا برا معاملہ کرے تو اس کے مقابل وہ طرز اختیار کرنا چاہیے جو اس سے بہتر ہو۔ مثلاً غصہ کے جواب میں بردباری...... گالی کے جواب میں تہذیب وشائستگی...... اور سختی کے جواب میں نرمی ...... اور مہربانی...... سے پیش آئے۔

اس طرزِ عمل کے نتیجہ میں تم دیکھو گے کہ سخت سے سخت دشمن بھی ڈھیلا پڑ جائے گا۔ اور گو دل سے دوست نہ بنے تاہم ایک وقت آئے گا جب وہ ظاہر میں ایک گہرے اور گرم جوش دوست کی طرح تم سے برتاؤ کرنے لگے گا، بل کہ ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد سچے دل سے دوست بن جائے اور دشمنی وعداوت کے خیالات یکسر قلب سے نکل جائیں۔[2]

بعض اوقات ایسے سخت دل جاہلوں سے سابقہ پڑتا ہے کہ ان کو کتنی ہی نرمی اور

[1] تفسیر قرطبی ۲۶۲/۸، حٰم فُصِّلَتْ: ۳۴

[2] تفسیر عثمانی، حٰم فُصِّلَتْ: ۳۴، تبلیغ کی آداب کی تعلیم ۴۹۷/۲

خیر خواہی سے بات سمجھائی جائے وہ اس پر بھی مشتعل ہو جاتے ہیں، زبان درازی کر کے ایذاء پہنچاتے ہیں، اور بعض اوقات اس سے بھی تجاوز کر کے ان کو جسمانی تکلیف پہنچاتے ہیں، بل کہ قتل تک سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایسے حالات میں دعوتِ حق دینے والوں کو کیا کرنا چاہیے۔

اس کے لیے ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾[1]

ترجمہ: ''اور اگر بدلہ لو بھی تو بالکل اتنا ہی جتنا صدمہ تمہیں پہنچایا گیا۔'' میں ایک تو ان حضرات کو قانونی حق دیا گیا کہ جو آپ پر ظلم کرے آپ کو بھی اس سے اپنا بدلہ لینا جائز ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ بدلہ لینے میں مقدارِ ظلم سے تجاوز نہ ہو، جتنا ظلم اس نے کیا ہے، اتنا ہی بدلہ لیا جائے اس میں زیادتی نہ ہونے پائے۔

اور آخر آیت میں مشورہ دیا کہ اگرچہ آپ کو انتقام لینے کا حق ہے، لیکن صبر کریں اور انتقام نہ لیں تو یہ بہتر ہے۔

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ آیت مدنی ہے، غزوۂ احد میں ستر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شہادت اور حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کر کے مثلہ کرنے کے واقعہ میں نازل ہوئی، صحیح بخاری کی روایت اسی کے مطابق ہے۔ دار قطنی نے بروایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نقل کیا ہے کہ:

''غزوۂ احد میں جب مشرکین لوٹ گئے تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ستر اکابر کی لاشیں سامنے آئیں، جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، چوں کہ مشرکین کو ان پر بڑا غیظ تھا، اس لیے ان کو قتل کرنے کے بعد ان کی لاش پر اپنا غصہ اس طرح نکالا کہ ان کی ناک، کان اور دوسرے اعضاء کاٹے گئے، پیٹ چاک کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منظر سے سخت صدمہ پہنچا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بدلے میں مشرکین کے ستر

---

[1] النحل: ۱۲۶

آدمیوں کا اسی طرح مثلہ کروں گا، جیسا انہوں نے حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر عورتیں غمگین نہ ہوتیں اور میرے بعد لوگ اس کو سنت نہ بنا لیتے تو میں حمزہ کو ایسا ہی چھوڑتا یہاں تک کہ قیامت کے دن یہ درندوں اور پرندوں کے پیٹوں میں سے نکلتا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر منگوا کر حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ڈال دی، چوں کہ چادر چھوٹی تھی تو پاؤں کھلے رہ گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پاؤں پر گھاس ڈالی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ستر مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی، جب ان کو دفن کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ ...... تا ...... ﴿وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾[1]

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر فرمایا اور کسی کا مثلہ نہیں کیا۔[2] بعض روایات میں ہے کہ دوسرے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ بھی ان ظالموں نے اسی طرح کا معاملہ (مثلہ کرنے کا) کیا تھا۔[3]

اس میں چوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ غم سے بلالحاظ تعداد ان صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بدلے میں ستر مشرکین کے مثلہ کرنے کا عزم فرمایا تھا، جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس اصولِ عدل و مساوات کے مطابق نہ تھا، جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دنیا میں قائم کرنا منظور تھا، اس لیے ایک تو اس پر متنبہ فرمایا گیا کہ بدلہ لینے کا حق تو ہے، مگر اسی مقدار اور پیمانہ پر جس مقدار کا ظلم ہے، بلالحاظ تعداد چند کا بدلہ ستر سے لینا درست نہیں۔

دوسرے آپ کو مکارمِ اخلاق کا نمونہ بنانا مقصود تھا، اس لیے یہ نصیحت کی گئی کہ

---

[1] النحل: ۱۲۵ تا ۱۲۷　[2] تفسیر قرطبی ۱۱۷/۵، النحل: ۱۲۷

[3] الترمذی، تفسیر سورۃ النحل ۱۴۵/۲

برابر سرابر بدلہ لینے کی اگرچہ اجازت ہے، مگر وہ بھی چھوڑ دو اور مجرموں پر احسان کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہم صبر ہی کریں گے، کسی ایک سے بھی بدلہ نہیں لیں گے، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کردیا۔[1]

غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف پہنچنے اور ان پر صبر کرنے کے بارے میں صاحب شفاء تحریر فرماتے ہیں:

کہ جب غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے دو دانت شہید ہو گئے اور چہرۂ مبارک زخمی ہوا تو یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین پر بہت گراں گزرا اور ان کو دلی کوفت پہنچی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرنے لگے کہ آپ ان کفار و مشرکین کے لیے بددعا فرمائیں تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنِّيْ لَمْ أُبْعَثْ لَعَّانًا وَلٰكِنِّيْ بُعِثْتُ دَاعِيًا وَّرَحْمَةً اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ"[2]

تَرجَمَہ: "میں بددعا دینے نہیں بھیجا گیا ہوں، بلکہ میں دین حق کی دعوت دینے اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، پھر فرمایا: اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے یہ نہیں سمجھتی۔"

فتح مکہ کے موقع پر جب یہ تمام مشرکین مغلوب ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قبضہ میں تھے، یہ موقع تھا کہ اپنا وہ عزم وارادہ پورا کر لیتے جو غزوۂ احد کے وقت کیا تھا، مگر آیات مذکورہ کے نزول کے وقت ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارادے کو چھوڑ کر صبر کرنے کا فیصلہ کرچکے تھے، اس لیے فتح مکہ کے وقت ان آیات کے مطابق صبر کا عمل اختیار کیا گیا، شاید اسی بناء پر بعض روایات میں

[1] تفسیر مظہری: ۵/۳۹۲، النحل: ۱۲۶ - ۱۲۸
[2] کتاب الشفاء: ۱۱/۱ بحوالہ عن مرشد الدعاۃ: ۲۱۳

یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ آیتیں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی تھیں۔ اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ان آیات کا نزول مکرر ہوا ہو، اول غزوۂ احد میں نازل ہوئیں اور پھر فتح مکہ کے وقت دوبارہ نازل ہوئیں۔[1]

اسی طرح قرآن کریم میں جب آیت ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾[2] (کہ ایسا شخص کون ہوگا جو اللہ کو اچھا قرض دے گا) نازل ہوئی، جس میں ایک بلیغ عنوان میں صدقہ وخیرات اللہ تعالیٰ کو قرض دینے سے تعبیر کیا ہے، اور اس بلیغ عنوان میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ یہاں دو گے اس کا بدل آخرت میں ایسا یقینی ہو کر ملے گا، جیسے کسی کا قرض ادا کیا جاتا ہے۔

ایک جاہل یا معاند یہودی نے اس کو سن کر یہ الفاظ کہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ أَغْنِيَاءُ﴾[3] (کہ اللہ غریب ہے اور ہم مال دار ہیں) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس گستاخی پر غصہ آیا اور یہودی کو طمانچہ رسید کیا، یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ﴾[4] (کہ ضرور تمھیں تمہارے مالوں اور جانوں سے آزمایا جائے گا) جس میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ دین کے لیے جان ومال کی قربانیوں سے اور کفار ومشرکین اور اہل کتاب کی بدزبانی کی ایذاؤں سے گھبرانا نہیں چاہیے، یہ سب ان کی آزمائش ہے، اور اس میں ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ صبر سے کام لیں اور اپنے اصل مقصد تقویٰ کی تکمیل میں مصروف رہیں ان کی جواب دہی کی فکر میں نہ پڑیں۔[5]

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

دشمنوں سے تو اس دنیا میں کسی چھوٹے بڑے، اچھے برے انسان کو نجات نہیں

[1] مظہری: ۵/۳۹۳، النحل: ۱۲۸
[2] البقرہ: ۲۴۵
[3] آل عمران: ۱۸۱
[4] آل عمران: ۱۸۶
[5] معارف القرآن: ۲/۲۵۶، آل عمران: ۱۸۶

ملتی - ہر شخص کا کوئی نہ کوئی دشمن ہوتا ہے۔ اور دشمن کتنا ہی حقیر وضعیف ہو اپنے مخالف کو کچھ نہ کچھ ایذا و پہنچا ہی دیتا ہے۔ زبانی گالی گلوچ ہی سہی، سامنے ہمت نہ ہو تو پیچھے ہی سہی۔ اس لیے دشمن کی ایذاؤں سے بچنے کی فکر ہر شخص کو ہوتی ہے۔

قرآن کریم نے ان کا بہترین اور کامیاب نسخہ دو چیزوں سے مرکب بیان فرمایا ہے۔

اول صبر یعنی اپنے نفس کو قابو میں رکھنا اور انتقام کی فکر میں نہ پڑنا۔

دوسرے اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں مشغول ہو جانا۔

تجربہ شاہد ہے کہ صرف یہی نسخہ ہے جس سے ان ایذاؤں سے نجات مل سکتی ہے ورنہ انتقام کی فکر میں پڑنے والا کتنا ہی قوی اور بڑا اور صاحب اقتدار ہو بسا اوقات مخالف سے انتقام لینے پر قادر نہیں ہوتا اور یہ فکر انتقام ایک مستقل عذاب اس کے لیے بن جاتا ہے اور جب انسان کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہو جائے، اور وہ دھیان یہ کرے کہ اس دنیا میں کوئی کسی کو کسی طرح کا نقصان یا ایذا بغیر مشیت خداوندی کے نہیں پہنچا سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اعمال و افعال سب حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس لیے جو صورت پیش آئی ہے اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی تو مخالف کی ایذاؤں سے پیدا ہونے والا غیظ وغضب خود بخود کافور ہو جاتا ہے۔[1]

امام ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم میں صبر کا ذکر ستر مقامات پر آیا ہے، کسی اور چیز کی فضیلت اتنی کثیر تعداد میں بیان نہیں ہوئی، جتنی اس کی ہوئی ہے، جس سے اس کی شان کا پتہ چلتا ہے۔ اور سورۃ العصر میں اس کے ساتھ حق کی تلقین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ داعی کے اوصاف میں شامل ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کو حق کی تلقین بھی کرے۔ مذکورہ سورۃ میں صبر سے مراد یہی ہے کہ وہ داعی کو

[1] معارف القرآن: ۶/۱۶۳، ۱۶۴، طٰہٰ: ۱۳۰

اس راستے میں پیش آمدہ مشکلات کو آسان بناتا ہے اور اس کے اندر اس کا ملکہ پیدا کرتا ہے۔[1]

منصب امامت اور صبر

حضرت مفتی محمد اشرف صاحب کا ایک مضمون "ماہنامہ محاسن اسلام" میں آیا تھا جس کو ائمہ کرام کے لیے مفید سمجھ کر ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ پڑھنے سے پہلے دعا کر لیجیے کہ اس مضمون پر ہمیں عمل کرنے کی بھی توفیق مل جائے کہ بسا اوقات نفس و شیطان کی شرارت سے صبر کے موقع پر انسان اس سے غافل ہو جاتا ہے اور صبر کی فضیلت سے محروم ہو جاتا ہے، مولانا مفتی محمد اشرف صاحب فرماتے ہیں:

امام پیشوا اور قائد کو کہتے ہیں، جو لوگوں کی قیادت کرے اور لوگ اس کی پیروی کریں۔ امام کا منصب ایک اونچا بل کہ بہت اونچا منصب ہے۔ یہ ایک لحاظ سے منصب نبوت کی نیابت ہے، رحمت عالم ﷺ امام المسلمین بھی تھے اور امام الانبیاء علیہم السلام بھی۔ اس عظیم منصب کے باوجود حق تعالیٰ جل شانہ نے قرآن مجید میں خطاب کرکے آپ ﷺ کو فرمایا:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ﴾[2]

ترجمہ: "تو آپ ویسا ہی صبر کیجیے جیسا اور ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا تھا اور ان لوگوں کے لیے انتقام الٰہی کی جلدی نہ کیجیے۔

اسی لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کی عیش وعشرت اور تنعم محمد (ﷺ) اور آل محمد (ﷺ) کی شایان شان نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ اولوا العزم سے بجز صبر کے اور کسی چیز پر راضی نہیں اور مجھے یہی حکم دیا ہے کہ میں اس طرح صبر کروں جیسے اور اولوا العزم

[1] عدۃ الصابرین، الباب الخامس عشر فی ذکر ما ورد فی الصبر: ۱/۵۷ [2] الاحقاف: ۳۵

پیغمبروں نے صبر کیا ہے۔

لہٰذا امام کے لیے صبر کے سوا چارہ نہیں۔ اگر امام، امامت و قیادت کے منصب پر فائز رہنا چاہتا ہے اور دنیا و آخرت میں بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ رحمتِ عالم سید المرسلین ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے صبر سے کام لیں، خواہ مصائب اور تکالیف پر صبر کرنا پڑے یا مقتدیوں کی فضول لایعنی اور دل خراش باتوں پر صبر سے کام لینا پڑے۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پرانی امتوں میں ان ہی لوگوں کو امامت و قیادت کے منصب پر فائز کیا گیا جو صبر اور یقین کی دولت سے مالا مال تھے۔ سورۃ السجدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ﴾[1]

تَرجَمَہ: ”ہم نے ان میں بہت سے ائمہ بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے جب کہ وہ صبر کرتے رہے اور ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔“

علامہ ابن کثیر رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالیٰ نے اس آیت کی تفسیر میں بعض علماء کا قول نقل کیا ہے: ”بِالصَّبْرِ وَالْيَقِينِ تُنَالُ الْإِمَامَةُ فِي الدِّينِ“[2] یعنی صبر اور یقین ہی کے ذریعے دین میں کسی کو امامت کا درجہ مل سکتا ہے۔[3]

حضرت عبد اللہ بن عکیم رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالیٰ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ نے فرمایا:

[1] السجدة: ۲۴

[2] تفسیر ابن کثیر: ۱۰۴۹/۱، السجدة: ۲۴

[3] بشکریہ مجالس اسلام ۳۱

”إِنَّهُ لَا حِلْمَ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنْ حِلْمِ إِمَامٍ وَرِفْقِهِ، وَلَا جَهْلَ أَبْغَضُ إِلَى اللّٰهِ مِنْ جَهْلِ إِمَامٍ وَخُرْقِهِ ......“[1]

تَرجَمَہ: ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بردباری اور نرمی امام کی بردباری اور نرمی سے زیادہ محبوب نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی جہالت امام کی جہالت سے زیادہ مبغوض نہیں ہے۔“

صبر کا فائدہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَا عِندَكُمْ يَنفَدُ ۖ وَمَا عِندَ اللّٰهِ بَاقٍ ﴾[2] یاد رکھیے مصیبت اور تکلیف کا صدمہ تو ہمیشہ باقی نہ رہے گا۔ ہاں! اس پر صبر کے نکلے ہوئے الفاظ حیات جاودانی اختیار کرلیں گے اور قیامت کے دن اللہ پاک شمار کر کر ایک ایک نیکی کا کئی کئی بار بدلہ عطا فرمائیں گے۔

یہ صرف ذہن بنانے کی بات ہے اگر داعی (امام) اپنا ذہن اس طرح بنالے کہ دین کی دعوت دینے میں جو کچھ غم یا تکلیف آئے اللہ کے ذکر کے ساتھ اس وقت کو رسول پاک ﷺ کی سنت کے مطابق گزار دیں تو ان فانی حالات میں سے ایسے باقی ذخائر ہم اللہ کے پاس بھیج دیں گے جو ہمیشہ کے لیے اس کے پاس ہمارے حساب میں جمع ہوجائیں گے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ داعی کو کسی نے گالی دی یا کوئی نقصان پہنچایا تو نہ تو وہ گالی ہمیشہ باقی رہے گی اور نہ نقصان ہمیشہ قائم رہے گا اور گالی تو محض بدزبانی کا اظہار ہے۔ اس سے تو داعی کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ بل کہ ایسی بے بنیاد چیز پر یعنی گالی کے بدلے داعی نے اگر ایک گالی دے دی تو اس کی اور داعی کی دونوں کی بدزبانی کا گناہ دونوں پر باقی رہ جائے گا اور داعی کو قیامت کے دن خسارہ پہنچ جائے گا کیوں

[1] الزهد لهناد، كتاب الزهد، باب العلم والعفو: ۶۰۲/۲، رقم: ۱۲۷۹

[2] النحل: ۹۶

کہ بجائے دین کی طرف لانے کے دین سے اور دور کر دیا۔ لیکن اگر داعی اس گالی کو برداشت کر گئے اور جواباً اس کو کہہ دیا کہ اللہ تم کو ہدایت دے تو یہ دعائیہ جملے ہمارے واسطے سرمایۂ آخرت اور اس کے واسطے ذریعہ ہدایت بن جائیں گے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی سے ایک مرتبہ کسی شخص نے عرض کیا کہ حضرت! لوگ آپ کی شان میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں، مگر آپ سے ہم نے ان کے بارے میں مذمت کا کوئی لفظ بھی نہیں سنا۔ فرمانے لگے: ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے، جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ایک بار منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ اسی حالت میں ایک شخص نے کہا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ تم فاسق ہو۔'' یہ سن کر صرف اس قدر بولے: ''تم جھوٹے گواہ ہو، میں تمہاری شہادت کو قبول نہیں کرتا۔''[2]

ایک بار کسی نے ان کو نامناسب کلمات کہے، لوگ بولے کہ آپ کیوں چپ ہیں؟ فرمایا: ''تقویٰ نے منہ میں لگام لگادی ہے۔''[3]

ایک بار کسی نے ایک آدمی کی نسبت ان سے کہا کہ یہ آپ کو گالی دیتا ہے۔ انھوں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر کہا، اب بھی روگردانی کی۔ اس نے تیسری بار کہا تو بولے: ''عمر اس کو اس طرح ڈھیل دے رہا ہے کہ اس کو خبر تک نہیں ہوتی۔''[4]

ایک بار رات کو مسجد میں گئے، ایک شخص سو رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کو ان کے پاؤں کی ٹھوکر لگ گئی تو اس نے جھلا کر کہا: ''کیا تم پاگل ہو؟'' بولے: ''نہیں۔'' چپڑاسی نے اس گستاخی پر اس کو سزا دینی چاہی، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے روک دیا اور کہا: ''اس نے مجھ سے صرف یہ پوچھا تھا کہ تم پاگل

[1] امام اعظم ابو حنیفہ کے حیرت انگیز واقعات: ۷۵
[2] سیرت عمر بن عبدالعزیز: ص ۵۰ [3] ایضاً [4] ایضاً

ہو، میں نے جواب دیا کہ نہیں۔''[1]

ایک بار کسی شخص نے ان کو سخت بات کہی، بولے: ''تو چاہتا ہے کہ حکومت کے اس غرور میں بھی تیرے ساتھ وہی سلوک کروں جو تو کل (قیامت کے دن) میرے ساتھ کرے گا۔'' یہ کہہ کر اس کو معاف کر دیا۔[2]

حضرت مولانا محمد یعقوب مجددی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے میرے کہنے پر جمعہ کی نماز پڑھائی ''سورۃ والتین'' کے آخر میں بجائے ﴿فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ کے ''لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ'' پڑھ دیا۔ مقتدیوں میں ایک صاحب بڑے سادہ لوح اور جلد باز تھے، پوری طرح سے سلام بھی نہیں پھیرا تھا کہ پکار کر کہا: ''صاحبو! ظہر پڑھ جاؤ نماز دوبارہ ہوگی۔'' مولانا نے میری طرف دیکھا اور فرمایا: ''دوبارہ نماز پڑھاؤں؟'' میں نے کہا: ''آپ ان باتوں کا کچھ خیال نہ کریں یہ بڑے بھولے آدمی ہیں۔'' شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: ''مولانا ایسے جلیل القدر عالم اور علم الفقہ کے مصنف تھے، لیکن بے بسی اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ یہ نہیں فرمایا کہ بھائی! میں بھی کچھ لکھا پڑھا ہوں نماز ہوگی۔''[3]

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ایک مرتبہ جمعے کا وعظ فرما رہے تھے کہ اچانک ایک شخص اٹھا اور نہایت گستاخی کے انداز میں چیخا کہ: ''مولوی صاحب! آپ نے داڑھی سکھوں کی طرح چھوڑی ہوئی ہے، اسے سنت کے مطابق کریں۔'' تمام مجمع حیرت میں آگیا اور بہت سے حضرات اس شخص پر لپکنے لگے، مگر حضرت نے فوراً ڈانٹا اور فرمایا: ''خبردار! سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔'' سب خاموشی سے بیٹھ گئے تو حضرت نے بڑی نرمی اور متانت سے اس شخص سے فرمایا: ''بھائی! جمعہ کے بعد تسلی سے مجھے مسئلہ سمجھا دینا یا مسئلہ سمجھ لینا۔'' پھر جمعہ کے

[1] ایضاً [2] ایضاً [3] پرانے چراغ: ۲/۲۲۶

بعد کچھ خاص لوگوں کی موجودگی میں حضرت نے اس شخص سے گفتگو فرمائی اور مسئلہ سمجھا دیا۔[1]

ایک مرتبہ چند اصحاب حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر تھے۔ اتفاق سے میں بھی اسی مجلس میں شریک تھا کہ ایک شخص اپنے لڑکے کو لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا: ''حضور! اس بچے کے لیے تعویذ بنادیں، کبھی یہ لاہور سے چلے جانے کی دھمکی دیتا ہے اور کبھی خودکشی کی، شاید اسے سایہ ہے۔''

حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اسے جسمانی مرض ہے، کسی حکیم یا ڈاکٹر کو دکھلایئے'' اور لڑکے سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''بیٹا! ایسے خیالات دل سے نکال۔'' اس پر وہ شخص بگڑ گیا اور کہنے لگا: ''ہم گیارہ بجے سے منتظر تھے کہ آپ سے تعویذ لیں گے اور آپ نے پرواہ تک نہیں کی۔'' حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ اسے غصے میں دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: ''اگر کسی کا میرے ہاتھ سے بھلا ہو جائے تو میرا کیا نقصان ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ بچے کو جسمانی مرض ہے اور میں ڈاکٹر طبیب نہیں ہوں۔'' مگر وہ شخص اور زیادہ بگڑ گیا کہنے لگا: ''ہمیں آپ سے یہ امید نہ تھی۔'' ہم سب حیران تھے کہ حضرت کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ آخر حضرت نے بڑے تحمل سے فرمایا: ''اچھا! ہمارے پاس تو پھر دعا ہی ہے کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے صحت عطا فرمائے گا۔'' اس کے بعد بھی وہ شخص غصے سے ہی بات کرتا رہا، مگر حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک بار بھی تلخ جواب نہیں دیا۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے: ''جو لوگ مجھے گالیاں دیتے ہیں ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت فرمائے۔''[2]

حضرت اقدس رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک روز اتحاد بین المسلمین اور اخلاقیات

[1] مولانا احمد علی لاہوری کے حیرت انگیز واقعات: ۳۶۷

[2] ایضاً: ص ۲۶۸، بحوالہ مرد مومن: ص ۱۷۵

کے موضوع پر باتیں کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک مولوی صاحب اپنی تقاریر میں ہمیشہ مجھے کوستے تھے۔ طعن و طنز، تشنیع اور دشنام کا نشانہ بناتے تھے۔ میں نے کبھی ان کی باتوں کا جواب نہ دیا، نہ برا منایا۔ ایک روز اتفاق سے سرِ راہ اُن کا اور میرا آمنا سامنا ہو گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو فوراً ایک دوسرے بازار کا رخ کر لیا۔ میں بھی ادھر ہی مڑ گیا۔ وہ ایک مسجد کے استنجا خانے میں چلے گئے۔ میں مسجد کے باہر انتظار کرتا رہا، جب وہ باہر آئے تو السَّلَامُ عَلَيْكُمْ...... کہہ کر میں ان کے ساتھ چل پڑا اور کہا: ''مولوی صاحب! آپ مجھے جتنا بھی چاہے برا بھلا کہہ لیا کریں، مجھے گوارا ہے مگر یہ گوارا نہیں کہ باہم سلام دعا تک نہ رہے، ایسا تو بے علم کرتے ہیں، علماء کا یہ کردار عوام پر کیا اثر چھوڑے گا؟! اگر آپ دیانت داری سے میرے عقیدے کو خلافِ شریعت سمجھ کر مجھے برا بھلا کہتے ہیں تو آپ اجر کے مستحق ہیں۔ اگر خدانہ کرے دانستہ تعصب سے ایسا کرتے ہیں تو خدا گواہ میں نے آپ کو معاف کیا۔'' یہ الفاظ سن کر وہ بہت نادم ہوئے اور کہا: ''مولوی صاحب! آئندہ میں کبھی آپ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا۔'' بغل گیر ہوئے۔ ہم دونوں اپنی اپنی راہ پر چل پڑے، پھر واقعی انہوں نے کبھی مجھے برا نہ کہا۔[1]

قاری عبدالعزیز کہتے ہیں کہ جب مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ تعالیٰ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے تو میں نے ان سے وقتِ ملاقات طے کیا اور طے شدہ وقت کے مطابق صبح نو بجے ان کی جائے قیام پر پہنچ گیا اور چٹ لکھ کر اپنی آمد کی اطلاع بھجوائی، لیکن ہوا یہ کہ دوپہر ہوئی، پھر شام ہوئی، پھر رات چھا گئی لیکن بلاوا نہ آیا، ادھر میرا غصہ بھی طوفان بن رہا تھا کہ ''دامن خود چاک یا دامن یزداں چاک۔'' آخر میں زبردستی آدمیوں کو پیچھے دھکیلتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کاغذوں اور فائلوں کے درمیان مصروف ہیں، آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور چہرے پر تھکاوٹ

[1] ایضاً: ص ۲۶۸، ۲۶۹، بحوالہ دو بزرگ: ص ۹۹

کے آثار ہیں۔ مفتی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی مجھ پر نظر پڑی تو فرمایا: ’’آپ جلالی صاحب کیسے آئے؟‘‘

میں یہ سن کر آتش فشاں بن گیا ’’آپ نے مجھے نو بجے کا وقت دیا اور رات کا ایک بج رہا ہے اور آپ کہتے ہیں کیسے آئے؟‘‘ میں نے خوب شور مچایا اور پھر باہر نکل آیا۔ لوگوں نے مجھے گھیر لیا، سرکاری ملازم میری طرف بڑھنے لگے تو اچانک میں نے ایک ہاتھ اپنے شانے پر محسوس کیا۔ یہ ہاتھ مولانا مفتی محمود رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ صرف سنانا ہی مردانگی نہیں، سنا کر سننا بھی مردانگی ہے۔ وہ مجھے دوبارہ کمرے میں لے گئے۔ معلوم ہوا کہ مفتی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کو میری آمد کی اطلاع ہی نہیں دی گئی، جو میں چٹ لکھ کر بھیجتا وہ ان تک ہی نہ پہنچتی جس پر مفتی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے اس ملازم کو بلا کر ڈانٹ پلائی بل کہ اگلے روز اس کی ڈیوٹی بھی تبدیل کر دی۔

مجھے اچھی طرح مطمئن کرنے کے بعد انہوں نے اپنی بات کہی کہ: ’’قاری صاحب! یہ دنیا کیا ہے، کچھ بھی نہیں، لوگ پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ جب کوئی مولوی میرے پاس دنیاوی کام لے کر آتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اسے گولی ماردوں، یہ دنیا کی لعنت دنیا والوں کے پاس ہی رہنے دیں تو اچھا ہے، لیکن جب کوئی میرے پاس لوگوں کے مسائل لے کر آتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنے علاقے کے مسائل لے کر آئے ہیں تو سنایئے میں سنوں گا۔‘‘ میں نے کہا: ’’اب وقت نہیں صبح بات کرلیں گے۔‘‘ لیکن ان کا کہنا تھا: ’’قیامت سے ڈرتا ہوں صبح تک زندگی کا کیا پتا۔‘‘ یہ کہہ کر انہوں نے میری بات سنی اور پھر احکامات جاری کیے۔[1]

شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کو دشمنانِ

[1] بیس مردان حق: ۲/۴۹۵

اسلام گالیوں بھرے خطوط سے نوازتے، مگر آپ نے کبھی بھی اس پر ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا، بل کہ فرماتے تھے کہ: ’’عقیدت مندوں کی تعریف و توصیف سے دل میں اگر اپنے بارے میں کچھ غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی تو وہ بِحَمْدِ اللّٰہِ اس سے صاف ہوگئی۔‘‘

حضرت کو ایک بار کسی نے بتلایا کہ ایک صاحب نے بڑے آدمی سے آپ کے بارے میں سوال کیا کہ ’’مولانا محمد یوسف لدھیانوی باقاعدہ مفتی ہیں؟‘‘

اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: ’’وہ نہ باقاعدہ مفتی ہیں نہ بے قاعدہ۔‘‘

یہ سن کر حضرت نے فرمایا: ’’ہاں! بھائی وہ سچ کہتے ہیں میں نہ باقاعدہ مفتی ہوں نہ بے قاعدہ۔‘‘[1]

مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

’’ایک جمعہ میں نے مرزائیت کے خلاف تقریر کی۔ تقریر کے دوران تو کوئی نہ بولا، نماز کے بعد شور مچ گیا، جو نئے مرزائی بنے تھے ان میں ایک ریٹائرڈ فوجی بھی تھا۔ میں نے انہیں سمجھانا چاہا تو فوجی مجھے کہتا ہے: ’’میں تیرے جیسوں کو سو جوتے مارتا ہوں اور ایک گنتا ہوں۔‘‘ میں نے اسے کہا: ’’تو پہلے سو جوتے مار لے تاکہ تیرا غصہ ٹھنڈا ہو جائے پھر تو میری بات غور سے سنے گا۔‘‘ میری اس بات کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ وہ بالکل ٹھنڈا ہوگیا، معافی مانگی اور بیٹھ گیا۔ میں نے سمجھایا ان کے اشکالات کے جوابات دیے تو تینوں مرزائی مسلمان ہوگئے۔[2]

حضرت فضیل بن عیاض رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے بارے میں آتا ہے کہ جب ان سے کوئی کہتا کہ فلاں شخص آپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا تو حضرت فضیل بن عیاض رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرماتے:

[1] ماہنامہ سلوک و احسان کراچی بحوالہ صبر و تحمل کی روشن مثالیں: ۱۱۹

[2] ماہنامہ الخیر ۔۔۔ محافظ اسلام نمبر: ص: ۴۴

"اللہ کی قسم! غصہ کرنا شیطان کے کاموں میں سے ہے۔" پھر فرماتے:

"اَللّٰھُمَّ! إِنْ كَانَ صَادِقًا فَاغْفِرْ لِيْ وَ إِنْ كَانَ كَاذِبًا فَاغْفِرْ لَهُ."

ترجمہ: "اے اللہ! اگر وہ (اپنی بات میں) سچا ہے تو میری مغفرت فرما اور اگر وہ (اپنی بات میں) جھوٹا ہے تو اس کی مغفرت فرما۔"

اسی طرح ایک شخص نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا:

"أَنْتَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ؟"

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "نَعَمْ"

پھر اس شخص نے کہا: "أَنْتَ سَارِقُ الْهِرَّةِ" تم نے بلی چوری کی ہے۔

اس پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَلِأَخِيْ هٰذَا."

ترجمہ: "اے اللہ! میری اور میرے اس بھائی کی مغفرت فرما۔"

پھر فرمایا:

"هٰكَذَا أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَسْتَغْفِرَ لِمَنْ ظَلَمَنَا."[1]

ترجمہ: "اسی طرح ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے کہ ہم اپنے ظالموں کے لیے مغفرت طلب کیا کریں۔"

بنو امیہ میں سے ایک شخص نے کسی فقیر کو کچھ روپے دے کر اس بات پر تیار کیا کہ بھرے مجمع میں جا کر جب زین العابدین درس دے کر فارغ ہوں تو ان کو گالیاں دینا۔

چناں چہ اس شخص نے جا کر ان کو بہت بری طرح گالیاں دیں، جب وہ چپ

[1] مناجات الصالحين، الباب الثاني عشر، أدعية متفرقة، دعاء للحاسدين: ۲۲۹

ہو اتو زین العابدین رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"يَا أَخِيْ إِنْ كُنْتُ كَمَا ذَكَرْتَ فَنَسْأَلُ اللّٰهَ أَنْ يَغْفِرَ لِيْ، وَإِنْ لَمْ أَكُنْ كَمَا قُلْتَ فَنَسْأَلُ اللّٰهَ أَنْ يَغْفِرَ لَكَ، فَخَرَّ الرَّجُلُ بَاكِيًا."

ترجمہ: "اے میرے بھائی! اگر میں ایسا ہی ہوں جیسا تم نے کہا تو پھر میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ میرے گناہوں کو معاف فرما دے، اور اگر میں ایسا نہیں ہوں جیسا تم نے کہا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے۔"

جب اس شخص نے حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ تعالیٰ سے یہ جواب سنا تو روتے روتے زمین پر گر گیا۔

اسی طرح کسی نقصان کے تاثرات تو تھوڑی دیر میں ختم ہو جائیں گے، لیکن باقی رہنے والی وہ نیکیاں یا برائیاں ہوں گی، جو اس کو پا کر داعی نے اپنے دل اور زبان سے ادا کیا۔

بزرگانِ دین کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی صدمہ آتا تو صبر کرتے، نوافل پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے اور یہی چیز اللہ تعالیٰ کے پاس باقی رہنے والی ہے۔

اب اگر ہم کو اس کا یقین ہو جائے کہ گالی سن کر یا نقصان اٹھا کر جو ذرا سی دیر میں ختم ہو جانے والا ہے، ہم صبر کریں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں کتنا بڑا درجہ ملنے والا ہے تو ہم بڑے سے بڑے نقصان پر بھی اس کا شکر ادا کریں اور صابر ہو جائیں۔

یہ واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ علماء امت کس طرح خون کے گھونٹ پی کر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہیں اور غصہ دلانے والے اور جذبات برانگیختہ کرنے والے نادان لوگوں کی حرکتوں اور باتوں کو برداشت کرتے ہوئے صبر و تحمل کی عظیم صفات پر کس طرح عمل پیرا ہو کر اپنی دنیا و آخرت درست رکھتے ہیں۔

لہٰذا ہم ائمہ مساجد کو بھی اپنے ان اکابرین کے نقش قدم پر چلنا چاہیے یہ تو بطور نمونہ چند واقعات ذکر کیے گئے ورنہ اس قسم کے واقعات سے کتابیں بھری پڑی ہیں، جن کا احاطہ یہاں پر ممکن نہیں ہے۔

ع اُولٰئِكَ اٰبَائِىْ فَجِئْنِىْ بِمِثْلِهِمْ

امام کو بسا اوقات اَن جان مقتدی یا بے ادب کمیٹی والوں کی طرف سے کوئی ناگوار بات سامنے آجائے تو اس پر بھی حضرت فضیل بن عیاض، حضرت زین العابدین رحمہما اللہ تعالیٰ، حضرت ابوہریرہ اور دیگر اکابرین کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے ان کے لیے دعا کریں اور فتنے کو دبانے کی کوشش کریں، ورنہ چھوٹی سی بات بہت بڑا انگارہ بن جاتی ہے، مثلاً: فتنہ ساز شخص امام تک ایسی بات پہنچا دیتا ہے جس سے امام صاحب کو غصہ آجائے تو ایسے شخص کی بات بغیر تحقیق کے عمل میں نہ لائیں، کسی کو آگے نقل نہ کریں اور قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ پر عمل کریں کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝﴾[1]

ترجمہ: ”اے مسلمانو! اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو پھر اپنے کیے پر پشیمانی اٹھاؤ۔“

یا اس شخص سے کہا جائے کہ مجھے ایسی باتیں نہ پہنچایا کرو، حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس طرح بات پہنچانے سے منع فرمایا تھا، چناں چہ آپ ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

”لَا يُبَلِّغُنِيْ أَحَدٌ مِنْ أَصْحَابِيْ عَنْ أَحَدٍ شَيْئًا فَإِنِّيْ أُحِبُّ أَنْ أَخْرُجَ إِلَيْكُمْ وَأَنَا سَلِيْمُ الصَّدْرِ.“[2]

[1] الحجرات: ۶ [2] ابوداؤد، الأدب، باب فی رفع الحدیث من المجلس، رقم: ۴۸۶۰

ترجمہ: ”میرے صحابہ (ساتھیوں) میں سے کوئی مجھے کسی کی ناپسندیدہ بات نہ پہنچائے، کیوں کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ تمہاری طرف اس حال میں نکلوں کہ میرا دل (تمہارے بارے میں) صاف ہو۔“

بسا اوقات کسی مقتدی کے منہ سے امام صاحب کے خلاف کوئی بات نکل جاتی ہے یا کسی نے امام صاحب کے کسی کام پر نکتہ چینی کی اور دوسرے آدمی نے اس پر نمک مسالہ لگا کر امام صاحب تک وہ بات پہنچا دی کہ فلاں صاحب آپ کے متعلق یہ کہہ رہے تھے، چناں چہ اس کے اس انداز پر امام صاحب کو غصہ آجاتا ہے اور پھر جمعے کے بیان میں اس کی طرف اشارہ کرکے کچھ کہہ دیتے ہیں، ادھر وہ موصوف امام صاحب کا بیان سن کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے کہ امام صاحب نے جمعے کے اجتماع میں میرے متعلق یہ کہہ دیا، اب وہ مقابلے پر آجاتا ہے یا تو وہ اس مسجد میں نماز پڑھنا چھوڑ دیتا ہے یا امام صاحب کو نکالنے کی فکر کرتا ہے یا پھر ان کو تنگ کرنے کے لیے دن رات پلاننگ بناتا ہے، جس سے امام صاحب کی یک سوئی ختم ہو جاتی ہے، مثلاً: ہمارے ایک ساتھی نے مسجد کے دروازے پر عیدالاضحیٰ کے دنوں میں کمیٹی کے کسی صاحب کے قربانی کے جانور بندھے ہوئے دیکھے، اس پر انہوں نے سمجھایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے، لیکن وہ صاحب نہیں مانے یا انہوں نے غفلت کی تو امام صاحب نے جمعے کے بیان میں منبر پر ڈانٹ دیا کہ یہ کمیٹی والے ایسے ہیں ویسے ہیں، مسجد کو اپنی جائیداد سمجھتے ہیں وغیرہ وغیرہ، نتیجہ یہ ہوا کہ کمیٹی والوں نے طیش میں آکر چند دنوں بعد ان کو منصب امامت سے معزول کرنے کا لیٹر بھیج دیا۔

اسی طرح محلے کے بچے کھیل رہے تھے اور دوسری طرف کچھ بڑی عمر کے لوگ بنچوں پر گپ شپ میں مصروف تھے، اتنے میں ایک بچے نے گیند پھینکی جو بنچوں پر بیٹھے ہوئے حضرات کو جا کر لگی تو انہوں نے غصے میں آکر کہا:

”تم امام صاحب کے پاس پڑھتے ہو، کیا امام صاحب تمہیں یہ تعلیم دیتے

ہیں؟"

بچوں نے جا کر امام صاحب کو بتایا کہ فلاں حضرات آپ کے متعلق یہ کہہ رہے تھے۔ امام صاحب نے جا کر ان کو ڈانٹا کہ: "تم لوگ یہاں بچوں پر کیوں بیٹھے ہو یہ تو بچوں کے کھیلنے کی جگہ ہے، یہاں بچے نہیں کھیلیں گے؟ تو کہاں کھیلیں گے۔ اگر آئندہ کبھی ان بچوں کو ایسی بات کی تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔"

نتیجہ یہ نکلا کہ پورے محلے میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں اور غیبتوں کا بازار گرم ہوا، نمازیوں میں دو فرقے ہوگئے، کچھ لوگ اس امام کے پیچھے نماز پڑھتے اور کچھ نہ پڑھتے اور جن لوگوں کی امام صاحب سے تلخ کلامی ہوئی تھی انہوں نے اپنے بچے مدرسے سے نکال لیے۔ امام صاحب کی بھی ذہنی یکسوئی اور فرحت و انبساط جو دین کے کام کے لیے انتہائی ضروری تھا وہ ختم ہوگیا، یہ سب کچھ صبر نہ کرنے کی وجہ سے ہوا، اگر دونوں میں سے کوئی ایک صبر سے کام لیتا تو اس قسم کے حالات پیدا نہ ہوتے۔

لہٰذا امام صاحب کو صبر کرنا چاہیے، اگرچہ حق پر ہو اور کبھی بھی طیش میں نہیں آنا چاہیے اور اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے تو ان شاء اللہ کبھی بھی امام اور مقتدیوں کے درمیان لڑائی جھگڑا نہیں ہوگا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جب وہ خلیفۃ المسلمین بنائے گئے تو منبر پر تشریف فرما ہوئے اور یہ اعلان فرمایا:

"إِنْ أَحْسَنْتُ فَأَعِينُونِي وَإِنْ أَسَأْتُ فَقَوِّمُونِي"[1]

ترجمہ: "اگر میں اچھا کام کروں تو میری معاونت کرو اور اگر میں برا کام کروں تو میری اصلاح کرو۔"

---

[1] تاریخ الطبری، سنۃ ۱۱ حدیث السقیفۃ: ۲۳۸/۲

وعظ و درس میں حکمت اور شفقت کی رعایت

دین کی تبلیغ تو ہر جگہ حکمت اور دانش مندی چاہتی ہے، اس میں داعی حق کے لیے انتہا درجے کا صبر و تحمل، مخاطب پر شفقت، حکمت و دانائی اور بات کو دل میں اتار دینے کی لگن کی ضرورت ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سن لیجیے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم شبہات کے مریض کا علاج کس طرح فرماتے تھے؟

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک قریشی نوجوان آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس نے ایک عجیب و غریب فرمائش کی، کہنے لگا:

"یا رسول اللہ! مجھے زنا کرنے کی اجازت دے دیجیے۔"

تصور تو فرمائیے! کہ یہ گھناؤنی فرمائش کس سے کی جارہی ہے؟ اس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جس کے تقدس کے آگے فرشتے بھی ہیچ ہیں، اور فرمائش بھی کسی چھوٹے موٹے گناہ کی نہیں، زنا کی اور وہ گناہ، جس کا نام ایک شریف انسان زبان پر لاتے ہوئے بھی شرماتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اس گستاخی کی سزا میں نوجوان کو دھکے دے کر باہر نکلوا دیتا۔

چناں چہ حاضرینِ مجلس اس نوجوان پر برس پڑے اور اسے ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا۔ لیکن قربان جائیے اس رحمتِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم پر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھانپ لیا کہ یہ شخص ضد اور عناد کا نہیں، شبہات کا مریض ہے اور یہ غصہ اور نفرت کے بجائے شفقت اور ترس کھانے کا مستحق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ڈانٹنے سے روکا، اور اس سے فرمایا: "میرے قریب آجاؤ۔" جب وہ قریب آگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

''کیا تم اس عمل کو اپنی ماں کے لیے پسند کرتے ہو؟''

نوجوان بولا: ''نہیں اللہ مجھے آپ پر قربان کرے، اللہ کی قسم نہیں''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اور لوگ بھی اپنی ماؤں کے لیے اس کو پسند نہیں کرتے۔''

پھر فرمایا: ''اچھا تو کیا تم اپنی بیٹی کے لیے اس عمل کو پسند کرتے ہو؟''

''نہیں یا رسول اللہ! مجھے اللہ آپ پر فدا کرے، اللہ کی قسم نہیں'' اس نے کہا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اور لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لیے اس عمل کو پسند نہیں کرتے۔''

''اور کیا تم اپنی بہن کے لیے اس عمل کو پسند کرتے ہو؟''

''نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر نثار کرے، اللہ کی قسم نہیں!'' نوجوان نے کہا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اور لوگ بھی اپنی بہنوں کے لیے اس عمل کو پسند نہیں کرتے۔''

''اور کیا تم اپنی پھوپھی کے لیے اسے پسند کرتے ہو؟''

''نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر قربان کرے، خدا کی قسم نہیں!'' نوجوان بولا۔

''آپ ﷺ نے فرمایا: تو اور لوگ بھی اسے اپنی پھوپھیوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔

اور کیا تم اسے اپنی خالہ کے لیے پسند کرتے ہو؟''

''نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر قربان کرے، واللہ نہیں'' نوجوان بولا۔

''آپ ﷺ نے فرمایا تو اور لوگ بھی اسے اپنی خالاؤں کے لیے پسند نہیں کرتے۔''

یہ فرما کر آپ ﷺ نے اپنا دست شفقت نوجوان پر رکھا اور فرمایا:

''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ ذَنْبَهٗ، وَطَهِّرْ قَلْبَهٗ، وَحَصِّنْ فَرْجَهٗ''

ترجمہ: ''یا اللہ! اس کے گناہ کو معاف فرما، اس کے قلب کو پاکیزگی عطا فرما اور عفت عطا فرما۔''

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

''فَلَمْ یَكُنْ بَعْدَ ذٰلِكَ الْفَتٰى يَلْتَفِتُ إِلٰى شَيْءٍ''

کہ اس واقعہ کے بعد نوجوان اتنا پاک دامن ہو گیا کہ کسی طرف التفات ہی نہیں کرتا تھا۔ امام ہیثمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔[1]

دین کا کام حکمت سے کرنا چاہیے

محمد اسدی کے والد ابو بکر کا بیان ہے کہ میں نے جس سال حج کیا، اسی سال ابو القاسم البغوی اور ابو بکر الادمی القاری نے بھی حج کیا۔ جب ہم نے حج کے فرائض ادا کر لیے تو مدینہ منورہ کی زیارت کا ارادہ کیا۔ مدینہ میں ایک دن ابو القاسم البغوی میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے:

''اے ابو بکر! مسجد نبوی کے ایک گوشے میں ایک اندھے آدمی نے اپنی مجلس قائم کر رکھی ہے اور حاضرین کو من گھڑت قصے اور موضوع احادیث سنا رہا ہے۔ کیوں نہ ہم لوگ اس کی مجلس میں چلیں اور اسے واعظ کرنے سے روکیں؟''

میں نے کہا:

''ابو القاسم! ابھی ہماری حالت اس قدر مضبوط نہیں ہے کہ حاضرین مجلس ہماری بات سننے پر آمادہ ہو جائیں گے اور اندھے کی چٹ پٹی باتیں چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ ہو جائیں، نیز اس وقت ہم بغداد میں نہیں ہیں جہاں ہماری اپنی ایک

[1] المعجم الکبیر للطبرانی، باب الصاد، ما أسند أبو أمامة: ۸/۱۶۲، رقم: ۷۶۷۹

پہچان ہے اور لوگ ہماری بات سنتے ہیں، یہاں ہم غریب الوطنوں کی بات کون سنے گا؟ ہاں البتہ اس کے بجائے کوئی دوسری مناسب صورت نکالی جاسکتی ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے ابوبکر الادمی کا ہاتھ پکڑا جو بہترین قاری تھے، اور آگے بڑھا کر کہا: "چلئے، تلاوت کلام پاک کیجیے۔"

انہوں نے جوں ہی تلاوت کلام پاک شروع کی، آہستہ آہستہ لوگ اندھے کی مجلس سے اٹھ کر ہماری مجلس میں منتقل ہونے اور ابوبکر کی قراءت سے محظوظ ہونے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں اندھے کی مجلس خالی نظر آنے لگی اور اب تمام حاضرین ہماری مجلس کی زینت بنے ہوئے تھے۔

یہ دیکھ کر اندھے نے اپنے قائد سے کہا:

"خُذْ بِيَدِي، فَهٰكَذَا تَزُوْلُ النِّعَمُ"

ترجمہ: "میرا ہاتھ پکڑ کر گھر لے چلو، نعمتیں اسی طرح زوال پذیر ہوتی ہیں۔"[1]

اس واقعے سے ہمیں سبق لینا چاہیے کہ بسا اوقات ایک منکر کو بغیر حکمت کے روکا جاتا ہے تو وہ کئی منکرات کے وجود کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

چناں چہ کسی اجتماعی، عمومی منکر کو روکنے کے لیے اکابر علما سے مشورہ ضرور کر لیا جائے کہ کس حکمت کے ساتھ کام کیا جائے کہ اس منکر کا رد بھی ہو اور امت میں انتشار و اختلاف کا ذریعہ بھی نہ بنے اور لوگ منکرات کو چھوڑ کر صراط مستقیم پر آجائیں۔

لہٰذا ائمہ کرام کو چاہیے کہ دعوت دینے میں ایسا مشفقانہ عنوان اختیار فرمائیں کہ سنگ دل مخالف بھی غور کرنے پر مجبور ہوجائے، جس شخص کے سامنے مخاطب کی ہدایت مقصود ہو اور انجام اس کے سامنے ہو کہ یہ مخاطب اگر دین پر نہ آیا تو موت کے

[1] سنہرے حروف: ۳۲۱ بحوالہ کتاب الاذکیاء لابن جوزی: ص ۱۳۹

بعد اس کا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟

یہ فکر اور یہ انجام اس کو شفقت پر لے آئے گا۔ اور لوگوں کی اس تباہ حالت کو دیکھ کر اس کا دل جلے گا، اور خیر خواہی سے اس کا دل چاہے گا کہ کسی طرح ان کی حالت سدھر جائے، ٹھیک اسی طرح جس طرح باپ بیٹے کی اصلاح اور رشد و ہدایت کا طالب محض پدرانہ شفقت اور خیر خواہی کی بنا پر ہوتا ہے، اسی طرح مبلغ اور داعی کے اندر بھی یہی جذبہ پیدا ہوگا، دینی خیر خواہی اور مسلمانوں پر رحمت و شفقت کی تاثیر اس کے دل کو بے چین رکھے گی۔ پھر وہ مخاطب کی بری سے بری بات کو سنی ان سنی کردے گا اور مخاطب کی ہدایت کے لیے بے چین اور بے قرار رہے گا۔ مقتدیوں اور ملنے جلنے والوں کی غلطیوں و کوتاہیوں کو سہہ کر وہ طریقہ اور انداز اختیار کرے گا، جس سے یہ لوگ خود بھی ہدایت پر آجائیں اور آگے ہدایت پھیلانے والے بھی بن جائیں۔

ائمہ کرام لوگوں کو بتائیں کہ گناہ پر تنقید نہ کریں

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جس طرح کفار کو اسلام میں لانے کی محنت فرمائی، اسی طرح مسلمان گناہ گاروں کو بہترین تدبیر، اور حکمت کے ذریعہ سے ان کو دین دار بنانے کی فکر فرماتے تھے۔

کہتے ہیں کہ انسان محبت کا بھوکا ہے، محبت کا اظہار کر کے، احسان اور دعا کر کے آپ کئی مسلمانوں کو جہنم کے راستے سے بچاسکتے ہیں۔

نفرت، ڈانٹ ڈپٹ، تنقید، عیوب اور گناہوں پر ذلیل کر کے تو انسان اپنے بیٹے کی بھی اصلاح نہیں کرسکتا۔

ایک مرتبہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گزر ایک مجمع پر سے ہوا جو ایک آدمی کے گرد اکٹھا تھا۔ لوگ اسے مار پیٹ رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔

انہوں نے حقیقت حال دریافت کی۔

"مَا الْخَبَرُ....؟"

"کیا بات ہے؟"

تو لوگوں نے بتایا:

"رَجُلٌ وَقَعَ فِي ذَنْبٍ كَبِيرٍ."

"ایک آدمی ہے جس نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے۔" ہم اس کی پٹائی کر رہے ہیں۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا:

"أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَقَعَ فِي بِئْرٍ أَلَمْ تَكُونُوا تَسْتَخْرِجُونَهُ مِنْهُ؟"

"یہ بتاؤ اگر یہ شخص کسی کنویں میں گر جاتا تو کیا تم اسے وہاں سے نہ نکالتے؟"

سب نے کہا:

"بَلٰی."

"کیوں نہیں۔"

حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان لوگوں کو سمجھاتے ہوئے فرمایا:

"لَا تَسُبُّوهُ وَلَا تَضْرِبُوهُ وَإِنَّمَا عِظُوهُ وَبَصِّرُوهُ، وَاحْمَدُوا اللّٰهَ الَّذِي عَافَاكُمْ مِنَ الْوُقُوعِ فِي ذَنْبِهِ."

"پھر تم اس کو نہ گالی دو، نہ مارو پیٹو بلکہ صرف سمجھانے بجھانے اور وعظ و نصیحت کو کافی سمجھو اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو اس گناہ سے محفوظ رکھا۔"

مجمع نے پوچھا:

"أَفَلَا تُبْغِضُهُ؟"

"تو کیا آپ اسے ناپسند نہیں کرتے؟"

حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا:

"إِنَّمَا أُبْغِضُ فِعْلَهُ فَإِذَا تَرَكَهُ فَهُوَ أَخِي."

ترجمہ: "میں صرف اس کے گناہ کو ناپسند کرتا ہوں، اگر اس سے باز آ جائے تو پھر یہ میرا دینی بھائی ہے۔"

حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ بات سنی تو وہ شخص پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اپنے گناہ سے توبہ کی۔[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَإِنَّآ أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى أَوْ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ﴾[2]

ترجمہ: "پوچھئے کہ تمہیں آسمانوں اور زمین سے روزی کون پہنچاتا ہے؟ (خود) جواب دیجیے! کہ اللہ تعالیٰ۔ (سنو) ہم یا تم۔ یا تو یقیناً ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں؟"

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں یہ مشرکین کفار کے ساتھ خطاب ہے۔ دلائل واضحہ سے اللہ تعالیٰ کا خالق و مالک ہونا اور قادر و مطلق ہونا واضح کر دیا گیا۔ بتوں اور غیر اللہ کی بے بسی اور کمزوری کا مشاہدہ کرا دیا گیا۔ ان سب باتوں کے بعد موقع اس کا تھا کہ مشرکین کو خطاب کر کے کہا جاتا کہ تم جاہل اور گمراہ ہو کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں اور شیاطین کی پرستش کرتے ہو۔

مگر قرآن حکیم نے اس جگہ جو حکیمانہ عنوان اختیار فرمایا، وہ دعوت و تبلیغ مخالفین اسلام، اور اہل باطل سے بحث و مناظرہ کرنے والوں کے لیے ایک اہم ہدایت نامہ

[1] صور من حیاۃ الصحابۃ: ۲۱۰،۲۰۹
[2] سبا: ۲۴

ہے کہ اس آیت میں ان کو کافر گمراہ کہنے کی بجائے عنوان یہ رکھا کہ ان دلائل واضحہ کی روشنی میں یہ تو کوئی سمجھ دار آدمی کہہ نہیں سکتا کہ توحید وشرک دونوں باتیں حق ہیں اور اہل توحید اور مشرک دونوں حق پرست ہیں۔ بل کہ یقینی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک حق پر دوسرا گمراہی پر ہے۔ اب تم خود سوچ لو اور فیصلہ کرلو کہ ہم حق پر ہیں یا تم۔ مخاطب کو خود کافر گمراہ کہنے سے اس کو اشتعال ہوتا اس سے گریز کیا گیا، اور ایسا مشفقانہ عنوان اختیار کیا کہ سنگ دل مخالف بھی غور کرنے پر مجبور ہو جائے۔[1]

یہ پیغمبرانہ دعوت وموعظت اور مجادلہ "بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ" کا طریقہ جو علما کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیے، اس کے نظر انداز ہونے ہی سے دعوت وتبلیغ اور بحث ومباحثہ بے اثر بل کہ مضر ہو کر رہ جاتا ہے۔ مخالفین ضد پر آجاتے ہیں ان کی گمراہی اور پختہ ہو جاتی ہے۔[2]

ایک سوال اور اس کا جواب

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں: بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ یعنی لوگوں کو اچھائی کی دعوت دو اور اگر کوئی غلط کام میں مبتلا ہے تو اس کو بتادو اور اس کو روک دو اور دوسری طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ دوسرے مسلمان کا دل مت توڑو۔ اب دونوں کے درمیان تطبیق کس طرح کی جائے گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق اس طرح ہوگی کہ جب دوسرے شخص سے کوئی بات کہو تو خیر خواہی سے کہو..... تنہائی میں کہو..... نرمی سے کہو..... محبت سے کہو..... اور اس انداز میں کہو کہ جس سے اس کا دل کم سے کم ٹوٹے۔

مثلاً تنہائی میں اس سے کہے کہ بھائی! تمہارے اندر یہ بات قابل اصلاح ہے،

[1] تفسیر قرطبی: ۷/۲۱۹ [2] معارف القرآن: ۷/۲۹۲، سبا: ۲۴

تم اس کی اصلاح کرلو، لیکن طعنہ کے انداز میں کہنا یا لوگوں کے سامنے برسر بازار اس کو رسوا کرنا، یہ چیز انسان کے دل میں گھاؤ ڈال دیتی ہے، اس لیے حرام اور گناہ ہے۔[1]

ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اَلْمُؤْمِنُ مِرْآۃُ الْمُؤْمِنِ"[2]

ترجمہ: "ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے۔"

حضرت شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: "یعنی جس طرح اگر کوئی شخص اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ لے تو چہرہ میں کوئی عیب یا داغ دھبہ ہوتا ہے وہ نظر آجاتا ہے اور انسان اس کی اصلاح کرلیتا ہے۔ اسی طرح ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے سامنے آنے کے بعد اس کو بتادیتا ہے کہ تمہارے اندر فلاں بات ہے اس کو درست کرلو، یہی حدیث کا مضمون ہے۔"

یہ حدیث ہم نے بھی پڑھی ہے اور آپ حضرات نے بھی اس کو پڑھا اور سنا ہوگا لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ علم حقیقی عطا فرماتے ہیں، ان کی نگاہ بہت دور تک پہنچتی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے مؤمن کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔ لوگ تو اتنا جانتے ہیں کہ آئینہ کے ساتھ یہ تشبیہ اس وجہ سے دی ہے کہ جس طرح آئینہ چہرے اور جسم کے عیوب کو بتادیتا ہے، اسی طرح مؤمن بھی دوسرے مؤمن کے عیوب بتادیتا ہے۔

[1] اصلاحی خطبات: ۱/۹۴ [2] ابوداود، الادب (باب فی النصیحۃ) ۲/۳۱۷

لیکن آئینہ کے ساتھ تشبیہ دینے میں ایک اور وجہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ آئینہ کا یہ کام ہے کہ وہ آئینہ عیب اور برائی صرف اس کو بتاتا ہے، جس کے اندر وہ عیب ہوتا ہے اور جو اس کے سامنے کھڑا ہے؛ لیکن دوسرا شخص جو دور کھڑا ہے، اس کو نہیں بتاتا کہ دیکھو اس کے اندر یہ عیب ہے۔ اسی طرح مؤمن کا کام یہ ہے کہ جس کے اندر کمزوری یا نقص یا عیب ہے، اس کو تو محبت اور پیار سے بتادے کہ تمہارے اندر یہ نقص اور کمزوری ہے؛ لیکن دوسرے کو بتاتا اور گاتا نہ پھرے کہ فلاں کے اندر فلاں عیب ہے اور فلاں نقص ہے۔ لہٰذا دوسروں کو ذلیل کرنا...... رسوا کرنا...... اس کی برائیاں بیان کرنا...... مؤمن کا کام نہیں۔

اسی طرح آئینہ میں جتنا عیب ہے، اس سے زیادہ نہیں بتاتا، یہ نہیں کہ چھوٹے سے عیب کو بڑا بنادے، بل کہ جتنا ہے صرف اتنا ہی بتاتا ہے، پچھلے عیبوں کو نہیں بتاتا، کل تمہارے اندر یہ عیب تھا، پرسوں یہ تھا۔

ایک آدمی میں یہ عیب ہے تو اس کے بھائی جب آئینہ کے سامنے آئیں اور ان میں عیب نہ ہو تو یہ نہیں کہ ایک کے عیب کی وجہ سے سارے بھائیوں کو عیب دار بنادے، اسی طرح مؤمن کسی جماعت کے کسی ایک ساتھی کی کمی کو پوری جماعت، یا کسی زبان بولنے والے میں ایک عیب ہو تو تمام لوگ جو اس زبان کو بولتے ہیں ان پر عیب نہیں لگاتا، کہ اس زبان کے بولنے والے سب ایسے ہوتے ہیں، یا اس جماعت کے سب لوگ ایسے ہوتے ہیں۔

یا آئینہ میں کھڑے ہونے والے شخص کو یہ نہیں بتاتا کہ تم سے پہلے آنے والے میں یہ...... یہ...... عیب تھے، اسی طرح مؤمن عیوب دیکھ کر غیبت نہیں کرتا۔

لہٰذا اس ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے دونوں باتیں بیان فرمادیں۔ ایک یہ کہ مؤمن کا کام یہ بھی ہے کہ اگر وہ دوسرے مؤمن کے اندر کوئی غلطی دیکھ رہا ہے تو اس کو بتائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو دوسروں کے سامنے ذلیل اور رسوا نہ

کرے، اس کا عیب دوسروں کو نہ بتائے۔

آج ہمارے معاشرے میں طعنہ دینے کا رواج پڑ گیا ہے۔ اب تو "طنز" باقاعدہ ایک فن بن گیا ہے اور اس کو ایک ہنر سمجھا جاتا ہے کہ کس خوب صورتی کے ساتھ بات لپیٹ کر کہہ دی گئی اور یہ خیال نہیں کہ اس کے ذریعہ دوسرے کا دل ٹوٹا یا دل آزاری ہوئی۔

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں، میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت لے کر آئے۔ کسی نبی کی زندگی میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملے گی کہ کسی نبی نے اپنے مخالف کو یا کسی کافر کو طعنہ دیا ہو یا طنز کیا ہو۔ بل کہ جو بات وہ دوسروں سے کہتے تھے، وہ محبت اور خیر خواہی سے کہتے تھے۔ تاکہ اس کے ذریعہ دوسرے کی اصلاح ہو۔

جب آدمی کو ادبیت اور مضمون نگاری کا شوق ہوتا ہے یا تقریر میں آدمی کو دل چسپی پیدا کرنے کا شوق ہوتا ہے تو پھر اس مضمون نگاری میں اور اس تقریر میں طنز اور طعن و تشنیع بھی اس کا ایک لازمی حصہ بن جاتا ہے۔ جس سے ہمیں بہت بچنا چاہیے۔

آج سے تقریباً پینتیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں (یعنی حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب) اس وقت دار العلوم کراچی سے نیا نیا فارغ ہوا تھا۔ اس وقت ایوب خان صاحب مرحوم کے دور میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے تھے، ان کے خلاف میں نے ایک کتاب لکھی۔ جن لوگوں نے ان قوانین کی حمایت کی تھی، ان کا ذکر کرتے ہوئے اور ان کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے اس کتاب میں جگہ جگہ طنز کا انداز اختیار کیا تھا۔ اس وقت چوں کہ مضمون نگاری کا شوق تھا۔ اس شوق میں بہت سے طنزیہ جملے اور طنزیہ فقرے لکھے اور اس پر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ یہ بڑا اچھا جملہ

چست کر دیا۔ جب وہ کتاب مکمل ہو گئی تو میں نے وہ کتاب حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ تعالیٰ کو سنائی، تقریباً دو سو صفحات کی کتاب تھی۔

جب والد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ پوری کتاب سن چکے تو فرمایا یہ بتاؤ کہ تم نے یہ کتاب کس مقصد کے لیے لکھی ہے؟

اگر اس مقصد سے لکھی ہے کہ جو لوگ پہلے سے تمہارے ہم خیال ہیں وہ تمہاری اس کتاب کی تعریف کریں کہ واہ واہ کیسا دندان شکن جواب دیا ہے اور یہ تعریف کریں کہ مضمون نگاری کے اعتبار سے اور بلاغت کے اعتبار سے، بہت اعلیٰ درجے کی کتاب لکھی ہے، اگر اس کتاب کے لکھنے کا یہ منشاء ہے تو تمہاری یہ کتاب بہترین ہے۔

لیکن اس صورت میں یہ دیکھ لیں کہ اس کتاب کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا قیمت ہوگی؟

اور اگر کتاب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جو آدمی غلطی پر ہے، اس کتاب کے پڑھنے سے اس کی اصلاح ہو جائے، تو یاد رکھو! تمہاری اس کتاب کے پڑھنے سے ایسے آدمی کی اصلاح نہیں ہوگی۔ بل کہ اس کتاب کو پڑھنے سے اس کے دل میں اور ضد پیدا ہوگی۔ دیکھو! حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے۔ انہوں نے دین کی دعوت دی اور کفر اور شرک کا مقابلہ کیا، لیکن ان میں سے ایک نبی بھی ایسا نہیں ملے گا، جس نے طنز کا راستہ اختیار کیا ہو۔ لہٰذا یہ دیکھو کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے واسطے لکھی ہے یا مخلوق کے واسطے لکھی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے واسطے لکھی ہے تو پھر اس کتاب سے اس طنز کو نکالنا ہوگا اور اس کا طرز تحریر بدلنا ہوگا۔

مجھے یاد ہے کہ جب والد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے یہ بات ارشاد فرمائی تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سر پر پہاڑ توڑ دیا۔ کیوں کہ دو سو ڈھائی سو صفحات کی کتاب لکھنے کے بعد اس کو از سر نو ادھیڑنا بڑا بھاری معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ مضمون نگاری کا بھی شوق تھا اور اس کتاب میں بڑے مزے دار فقرے

بھی تھے۔ ان فقروں کو نکالتے بھی دل کٹتا تھا، لیکن یہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ تعالیٰ کا فیض تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق عطا فرمائی اور میں نے پھر پوری کتاب کو ادھیڑا اور از سر نو اس کو لکھا۔ پھر الحمد للہ وہ کتاب "ہمارے عائلی قوانین" کے نام سے چھپی۔ لیکن وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، الحمد للہ یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ داعی حق کے لیے طنز کا طریقہ اور طعنہ دینے کا طریقہ اختیار کرنا درست نہیں، یہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ نہیں ہے۔[1]

سخت کلامی اور سب وشتم سنتِ انبیاء کے خلاف ہے

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿٥٣﴾﴾[2]

ترجمہ: "اور میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ وہ بہت ہی اچھی بات منہ سے نکالا کریں، کیوں کہ شیطان آپس میں فساد ڈلواتا ہے، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: پہلی آیت میں جو مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ سخت کلامی سے منع کیا گیا ہے اس کی مراد یہ ہے کہ بے ضرورت سختی نہ کی جاوے اور ضرورت ہو تو قتل تک کرنے کی اجازت ہے ؎

کہ بے حکم شرع آب خوردن خطاست ✿ وگر خون بفتوی بریزی رواست

قتل و قتال کے ذریعے کفر کی شوکت اور اسلام کی مخالفت کو دبایا جا سکتا ہے، اس لیے اس کی اجازت ہے۔ گالی گلوچ اور سخت کلامی سے نہ کوئی قلعہ فتح ہوتا ہے نہ

[1] اصلاحی خطبات: ۱۱/۹۴ تا ۹۹

[2] بنی اسرائیل: ۵۳

کسی کو ہدایت ہوتی ہے، اس لیے اس سے منع کیا گیا ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک واقعے میں نازل ہوئی جس کی صورت یہ تھی کہ کسی شخص نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دی، اس کے جواب میں انہوں نے بھی سخت جواب دیا اور اس کے قتل کا ارادہ کیا اس کے نتیجے میں خطرہ پیدا ہوگیا کہ دو قبیلوں میں جنگ چھڑ جائے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحقیق یہ ہے کہ:

"أَمَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي هٰذِهِ الْآيَةِ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْمَا بَيْنَهُمْ خَاصَّةً بِحُسْنِ الْأَدَبِ، وَ إِلَانَةِ الْقَوْلِ، وَخَفْضِ الْجَنَاحِ، وَاطِّرَاحِ نَزَغَاتِ الشَّيْطَانِ"

اس آیت میں مسلمانوں کو آپس میں خطاب کرنے کے متعلق ہدایت ہے کہ باہم اختلاف کے وقت سخت کلامی نہ کیا کریں کہ اس کے ذریعے شیطان ان کے آپس میں جنگ و فساد پیدا کر دیتا ہے۔[1]

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾[2]

"لڑائی کر کافروں سے اور منافقوں سے اور تند خوئی کر ان پر۔"

اس آیت میں کفار اور منافقین دونوں سے جہاد اور ان کے معاملہ میں شدت اختیار کرنے کا حکم رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا ہے۔ ظاہری کفار سے جہاد کا معاملہ تو واضح ہے، لیکن منافقین سے جہاد کا مطلب خود رسول اللہ ﷺ کے تعامل سے یہ ثابت ہوا کہ ان کے ساتھ جہاد سے مراد زبانی جہاد ہے کہ ان کو اسلام کی حقانیت

[1] قرطبی: ۲۰۱/۵، الجزء العاشر سو۔ معارف القرآن: ۴۹۶/۵، ۴۹۷

[2] التوبة: ۷۳

سمجھنے کی طرف دعوت دیں، تاکہ وہ اپنے دعوائے اسلام میں مخلص ہو جائیں۔[1]

﴿وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ "غلظ" کے اصلی معنی یہ ہیں کہ مخاطب جس طرز عمل کا مستحق ہے اس میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے، یہ لفظ رأفت کے مقابل استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی رحمت اور نرم دلی کے ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس جگہ غلظت استعمال کرنے سے عملی غلظت مراد ہے کہ ان پر احکام شرعیہ جاری کرنے میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے۔ زبان اور کلام میں غلظت اختیار کرنا مراد نہیں، کیوں کہ وہ سنت انبیاء علیہم السلام کے خلاف ہے، وہ کسی سے سخت کلامی اور سب و شتم نہیں کرتے۔[2] ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"إِذَا زَنَتْ أَمَةُ أَحَدِكُمْ فَلْيَجْلِدْهَا الْحَدَّ وَلَا يُثَرِّبْ عَلَيْهَا"[3]

ترجمہ: "اگر تمہاری کوئی کنیز زنا کی مرتکب ہو تو اس کی سزا حد شرعی اس پر جاری کر دو، مگر زبانی ملامت اور طعن و تشنیع نہ کرو۔"

اور رسول اللہ ﷺ کے حال میں خود حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾[4]

ترجمہ: "یعنی اگر آپ (ﷺ) سخت کلام سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے۔"

اور آں حضرت ﷺ کے تعامل میں بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ کفار و منافقین

[1] تفسیر قرطبی: ۱۰۶/۴ سو۔ تفسیر مظہری: ۲۶۶/۴، التوبة: ۷۳

[2] تفسیر قرطبی: ۱۰۶/۴، التوبة: ۷۳

[3] ترمذی، الحدود، باب ما جاء في إقامة الحد على الإماء، رقم: ۱۴۴۰، أبو داود، الحدود، باب في الأمة تزني ولم تحصن رقم: ۴۴۷۱

[4] آل عمران: ۱۵۹

سے گفتگو اور خطاب میں بھی غلاظت اختیار فرمائی ہو۔

تنبیہ: حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: افسوس کہ خطاب اور کلام میں غلاظت جس کو کفار کے مقابلے میں بھی اسلام نے اختیار نہیں کیا، آج کل کے مسلمان دوسرے مسلمانوں کے بارے میں بے دھڑک استعمال کرتے ہیں اور بہت سے لوگ تو اس کو دین کی خدمت سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔[1]

ظلم کا جواب ظلم نہیں انصاف ہے، مجرم کی سزا میں بھی انصاف کی رعایت

قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ ﴿فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ﴾[2] اسلامی قانون کی ایک خاص ہدایت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ظلم کا بدلہ ظلم سے لینا جائز نہیں، بدلہ میں بھی انصاف کی رعایت لازمی ہے، جب تک ولی مقتول انصاف کے ساتھ اپنے مقتول کا انتقام شرعی قصاص کے ساتھ لینا چاہے تو قانون شریعت اس کے حق میں ہے یہ منصور حق ہے اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہے اور اگر اس نے جوشِ انتقام میں شرعی قصاص سے تجاوز کیا تو اب یہ مظلوم کے بجائے ظالم ہو گیا اور ظالم اس کا مظلوم بن گیا اب معاملہ برعکس ہو جائے گا اللہ تعالیٰ اور اس کا قانون اب اس کی مدد کرنے کی بجائے دوسرے فریق کی مدد کرے گا کہ اس کو ظلم سے بچائے گا۔

جاہلیت عرب میں یہ بات عام تھی کہ ایک شخص قتل ہوا تو اس کے بدلہ میں قاتل کے خاندان یا ساتھیوں میں جو بھی ہاتھ لگے اس کو قتل کر دیتے تھے۔ بعض جگہ یہ صورت ہوتی کہ جس کو قتل کیا گیا وہ قوم کا کوئی بڑا آدمی ہے تو اس کے بدلہ میں صرف

[1] معارف القرآن: ۴۲۲/۱، التوبۃ: ۷۳

[2] بنی اسرائیل: ۳۳

ایک قتل قصاص کرنا کافی نہ سمجھا جاتا تھا، بل کہ ایک خون کے بدلہ دو تین یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی جان لی جاتی تھی، بعض لوگ جوشِ انتقام میں قاتل کے صرف قتل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بل کہ اس کی ناک کان وغیرہ کاٹ کر مثلہ کر دیتے تھے یہ سب چیزیں اسلامی قصاص کی حد سے زائد اور حرام ہیں، اس لیے آیت ﴿فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ﴾[1] میں ان کو روکا گیا ہے۔

بعض ائمہ مجتہدین کے سامنے کسی شخص نے حجاج بن یوسف پر کوئی الزام لگایا۔ حجاج بن یوسف اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا ظالم اور انتہائی بدنام شخص ہے، جس نے ہزاروں صحابہ وتابعین کو ناحق قتل کیا ہے، اس لیے عام طور پر اس کو برا کہنے کی برائی لوگوں کے ذہن میں نہیں رہتی، جن بزرگ کے سامنے یہ الزام حجاج بن یوسف پر لگایا گیا انہوں نے الزام لگانے والے سے پوچھا کہ: ”تمہارے پاس اس الزام کی کوئی سند یا شہادت موجود ہے؟“

انہوں نے کہا: ”نہیں۔“ آپ نے فرمایا: ”اگر اللہ تعالیٰ حجاج بن یوسف ظالم سے ہزاروں مقتولین بے گناہ کا انتقام لے گا تو یاد رکھو کہ جو شخص حجاج پر کوئی ظلم کرتا ہے اس کو بھی انتقام سے نہیں چھوڑا جائے گا۔ حجاج کا بدلہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی لیں گے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کوئی جنبہ داری (جانب داری، طرف داری) نہیں ہے کہ برے اور گناہ گار بندوں پر دوسروں کو آزاد چھوڑ دیں اور وہ جو چاہیں الزام و اتہام لگا دیا کریں۔“[2]

پیغمبرانہ دعوت کی روح

مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس جا کر تبلیغ کرنے کا حکم دیا اور تبلیغ کے لیے اصول یہ بتلایا:

[1] بنی اسرائیل: ۳۳

[2] معارف القرآن: ۴۷۷/۵، ۴۷۸، بنی اسرائیل: ۳۳

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ﴾[1]

ترجمہ: ”پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ (برغبت) نصیحت قبول کرلے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے۔“

بتلائیے اس امت کا کوئی خطیب کوئی عالم دین، کوئی لیڈر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے زیادہ افضل ہے۔ اور کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ امتی بھی فرعون سے زیادہ برا اور گنہ گار ہے، جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام جیسے پاک باز انسانوں کو حکم یہ ہے کہ فرعون جیسے مردود کو دین کی بات سمجھاؤ تو نرمی اور محبت سے سمجھاؤ۔ اس پر کیچڑ نہ اچھالو، اس کا مذاق نہ اڑاؤ۔ تو آج کے کسی بھی خطیب اور واعظ کے لیے کیسے جائز ہے کہ وہ اس امت ہی کے بعض افراد سے انتہائی غلیظ زبان میں مخاطب ہو اور کسی گروہ کے بزرگوں کے لیے بازاری زبان استعمال کرے۔

فرعون نے لوگوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بدگمان کرنے کے لیے جب یہ پوچھا کہ پہلے لوگوں یعنی ہمارے آباؤ اجداد کے بارے میں کیا خیال ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ وہ تو کافر اور مشرک تھے، وہ تو جہنم میں جل رہے ہیں بلکہ حکمت کے ساتھ یوں جواب دیا کہ:

﴿قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۖ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى﴾[2]

ترجمہ: ”کہا کہ ان کا علم میرے پروردگار کو ہے (جو) کتاب میں (لکھا ہوا) ہے میرا پروردگار نہ چوکتا نہ بھولتا ہے۔“

جب کہ ہمارے ہاں کامیاب خطیب اسے سمجھا جاتا ہے جو مخالف گروہ کے بزرگوں کو اپنی چرب لسانی سے دائرۂ ایمان سے تو کیا دائرۂ انسانیت سے بھی خارج کردے۔

---

[1] طٰہٰ: ۴۴ [2] طٰہٰ: ۵۲

کاش! ہم محبت سے بات کرنا سیکھ لیں، پھر دیکھنا ہمارے معاشرے سے نفرتیں کیسے بوریا بستر سمیٹتی ہیں اور محبتوں اور خوشیوں کی خوشبو مشام جان کو کیسے معطر کرتی ہے، پھر تو آپ کہہ اٹھیں گے:

یہ کس نے محبت سے دوالیں نگاہیں
کہ عالم میں پھر سے بہار آرہی ہے
جو دن آرہا ہے بھلا آرہا ہے
جو رات آرہی ہے خوشی لا رہی ہے

اور اگر ہم نے محبت کرنا نہ سیکھا تو اندیشہ ہے کہ ہم آپس ہی میں لڑ لڑ کر اپنا نام و نشان ہی نہ مٹا دیں۔[1]

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہماری تبلیغ و دعوت اور اصلاحی کوششوں کو بے کار کرنے اور تفرق اور جنگ و جدل کی خلیج کو وسیع کرنے میں سب سے زیادہ دخل اس کو ہے کہ آج کل کے اہل زبان اور اہل قلم علماء نے عموماً دعوت و اصلاح کے پیغمبرانہ طریقوں کو نظر انداز کر کے صحافیانہ زبان اور فقرے چست کرنے ہی کو بات میں وزن پیدا کرنے اور موثر بنانے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ اور تجربے و مشاہدے سے واضح ہے کہ یہ ایک ایسا منحوس طریقہ ہے کہ اس سے خطا کار یا گمراہ کی اصلاح کی کبھی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

یہ طریق کار ان کو ضد اور ہٹ دھرمی پر اور زیادہ مضبوط کر دیتا ہے۔ اور اصلاح کے بجائے دلوں میں دشمنی کے بیج بوتا ہے۔ اور عداوت کی آگ بھڑکاتا ہے۔

ہاں اپنے ہوا خواہوں اور معتقدین کے لیے کچھ دیر کا سامان تفریح ضرور ہو جاتا ہے اور ان کی داد تحسین دینے سے لکھنے والے بھی کچھ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے دین کی بڑی اچھی خدمت کی ہے۔

---

[1] ندائے منبر و محراب..... اتفاق و اتحاد: ۱/ ۲۱۰

لیکن جو لوگ اس مضمون کے مخاطب ہوتے ہیں ان کے دلوں سے پوچھیے کہ اگر کسی وقت ان کو اس بات کے حق ہونے کا یقین بھی ہو جائے تو یہ فقرہ بازی اور تمسخر و استہزاء کا طریق اس کو حق کی طرف آنے سے مانع نہیں بن جاتا؟ اور انہیں ہمیشہ کے لیے اس داعی کا دشمن نہیں بنا دیتا؟

لہٰذا نہایت ہی ادب سے عاجزانہ گزارش ہے امام اور اہلِ علم ہوتے ہوئے یہ فیصلہ فرمالیجیے کہ اگر ہم دین کو پھیلانے والے نہ بن سکیں تو اللہ نہ کرے دین کو پھیلانے کے راستے میں مانع نہ بن جائیں یعنی فقرہ بازی، ...... طعنہ زنی، ...... مخاطب کو ذلیل، شرمندہ کرنے سے بچیں گے۔ دعوت میں پیغمبرانہ طریقہ اپنائیں گے۔ نفس اور شیطان کی ہرگز اطاعت نہیں کریں گے۔ اس نفس امارہ کی اطاعت کرتے ہوئے ہمارے کتنے بھائی ہم سے دور ہوگئے۔

اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور پیغمبروں کی دعوت کا طریقہ ملاحظہ فرمایا جائے تو اس کے الفاظ سادہ مگر عام انسانی ہمدردی سے لبریز اور نرم ہوتے ہیں۔ وہ مخالفین کی سخت ترین بدکلامی سن کر بھی جواب سادہ اور نرم دیتے ہیں فقرے نہیں کستے، دل میں ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے کہ کسی طرح یہ حق بات قبول کرے، اس کے لیے حکمت کے ساتھ تدبیریں کرتے ہیں۔

پیغمبرانہ دعوت کی روح قرآن کے ایک لفظ "نذیر" سے سمجھی جاسکتی ہے، جو ہر پیغمبر کے لیے قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں جابجا ان کو "بشیر و نذیر" کہا گیا ہے۔ لفظ "نذیر" کا ترجمہ اردو میں ڈرانے والے کا کیا جاتا ہے۔ مگر ڈرانے کا لفظ "نذیر" کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ اردو زبان کی تنگی کی وجہ سے اس ترجمہ کو اختیار کرلیا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ڈرانے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ چور، ڈاکو کا بھی ڈراتا ہے۔ درندہ اور دشمن کا بھی ڈراتا ہے۔ اور ایک شفیق باپ بھی اپنے بچے کو بچھو، سانپ، زہر اور آگ

سے ڈراتا ہے۔ پہلی قسم نری تخویف ہے نذیرات و انذار نہیں۔ چور، ڈاکو یا دشمن اور درندہ کو "نذیر" نہیں کہا جائے گا۔ اور دوسری قسم جو مہربان باپ کی طرف سے ہے وہ ڈرانا شفقت و ہمدردی کی بناء پر مضر اور تکلیف دہ چیزوں سے ڈرانے والے کو "نذیر" کہا جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے لیے "نذیر" کا لفظ استعمال فرما کر ان کی تبلیغ و تعلیم کی روح کی طرف اشارہ کردیا گیا، وہ صرف کوئی پیغام ہی نہیں پہنچاتے، بلکہ حکمت اور ہمدردی و خیر خواہی سے اس پیغام کو مؤثر بنانے اور مخاطب کو ہلاکت سے بچانے کی پوری تدبیر اور کوشش بھی کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں دعوت پیغمبرانہ کے جو اصول ایک آیت میں بیان کیے گئے ہیں، وہ گویا اس لفظ "نذیر" کی شرح ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾[1]

اس میں دعوت الی اللہ کے آداب میں سب سے پہلے حکمت کو رکھا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ داعی کا کام صرف ایک پیغام و کلام کو لوگوں کے کانوں میں ڈال دینا نہیں، بلکہ حکمت و تدبیر سے مناسب وقت مناسب ماحول دیکھ کر ایسے عنوان سے پہنچانا ہے کہ مخاطب کے لیے قبول کرنا آسان ہوجائے۔

دوسری چیز موعظہ ہے۔ جس کے معنی کسی ہمدردی و خیر خواہی کے ساتھ نیک کام کی طرف بلانے کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ داعی کے لیے ضروری ہے کہ جو کام کرے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ سے کرے۔

تیسری چیز "موعظة" کے ساتھ "حسنة" کی قید ہے۔ اس میں اشارہ عنوان کو نرم اور دل نشین بنانا ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات خالص ہمدردی اور خیر خواہی

---

[1] النحل: ۱۲۵

سے کسی کو اس کی بھلائی کی طرف بلایا جاتا ہے، مگر عنوان اور لب ولہجہ دل خراش ہوتا ہے تو وہ دعوت بھی موثر نہیں ہوتی۔ اس لیے "مَوْعِظَة" کے ساتھ "حَسَنَة" کی قید لگادی۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت نے دعوت پیغمبرانہ کے آداب میں تین چیزوں کو ضروری قرار دیا۔

① اول حکمت وتدبر، اس لیے کہ دعوت بے کار نہ ہوجائے موثر ہو۔

② دوسرے ہمدردی وخیر خواہی سے نیک کام کی دعوت۔

③ تیسرے اس دعوت کا عنوان اور لب ولہجہ نرم وقابل قبول ہو۔

جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنْ أَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ فَلْيَكُنْ أَمْرُهٗ ذٰلِكَ بِمَعْرُوْفٍ" [1]

ترجمہ: "جو شخص کسی کو بھلائی کا حکم کرے تو اس کو چاہیے کہ اس کے کہنے کا انداز بھی بھلا (نرمی والا) اختیار کرے۔"

آخر میں ایک چوتھی چیز یہ بتلائی کہ اگر دعوت کو ان آداب کے ساتھ پیش کرنے پر بھی قبول نہ کیا جائے اور نوبت مجادلہ ہی کی آجائے تو پھر عامیانہ انداز کا مجادلہ نہ ہونا چاہیے، بل کہ "بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" یعنی اچھے طریقے پر ہونا چاہیے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تفسیر میں فرمایا:

"بِرِفْقٍ وَّلِيْنٍ وَّحُسْنِ خِطَابٍ" [2]

یعنی مجادلہ بھی نرمی، خیر خواہی اور حسن خطاب کے ساتھ ہونا چاہیے۔

اور تفسیر مظہری میں فرمایا کہ "مُجَادَلَةٌ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" یہ ہے کہ اس میں اپنا غصہ اتارنا یا اپنے نفس کی بڑائی اور شیطان کا وسوسہ پیش نظر نہ ہو بل کہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کلمہ حق کو بلند کرنے کے لیے ہو[3] اور "مُجَادَلَةٌ بِالَّتِیْ هِیَ

[1] کنز العمال الثانی، الاخلاق: ۳/۳۱، رقم: ۵۵۲۰

[2] تفسیر ابن کثیر: ۷۵۷، النحل: ۱۲۵ [3] تفسیر مظہری (عربی) ۵/۳۹۰، النحل: ۱۲۵

اَحْسَنُ" صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بل کہ غیر مسلموں سے مجادلہ کی نوبت آئے تو اس میں بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اسی کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ [1]

یعنی کفار اہل کتاب سے مجادلہ کی نوبت آئے تو وہ بھی "بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" یعنی نرمی، خیر خواہی اور حسن خطاب کے ساتھ ہونا چاہیے۔

پیغمبرانہ دعوت کے چند امتیازی خصائص

حضرت مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ پیغمبرانہ دعوت کے چند امتیازی خصائص ہیں:

① امت کی فکر

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو اپنی امت کی اصلاح کی فکر اس قدر شدت کے ساتھ لگ جاتی ہے کہ وہ طبعی تقاضوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ جب پیغمبر اس فکر میں گھلنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی کا سامان کیا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ [2]

ترجمہ: "شاید آپ اس غم میں اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں کہ یہ لوگ مومن کیوں نہیں بنتے۔"

اور سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾ [3]

[1] العنکبوت: ۴۶ [2] الشعراء: ۳ [3] النحل: ۱۲۵

ترجمہ: ”یقیناً آپ کا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والوں کو بھی بخوبی جانتا ہے اور وہ راہ یافتہ لوگوں سے بھی پورا واقف ہے۔“

یہ جملہ داعیانِ دین کی تسلی کے لیے ارشاد فرمایا ہے، کیوں کہ مذکورۃ الصدر آدابِ دعوت کو استعمال کرنے کے باوجود، جب مخاطب حق بات کو قبول نہ کرے تو طبعی طور پر انسان کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔

اور بعض اوقات اس کا یہ اثر بھی ہوسکتا ہے کہ دعوت کا فائدہ نہ دیکھ کر آدمی پر مایوسی طاری ہوجائے اور کام ہی چھوڑ بیٹھے۔ اس لیے اس جملہ میں یہ فرمایا کہ آپ کا کام صرف دعوتِ حق کو اصولِ صحیحہ کے مطابق ادا کردینا ہے۔ آگے اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا اس میں نہ آپ کا کوئی دخل ہے نہ آپ کی ذمہ داری، وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ رہے گا، اور کون ہدایت پائے گا، آپ اس فکر میں نہ پڑیں، اپنا کام کرتے رہیں اس میں ہمت نہ ہاریں مایوس نہ ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جملہ بھی آدابِ دعوت ہی کا تکملہ ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ ”ملفوظات مولانا الیاس“ میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے فرمایا:

حضرت ابو سعید خدری رَضِيَ اللهُ تَعَالَىٰ عَنْهُ کی مشہور حدیث ”مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ“[1] کے آخری جز ”فَبِقَلْبِهِ“ کا ایک درجہ اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ازالہ منکر کے لیے اصحابِ قلوب اپنی قلبی قوتوں کو استعمال کریں یعنی ہمت و توجہ کو کام میں لائیں۔ پھر اسی ذیل میں فرمایا: حضرت امام عبدالوہاب شعرانی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے مقامِ قطبیت حاصل کرنے کی ایک تدبیر لکھی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر جہاں جہاں جو جو معروفات مٹے ہوئے ہیں اور مردہ ہوگئے ہیں ان کا تصور

[1] مسلم، الایمان، باب کون النھی عن المنکر من الایمان: ۱/۵۱

کرے پھر دل میں ان کے مٹنے کا ایک درد محسوس کرے اور پورے الحاح اور تضرع کے ساتھ ان کے زندہ اور رائج کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور اپنی قلبی قوت کو بھی ان کے احیاء کے لیے استعمال کرے۔

اسی طرح جہاں جہاں جو منکرات پھیلے ہوئے ہیں ان کا بھی دھیان کرے اور پھر ان کے فروغ کی وجہ سے اپنے اندر ایک سوزش اور دکھ محسوس کرے، پھر پورے تضرع کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ان کو مٹادینے کے لیے دعا کرے اور اپنی ہمت و توجہ کو بھی ان کے استیصال کے لیے استعمال کرے۔ حضرت امام عبدالوہاب شعرانی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے لکھا ہے کہ جو شخص ایسا کرتا رہے گا ان شاء اللہ وہ قطبِ عصر ہوگا۔[1]

لہٰذا داعی اسلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کو اس پیغمبرانہ فکر کا کوئی حصہ نصیب ہو۔ چناں چہ اسلافِ امت میں سے جن جن کو اس فکر کا جتنا حصہ ملا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت میں اتنی ہی برکت عطا فرمائی اور اتنے ہی بہتر ثمرات پیدا فرمائے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ کو دعوت و تبلیغ کا ایسا تقاضا ہوتا تھا جیسا بھوک کے وقت کھانے اور پیاس کے وقت پینے کا تقاضا ہوتا ہے۔ جس طرح انسان ان طبعی تقاضوں سے صبر نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ دعوت کے مواقع پر دعوت سے صبر نہیں کرسکتے تھے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت میں تاثیر بھی ایسی فرمائی کہ ان کے ایک ایک وعظ سے سینکڑوں انسان بیک وقت تائب ہوتے تھے۔

[1] ملفوظات مولانا الیاس: ۶۱

❷ دعوت کی لگن

انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا دوسرا اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر دعوت میں لگاتار مشغول رہتے ہیں اور حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی بات متواتر کہے چلے جاتے ہیں۔ جہاں اور جس موقع پر کسی شخص کو اچھی بات پہنچانے کا کوئی موقع مل جائے وہ اسے غنیمت سمجھ کر اپنی بات پہنچا ہی دیتے ہیں۔

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی مثال میں فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھئے کہ وہ مدت سے عزیز مصر کی قید میں محبوس ہیں۔ گرد وپیش میں کوئی ہم نوا نہیں۔ اس حالت میں جیل کے دو ساتھی خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے آتے ہیں۔ سوال کا کوئی تعلق دین ومذہب سے نہیں ہے؛ لیکن ان کے جواب میں پہلے تو انہیں مطمئن فرما دیتے ہیں کہ تمہارے خواب کی تعبیر مجھے معلوم ہے اور میں تمہیں بتا بھی دوں گا، مگر پہلے ایک بظاہر قطعی غیر متعلق بات شروع کر دیتے ہیں، اور وہ یہ کہ:

﴿اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ﴾[1]

ترجمہ: "بلاشبہ میں نے ان لوگوں کے دین کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور میں نے اپنے آباء واجداد میں سے حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) کے دین کی پیروی کی ہے۔"

اور:

﴿یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ

[1] یوسف: ۳۷، ۳۸

الْقَهَّارُ﴾[2]

ترجمہ: "اے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق پروردگار (ماننا) بہتر ہیں یا وہ اللہ جو ایک اور قہار ہے۔"

اور اس طرح خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے اپنا پیغام انہیں پہنچایا۔

دعوت کی اس لگن کا حاصل یہ ہے کہ انسان بات پہنچانے کے مواقع کی تلاش میں رہے، جب جتنا موقع مل جائے اس سے فائدہ اٹھائے اور دعوت سے کسی مرحلے پر تھکنے یا اکتانے کا نام نہ لے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کا دارو غہ بن کر ان کے پیچھے نہ پڑے، بلکہ اپنی بات مؤثر سے مؤثر انداز میں کہہ کر فارغ ہو جائے، پھر جب دیکھے کہ اس پر عمل نہیں ہوا تو موقع دیکھ کر پھر کہہ دے؛ لیکن نہ مسلط ہونے کا طریقہ اختیار کرے اور نہ مایوس ہو کر بیٹھے۔

❸ مخاطب کی شفقت

پیغمبرانہ دعوت کا تیسرا اہم عنصر "مخاطب کی شفقت" ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا داعیہ شفقت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اپنی برتری جتلانے یا دوسرے کی تحقیر کا ان کے یہاں شائبہ نہیں، حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم نے بیشتر مواقع پر تبلیغ ودعوت کو لفظ "انذار" سے تعبیر فرمایا ہے، جس کا لفظی ترجمہ لوگ "ڈرانا" کرتے ہیں لیکن درحقیقت عربی میں "انذار" اس ڈرانے کو کہتے ہیں، جس کا محرک دوسرے پر شفقت ہو، جیسے باپ بیٹے کو آگ سے ڈراتا ہے۔ چناں چہ اگر ایک ظالم حکمران اپنے کسی محکوم کو کسی سزا سے ڈرائے تو اس کو "انذار" نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا اس لفظ کے انتخاب سے اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ داعی حق جس کو نصیحت کرتا ہے، ان سے نفرت یا ان کی حقارت اس کے دل میں نہیں

[2] یوسف: ۳۹

ہوتی بل کہ اس کا محرک شفقت ہی شفقت ہوتا ہے، جس طرح ایک طبیب کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی بیمار سے نفرت کرے اور جو طبیب نفرت کا مرتکب ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح داعی کو بھی بدتر سے بدتر کافر یا فاسق و فاجر سے نفرت نہیں ہونی چاہیے، بل کہ اس کے افعال سے نفرت کرکے اس پر رحم کھانا چاہیے اور اس کی دعوت میں اس رحم اور شفقت کی جھلک محسوس ہونی چاہیے۔

۷ حکمت

پیغمبرانہ دعوت کی چوتھی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کے لیے ایسا موقع اور ایسا ماحول تلاش کرتے ہیں جس سے ان کی بات زیادہ سے زیادہ مؤثر ہوسکے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ اس کی بہت سی مثالیں دیا کرتے تھے۔ فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے ایک بے تکلف دوست تھے جو آزاد منش واقع ہوئے تھے۔ وضع قطع میں کسی طرح حضرت مولانا رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے دوست قرار پانے کے اہل معلوم نہیں ہوتے تھے، اسی زمانے میں ڈاڑھی چڑھانے کا فیشن تھا، وہ اس فیشن پر بہت عمل کرنے کے عادی تھے اور کپڑے بھی علماء وصلحاء کی وضع قطع کے خلاف پہنتے تھے۔ بعض لوگ حضرت نانوتوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی پر تعجب بھی کرتے تھے کہ ایسے صاحب کو حضرت رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے دوست کیسے بنالیا؟

اور کبھی لوگ پوچھتے بھی تھے کہ آپ ان کو سمجھاتے کیوں نہیں؟ لیکن حضرت نانوتوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ہمیشہ کی طرح ٹال جاتے اور ان کے ساتھ اسی طرح دوستانہ بے تکلفی سے پیش آتے، اسی طرح بہت دن گزر گئے۔ ایک روز وہ صاحب آئے ہوئے تھے، حضرت نانوتوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے ان سے فرمایا:

"بھائی ہمیں بھی اپنے جیسے کپڑے سلوا دو۔" انہوں نے پوچھا "کیوں؟" فرمایا "ہمارا جی چاہتا ہے کہ آپ ہی جیسا لباس پہنا کریں، دوستوں کے درمیان لباس کی مغایرت اچھی معلوم نہیں ہوتی، اور یہ میری ڈاڑھی موجود ہے، اس کو اپنی ڈاڑھی کی طرح چڑھا دو۔"

یہ سن کر وہ صاحب پانی پانی ہوگئے، اور عرض کیا کہ "حضرت! آپ کو اپنی وضع بدلنے کی ضرورت نہیں، آج سے ان شاء اللہ میرا لباس اور تراش خراش آپ کے طرز کے مطابق ہوگی۔"

حضرت والد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اس واقعے کو نقل کرکے فرمایا کرتے تھے کہ جب داعی حق کے دل میں جذبہ، لگن...... اور للّٰہیت ہوگی...... تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر حکمت کا القاء فرماتے ہیں، اور اسے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ کون سی بات کہنے کے لیے کون سا موقع مناسب ہوگا؟

۸ موعظہ حسنہ

پیغمبرانہ دعوت کا پانچواں اہم اصول یہ ہے کہ وہ دعوت کے لیے انداز بیان اور اسلوب ایسا اختیار فرماتے ہیں جو نرمی...... ہمدردی...... اور دل سوزی...... کا آئینہ دار ہو۔ حضرت والد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون عَلَیْہِمَا السَّلَام کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ ہدایت فرمائی کہ:

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾[1]

تَرْجَمَہ: "تم دونوں اس سے نرم بات کہنا۔"

اب کوئی شخص فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہوسکتا، اور حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام سے بڑا مصلح اور داعی نہیں ہوسکتا، جب حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام جیسے داعی کو فرعون جیسے

[1] طٰہٰ: ۴۴

گر اوپر سے بھی نرم بات کہنے کا حکم دیا جارہا ہے تو ہما شما کی کیا حقیقت ہے؟

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا انداز دعوت وتبلیغ حتی الامکان ان ہی اصولوں کے مطابق ہوتا تھا، ایک مرتبہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کسی سفر پر ریل میں جارہے تھے، ساتھ ہی ایک الٹرا ماڈرن قسم کے افسر بھی سفر کررہے تھے، شروع میں وہ اجنبیت کی بنا پر کھنچے کھنچے سے رہے، لیکن تھوڑی ہی دیر میں مانوس ہوکر گفتگو کرنے لگے، مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی۔

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سفر میں اپنے رفقاء کو راحت پہنچانے کے لیے ایثار وخدمت کے عادی تھے، چناں چہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ فرمایا، یہاں تک کہ کسی نماز کا وقت آگیا، حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس موقع پر چپکے سے اٹھے اور نماز پڑھ کر آگئے۔ اس وقت ان صاحب نے کہا "مولانا! جب آپ نماز کے لیے اٹھنے والے تھے تو مجھے خیال ہورہا تھا کہ آپ شاید مجھے بھی نماز کے لیے کہیں گے، لیکن چوں کہ میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا، اس لیے اگر آپ اس بارے میں کچھ فرماتے تو مجھ پر بار بھی ہوتا اور شاید میں عذر بھی کردیتا، لیکن آپ کے اس طرز عمل نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ اب میں ذہنی طور پر بالکل تیار ہوں اور آئندہ آپ کے ساتھ میں بھی نماز پڑھا کروں گا۔"

دوسرے فرقوں کی تردید

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے زمانے کے تقریباً تمام فرقوں کی تردید میں کتابیں یا مقالے تحریر فرمائے اور ابتدائی زمانے میں متعدد معرکے کے مناظرے بھی کیے، لیکن اس بارے میں بھی حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا مزاج یہ تھا کہ یہ تردید وتنقید قرآن کریم کی اصطلاح میں "جَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" کی حد سے متجاوز نہ ہو۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ باطل فرقوں کی تردید بھی درحقیقت دعوت وتبلیغ ہی کی ایک قسم ہے، لہٰذا اس میں بھی حکمت ...... موعظۂ حسنہ ...... اور "مُجَادَلَه بِالَّتِي هِيَ أَحْسَن ......" کے اصولوں پر عمل ضروری ہے، آج کل دوسروں کی تردید میں طعن وتشنیع ...... طنز وتعریض ...... اور فقرے کسنے ...... کا جو انداز عام ہوگیا ہے، حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس کے سخت مخالف تھے اور فرماتے تھے کہ اس سے اپنے ہم خیال لوگوں سے داد تو وصول ہوجاتی ہے، لیکن اس سے مخالفین کے دل میں ضد اور عناد پیدا ہوجاتا ہے اور کسی کا ذہن بدلنے میں مدد نہیں ملتی۔

تردید میں طعن وتشنیع کا انداز

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ میں آغاز شباب میں دوسروں کی تردید کے لیے بڑی شوخ اور چلبلی تحریریں لکھنے کا عادی تھا اور تحریری مناظروں میں میرا طرز تحریر طنز وتعریض سے بھرپور ہوتا تھا، اور "ختم نبوت" نامی کتاب میں نے اسی زمانے میں لکھی تھی، لیکن اس کے شائع ہونے کے بعد ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے میرے انداز تحریر کا رخ بدل دیا اور وہ یہ کہ میرے پاس ایک قادیانی کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ آپ نے اپنی کتاب "ختم نبوت" میں جو دلائل پیش کیے ہیں، بنظر انصاف پڑھنے کے بعد وہ مجھے بہت مضبوط معلوم ہوتے ہیں، اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں مرزا صاحب کی اتباع سے تائب ہوجاؤں، لیکن آپ نے اس کتاب میں جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہ مجھے اس اقدام سے روکتا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں وہ دلائل پر اکتفا کرتے ہیں طعن وتشنیع سے کام نہیں لیتے، اس لیے میں اب تک اپنے مذہب پر قائم ہوں اور آپ کے

طعن وتشنیع نے دل میں کچھ ضد بھی پیدا کردی ہے۔

حضرت والد صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ فرماتے تھے کہ یہ تو معلوم نہیں کہ ان صاحب نے یہ بات کہاں تک درست لکھی تھی، لیکن اس واقعے سے مجھے یہ تنبہ ضرور ہوا کہ طعن وتشنیع کا یہ انداز مفید کم ہے اور مضر زیادہ۔

چناں چہ اس کے بعد میں نے ''ختم نبوت'' پر اس نقطۂ نظر سے نظر ثانی کی، اور اس میں ایسے حصے حذف کردیے جن کا مصرف دل آزاری کے سوا کچھ نہ تھا اور اس کے بعد کی تحریروں میں دل آزار اسلوب سے مکمل پرہیز شروع کردیا۔

والد صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ فرماتے تھے کہ ہمیں انبیاء عَلَيْهِمُ السَّلَامُ کے طریق کار سے سبق لینا چاہیے کہ وہ ہمیشہ گالیوں اور طعنوں کے جواب میں پھول برساتے رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کی سخت کلامی کا جواب بھی نہیں دیا مثلاً حضرت ہود عَلَيْهِ السَّلَامُ سے ان کی قوم کہتی ہے کہ:

﴿إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ﴾[1]

ترجمہ: ''بلاشبہ ہم آپ کو بے وقوفی میں مبتلا پاتے ہیں اور آپ کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔''

اس فقرے میں انہوں نے بیک وقت جھوٹا ہونے...... اور بے وقوف ہونے...... کا طعنہ دیا ہے والد صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ فرماتے تھے کہ اگر آج کا کوئی مناظر ہوتا تو جواب میں ان کے باپ دادا کی بھی خبر لاتا، لیکن سنیے کہ اللہ کا پیغمبر کیا جواب دیتا ہے؟

﴿يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ﴾[2]

ترجمہ: ''اے قوم! میں بے وقوفی میں مبتلا نہیں ہوں، بل کہ میں تو پروردگار عالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں۔''

[1] الاعراف: ٦٦ [2] الاعراف: ٦٧

دعوت کا کام انبیاء عَلَيْهِمُ السَّلَامُ کی وراثت ہے، اس لیے اس میں غصہ نکالنے، طنز کے تیر ونشتر چلانے یا فقرے کس کر چٹخارے لینے کا کوئی موقع نہیں، اس کام میں تو نفسانیت کو کچلنا پڑتا ہے اور اس کے لیے دوسروں کی گالیاں کھا کر بھی دعائیں دینے کا حوصلہ چاہیے۔

اسی ضمن میں حضرت والد صاحب قدس سرہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید صاحب قدس سرہ وعظ کہنے کے بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ اتنے میں مخالفین میں سے کوئی شخص سامنے آگیا اور اس نے مولانا رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ کی تحقیر وتذلیل کی غرض سے کہا:

''مولانا! میں نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں؟''

تصور فرمائیے! یہ بات اس شخص سے کہی جارہی ہے جو ایک طرف علم وفضل کا دریائے بیکراں اور دوسری طرف خاندانی طور پر مسلم شہزادہ اور جس نے دین کی خاطر اپنے سارے ہی شاہی ٹاٹ باٹ کو تج کر رکھ دیا، اور پھر یہ بات اس وقت کہی جارہی ہے جب وہ وعظ کہہ کر اتر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس وقت ان کے کچھ نہ کچھ معتقدین یا ہم خیال حضرات بھی ساتھ ہوں گے، آج اگر کسی واعظ سے ایسے ماحول میں یہ بات کہی جائے تو واعظ صاحب برافروختہ ہو کر اس کے حسب ونسب کو معرض بحث میں لے آئیں گے اور ان کے رفقاء یقیناً ایسے شخص کو سلامت نہ جانے دیں گے، لیکن بے نفسی کی انتہا دیکھیے! حضرت شاہ صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے جواب میں فرمایا:

''جناب! آپ کو کسی نے غلط خبر پہنچائی، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو اب تک دہلی میں موجود ہیں۔''

اس طرح حضرت رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے معترض کے اس فقرے کو جو صرف گالی دینے کے لیے بولا گیا تھا، ایک مسئلہ بنا کر سنجیدگی سے جواب دے دیا۔ یہی وہ طرز

عمل تھا جس نے سنگ دل سے سنگ دل انسانوں کو موم کیا اور جس کی بناء پر دعوت حق کی فضا ہموار ہوئی۔

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ اردو زبان میں دو شاعر ایسے ہیں، جنہوں نے اپنی شاعری سے دین کی خدمت کی ہے اور اس سے دینی فکر کی اشاعت کا کام لیا ہے، ایک اکبر الہ آبادی مرحوم ہیں اور دوسرے ڈاکٹر اقبال مرحوم۔

ان دونوں میں سے اکبر الہ آبادی مرحوم کے یہاں فکری سلامتی اقبال مرحوم کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اکبر مرحوم کی فکر ٹھیٹھ دینی فکر ہے اور ان کے یہاں حکمت کی بھی فراوانی ہے، اقبال مرحوم کی فکر بھی اگرچہ مجموعی اعتبار سے دینی فکر ہے، مگر اس میں اس درجہ سلامتی نہیں، اس کے باوجود یہ بات واضح طور سے نظر آتی ہے کہ اقبال کی شاعری جتنی مؤثر ہوئی اور اس سے جتنا فائدہ پہنچا، اکبر مرحوم کی شاعری اس درجہ مؤثر نہیں ہوئی۔

میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ اکبر مرحوم نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے طنز و تعریض کا طریقہ اختیار کیا اور طنز کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے ہم خیال لوگ لطف تو محسوس کرتے ہیں، لیکن اس سے کوئی مؤثر اصلاحی کام نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات مخالفین میں ضد پیدا ہو جاتی ہے۔

تصلب اور عناد کا فرق

خلاصہ یہ کہ مثبت دعوت و تبلیغ ہو...... یا کسی باطل نظریے کی تردید......، حضرت والد صاحب قدس سرہ کا مذاق دونوں میں یہ تھا کہ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہنے کے باوجود طعن و تشنیع اور دل آزار اسلوب بیان سے مکمل پرہیز کیا جائے اور اس کے بجائے ہمدردی...... دل سوزی...... اور نرمی و شفقت...... سے کام لے کر

دلوں کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔

لیکن اس نرمی کا یہ مطلب نہیں کہ حق یا باطل کہنے میں مداہنت سے کام لیا جائے، کیوں کہ کفر کو کفر تو کہنا ہی پڑے گا، لیکن مطلب یہ ہے کہ حقیقت کے ضروری اظہار کے بعد محض اپنی نفسانیت کی تسکین کے لیے فقرہ بازیاں نہ کی جائیں، حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ داعی حق کی مثال ریشم جیسی ہونی چاہیے کہ اس کو چھو کر دیکھو تو اتنا نرم و ملائم کہ ہاتھوں کو سکون نصیب ہو، لیکن اگر کوئی اسے توڑنا چاہے تو اتنا سخت کہ تیز دھار بھی اس پر پھسل کر رہ جائے۔

چناں چہ مباحثہ تحریری ہو یا زبانی، حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ حق کے معاملے میں ادنیٰ لچک کے روادار نہیں تھے، لیکن بات کہنے کا طریقہ ہمیشہ ایسا ہوتا، جس سے عناد کے بجائے دل سوزی، حق پرستی اور للہیت مترشح ہوتی تھی۔ چناں چہ جس شخص سے بھی قلمی مباحثہ ہو رہا ہو، وہ اگر کبھی سامنے آ جائے تو نہ آپ کے انداز گفتگو اور انداز تحریر میں کوئی فرق ہوتا تھا، اور نہ آپ کو کبھی اس بناء پر شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی کہ جس شخص کے بارے میں حد سے گزرے ہوئے الفاظ لکھ چکا ہوں، اس کا سامنا کیسے کروں؟

آپ مخالف نقطۂ نظر والوں کو زبانی گفتگو میں بھی حق کے معاملے میں سخت سے سخت بات کہہ دیتے، لیکن وہ بھی یہ تأثر لے کر نہیں اٹھتا تھا کہ اس سختی کا سبب کوئی عناد ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں مجھے یاد ہیں، جن میں آپ نے بڑے بڑے ذی اثر لوگوں کو خوب کھری کھری سنائیں، لیکن ایسا ایک واقعہ یاد نہیں کہ ان کی بناء پر کوئی عناد کا تأثر لے کر گیا ہو۔

احتیاط و تثبت

دوسرے نظریات کی تردید میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کا ایک اصول یہ

تھا کہ جس شخص یا گروہ پر تنقید کی جارہی ہے، پہلے اس کے نظریات و افکار اور اس کے منشاء و مراد کی اچھی طرح تحقیق کر لی جائے اور اس کی طرف کوئی ایسی بات نہ کی جائے، جو اس نے نہیں کہی یا جو اس کی عبارتوں کے منشاء و مراد کے خلاف ہو۔

آج کل بحث و مباحثہ اور مناظروں کی گرم بازاری میں احتیاط و تثبت کے اس پہلو کی رعایت بہت کم کی جاتی ہے اور دوسرے کی تردید کے جوش میں اس کی غلطی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح بعض ایسی باتیں مخالف کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں، جو اس نے نہیں کہی ہوتیں۔ یہ طرز عمل اول تو انصاف کے خلاف ہے، دوسرے اس سے تردید کا فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا اور بسا اوقات اس کے نتیجے میں بحث و مباحثہ کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جو افتراق و انتشار پر منتج ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت والد صاحب قدس سرہ نے احقر کو اس زریں اصول کی تلقین فرمائی تھی کہ یوں تو انسان کو اپنے ہر قول و فعل میں محتاط ہونا چاہیے، لیکن خاص طور پر جب دوسروں پر تنقید کا موقع ہو تو ایک ایک لفظ یہ سوچ کر لکھو کہ اسے عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا اور کوئی ایسا دعویٰ جزم کے ساتھ نہ کرے جسے شرعی اصولوں کے مطابق ثابت کرنے کے لیے کافی مواد موجود نہ ہو۔ حضرت والد ماجد قدس سرہ کی اس نصیحت نے احقر کو جس قدر فائدہ پہنچایا اور اس کے جن بہتر ثمرات کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوا انہیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

خود حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریروں میں احتیاط کا یہ پہلو جس قدر نمایاں ہے اور اس کے پیش نظر آپ کی عبارت میں جو قیود و شرائط ملتی ہیں، ان کی مثالیں دینا چاہوں تو ایک پورا مقالہ اس کے لیے چاہیے، لیکن یہاں ایک واضح مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

خاکسار تحریک کے بانی عنایت اللہ مشرقی صاحب نے ایک زمانے میں

ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا، ان کے عقائد و نظریات جمہور امت سے بہت سے معاملات میں مختلف تھے، اور بعض نظریات تو ایسے تھے کہ دائرہ اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے ایماء پر حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نظریات کی تردید میں ایک رسالہ تحریر فرمایا جو "مشرقی اور اسلام" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ رسالہ تو مختصر سا ہے؛ لیکن حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اس کی ترتیب میں بڑی محنت اٹھائی، اول تو مشرقی صاحب کی تمام معروف تصانیف کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا، پھر ان کے جن مقامات پر جمہور امت سے ناقابل برداشت انحراف نظر آیا ان کو قلم بند کیا۔ اور پھر مزید احتیاط یہ کی کہ ان عبارتوں کو جمع کر کے مشرقی صاحب کے پاس بھیجا کہ ان عبارتوں سے آپ کی مراد وہی ہے جو ان سے ظاہر ہوتی ہے یا آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟

ان کی طرف سے کوئی واضح جواب نہ آیا تو انہیں دوبارہ خط لکھا۔ اور یہ خط و کتابت کافی عرصے تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ جب اس خط و کتابت کے نتیجے میں یقین ہو گیا کہ مراد وہی ہے جو ان کی عبارتوں سے ظاہر ہے تو پھر اس پر تردید تحریر فرمائی۔ یہ رسالہ پہلے مستقل شائع ہوا تھا اور اب "جواہر الفقہ" میں شامل ہے۔

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کے بارے میں حضرت والد صاحب قدس سرہ نے ایک زمانے تک کسی واضح اور حتمی تحریر کی اشاعت سے گریز فرمایا، لیکن درحقیقت آپ کے اس طرز عمل کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ آپ کا سوچا سمجھا موقف یہ تھا کہ اس نازک دور میں جب کہ اسلام کی بنیادوں پر کھلے کفر و الحاد کی یورش (سازش) انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو باقاعدہ محاذ جنگ اور معرکہ کارزار بنانا

اسلام کے مقاصد کے لیے مضر ہوگا۔ اس لیے آپ اس دور میں علمی طور پر اپنے مسلک وموقف کی وضاحت اور دوسرے موقف پر تنقید کو بھی ضروری سمجھتے تھے، لیکن اس علمی تنقید کے لیے وہی احتیاط وتثبت اور تحقیق لازمی تھی۔ حضرت والد صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی کو اس ضرورت کا ہمیشہ احساس رہا کہ مولانا مودودی صاحب سے جن مسائل ونظریات میں جس درجے کا اختلاف ہے، اسے یا تو افہام وتفہیم کے ذریعے ختم یا کم کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس اختلاف کی وضاحت کرکے اس پر علمی تنقید وتردید کی جائے، لیکن آپ کی مصروفیات اس قدر گوناگوں تھیں کہ آپ کو مدت تک اس بات کا موقع نہیں مل سکا کہ مولانا مودودی صاحب کی کتابوں کا خود مطالعہ کرسکیں اور سنی سنائی باتوں یا دوسروں کے دیے ہوئے اقتباسات کی بنیاد پر کچھ لکھنا آپ کے مزاج کے بالکل خلاف تھا، اس لیے عرصہ دراز تک اس سلسلے میں آپ نے کوئی تحریر شائع نہیں فرمائی اور نجی سوالات کے موقع پر اجمالی جوابات دیتے رہے۔ یہاں تک کہ وفات سے چند سال پہلے آپ نے مودودی صاحب کی کچھ کتابوں کا خود مطالعہ فرمایا اور اس موقع پر ان کے بارے میں اپنی تلی رائے ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرما دی، اور اسے ''جواہر الفقہ'' کا جزء بنا دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو احتیاط وتثبت...... عدل وانصاف...... توازن واعتدال...... اور ہمدردی ودل سوزی...... حضرت والد صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی کی تنقیدی یا تردیدی تحریروں میں نظر آتی ہے، اس کا اصل سبب وہ للہیت...... بے نفسی...... اور خدا ترسی...... ہے جو آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور اس کا لازمی ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ حق پسند طبیعتیں بات کو قبول کرتی ہیں۔

اور اگر کوئی قبول بھی نہ کرے تو اس سے مسلمانوں کے درمیان افتراق وانتشار کا دروازہ نہیں کھلتا۔ چناں چہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کو جتنے مکاتب فکر سے اختلاف تھا، ان میں سے غالباً ہر ایک کے بارے میں تنقیدی مضامین یا رسالے آپ

نے تحریر فرمائے ہیں۔ شیعہ صاحبان سے لے کر اہل حدیث حضرات تک کوئی بھی مکتب فکر ایسا نہیں ہے، جس کے بارے میں آپ کی کوئی تنقیدی تحریر موجود نہ ہو۔

لیکن یہ اسی للہیت کا ثمرہ تھا کہ کسی بھی مکتب فکر سے مخاصمت کی فضا پیدا نہیں ہوئی، بل کہ ملت کے کسی اجتماعی کام میں جب مختلف مکاتب فکر کی مشترک جدوجہد کی ضرورت پیش آتی تو حضرت والد صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی ان حضرات میں سے تھے جن کی طرف اس بارے میں سب سے پہلے نگاہیں اٹھتی تھیں اور مخالف فرقے بھی عموماً اس بات کے معترف تھے کہ آپ نے جو کچھ کہا، اور لکھا ہے اس کا منشاء للہیت کے سوا کچھ نہیں۔

اگر آج مسلمانوں کے تمام گروہ اور جماعتیں اس طریق کار کو اپنا لیں تو امت کو افتراق اور انتشار کے اس عذاب سے نجات مل جائے جو اس کی اجتماعی فلاح کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔[1]

ائمہ کرام سے نہایت ہی ادب سے عاجزانہ گزارش ہے کہ اپنے دروس اور جمعہ کے بیانات میں ان باتوں کا خصوصی لحاظ رکھیں کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے مسلمانوں میں افتراق وانتشار بڑھنے کا دروازہ کھلے، اس وقت مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو باقاعدہ محاذ جنگ اور میدان کارزار بنانا اسلام کے مقاصد کے لیے بہت ہی زیادہ مضر ہے۔

ہم ائمہ کو اپنا مقام پہچاننا چاہیے، اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ نے ہمیں امت کا قائد، رہبر اور امام بنایا ہے ہم ان کے لیے اسوہ اور نمونہ ہیں، ہم اگر اخلاق حسنہ کو زندہ کریں گے تو دنیا میں اچھے اخلاق پھیلیں گے، اور اگر ہم گالیوں اور طعنوں کا جواب گالیوں اور طعنوں سے دیں گے تو یہی چیز معاشرہ میں عام ہوگی، ہمیں چاہیے کہ جب بھی جاہلوں کی طرف سے گالیاں یا طعنے موصول ہوں تو حضرت ہود عَلَیْهِ السَّلَام کا یہ

[1] از میرے والد میرے شیخ اور ان کا مزاج و مذاق ۱۰۴ تا ۱۱۶

جواب پڑھیں فرمایا:

﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾[1]

ترجمہ: "اے قوم! میں بے وقوفی میں مبتلا نہیں ہوں بل کہ میں پروردگار عالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں۔"

اسی طرح بیانات میں بھی طنز و تعریض کا طریقہ ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے اصلاح کے بجائے مزید نقصان ہوتا ہے، ائمہ کرام کو خوب غور کرنا چاہیے کہ ہمارے اکابر کے کس عمل نے سنگ دل سے سنگ دل انسانوں کو موم کیا، اور اسلام کی دعوت پھیلتی رہی، اور بے دین سے بے دین مسلمان پکے دین دار بن گئے، جب بھی کسی مقتدی کی غلطی پر غصہ آئے یا کسی مخالف کی بات سے تکلیف پہنچے تو شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کا قصہ یاد کرلیا جائے جس سے ان شاء اللہ تعالیٰ عام لوگوں کی بعض ایذا اس پر صبر کرنے میں کافی مدد اور راہنمائی ملے گی۔

ائمہ کرام مقتدیوں میں دعوت کا جذبہ پیدا کریں

ہر امام کو چاہیے کہ وہ اپنے مقتدیوں میں دعوت الی اللہ کا ایسا جذبہ پیدا کریں کہ ان میں سے ہر ایک داعی بن جائے، آخرت کا غم، درد اور امت کی فکر اور ان کی خیر خواہی کا جذبہ ان کے دل میں پیدا ہو جائے کہ ہم اور دوسرے لوگ جہنم سے کیسے بچ جائیں اور جنت میں کیسے جانے والے بن جائیں۔

لہٰذا ائمہ کرام کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہر مسلمان کو یہ سمجھائیں کہ صرف اپنے اعمال صالحہ نجات کے لیے کافی نہیں ہوں گے، بل کہ سارے انسانوں کی فکر کرنی ہوگی۔ شیطان اکیلا جہنم میں نہیں جاتا، اپنے ساتھ سب کو لے جانے کی فکر و سعی کرتا ہے۔ اسی طرح ہم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ دین کو زندہ کرنے کی محنت کرے،

[1] الاعراف: ۶۷

اس کے لیے فکر کرے، اس کے لیے دعا کرے۔

اپنے ذمہ سمجھے کہ میری ذمہ داری ہے کہ ایسی محنت اور کوشش کروں، جس سے ساری انسانیت جنت میں جانے والی بن جائے، ہر انسان کا تعلق اللہ سے ہو جائے، ہر انسان اپنے خالق و مالک کو پہچان کر اس کی مان کر زندگی گزارنے والا بن جائے، اور ہر ایک دوسروں کو دین پر لگانے والا بنے، ہر ایک دوسرے کی فکر کرنے والا بنے، ہر ایک دوسرے کے لیے دعا کرنے والا بنے۔

کتنے مقتدی ہیں، جو فجر کی نماز میں آتے ہیں، جن جن گھروں کے پاس سے گزرتے ہیں، راتوں کو کیا ان کو دعوت دے کر سوتے ہیں کہ فجر کی نماز جماعت سے پڑھنی ہے، صبح ان کو اٹھاتے ہوئے گزرتے ہیں؟

یا ان کے گھروں سے گزرتے ہوئے دعا کرکے گزرتے ہیں کہ اے اللہ! اس گھر کے ہر بالغ فرد کو نمازی بنا دے، قضا نماز کے گناہ سے بچا دے۔

اگر یہ یقین ہو جائے کہ اس پڑوسی نے یا میرے ہی نوجوان بیٹے یا بیٹی نے فجر کی نماز قضا کی اور میں نے اس کے لیے کوئی کوشش نہ کی تو میں بھی پکڑا جاؤں گا۔

جیسا حضور ﷺ نے یاجوج و ماجوج کے بارے میں اپنی انگلیوں سے اشارہ کر کے فرمایا کہ آج اتنی جگہ ان کی دیوار میں سے کھول دی گئی تو حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا "أَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ؟" کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے، حالاں کہ ہمارے اندر نیک اور صلحا لوگ ہوں گے؟

فرمایا "نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ" ہاں جب خباثت کی کثرت ہو جائے۔[1]

آج ہم اپنے آپ سے سوال کریں کہ ہم نے "إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ" کو کم کرنے کے لیے کیا کوشش کی؟

لہٰذا ائمہ کو چاہیے کہ سارے مقتدیوں کو اس بات پر تیار کرلیں کہ ہر ایک

[1] بخاری، الفتن، باب یأجوج ومأجوج: ۲/۱۰۵۶

گناہوں سے خود بھی بچنے والا ہے اور پیار و محبت اور حکمت و بصیرت سے دوسروں کو بھی بچانے والا ہے، خود بھی دین کو پھیلانے میں محنت و کوشش کرے اور دوسروں کو بھی اس مبارک محنت میں لگائے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى "سورۃ العصر" کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

وصیت حق سے مراد یہ ہے کہ شبہات کو دور کرے، اور وصیت صبر سے مراد یہ کہ نفسانی خواہشات کو چھوڑ کر اچھے اعمال اختیار کرنے کی ہدایت کرے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وصیت بالحق سے مراد دوسرے مسلمانوں کی علمی اصلاح ہے اور وصیت بالصبر سے مراد عملی اصلاح۔

اس سورت نے مسلمانوں کو ایک بڑی ہدایت یہ دی کہ ان کا صرف اپنے عمل کو قرآن وسنت کے تابع کر لینا جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی اہم یہ ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ایمان اور عمل صالح کی طرف بلانے کی مقدور بھر کوشش کریں ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لیے کافی نہ ہوگا، خصوصاً اپنے اہل و عیال اور احباب و متعلقین کے اعمال سیئہ سے غفلت برتنا اپنی نجات کا راستہ بند کرتا ہے اگرچہ خود وہ کیسے ہی اعمال صالحہ کا پابند ہو۔

اسی لیے قرآن وحدیث میں ہر مسلمان پر اپنی اپنی مقدرت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کیا گیا ہے۔ اس معاملے میں عام مسلمان بلکہ بہت سے خواص تک غفلت میں مبتلا ہیں، خود عمل کرنے کو کافی سمجھ بیٹھتے ہیں، اولاد و عیال کچھ بھی کرتے رہیں اس کی فکر نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آیت پر عمل کی توفیق نصیب فرمادیں۔[1]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] معارف القرآن: ۸/۸۱۴، العصر: ۳

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾[1]

تَرجَمَہ: "اور اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے، اور کہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔"

علامہ شبیر احمد عثمانی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

پہلے ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾[2] میں ان مخصوص مقبول بندوں کا ذکر تھا جنھوں نے صرف ایک اللہ کی ربوبیت پر اعتقاد جما کر اپنی استقامت کا ثبوت دیا۔ یہاں ان کے ایک اور اعلیٰ مقام کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی بہترین شخص وہ ہے جو خود اللہ کا ہو رہے...... اسی کی حکم برداری کا اعلان کرے...... اسی کی پسندیدہ روش پر چلے...... اور دنیا کو اسی کی طرف آنے کی دعوت دے...... اس کا قول و فعل بندوں کو خدا کی طرف کھینچنے میں مؤثر ہو...... جس نیکی کی طرف لوگوں کو بلائے بذات خود اس پر عامل ہو...... خدا کی نسبت اپنی بندگی اور فرماں برداری کا اعلان کرنے سے کسی موقع پر اور کسی وقت نہ جھجکے...... اس کا طغرائے قومیت صرف مذہب اسلام ہو...... اور ہر قسم کی تنگ نظری...... اور فرقہ وارانہ نسبتوں سے یکسو ہو کر اپنے مسلم خالص...... ہونے کی منادی کرے...... اور اسی اعلیٰ مقام کی طرف لوگوں کو بلائے، جس کی دعوت دینے کے لیے سیدنا محمد ﷺ کھڑے ہوئے تھے...... اور صحابہ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمْ نے اپنی عمریں صرف کی تھیں۔[3]

حضرت مولانا علی میاں رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى فرماتے ہیں:

مسلمانوں کا پہلا فرض تو یہ ہے کہ وہ جہاں بھی اور جس ملک میں بھی ہوں وہاں

---

[1] حٰم السجدۃ: ۳۳ [2] حٰم السجدۃ: ۳۰

[3] تفسیر عثمانی: ۶۳۸، حٰم السجدۃ: ۳۰

وہ اولاً اپنے ہم وطنوں کو اللہ کی اس نعمت (دینِ حق) میں شریک کرنے کی کوشش کریں، جو اللہ نے ان کو عطا کی ہے اور ان کو اس کی فکر بھی رہے، یہ فکر سب سے زیادہ پیغمبروں کو رہا کرتی تھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار رسول اللہ ﷺ کو تسکین دی:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾[1]

ترجمہ: "ان کے ایمان نہ لانے پر شاید آپ تو اپنی جان کھو دیں گے۔"

نبی کریم ﷺ کو انسانیت سے جو ہمدردی اور ان کی ہدایت کے لیے جو تڑپ تھی، اس میں اس کا اظہار ہے۔

اس کے بعد درجہ بدرجہ جن لوگوں کو ان سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے، ان کے اندر یہ فکر زیادہ ہوتی ہے، تو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مسلمان جس ملک میں بھی رہیں وہاں ہدایت کو عام کریں اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو احسان فرمایا ہے، ان کو جو ہدایت دی ہے، ان کو جو روشنی عطا فرمائی ہے، اس روشنی کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں، سارا قرآن شریف اس سے بھرا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾[2]

ترجمہ: "تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں، جو تمہاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں، ایمان داروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔"

اگر تمہارے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔

---

[1] الشعراء: ۳ [2] التوبة: ۱۲۸

جس سے تم مشکل میں پڑو دشواری میں پڑو وہ اس کو شاق ہے، وہ اس کو پسند نہیں (حَرِيصٌ عَلَيْكُم) تمہاری اس کو بڑی فکر ہے، اس کو تمہارا بڑا دھیان۔ ایمان والوں کے ساتھ، بہت ہی مہربان بہت ہی شفقت والے۔[1]

حضرت علامہ عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

یعنی تمہاری خیر خواہی اور نفع رسانی کی خاص تڑپ ان کے دل میں ہے۔ لوگ دوزخ کی طرف بھاگتے ہیں، آپ ان کی کمریں پکڑ پکڑ کر ادھر سے ہٹاتے ہیں۔ آپ کی بڑی کوشش اور آرزو یہ ہے کہ اللہ کے بندے اصلی بھلائی اور حقیقی کامیابی سے ہم کنار ہوں۔

جہاد وغیرہ کا مقصد بھی خونریزی نہیں، بل کہ بحالت مجبوری تختِ آپریشن کے ذریعے سے بنی نوع انسان کے فاسد و مسموم اعضا کو کاٹ کر اور خراب جراثیم کو تباہ کر کے امت کے مزاج عمومی کو صحت و اعتدال پر رکھنا ہے۔

جب آپ تمام جہان کے اس قدر خیر خواہ ہیں تو خاص ایمان داروں کے حال پر ظاہر ہے کس قدر شفیق و مہربان ہوں گے۔

اگر آپ کی عظیم الشان شفقت، خیر خواہی اور دل سوزی کی لوگ قدر نہ کریں تو کچھ پروا نہیں۔ اگر فرض کیجیے ساری دنیا آپ سے منہ پھیر لے تو تنہا خدا آپ کو کافی ہے، جس کے سوا نہ کسی کی بندگی ہے نہ کسی پر بھروسہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ زمین و آسمان کی سلطنت، عرشِ عظیم اور تختِ شہنشاہی کا مالک وہی ہے سب نفع و ضرر ہدایت و ضلالت اسی کے ہاتھ میں ہے۔[2]

"مرشد الدعاة" نامی کتاب میں شیخ محمد نمیر الخطیب "دَعْوَةُ الْأَفْرَادِ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ" کا عنوان باندھتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فَالْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، وَلَاتَتِمُّ الْأُخُوَّةُ إِلَّا إِذَا أَحَبَّ كُلُّ

---

[1] قرآنی افادات: ۳۰۵ [2] تفسیر عثمانی: ۲۷۴، التوبة: ۱۲۸

وَاحِدٍ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّهُ لِنَفْسِهِ وَكُلُّ مُسْلِمٍ مِرْآةٌ لِأَخِيْهِ الْمُسْلِمِ، نَحْوَ الْإِيْمَانِ الْكَامِلِ أَنْ لَا يَقْتَصِرَ الْمُسْلِمُ عَلٰى إِصْلَاحِ نَفْسِهِ بَلْ يَنْبَغِي أَنْ يَجْتَهِدَ فِي إِصْلَاحِ غَيْرِهٖ"[1]

ترجمہ: "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ بھائی چارگی کا مفہوم تب ہی پورا ہوگا، جب ہر بھائی اپنے دوسرے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے، اسی طرح ایمان تب ہی مکمل ہوگا، جب ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کی مکمل اصلاح و تربیت میں لگا رہے۔"

آگے شیخ لکھتے ہیں:

"أَمَّا إِذَا قَصَّرَ الْمُسْلِمُ فِي أَدَاءِ وَاجِبِهٖ مَعَ غَيْرِهٖ، فَتَرَكَ النُّصْحَ، وَلَمْ يَأْمُرْ بِمَعْرُوْفٍ وَلَمْ يَنْهَ عَنْ مُنْكَرٍ، فَمَا ذٰلِكَ مِنَ الصَّلَاحِ فِي شَيْءٍ، لَا فِي حَقِّ نَفْسِهٖ وَلَا فِي حَقِّ غَيْرِهٖ وَإِنْ صَلّٰى وَصَامَ وَفَعَلَ جَمِيْعَ الطَّاعَاتِ"

"إِنَّ مَثَلَ الْمُسْلِمِيْنَ فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ الْجُنُوْدِ فِي جَبْهَةِ الْقِتَالِ فَإِذَا قَصَّرَتْ فِرْقَةٌ فِي وَاجِبِهَا، أَوْشَكَ أَنْ يَنْكَسِرَ الْجَيْشُ كُلُّهٗ وَأَوْشَكَتْ أَنْ تَحُلَّ الْهَزِيْمَةُ بِهِمْ جَمِيْعًا كَذٰلِكَ الْمُسْلِمُوْنَ إِذَا لَمْ يَقُوْمُوْا بِوَاجِبِ النُّصْحِ، وَتَرَكُوْا وَاجِبَ الدَّعْوَةِ إِلَى اللّٰهِ وَوَاجِبَ التَّحْذِيْرِ عِقَابَهٗ، أَوْشَكَ أَنْ تَحُلَّ بِهِمُ الْهَزِيْمَةُ وَأَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ الْعَذَابُ وَالْبَلَاءُ وَالْخَيْبَةُ، أَنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوْا عَلٰى يَدِهٖ، أَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ"

[1] مرشد الدعاۃ: ٦٤

"عَرَّفَ الشَّارِعُ الْحَكِيْمُ هٰذِهِ الرَّابِطَةَ وَهٰذِهِ الْعَلَاقَةَ، فَلَمْ يَكْتَفِ مِنَ الْمُسْلِمِ أَنْ يَكُوْنَ صَالِحًا فِي ذَاتِ نَفْسِهٖ غَيْرَ مُهْتَمٍّ بِبَقِيَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ بَلْ أَوْجَبَ عَلَيْهِ لِيَكُوْنَ صَالِحًا أَنْ يَكُوْنَ مُصْلِحًا لِغَيْرِهٖ مَا أَمْكَنَهٗ ذٰلِكَ سَبِيْلًا"[1]

ترجمہ: "مسلمانوں کی کوتاہی دوسروں کے حقوق ادا نہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمان نصیحت کرنا، اچھائی کا حکم کرنا اور برائی سے منع کرنا چھوڑ دے تو یہ اس کے لیے کسی درجہ میں بھی مصلح اور فائدہ مند نہیں ہے نہ اس کے حق میں اور نہ دوسروں کے حق میں اگرچہ وہ خود نماز پڑھے، روزہ رکھے اور تمام احکامات بجالائے۔

اس لیے کہ مسلمان کی مثال اس دنیا میں محاذ جنگ کے لشکر کی مانند ہے کہ جب صف اول کے مجاہدین سے اس کے حقوق میں کوئی کوتاہی اور غلطی سرزد ہوگی تو قریب ہے کہ پورا لشکر ٹوٹ جائے اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ سب کو شکست سے دوچار ہونا پڑے۔

بالکل اسی طرح مسلمان جب دوسرے کے خیر خواہ بن کر نصیحت نہیں کریں گے اور اللہ کی طرف بلانا اور اللہ کے عذاب سے ڈرانے کو چھوڑیں گے تو قریب ہے کہ یہ بھی شکست سے دوچار ہوجائیں اور اللہ کا عذاب، مصیبت اور ناکامی سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ لوگوں نے گناہ گار کو دیکھ کر اس کو گناہ سے روکنے کی کوشش نہ کی تو عمومی عذاب سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

چناں چہ حضور ﷺ نے ہمیں یہی سکھایا اور اسی چیز کا درس دیا ہے۔ لہٰذا کوئی مسلمان اس بات پر اکتفا نہ کرے کہ خود تو صالح (نیک

[1] مرشد الدعاۃ: ۸۳

اور عبادت گزار) بنے اور دوسرے مسلمان بھائیوں کی فکر نہ کرے، بل کہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بھی نیک بنے اور دوسروں کو بھی نیکی پر لانے کی کوشش کرے، جتنا اس کے لیے ممکن اور سہل ہو۔"

کیا لوگوں کے گناہوں میں ہم شریک نہیں ہیں؟

غور کرنے کی بات ہے کہ آج زمین پر جتنے گناہ ہو رہے ہیں کیا ہم ائمہ مساجد کی جماعت ان گناہوں میں شریک نہیں ہے؟

ان گناہوں پر اگر خدانخواستہ عذاب الٰہی نازل ہوا تو کیا وہ ہمیں بھی اپنی گرفت میں لے لے گا، یا ہم اس عذاب سے بچ جائیں گے؟

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾[1]

ترجمہ: "کیوں نہیں منع کرتے، ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے، بہت ہی برے عمل ہیں، جو کر رہے ہیں۔"

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: اس آیت میں یہود کے مشائخ اور علماء کو اس پر سخت تنبیہ کی گئی کہ وہ ان لوگوں کو برے اعمال سے کیوں نہیں روکتے، قرآن میں اس جگہ دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں، ایک "رَبّٰنِيُّوْنَ" جس کا ترجمہ ہے اللہ والے، یعنی عابد، زاہد، جن کو ہمارے عرف میں درویش یا پیر یا مشائخ کہا جاتا ہے، اور دوسرا لفظ "اَحْبَار" استعمال فرمایا، یہود کے علماء کو احبار کہا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اَمْر بِالْمَعْرُوْف اور نَهْي عَنِ

---

[1] المائدة ۶۳

الْمُنْكَر کی اصل ذمہ داری ان دو طبقوں پر ہے، ایک مشائخ، دوسرے علماء۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ "رَبّٰنِيُّوْنَ" سے مراد وہ علماء ہیں جو حکومت کی طرف سے مامور اور با اقتدار ہوں، اور "اَحْبَار" سے مراد عام علماء ہیں، اس صورت میں جرائم سے روکنے کی ذمہ داری حکام اور علماء دونوں پر عائد ہو جاتی ہے، اور بعض دوسری آیات میں اس کی تصریح بھی ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا ﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ یعنی ان مشائخ و علماء کی یہ سخت بری عادت ہے کہ اپنا فرض منصبی اَمْر بِالْمَعْرُوْف اور نَهْي عَنِ الْمُنْكَر چھوڑ بیٹھے، قوم کو ہلاکت کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں اور یہ ان کو نہیں روکتے۔

علماء مفسرین نے فرمایا کہ پہلی آیت جس میں عوام کی غلط کاریوں کا ذکر تھا، اس کے آخر میں تو ﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ ارشاد فرمایا گیا، اور دوسری آیت جس میں مشائخ و علماء کی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے، اس کے آخر میں ﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ کا لفظ ارشاد فرمایا گیا، وجہ یہ ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ "فعل" تو ہر کام کو شامل ہے، خواہ با قصد ہو یا بلا قصد، اور لفظ "عمل" صرف اس کام کے لیے بولا جاتا ہے جو قصد و ارادہ سے کیا جائے، اور لفظ "صنع" اور "صنعت" کا ایسے کام کے لیے اطلاق کیا جاتا ہے، جس میں قصد و اختیار بھی ہو اور اس کو بار بار بطور عادت اور مقصد کے درست کرکے کیا جائے، اس لیے عوام کی بدعملی کے نتیجہ میں تو صرف لفظ "عمل" اختیار فرمایا ﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ اور خواص مشائخ و علماء کی غلط کاری کے نتیجہ میں لفظ "صنع" اختیار فرمایا ﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ اس میں اس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے کہ ان علماء و مشائخ کی یہ غلط روش کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ اگر ہم ان کو منع کریں گے تو یہ ہمارا کہنا سنیں گے اور باز آجائیں گے، پھر بھی ان لوگوں کے نذرانوں کے لالچ یا بد اعتقاد ہو جانے کے خوف سے ان کے

دلوں میں حمایت حق کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا، یہ ان بدکاروں کے اعمال بد سے بھی زیادہ اشد ہے۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ جس قوم کے لوگ جرائم اور گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کے مشائخ وعلماء کو یہ بھی اندازہ ہو کہ ہم ان کو روکیں گے تو یہ باز آ جائیں گے، ایسے حالات میں اگر یہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے ان جرائم اور گناہوں کو نہیں روکتے تو ان کا جرم اصل مجرموں، بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ اشد ہے، اس لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا:

"مشائخ وعلماء کے لیے پورے قرآن میں اس آیت سے زیادہ سخت تنبیہ کہیں نہیں۔"

اور امام تفسیر ضحاک نے فرمایا: "میرے نزدیک مشائخ علماء کے لیے یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے۔"

وجہ یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے ان کا جرم تمام چوروں، ڈاکوؤں اور ہر طرح کے بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے (اَلْعِيَاذُ بِاللّٰهِ) مگر یاد رہے کہ یہ شدت اور وعید اسی صورت میں ہے جب کہ مشائخ وعلماء کو اندازہ بھی ہو کہ ان کی بات سنی اور مانی جائے گی اور جس جگہ قرائن یا تجربہ سے یہ گمان غالب ہو کہ کوئی سنے گا نہیں، بل کہ اس کے مقابلہ میں ان کو ایذائیں دی جائیں گی تو وہاں حکم یہ ہے کہ ان کی ذمہ داری تو ساقط ہو جاتی ہے، لیکن افضل واعلیٰ پھر بھی یہی رہتا ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے یہ حضرات اپنا فرض ادا کریں، اور اس میں کسی کی ملامت یا ایذاء کی فکر نہ کریں، جیسا کہ چند آیات میں پہلے اللہ تعالیٰ کے مقبول مجاہدین کی صفات میں گزر چکا ہے ﴿وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾[1] یعنی یہ لوگ اللہ کے راستہ میں اور حق ظاہر کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہیں کرتے۔

[1] المائدۃ: ۵۴

خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ بات سننے اور ماننے کا احتمال غالب ہو وہاں مشائخ وعلماء بل کہ ہر مسلمان پر جس کو اس کام کا جرم وگناہ ہونا معلوم ہو، فرض ہے کہ گناہ کو روکنے اور منع کرنے میں مقدور بھر کوشش کرے، خواہ ہاتھ سے یا زبان سے، یا کم از کم اپنے دل کی نفرت اور اعراض سے، اور جس جگہ غالب گمان یہ ہو کہ اس کی بات نہ سنی جائے گی، یا یہ کہ اس کے خلاف دشمنی بھڑک اٹھے گی، تو ایسی حالت میں منع کرنا اور روکنا فرض تو نہیں رہتا، مگر افضل واعلیٰ بہر حال ہے، اَمْر بِالْمَعْرُوْف اور نَهْی عَنِ الْمُنْكَر کے متعلق یہ تفصیلات صحیح احادیث سے مستفاد ہیں۔

خود نیک عمل اختیار کرنے اور برے اعمال سے بچنے کے ساتھ دوسروں کو بھی نیکی کی طرف ہدایت اور برائی سے روکنے کا فریضہ عام مسلمانوں پر اور بالخصوص علماء و مشائخ پر ڈال کر اسلام نے دنیا میں امن واطمینان پیدا کرنے کا ایک ایسا زریں اصول بنا دیا ہے کہ اس پر عمل ہونے لگے تو پوری قوم بہت آسانی کے ساتھ تمام برائیوں سے پاک ہو سکتی ہے۔[1]

اصلاحِ امت کا طریقہ

اسلام کے قرونِ اولیٰ میں اور قرونِ مابعد میں بھی جب تک اس پر عمل ہوتا رہا مسلمانوں کی پوری قوم علم وعمل ...... اخلاق وکردار ...... کے اعتبار سے پوری دنیا میں سربلند اور ممتاز رہی، اور جب سے مسلمانوں نے اس فریضہ کو نظر انداز کر دیا، اور جرائم کی روک تھام صرف حکومت اور اس کی پولیس کا فرض سمجھ کر خود اس سے علیحدہ ہو بیٹھے تو اس کا نتیجہ وہی ہوا، جو آج ہر جگہ سامنے ہے کہ ماں باپ اور پورا خاندان دین دار و پابند شریعت ہے، مگر اولاد اور متعلقین اس کے برعکس ہیں۔ ان کا نظری اور فکری رخ بھی اور ہے اور عملی طریقے بھی جداگانہ ہیں۔

[1] معارف القرآن: ۳/ ۱۸۵ تا ۱۸۷، المائدۃ: ۶۳

اسی لیے ملت کی اجتماعی اصلاح کے لیے قرآن و حدیث میں اَمر بِالمعرُوف اور نَہی عَنِ المُنکر پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کام کو امت محمدیہ ﷺ کی خصوصیات میں شمار فرمایا ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی کرنے کو سخت گناہ اور موجب عذاب قرار دیا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: کہ جب کسی قوم میں گناہ کے کام کیے جائیں اور کوئی آدمی اس قوم میں رہتا ہے اور ان کو منع نہیں کرتا تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ سب لوگوں پر عذاب بھیج دے۔[1]

گناہوں پر اظہارِ نفرت نہ کرنے پر وعید

حضرت مالک بن دینار رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو تباہ کر دو، فرشتوں نے عرض کیا اس بستی میں تو آپ کا فلاں عبادت گزار بندہ بھی ہے۔ حکم ہوا کہ اس کو بھی عذاب چکھاؤ، کیوں کہ ہماری نافرمانیوں اور گناہوں کو دیکھ کر اس کو کبھی غصہ نہیں آیا۔ اور اس کا چہرہ غصہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا۔

حضرت یوشع بن نون عَلَیْہِ السَّلَام پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ آپ کی قوم کے ایک لاکھ آدمی عذاب سے ہلاک کیے جائیں گے۔ جن میں چالیس ہزار نیک لوگ ہیں اور ساٹھ ہزار بدعمل۔ حضرت یوشع عَلَیْہِ السَّلَام نے عرض کیا کہ رب العالمین! بدکرداروں کی...... ہلاکت کی وجہ تو ظاہر ہے؛ لیکن نیک لوگوں کو کیوں ہلاک کیا جا رہا ہے؟ تو ارشاد ہوا کہ یہ نیک لوگ بھی ان بدکرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے، اور ہنسی دل لگی میں شریک رہتے تھے۔ میری نافرمانیاں اور گناہ دیکھ کر کبھی ان کے چہروں پر کوئی ناگواری کا اثر تک نہ آیا۔[2]

---

[1] المعجم الکبیر للطبرانی: مسند جریر بن عبداللہ: ۳۳۲/۲، رقم: ۲۳۸۴

[2] تفسیر بحر محیط: ۵۲۳/۳، المائدۃ: ۶۳

کتاب ''علو الہمۃ'' عربی کی ایک بہترین کتاب ہے، جس میں مصنف نے ہر مسلمان کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا ہے خصوصاً علمائے کرام و ائمہ عظام کو فکرمند فرمایا ہے، ان کو اپنی تاریخ یاد دلائی ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک بلند درجہ جو عطا فرمایا ہے، آپ کو یہ شرف بخشا ہے کہ آپ آگے بڑھ کر قیادت کریں اور مسجد کے پورے وفد کی نمائندگی کریں، چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

كَبِيْرُ الْهِمَّةِ يَحْمِلُ هَمَّ الْأُمَّةِ

مِنْ أَعْظَمِ مَا يَهْتَمُّ بِهِ الدَّاعِيَةُ هِدَايَةُ قَوْمِهِ، وَ بُلُوْغُ الْجُهْدِ فِي النُّصْحِ لَهُمْ، كَمَا يَتَّضِحُ ذٰلِكَ جَلِيًّا لِمَنْ تَدَبَّرَ سُوْرَةَ نُوْحٍ عَلٰى سَبِيْلِ الْمِثَالِ، وَ كَذَا قَصَصُ سَائِرِ الْمُرْسَلِيْنَ، حَتّٰى خَاتَمِهِمْ وَسَيِّدِهِمْ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَذَا أَتْبَاعُهُمْ كَمُؤْمِنِ آلِ فِرْعَوْنَ الَّذِيْ قَالَ لِقَوْمِهِ: ﴿يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْ بَأْسِ اللّٰهِ إِنْ جَاءَنَا﴾[1] وَكَحَبِيْبٍ النَّجَّارِ الَّذِيْ حَمَلَ هَمَّ دَعْوَةِ قَوْمِهِ فِي الْحَيَاةِ، وَأَبْلَغَ فِي النُّصْحِ لَهُمْ بَعْدَ الْاِسْتِشْهَادِ: ﴿قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ﴾[2]

إِذَا تَأَمَّلْتَ قَوَائِمَ عُظَمَاءِ رِجَالَاتِ الْإِسْلَامِ مِنَ الرَّعِيْلِ الْأَوَّلِ وَمَنْ بَعْدَهُمْ لَرَأَيْتَ أَنَّ «عُلُوَّ الْهِمَّةِ» هُوَ الْقَاسِمُ الْمُشْتَرَكُ بَيْنَ كُلِّ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ اعْتَزُّوْا بِالْإِسْلَامِ، وَاعْتَزَّ بِهِمُ الْإِسْلَامُ، وَوَقَفُوْا حَيَاتَهُمْ لِحِرَاسَةِ الْمِلَّةِ وَخِدْمَةِ الْأُمَّةِ، سَوَاءٌ كَانُوْا عُلَمَاءَ أَوْ دُعَاةً أَوْ مُجَدِّدِيْنَ أَوْ مُجَاهِدِيْنَ أَوْ مُرَبِّيْنَ أَوْ عُبَّادًا صَالِحِيْنَ، وَلَوْ لَمْ يَتَحَلَّوْا بِعُلُوِّ الْهِمَّةِ

---

[1] المؤمن: ۲۹ [2] یٰس: ۲۶، ۲۷

لَمَا كَانَ لَهُمْ مَوْضِعٌ فِي قَوَائِمِ الْعُظَمَاءِ، وَلَمَا تَرَبَّعُوا فِي قُلُوبِ أَبْنَاءِ مِلَّتِهِمْ، وَلَا تَزَيَّنَتْ بِذِكْرِهِمْ صَحَائِفُ التَّارِيخِ، وَلَا جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ.

وَأُسْوَتُهُمْ فِي حَمْلِ هَمِّ الْأُمَّةِ -بَلْ فِي كُلِّ بَابٍ مِنْ أَبْوَابِ الْخَيْرِ- هُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، الَّذِي شَارَكَ الْمُسْلِمِينَ الْأَمْهُمْ، وَكَانَ فِي حَاجَتِهِمْ حَتَّى حَطَمَهُ النَّاسُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

فَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ شَقِيقٍ قَالَ: قُلْتُ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا: "هَلْ كَانَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي وَهُوَ قَاعِدٌ؟" قَالَتْ: "نَعَمْ بَعْدَ مَا حَطَمَهُ النَّاسُ". [1]

وَكَذَا قَوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنِ اسْتَغْفَرَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ، كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ بِكُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ حَسَنَةً". [2]

وَقَوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي وَصْفِ أَهْلِ الْجَنَّةِ: "وَرَجُلٌ رَحِيمٌ رَقِيقُ الْقَلْبِ لِكُلِّ ذِي قُرْبَى وَمُسْلِمٍ". [3]

قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "وَلَأَنْ يَمْشِيَ أَحَدُكُمْ مَعَ أَخِيهِ فِي قَضَاءِ حَاجَتِهِ -وَأَشَارَ بِأُصْبُعَيْهِ- أَفْضَلُ مِنْ أَنْ يَعْتَكِفَ فِي مَسْجِدِي -أَيْ مَسْجِدِ الْمَدِينَةِ- هٰذَا شَهْرَيْنِ". [4]

---

[1] يقال: حطم فلانا أهله، إذا كبر فيهم، كأنهم بما حملوه من أثقالهم صيروه شيخا محطوما (صحيح مسلم، صلوة المسافرين وقصرها، باب جواز النافلة قائما وقاعدا: ١/٢٥٣)

[2] مجمع الزوائد، التوبة، باب الاستغفار للمؤمنين والمؤمنات: ١٠/٢٥٥، الرقم: ١٧٥٩٨

[3] صحيح مسلم، الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب صفات التي يعرف بها في الدنيا أهل الجنة والنار: ٢/٣٨٥

[4] المستدرك للحاكم، الأدب: ٤/٤٠٤، الرقم: ٧٧٨٧

وَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا، نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ". [1]

وَعَنْ عَبْدِالْكَرِيمِ أَبِي أُمَيَّةَ قَالَ: لَأَنْ أَرُدَّ رَجُلًا عَنْ رَأْيٍ سَيِّئٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنِ اعْتِكَافِ شَهْرٍ.

وَتَصِفُ فَاطِمَةُ بِنْتُ عَبْدِالْمَلِكِ زَوْجَهَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيزِ فَتَقُولُ: "كَانَ قَدْ فَرَّغَ لِلْمُسْلِمِينَ نَفْسَهُ، وَلِأُمُورِهِمْ ذِهْنَهُ، فَكَانَ إِذَا أَمْسَى مَسَاءً لَمْ يَفْرُغْ فِيهِ مِنْ حَوَائِجِ يَوْمِهِ، وَصَلَ يَوْمَهُ بِلَيْلِهِ.

وَقَالَ أَبُوعُثْمَانَ شَيْخُ الْبُخَارِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى:

مَا سَأَلَنِي أَحَدٌ حَاجَةً إِلَّا قُمْتُ لَهُ بِنَفْسِي، فَإِنْ تَمَّ، وَإِلَّا قُمْتُ لَهُ بِمَالِي فَإِنْ تَمَّ، وَإِلَّا اسْتَعَنْتُ لَهُ بِالْإِخْوَانِ، فَإِنْ تَمَّ، وَإِلَّا اسْتَعَنْتُ بِالسُّلْطَانِ.

وَكَانَ اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى: يَجْلِسُ لِلْمَسَائِلِ يَغْشَاهُ النَّاسُ فَيَسْأَلُونَهُ، وَيَجْلِسُ لِحَوَائِجِ النَّاسِ، لَا يَسْأَلُهُ أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ فَيَرُدُّهُ، كَبُرَتْ حَاجَتُهُ أَوْ صَغُرَتْ.

وَاعْتَادَتْ أُمُّ الشَّيْخِ مُحَمَّدٍ رَشِيدٍ رِضَا -رَحِمَهُ اللّٰهُ- أَنْ تَرَاهُ مُهْتَمًّا لِأَحْوَالِ الْمُسْلِمِينَ إِذَا أَلَمَّتْ بِهِمْ أَوْ بِأَحَدِهِمْ نَائِبَةٌ، وَرَأَتْهُ ذَاتَ يَوْمٍ عَلَى هٰذِهِ الْحَالِ، فَقَالَتْ لَهُ: "مَالَكَ؟ هَلْ مَاتَ مُسْلِمٌ بِالصِّينِ؟"

وَهٰذَا شَاعِرُ الدَّعْوَةِ الْإِسْلَامِيَّةِ الْمُعَاصِرَةِ عُمَرُ بَهَاءُ الدِّينِ الْأَمِيرِيُّ، وَهُوَ فِي جَنَاحِ طِبِّ الْقَلْبِ، مَوْصُولُ الصَّدْرِ إِلَى جِهَازِ

---

[1] صحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب فضل الاجتماع: ٢/٣٤٥

الْمُرَاقَبَةِ الإِلِكْتُرُونِي بِأَسْلاكٍ تَقِلُّ مِنْ حَرَكَتِهِ، يُحْقَنُ فِي الْبَطْنِ كُلَّ يَوْمٍ مَرَّاتٍ بِإِبَرٍ لِإِمَاعَةِ الدَّمِ، وَقَدْ جَاءَ الطَّبِيبُ، يَسْأَلُ الْقَائِمَ عَلَى التَّمْرِيضِ عَنِ اسْتِرَاحَةِ شَاعِرِنَا، فَيَرُدُّ عَلَيْهِ بِاسْتِغْرَابٍ، وَيَفْهَمُ يَخْتَلِفُ عَنْ فَهْمِهِ، فَيَقُولُ:

كَلَّا رُوَيْدَكَ يَا طَبِيبُ
وَقَدْ سَأَلْتَ: أَمَا اسْتَرَاحْ؟
هَلْ يَسْتَرِيحُ الْحُرُّ يُوقَدُ
صَدْرَهُ الْعَبَثُ الرَّزَاحْ؟

حَرَكَةُ الدَّاعِيَةِ

إِنَّ الْحَرَكَةَ وَلُودٌ، وَالسُّكُونَ عَقِيمٌ، وَالْحَرَكَةُ فِي قَامُوسِ الدُّعَاةِ هِيَ الْحَيَاةُ، وَالسُّكُونُ هُوَ الْمَوْتُ.

قَالَ الْجِيلَانِيُّ: "الْحَرَكَةُ بِدَايَةٌ، وَالسُّكُونُ نِهَايَةٌ"، وَالْحَرَكَةُ هِيَ الْحَدُّ الْفَاصِلُ بَيْنَ عَهْدِ الزَّخَارِفِ، وَبَيْنَ عَهْدِ حَمْلِ الأَمَانَةِ بِعَزْمٍ وَحَزْمٍ وَوَفَاءٍ، وَبِالْحَرَكَةِ إِنْتَشَرَ الْمُسْلِمُونَ الأَوَائِلُ مِثْلَ شُعَاعِ الشَّمْسِ فِي أَقْطَارِ الأَرْضِ يَفْتَحُونَ الْبِلَادَ وَيَفْتَحُونَ قُلُوبَ الْعِبَادِ، وَيَدْعُونَ إِلَى التَّوْحِيدِ، وَيُحَطِّمُونَ الطَّوَاغِيتَ، وَيَقُودُونَ النَّاسَ إِلَى الْجَنَّةِ، وَبِالْحَرَكَةِ صَارُوا فِي ظُلُمَاتِ الْحَيَاةِ سِرَاجًا وَهَّاجًا، فَإِذَا الْبَاطِلُ رَمَادٌ بَعْدَ الْتِهَابٍ، وَخُمُودٌ بَعْدَ حَرَكَةٍ.

إِنَّمَا التَّوْحِيدُ إِيجَابٌ وَسَلْبٌ ❊ فَهُمَا فِي النَّفْسِ عَزْمٌ وَمَضَاءٌ
"لَا" وَ "إِلَّا" قُوَّةٌ قَاهِرَةٌ ❊ لَهُمَا فِي النَّفْسِ فِعْلُ الْكَهْرُبَاءْ

وَهٰذَا الإِمَامُ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ يُصَوِّرُ عِشْقَهُ الْحَرَكَةَ، وَبُغْضَهُ

الْجُمُودَ وَالْكَسَلَ، وَيُمَثِّلُ السُّكُونَ بِالْمَاءِ الَّذِي يَتَوَقَّفُ عَنِ الْجَرَيَانِ فَيَفْسُدُ، وَيَجْزِمُ بِأَنَّ الأَسَدَ قَدْ تَعَرَّضَ لِلْهَلَاكِ لَوْ لَمْ تَتَحَرَّكْ بَاحِثَةً عَنْ فَرِيسَتِهَا، وَكَذٰلِكَ السِّهَامُ لَوْ لَا تَحَرُّكُهَا مِنَ الْكِنَانَةِ إِلَى الْقِسِيِّ وَمِنَ الْقِسِيِّ إِلَى الْهَدَفِ مَا أَصَابَتْ:

إِنِّي رَأَيْتُ وُقُوفَ الْمَاءِ يُفْسِدُهُ ❊ إِنْ سَاحَ طَابَ وَإِنْ لَمْ يَجْرِ لَمْ يَطِبِ
وَالأُسْدُ لَوْ لَا فِرَاقُ الأَرْضِ مَا افْتَرَسَتْ ❊ وَالسَّهْمُ لَوْ لَا فِرَاقُ الْقَوْسِ لَمْ يُصِبِ
وَالشَّمْسُ لَوْ وَقَفَتْ فِي الْفُلْكِ دَائِمَةً ❊ لَمَلَّهَا النَّاسُ مِنْ عُجْمٍ وَمِنْ عَرَبِ

وَهٰذَا الشَّاعِرُ الإِسْلَامِيُّ وَلِيدُ الأَعْظَمِيُّ يَهِيبُ بِالدَّاعِيَةِ أَنْ يَتَحَرَّكَ، وَيُحَرِّكَ الآخَرِينَ، مُبْتَدِئًا بِعَشِيرَتِهِ الأَقْرَبِينَ:

كُنْ مُشْعَلًا فِي جُنْحِ لَيْلٍ حَالِكٍ ❊ يَهْدِي الأَنَامَ إِلَى الْهُدَى وَيُبِينُ
وَانْشَطْ لِدِينِكَ لَا تَكُنْ مُتَكَاسِلًا ❊ وَاعْمَلْ عَلَى تَحْرِيكِ مَا هُوَ سَاكِنٌ
وَابْدَأْ بِأَهْلِكَ إِنْ دَعَوْتَ فَإِنَّهُمْ ❊ أَوْلَى الْوَرَى بِالنُّصْحِ مِنْكَ وَأَقْمَنُ
وَاللّٰهُ يَأْمُرُ بِالْعَشِيرَةِ أَوَّلًا ❊ وَالأَمْرُ مِنْ بَعْدِ الْعَشِيرَةِ هَيِّنُ

وهذا القرضاوى يجادل الخاملين، ويحاج الخامدين، ويوبخ الهامدين:

قَالُوا السَّعَادَةُ فِي السُّكُونِ ❊ وَفِي الْخُمُولِ وَفِي الْخُمُودِ
فِي الْعَيْشِ بَيْنَ الأَهْلِ لَا ❊ عَيْشِ الْمُهَاجِرِ وَالطَّرِيدِ
فِي الْمَشْيِ خَلْفَ الرَّكْبِ فِي ❊ دَعَةٍ وَفِي خَطْوٍ وَئِيدِ
فِي أَنْ تَقُولَ كَمَا يُقَالُ ❊ فَلَا اعْتِرَاضَ وَلَا رُدُودَ
فِي أَنْ تَسِيرَ مَعَ الْقَطِيعِ ❊ وَأَنْ تُقَادَ وَلَا تَقُودَ
فِي أَنْ تَصِيحَ لِكُلِّ وَالٍ ❊ عَاشَ عَهْدُكُمُ الْمَجِيدُ
قُلْتُ الْحَيَاةُ هِيَ التَّحَرُّكُ ❊ لَا السُّكُونُ وَلَا الْهُمُودُ

وهي الجهادُ وهل يُجا ❁ هِدُ من تعلَّق بالقعودْ؟

وهي التلذذُ بالمتاعب ❁ لا التلذذُ بالرُّقودْ

هي أن تذودَ عن الحِياض ❁ وأيُّ حرٍّ لا يذودْ؟

هي أن تحسَّ بأنَّ كأسَ ❁ الذُّلِّ من ماءٍ صديدْ

هي أن تعيشَ خليفةً ❁ في الأرض شأنُك أن تسُودْ

وتقولُ: لا، ونعم، إذا ما ❁ شئتَ في بَصَرٍ حديدْ

الحركةُ قيامةٌ وبعثٌ للروح

قال تعالى: ﴿يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنذِرْ﴾[1] وقال تعالى: ﴿قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا﴾[2] وقال عزوجل في شأن أصحاب الكهف: ﴿وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾[3] فهذه القيامةُ الروحيةُ، واليقظةُ القلبيةُ من أوائل منازل الطريق، التي تستدعي الحركةَ في سبيل الدعوة، قال تعالى: ﴿قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾[4] قال الكلبي: "حقٌّ على كلِّ من اتبعه أن يدعو إلى ما دعا إليه"، وتلا الحسنُ البصريُّ قولَه تعالى: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾[5] ثم قال: "هو المؤمنُ أجاب اللهَ في دعوته، ودعا الناسَ إلى ما أجاب اللهَ فيه من دعوته، وعمل صالحًا في إجابته، فهذا حبيبُ الله، هذا وليُّ الله".

[1] المدثر ٢،١ [2] سبأ ٤٦ [3] الكهف ١٤

[4] يوسف ١٠٨ [5] حم السجدة ٣٣

وقال الوزيرُ ابنُ هُبَيرة في قوله تعالى:

﴿وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ﴾[1] ...... وقوله عزوجل: ﴿وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ﴾[2]:

"تأملتُ ذكرَ أقصى المدينة، فإذا الرجلان جاءا من بُعدٍ في الأمر بالمعروف، ولم يتقاعدا لبُعد الطريق".

لا يكونُ المؤمنُ العامرُ القلبِ إلا متحرِّكًا محرِّكًا، أما المتباطئ الذي يعدُّ بالالتحاق بعد ما تظهرُ بوادرُ النجاح، فإنما يعدُّ وعدَ الضِّعاف.

صاح ما الحرُّ من يثورُ على الظُّلم ❁ وقد ثارت لحتفها الأقوامُ

إنما الحرُّ من يثيرُ إلى الظُّلمِ ❁ فيضيه والأنامُ نيامُ

فلا تؤجِّل الانضواءَ تحت لواء الحق، وإلا عضضتَ أنيةَ الندم.

دعا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم ذا الجوشن الضِّبابيَّ إلى الإسلام بعد بدرٍ فقال له: "هل لك إلى أن تكونَ من أوائل هذا الأمر؟" قال: "لا" قال: "فما يمنعُك منه؟" قال: "رأيتُ قومَك كذَّبوك، وأخرجوك، وقاتلوك، فأنظرُ، فإن ظهرتَ عليهم آمنتُ بك واتبعتُك، وإن ظهروا عليك لم أتبعك"، فكان ذو الجوشن يتوجَّع على تركِه الإسلامَ حين دعاه إليه رسولُ الله صلى الله عليه وسلم".[3]

فكن رائدًا، وأجبْ داعيَ الله، بلا تلكؤٍ، ولا تلعثمٍ، ولا تردُّدٍ، فهذا هو شأنُ المؤمنين.

[1] يس ٢٠ [2] القصص ٢٠ [3] انظر المنطلق ٩٦

قَالَ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "يَا إِسْمَاعِيلُ إِنَّ اللّٰهَ أَمَرَنِي بِأَمْرٍ"، قَالَ: "فَاصْنَعْ مَا أَمَرَكَ رَبُّكَ"، قَالَ: "وَتُعِينُنِي؟" قَالَ: "وَأُعِينُكَ".[1]

وَقَدْ كَانَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنَادِي فِي مَوْسِمِ الْحَجِّ: "مَنْ يَحْمِلُنِي حَتّٰى أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي"، وَهَا هُوَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنَاشِدُكَ: "بَلِّغُوا عَنِّي، وَلَوْ آيَةً"[2]، وَيَدْعُو لِمَنْ يُبَلِّغُ عَنْهُ: "نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَءًا سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا، فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ"[3] وَرُوِيَ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي دُعَائِهِ: "اللّٰهُمَّ زَيِّنَّا بِزِينَةِ الْإِيمَانِ، وَاجْعَلْنَا هُدَاةً مُهْتَدِينَ"[4]، وَقَدْ أَثْنَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلٰى عِبَادِ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ كَانَ مِنْ دُعَائِهِمْ إِيَّاهُ: ﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا﴾[5] أَيْ: نَقْتَدِي بِمَنْ قَبْلَنَا، وَيَقْتَدِي بِنَا مَنْ بَعْدَنَا" سُئِلَ وَهْبُ بْنُ مُنَبِّهٍ عَنْ صِفَةِ الْمُسْلِمِ فَقَالَ رَحِمَهُ اللّٰهُ: "يَقْتَدِي بِمَنْ قَبْلَهُ وَهُوَ إِمَامٌ لِمَنْ بَعْدَهُ".

وَوَاجِبٌ أَنْ يَكُونَ فِي كُلِّ مَسْجِدٍ وَمَحَلَّةٍ مِنَ الْبَلَدِ فَقِيهٌ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِينَهُمْ، وَكَذَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ، وَوَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ فَقِيهٍ -فَرَغَ مِنْ فَرْضِ عَيْنِهِ وَتَفَرَّغَ لِفَرْضِ الْكِفَايَةِ- أَنْ يَخْرُجَ إِلٰى مَا يُجَاوِرُ بَلَدَهُ مِنْ أَهْلِ السَّوَادِ وَمِنَ الْعَرَبِ وَالْأَكْرَادِ وَغَيْرِهِمْ، وَيُعَلِّمَهُمْ دِينَهُمْ وَفَرَائِضَ شَرْعِهِمْ.[6]

---

[1] بخاري، الانبياء، باب "يزفون" (الصّٰفّٰت: ۹۴) النسلان في المشي، رقم: ۳۳۶۴

[2] بخاري، احاديث الانبياء، باب ما ذكر عن بني اسرائيل، رقم: ۳۴۶۱

[3] ترمذي، العلم، باب ما جاء في الحث على تبليغ السماع، رقم: ۲۶۵۷

[4] نسائي، السهو، باب ۶۲ نوع آخر، رقم: ۱۳۰۶

[5] الفرقان: ۷۴

[6] إحياء علوم الدين، الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، المنكرات العامة: ۲/ ۴۵۷

وَهٰذَا شَيْخُ الْإِسْلَامِ ابْنُ تَيْمِيَّةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ يُفَسِّرُ قَوْلَهُ تَعَالٰى: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ﴾[1] فَيَقُولُ:

"فَوَاجِبٌ عَلَى الْأُمَّةِ أَنْ يُبَلِّغُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ، وَيُنْذِرُوا كَمَا أَنْذَرَ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝﴾[2] وَالْجِنُّ لَمَّا سَمِعُوا الْقُرْآنَ: ﴿وَلَّوْا إِلٰى قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ﴾[3]

وَهٰذَا تِلْمِيذُهُ الْإِمَامُ الْمُحَقِّقُ ابْنُ قَيِّمِ الْجَوْزِيَّةِ رَحِمَهُ اللّٰهُ يَقُولُ: "وَتَبْلِيغُ سُنَّتِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى الْأُمَّةِ أَفْضَلُ مِنْ تَبْلِيغِ السِّهَامِ إِلٰى نُحُورِ الْعَدُوِّ، لِأَنَّ تَبْلِيغَ السِّهَامِ يَفْعَلُهُ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ، وَأَمَّا تَبْلِيغُ السُّنَنِ فَلَا يَقُومُ بِهِ إِلَّا وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، وَخُلَفَاؤُهُمْ فِي أُمَمِهِمْ، جَعَلَنَا اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْهُمْ بِمَنِّهِ وَكَرَمِهِ".[4]

إِنَّ سَنَاءَ الْهِمَّةِ فِي نُشْدَانِ الْكَمَالِ الْمُمْكِنِ، وَمَنْ أَرَادَ الْمَنْزِلَةَ الْعُلْيَا الْقُصْوٰى مِنَ الْجَنَّةِ، فَعَلَيْهِ أَنْ يَكُونَ فِي الْمَنْزِلَةِ الْقُصْوٰى فِي هٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا، وَاحِدَةٌ بِوَاحِدَةٍ، وَلِكُلِّ سِلْعَةٍ ثَمَنٌ.[5]

إِذَا مَا عَلَا الْمَرْءُ رَامَ الْعُلَا
وَيَقْنَعُ بِالدُّونِ مَنْ كَانَ دُونَا

وَلَيْسَتْ هٰذِهِ الْمَنْزِلَةُ الْعُلْيَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا مَنْزِلَةَ الدَّعْوَةِ إِلَى اللّٰهِ، وَوِرَاثَةَ وَظَائِفِ النُّبُوَّةِ الَّتِي لَيْسَ أَشْرَفَ مِنْهَا إِلَّا مَنْزِلَةُ النُّبُوَّةِ نَفْسِهَا،

---

[1] المدثر: ۲،۱ [2] التوبة: ۱۲۲

[3] الاحقاف: ۲۹، مجموع الفتاوىٰ: ۱۶/ ۳۲۷

[4] التفسير القيم: ۴۳۱ [5] المنطلق: ۱۲۱

وهذا الإمام أبو الفرج بن الجوزي رحمة الله تعالى يناديك:

"ألست تبغي القرب منه؟ فاشتغل بدلالة عباده عليه، فهي حالات الأنبياء عليهم الصلاة والسلام، أما علمت أنهم آثروا تعليم الخلق على خلوات التعبد، لعلمهم أن ذلك آثر عند حبيبهم" (و هل كان شغل الأنبياء إلا معاناة الخلق، وحثهم على الخير، ونهيهم عن الشر) اهـ. وها هو رحمة الله يقارن بين الشجعان الذين يخالطون الناس لدعوتهم، ويصبرون على أذيتهم، وبين المتخاذلين المعتزلين القاعدين عن الدعوة إلى الله تعالى، فيقول:

"الزهاد في مقام الخفافيش، قد دفنوا أنفسهم بالعزلة عن نفع الناس، وهي حالة حسنة إذا لم تمنع من خير، من جماعة واتباع جنازة وعيادة مريض"،

ألا إنها حالة الجبناء. فأما الشجعان فهم يتعلمون ويعلمون، وهذه مقامات الأنبياء عليهم السلام).

وهذا الشيخ الداعية القدوة عبد القادر الكيلاني الذي تكلم كثيرا، وصاح بأهل العراق صيحات بليغة رفيعة المعنى والمبنى، وينتشل لنا أحد تلامذته من تلك الصيحات كلمات يدونها سريعا والإمام يخطب خطبه الأسبوعية سنة ۵۴۵ھ، ويودعها كتابا سماه "الفتح الرباني والفيض الرحماني" قد نجد فيه ما يجب رده، لكنه مملوء بصيحات الحق، والإلتفافات القيمة، والتشديد على وجوب الدعوة والأمر والنهي.

فاسمع من صيحات الحق هذه قول عبد القادر رحمه الله:

"المتزهد المبتدي في زهده يهرب من الخلق، والزاهد الكامل في زهده لا يبالي منهم، لا يهرب منهم، بل يطلبهم، لأنه يصير عارفا لله عز وجل، ومن عرف الله لا يهرب من شيء، ولا يخاف من شيء سواه. المبتدي يهرب من الفساق والعصاة، والمنتهي يطلبهم كيف لا يطلبهم وكل دوائهم عنده؟

ولهذا قال بعضهم رحمة الله عليه: "لا يضحك في وجه الفاسق إلا العارف".

من كملت معرفته لله عز وجل صار دالا عليه، يصير شبكة يصطاد بها الخلق من بحر الدنيا، يعطى القوة حتى يهزم إبليس وجنده، يأخذ الخلق من أيديهم،

يا من اعتزل بزهده مع جهله، تقدم واسمع ما أقول، يا زهاد الأرض تقدموا،

خربوا صوامعكم واقربوا مني، قد قعدتم في خلواتكم من غير أصل، ما وقعتم بشيء، تقدموا......

قال هذا رحمة الله وهو في الشيخوخة.

وكذلك فهم العالم العامل، و إن كلماته ليهتز لها القلب اهتزازا. تأمل قوله: "يا زهاد الأرض تقدموا، خربوا صوامعكم" خرب صومعتك أيها الهارب الذي ترزح تحت نير الأفكار الأرضية، وآراء طواغيت القرن العشرين. خذ مكانك في صفوف دعوة الإسلام اهـ.[1]

ويستطرد الداعية المبدع الراشد محمد أحمد الراشد حفظه الله قائلا: "ولا ينبغي للداعية أن ييئس إن لم يجد فضل وقت

[1] المنطلق: ۱۱۴، ۱۱۵

لِقِيَامِ اللَّيْلِ يَوْمِيًّا، وَالْإِكْثَارِ مِنْ خَتَمَاتِ الْقُرْآنِ، فَإِنَّ مَا هُوَ فِيهِ مِنَ الدَّعْوَةِ وَتَعْلِيمِ النَّاسِ وَتَرْبِيَةِ الشَّبَابِ خَيْرٌ وَأَجْزَلُ أَجْرًا، وَقُدْوَتُهُ فِي ذٰلِكَ وَرَائِدُهُ أَئِمَّةُ الدُّعَاةِ مِنَ السَّلَفِ الصَّالِحِ الَّذِينَ كَانُوا يَسِيحُونَ لِنَشْرِ الدَّعْوَةِ وَتَبْلِيغِهَا، وَيُبَادِئُونَ النَّاسَ بِالْكَلَامِ، وَيَحْتَكُّونَ بِهِمْ احْتِكَاكًا هَادِفًا، وَلَا يَنْتَظِرُونَ مَجِيءَ النَّاسِ لَهُمْ لِيَسْأَلُوهُمْ".[1]

وَيَرْوِي لَنَا التَّابِعِيُّ الْكُوفِيُّ، الْفَقِيهُ النَّبِيلُ عَامِرٌ الشَّعْبِيُّ: "أَنَّ رِجَالًا خَرَجُوا مِنَ الْكُوفَةِ، وَنَزَلُوا قَرِيبًا يَتَعَبَّدُونَ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُودٍ، فَأَتَاهُمْ، فَفَرِحُوا بِمَجِيئِهِ إِلَيْهِمْ، فَقَالَ لَهُمْ: "مَا حَمَلَكُمْ عَلَى مَا صَنَعْتُمْ؟" قَالُوا: "أَحْبَبْنَا أَنْ نَخْرُجَ مِنْ غِمَارِ النَّاسِ نَتَعَبَّدُ" فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: "لَوْ أَنَّ النَّاسَ فَعَلُوا مِثْلَ مَا فَعَلْتُمْ فَمَنْ كَانَ يُقَاتِلُ الْعَدُوَّ؟ وَمَا أَنَا بِبَارِحٍ حَتَّى تَرْجِعُوا".[2]

"كَانَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ إِذَا بَلَغَهُ عَنْ شَخْصٍ صَلَاحٌ أَوْ زُهْدٌ، أَوْ قِيَامٌ بِحَقٍّ، أَوِ اتِّبَاعٌ لِلْأَمْرِ، سَأَلَ عَنْهُ، وَأَحَبَّ أَنْ يَجْرِيَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ مَعْرِفَةٌ، وَأَحَبَّ أَنْ يَعْرِفَ أَحْوَالَهُ".[3]

لَمْ يَكُنْ بِالْمُنْعَزِلِ الْمُتَوَارِي الْهَارِبِ مِنَ النَّاسِ، فَالدَّاعِيَةُ يُفَتِّشُ عَنِ النَّاسِ، وَيَبْحَثُ عَنْهُمْ، وَيَسْأَلُ عَنْ أَخْبَارِهِمْ، وَيَرْحَلُ لِلِقَائِهِمْ، وَيَزُورُهُمْ فِي مَجَالِسِهِمْ وَمُنْتَدَيَاتِهِمْ، وَمَنِ انْتَظَرَ مَجِيءَ النَّاسِ إِلَيْهِ فِي مَسْجِدِهِ أَوْ بَيْتِهِ، فَإِنَّ الْأَيَّامَ تُبْقِيهِ وَحِيدًا، وَيَتَعَلَّمُ فَنَّ التَّثَاؤُبِ.[4]

قَالُوا فِي التَّعْرِيفِ بِمُوسَى بْنِ حِزَامٍ شَيْخِ الْبُخَارِيِّ وَالتِّرْمِذِيِّ:

[1] المنطلق: ۱۱۹ — [2] كتاب الزهد لابن المبارك: ۳۹۰

[3] مناقب الإمام أحمد: ۱۱۸ — [4] المنطلق ص ۱۲۷

"إِنَّهُ كَانَ ثِقَةً صَالِحًا لٰكِنَّهُ كَانَ فِي أَوَّلِ أَمْرِهِ يَنْتَحِلُ الْإِرْجَاءَ، ثُمَّ أَعَانَهُ اللّٰهُ تَعَالَى بِأَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ، فَانْتَحَلَ السُّنَّةَ، وَذَبَّ عَنْهَا، وَقَمَعَ مَنْ خَالَفَهَا، مَعَ لُزُومِ الدِّينِ، حَتَّى مَاتَ".[1]

نَمَاذِجُ مِنْ حَرَكَةِ السَّلَفِ فِي الدَّعْوَةِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى وَحِرْصِهِمْ عَلَى هِدَايَةِ الْخَلْقِ

عَنْ جَعْفَرِ بْنِ سُلَيْمَانَ قَالَ: "سَمِعْتُ مَالِكَ بْنَ دِينَارٍ يَقُولُ: لَوِ اسْتَطَعْتُ أَنْ لَا أَنَامَ، لَمْ أَنَمْ مَخَافَةَ أَنْ يَنْزِلَ الْعَذَابُ وَأَنَا نَائِمٌ، وَلَوْ وَجَدْتُ أَعْوَانًا، لَفَرَّقْتُهُمْ يُنَادُونَ فِي سَائِرِ الدُّنْيَا كُلِّهَا: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! النَّارَ النَّارَ".

وَعَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ الْأَشْعَثِ قَالَ: "كُنَّا إِذَا خَرَجْنَا مَعَ الْفُضَيْلِ فِي جَنَازَةٍ لَا يَزَالُ يَعِظُ، وَيُذَكِّرُ وَيَبْكِي حَتَّى لَكَأَنَّهُ يُوَدِّعُ أَصْحَابَهُ ذَاهِبٌ إِلَى الْآخِرَةِ، حَتَّى يَبْلُغَ الْمَقَابِرَ، فَيَجْلِسُ فَكَأَنَّهُ بَيْنَ الْمَوْتَى، جَلَسَ مِنَ الْحُزْنِ وَالْبُكَاءِ حَتَّى يَقُومَ، وَلَكَأَنَّهُ رَجَعَ مِنَ الْآخِرَةِ يُخْبِرُ عَنْهَا".

وَعَنْ شُجَاعِ بْنِ الْوَلِيدِ قَالَ: "كُنْتُ أَخْرُجُ مَعَ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ، فَمَا يَكَادُ لِسَانُهُ يَفْتُرُ عَنِ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ ذَاهِبًا وَرَاجِعًا".

وَالْإِمَامُ الزُّهْرِيُّ لَمْ يَكْتَفِ بِتَرْبِيَةِ أَجْيَالٍ وَتَخْرِيجِ أَئِمَّةٍ فِي الْحَدِيثِ، بَلْ كَانَ يَنْزِلُ إِلَى الْأَعْرَابِ، يُعَلِّمُهُمْ.

وَكَانَ الْفَقِيهُ الْوَاعِظُ أَحْمَدُ الْغَزَالِيُّ، شَقِيقُ أَبِي حَامِدٍ الْغَزَالِيِّ

[1] تهذيب التهذيب: ۱۰/۳۴۱

رحمهما الله كان يدخل القرى والضياع، ويعظ لأهل البوادي، تقربا إلى الله. اهـ.

أما الشيخ أبو إسحاق الفزاري رحمه الله: فقد كان رجل عامة، وهو الذي أدب أهل الثغور الإسلامية التي في أعالي بلاد الشام والجزيرة تجاه الروم، وعلمهم سنن النبي صلى الله عليه وسلم، وكان يأمر وينهى، وإذا دخل الثغر رجل مبتدع أخرجه.

وأما الشيخ الزاهد الفقيه محمد بن أحمد الدباهي:

فقد لازم العبادة، والعمل الدائب والجد، واستغرق أوقاته في الخير، صلب في الدين، وينصح الإخوان، وإذا رآه إنسان، عرف الجد في وجهه.

وعلى الفتى لطباعه سمة تلوح على جبينه

وأما الإمام الجليل الخرقي صاحب (المختصر) فقد قال الإمام ابن قدامة رحمه الله: "وسمعت من يذكر أن سبب موته، أنه أنكر منكرا بدمشق، فضرب، فكان موته بذلك".

ومن نماذج حرصهم على تعليم الناس العلم الشريف

ما رواه جعفر بن برقان قال: كتب إلينا عمر بن عبد العزيز، وقال في كتابه: "ومر أهل الفقه من جندك فلينشروا ما علمهم الله في مساجدهم ومجالسهم، والسلام".

وعن عثمان بن عطاء عن أبيه قال: "إن أوثق عملي في نفسي نشري العلم" وعطاء بن أبي رباح مفتي مكة هو القائل: "لأن أرى

في بيتي شيطانا، خير من أن أرى فيه وسادة، لأنها تدعو إلى النوم".

وقال الإمام ربيعة الرأي رحمه الله: "لا ينبغي لأحد عنده شيء من العلم أن يضيع نفسه".[1]

طریقِ نبوت اور ہم

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ دعوت و اصلاح کا کام انبیاء یا ان کے وارث ہی کر سکتے ہیں جو قدم قدم پر اپنا خون پیتے ہیں اور دشمن کی خیر خواہی اور ہمدردی میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی رفتار و گفتار میں کسی مخالفت پر طعن و تشنیع کا شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ مخالف کے جواب میں فقرے چست کرنے کی فکر نہیں کرتے۔ وہ ان پر الزام تراشی کا پہلو اختیار نہیں کرتے، اسی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ چند روز کی مخالفتوں کے بعد بڑے بڑے سرکشوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، ان کی بات کو ماننا پڑتا ہے۔ آج افسوس یہ ہے کہ ہم اسوۂ انبیاء سے اتنی دور جا پڑے کہ ہمارے کلام و تحریر میں ان کی کسی بات کا رنگ نہ رہا!

آج کل کے مبلغ و مصلح کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مخالف پر طرح طرح کے الزام لگا کر اس کو رسوا کرے اور فقرے ایسے چست کرے کہ سننے والا دل کو پکڑ کر رہ جائے۔ اسی کا نام آج کی زبان میں زبان دانی اور اردو ادب ہے۔ "إنا لله وإنا إليه راجعون"

ہمارے علماء اور مصلحین و مبلغین کے لیے کیسے روا ہو گیا کہ جس سے ان کو کسی رائے میں اختلاف ہو جائے تو اس کی پگڑی اچھالیں، اور ٹانگ کھینچنے کی فکر میں لگ جائیں، اور استہزاء و تمسخر کے ساتھ اس پر فقرے چست کریں، اور پھر دل میں خوش

[1] ماخوذ من "علو الهمة" ۱۵۵ تا ۱۷۱

ہوں کہ ہم نے دین کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور لوگوں سے اس کے متوقع رہیں کہ ہماری خدمات کو سراہیں اور قبول کریں۔

میری نظر میں (یعنی حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ گویا ہیں) اس وقت یہ تین اسباب ہیں جو مسلمانوں کا شیرازہ بندھنے نہیں دیتے۔ ہر اجتماع کے نتیجے میں افتراق...... اور ہر تنظیم کے نتیجے میں تفریق...... ہر اصلاح کے نتیجہ میں فساد...... اور ہر دعوت کے نتیجے میں نفرت...... ہمارے سامنے آتی ہے۔

کاش ہم مل کر سوچیں اور دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر کریں! کیوں کہ اصل مرض یہی ہے کہ حب مال و جاہ، حسد و بغض کی نجاستوں سے اپنے قلوب پاک نہیں۔ ہمیں (یعنی علماء و ائمہ کی جماعت) اس پر بڑا ناز ہے کہ ہم چوری...... رشوت...... سود...... شراب...... رقص و سرود...... اور سینما سے پرہیز کرتے ہیں اور نماز روزے کے پابند ہیں۔

لیکن خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہماری یہ نماز روزہ کی پابندی اور سود، شراب، رقص و سرود سے پرہیز کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف اپنی مولوی گری کے پیشے کی خاطر ہو کیوں کہ اس پیشے میں ان چیزوں کی کھپت نہیں، ورنہ اگر ہم ان چیزوں سے خالص خوف خدا کی بنا پر بھی بچے ہوتے تو حب مال و جاہ، حسد و بغض اور کبر و ریاء سے بچے ہوتے، کیوں کہ ان کی نجاست کچھ سود و شراب سے کم نہیں۔ مگر یہ باطنی گناہ ہمارے جبے اور عمامے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی پروا نہیں ہوتی اور یہی وہ چیزیں ہیں جو در اصل سارے تفرقوں کی بنیاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب آفتوں (ظاہری اور باطنی گناہوں) سے بچنے کی توفیق کامل عطا فرمائے، تا کہ ایک دل ہو کے دعوت و اصلاح کا کام پیغمبرانہ جذبے اور پیغمبرانہ آداب کے ساتھ لے کر کھڑے ہو جائیں۔[1]

[1] وحدت امت: ٣٧ تا ٤١

دین کی بات پہنچانے میں حکمت سے کام لینا سنت انبیاء ہے

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام لوگوں کو صرف دین کی دعوت نہیں دیتے تھے، بل کہ اس دعوت میں مناسب حکمت اور تدابیر بھی اختیار کرتے تھے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کی حکمت کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ﴾[1]

یعنی ایک رات میں جب تاریکی چھا گئی اور ایک کوکب یعنی ستارہ پر نظر پڑی تو اپنی قوم کو (ابراہیم علیہ السلام نے) یہ سنا کر کہا کہ یہ ستارہ میرا رب ہے، مطلب یہ تھا کہ تمہارے خیالات و عقائد کی رو سے یہی میرا اور تمہارا رب یعنی پالنے والا ہے، اب تھوڑی دیر میں اس کی حقیقت دیکھ لینا۔

چنانچہ کچھ دیر کے بعد وہ غروب ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم پر حجت قائم کرنے کا واضح موقع ہاتھ آیا، اور فرمایا ﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ﴾ "آفلین" "افول" سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں غروب ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ میں غروب ہو جانے والی چیزوں سے محبت نہیں رکھتا، جس کو خدا یا معبود بنایا جائے، ظاہر ہے کہ وہ سب سے زیادہ محبت و عظمت کا مستحق ہونا چاہیے، مولانا رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک شعر میں اسی واقعہ کو بیان فرمایا ہے۔

خلیل آسا در ملک یقین زن
نوائے لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ زن

اس کے بعد پھر کسی دوسری رات میں چاند چمکتا ہوا نظر آیا تو پھر اپنی قوم کو سنا کر وہی طریقہ اختیار فرمایا اور کہا کہ (تمہارے عقائد کے مطابق) یہ میرا رب ہے،

[1] الانعام: ٧٦

مگر اس کی حقیقت بھی کچھ دیر کے بعد سامنے آجائے گی۔ چناں چہ جب چاند غروب ہوگیا تو فرمایا:

اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ کرتا تو میں بھی تمہاری طرح گمراہوں میں داخل ہوجاتا، اور چاند ہی کو اپنا رب اور معبود سمجھ بیٹھتا، لیکن اس کے طلوع وغروب کے بدلنے والے حالات نے مجھے متنبہ کردیا کہ یہ ستارہ بھی قابل عبادت نہیں۔

اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ میرا رب کوئی دوسری شے ہے جس کی طرف سے مجھے ہدایت ہوتی رہتی ہے۔

اس کے بعد ایک روز آفتاب کو نکلتے ہوئے دیکھا تو پھر قوم کو سنا کر اسی طریقے پر فرمایا کہ (تمہارے خیال کے مطابق) یہ میرا رب ہے، اور یہ تو سب سے بڑا ہے۔ مگر اس بڑے کی حقیقت وحیثیت بھی عن قریب تمہارے سامنے آجائے گی۔ چناں چہ آفتاب بھی اپنے وقت پر غروب ہوگیا، تو قوم پر آخری حجت تمام کرنے کے بعد اب اصل حقیقت کو واضح طور پر بیان فرمادیا کہ ﴿یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾[1] یعنی اے میری قوم! میں تمہارے ان مشرکانہ خیالات سے بے زار ہوں، کہ تم نے خدا تعالیٰ کی مخلوقات کو ہی خدا کا شریک بنا رکھا ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت کو بتلادیا کہ میرا اور تمہارا رب (پالنے والا) ان تمام مخلوقات میں سے کوئی نہیں ہوسکتا، جو خود اپنے وجود میں دوسرے کی محتاج ہیں، اور ہر وقت ہر آن عروج ونزول اور طلوع وغروب کے تغیرات میں گھری ہوئی ہیں۔ بل کہ ہم سب کا رب وہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین اور ان میں پیدا ہونے والی تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اس لیے میں نے اپنا رخ تمہارے سب خود تراشیدہ بتوں اور تغیرات وتاثرات میں گھرے ہوئے ستاروں سے پھیر کر صرف ایک خدائے وحدہ لاشریک لہ کی طرف کرلیا ہے، اور میں تمہاری طرح مشرکین میں سے

[1] الانعام: ۷۸

نہیں ہوں۔

اس واقعہ مناظرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیغمبرانہ حکمت وموعظت سے کام لے کر یک بارگی ان کی نجوم پرستی کو غلط یا گمراہی نہیں فرمایا، بل کہ ایک ایسا انداز قائم کیا، جس سے ہر ذی عقل انسان کا قلب ودماغ خود متاثر ہوکر حقیقت کو پہچان لے۔

ہاں بت پرستی کے خلاف بات کرنے میں اول ہی سے شدت اختیار فرمائی، اور اپنے باپ اور پوری قوم کا گمراہی پر ہونا صاف طور پر بیان کردیا۔ وجہ یہ تھی کہ بت پرستی کا نامعقول گمراہی ہونا بالکل واضح اور کھلا ہوا تھا، بخلاف نجوم پرستی کے کہ اس کی گمراہی اتنی واضح اور جلی نہیں تھی۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نجوم پرستی کے خلاف اپنی قوم کے سامنے جو استدلال بیان فرمایا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جو چیز تغیر پذیر ہو، اور اس کے حالات ادل بدل ہوتے رہتے ہوں، اور وہ اپنی حرکات میں کسی دوسری طاقت کے تابع ہو وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کو اپنا رب قرار دیں۔

اس استدلال میں سیاروں کے طلوع غروب اور درمیانی تمام حالات سے استدلال کیا جاسکتا تھا، کہ وہ اپنی حرکات میں خود مختار نہیں کسی کے حکم کے تابع ایک خاص روش پر چل رہے ہیں۔

لیکن حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے ان تمام حالات وکیفیات میں استدلال کے لیے ان سیاروں کے غروب کو پیش کیا، کیوں کہ ان کا غروب عوام کی نظروں میں ایک طرح سے ان کا زوال سمجھا جاتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا عام طرز استدلال وہ ہوتا ہے جو عوام کے ذہنوں پر اثر انداز ہو، وہ فلسفیانہ حقائق کے پیچھے زیادہ نہیں پڑتے، بل کہ عام ذہنوں کے مطابق خطاب فرماتے ہیں۔ اس لیے ان سیاروں کی بے بسی اور بے اثری ثابت کرنے کے لیے ان کے غروب کو پیش کیا۔ ورنہ ان کے

بے بس اور بے قدرت ہونے پر تو طلوع سے بھی استدلال ہو سکتا تھا، اور اس کے بعد غروب سے پہلے تک جتنے تغیرات پیش آتے ہیں ان سے بھی اس پر دلیل پکڑی جاسکتی تھی۔[1]

ائمہ کرام کے لیے چند ہدایات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس طرزِ مناظرہ سے علماء و مبلغین کے لیے چند اہم ہدایات حاصل ہوئیں۔

اوّل یہ کہ قوموں کی تبلیغ و اصلاح میں ہر جگہ سختی مناسب ہے نہ ہر جگہ نرمی، بل کہ ہر ایک کا ایک موقع اور ایک حد ہے۔ چناں چہ بت پرستی کے معاملے میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ کیوں کہ اس کی گمراہی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے، اور نجوم پرستی کے معاملے میں ایسے سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے، بل کہ ایک خاص تدبیر سے معاملہ کی حقیقت کو قوم کے ذہن نشین فرمایا۔ کیوں کہ سیاروں اور ستاروں کا بھی بے بس اور بے اختیار ہونا اتنا واضح اور کھلا ہوا نہیں تھا جتنا خود تراشیدہ بتوں کا۔

اس سے معلوم ہوا کہ عوام اگر کسی ایسی غلطی میں مبتلا ہوں جس کا غلطی اور گمراہی ہونا عام نظروں میں واضح نہ ہو تو عالم اور مبلغ (امام) کو چاہیے کہ تشدد کے بجائے ان کے شبہات کو دور کرنے کی تدبیر کرے۔

ان کو مختلف طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کرے۔

دوسری ہدایت اس میں یہ ہے کہ اظہارِ حق و حقیقت کے لیے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو یوں خطاب نہیں کیا کہ تم ایسا کرو، بل کہ اپنا حال بتلا دیا کہ میں تو ان طلوع و غروب کے چکر میں رہنے والی چیزوں کو معبود قرار نہیں دے سکتا۔ اس لیے میں نے اپنا رخ ایک ایسی ہستی کی طرف کر لیا ہے، جو ان سب چیزوں

[1] معارف القرآن: ۳/۳۸۱، ۳۸۲، الانعام: ۷۶

کو پیدا کرنے والی اور پالنے والی ہے۔ مقصد تو یہی تھا کہ تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے مگر حکیمانہ انداز میں صریح خطاب سے پرہیز فرمایا، تاکہ وہ ضد پر نہ آجائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصلح اور امام کا صرف یہ کام نہیں کہ حق بات کو جس طرح چاہے کہہ ڈالے، بل کہ اس پر لازم ہے کہ ایسے انداز سے کہے جو لوگوں کے لیے موثر ہو۔[1]

چناں چہ شیخ محمد احمد اسماعیل صاحب اپنی کتاب "علو الہمۃ" میں اسی بات کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

"فَيَنْبَغِيْ لِلدَّاعِيَةِ أَنْ يَكُوْنَ كَالطَّبِيْبِ الْحَاذِقِ الْحَكِيْمِ الَّذِيْ يُشَخِّصُ الْمَرَضَ، وَيَعْرِفُ الدَّاءَ وَيُحَدِّدُهُ، ثُمَّ يُعْطِي الدَّوَاءَ الْمُنَاسِبَ عَلٰى حَسَبِ حَالِ الْمَرِيْضِ وَمَرَضِهٖ، مُرَاعِيًا فِيْ ذٰلِكَ قُوَّةَ الْمَرِيْضِ وَضُعْفَهٗ، وَتَحَمُّلَهٗ لِلْعِلَاجِ، وَقَدْ يَحْتَاجُ الْمَرِيْضُ إِلٰى عَمَلِيَّةٍ جِرَاحِيَّةٍ فَيَشُقُّ بَطْنَهٗ، أَوْ يَقْطَعُ شَيْئًا مِنْ أَعْضَائِهٖ مِنْ أَجْلِ اسْتِئْصَالِ الْمَرَضِ طَلَبًا لِصِحَّةِ الْمَرِيْضِ."

ترجمہ: "داعی کا کردار ایک طبیب حاذق کی مانند ہونا چاہیے کہ جس طرح ایک طبیب مرض کی تشخیص کرتا ہے اس کے لیے مناسب دوا تجویز کر کے اس کی بیماری کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مریض کی پوزیشن کے مطابق اسے دوا دیتا ہے اس کی برداشت و کمزوری کی رعایت کرتے ہوئے۔ کبھی مریض کی صحت کا لحاظ کر کے اس کا آپریشن بھی کرنا پڑتا ہے، چاہے اس کا پیٹ چاک کرنا پڑے یا اس کے اعضاء میں سے کوئی عضو کاٹ کر الگ کرنا پڑے، تاکہ مریض صحت یاب ہو۔"

ہم سب کے سوچنے کی بات ہے کہ سورۂ یٰسین کو قلب القرآن کس وجہ سے کہا

[1] معارف القرآن: ۳/۳۸۲، ۳۸۳، الانعام: ۷۶

گیا ہے، اس میں دعوت الی اللہ اور اخلاقِ حسنہ کی اہمیت کے ساتھ تعلیم دی گئی ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ملک شام کی طرف جو تین رسول بھیجے گئے، انہوں نے مشرکین و کفار سے جس طرح خطاب کیا اور ان کی سخت و تلخ باتوں اور دھمکیوں کا جس طرح جواب دیا اسی طرح ان کی دعوت سے مسلمان ہونے والے حبیب نجار نے اپنی قوم سے جس طرح خطاب کیا ان سب چیزوں کو ذرا غور کر دیکھئے تو ان میں تبلیغ دین اور اصلاحِ خلق کی خدمت انجام دینے والوں کے لیے بڑے سبق ہیں۔

ان رسولوں کی ناصحانہ تبلیغ و تلقین کے جواب میں مشرکین نے تین باتیں کہیں:

1. تم تو ہمارے جیسے انسان ہو ہم تمہاری بات کیوں مانیں؟
2. اللہ رحمٰن نے کسی پر کوئی پیغام اور کتاب نہیں اتاری۔
3. تم خالص جھوٹ بولتے ہو۔

آپ غور کیجیے کہ بے غرض ناصحانہ کلام کے جواب میں یہ اشتعال انگیز گفتگو کیا جواب چاہتی تھی؟

مگر ان رسولوں نے کیا جواب دیا؟

صرف یہ کہ ﴿رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ﴾[1] یعنی ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمہاری طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں، اور ﴿مَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾[2] یعنی ہمارا جو کام تھا وہ کر چکے کہ تمہیں اللہ کا پیغام واضح کر کے پہنچا دیا، آگے تمہیں اختیار ہے، مانو یا نہ مانو۔ دیکھیے ان کے کسی لفظ میں کیا ان کی اشتعال انگیزی کا کوئی تاثر ہے؟

کیسا مشفقانہ جواب دیا۔

پھر ان لوگوں نے اور آگے بڑھ کر یہ کہا کہ تم لوگ منحوس ہو تمہاری وجہ سے ہم

[1] یٰسٓ: ۱۶ [2] یٰسٓ: ۱۷

مصیبت میں پڑ گئے۔ اس کا متعین جواب یہ تھا کہ منحوس تم خود ہو، تمہارے اعمال کی شامت تمہارے گلے میں آ رہی ہے۔ مگر ان رسولوں نے اس بات کو ایسے مجمل الفاظ میں ادا کیا، جس میں ان کو کسی منحوس ہونے کی تصریح نہیں فرمائی، بل کہ یہ فرمایا: ﴿طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ﴾ یعنی تمہاری بدفالی تمہارے ساتھ ہے۔

اور پھر دی مشفقانہ خطاب کیا، ﴿اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ﴾ یعنی تم یہ تو سوچو کہ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟

ہم نے تو صرف تمہیں خیر خواہانہ نصیحت کی ہے، بس سب سے بھاری جملہ جو بولا تو یہ کہ ﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ﴾[1] "یعنی تم لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہو" بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہو۔

یہ تو ان رسولوں کا مکالمہ تھا۔ اب وہ مکالمہ دیکھیے جو ان رسولوں کی دعوت پر ایمان لانے والے نومسلم حبیب نجار نے کیا۔ اس نے پہلے تو اپنی قوم کو دو باتیں بتا کر رسولوں کی بات ماننے کی دعوت دی:

اوّل یہ کہ ذرا یہ تو سوچو کہ یہ لوگ دور سے چل کر تمہیں نصیحت کرنے آئے ہیں، سفر کی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم سے کچھ مانگتے نہیں، یہ بات خود انسان کو غور کی دعوت دیتی ہے کہ بے غرض لوگ ہیں ان کی بات میں غور تو کر لیں۔

دوسرے یہ کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں وہ سراسر عقل و انصاف اور ہدایت کی بات ہے۔ اس کے بعد قوم کو ان کی غلطی اور گمراہی پر متنبہ کرنا تھا کہ اپنے پیدا کرنے والے قادرِ مطلق کو چھوڑ کر تم لوگ خود تراشیدہ بتوں کو اپنا حاجت روا سمجھ بیٹھے ہو، جب کہ ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ خود تمہارا کوئی کام بنا سکتے ہیں اور نہ اللہ کے یہاں ان کا کوئی مقام اور درجہ ہے کہ اس سے سفارش کر کے تمہارا کام کرا دیں۔

مگر حبیب نجار نے یہ ساری باتیں ان کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنی

[1] یٰسٓ: ۱۹

طرف منسوب کرنے کا عنوان اختیار کیا کہ میں ایسا کروں تو بڑی گمراہی کی بات ہوگی، ﴿وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي﴾[1] یہ سب اس لیے کہ مخالف کو اشتعال نہ ہو، بات میں ٹھنڈے دل سے غور کرے۔

پھر جب اس کی قوم نے اس شفقت و رحمت کا بھی کچھ اثر نہ لیا، اور ان کو قتل کرنے کے لیے ان کے درپے ہوئے تو اس وقت بھی ان کی زبان پر کوئی بددعا کا کلمہ نہ آیا، بل کہ یہی کہتے ہوئے جان دے دی کہ ”رَبِّ اهْدِ قَوْمِي“ یعنی میرے پروردگار! میری قوم کو ہدایت فرمادے۔

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ قوم کے اس ظلم وستم سے شہید ہونے والے کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام واکرام اور جنت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہوا تو اس وقت بھی اپنی یہی ظالم قوم یاد آئی اور اس کی خیر خواہی وہمدردی سے یہ تمنا کی کہ کاش! میری قوم میرے حالات انعام واکرام سے واقف ہوجاتی تو شاید وہ بھی اپنی گمراہی سے باز آکر ان نعمتوں کی شریک بن جاتی۔

سبحان اللہ! خلق اللہ کی خیر خواہی ان کے مظالم کے باوجود کس طرح ان حضرات کی رگ وپے میں پیوست ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے قوموں کی کایا پلٹی ہے، کفر وضلالت سے نکال کر وہ مقام بخشا ہے کہ فرشتے بھی ان پر رشک کرتے ہیں۔

آج کل کے (بعض) مبلغین اور دعوت واصلاح کی خدمت انجام دینے والوں نے عموماً اس پیغمبرانہ اسوہ کو چھوڑ دیا ہے، اسی لیے ان کی دعوت وتبلیغ بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔ تقریر وخطاب میں غصہ کا اظہار...... مخالف پر فقرے چست کرنا...... بڑا کمال سمجھا جاتا ہے، جو مخالف کو اور زیادہ ضد وعناد کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

”اللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مُتَّبِعِيْنَ لِسُنَنِ أَنْبِيَائِكَ وَوَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضَاهُ.“[2]

[1] یٰس: ۲۲ [2] معارف القرآن: ۷/ ۳۷۷ تا ۳۷۹

پیغمبرانہ شفقت کی عجیب مثال

اسی طرح مفتی اعظم پاکستان رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى سورۂ یوسف کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ دو قیدی جو یوسف عَلَيْهِ السَّلَامُ کے ساتھ جیل میں گئے تھے، ایک روز انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں نیک صالح بزرگ معلوم ہوتے ہیں، اس لیے آپ سے ہم اپنے خواب کی تعبیر دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

بہر حال ان میں سے ایک یعنی شاہی ساقی نے تو یہ کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں انگور سے شراب نکال رہا ہوں۔ اور دوسرے یعنی باورچی نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیوں کا کوئی ٹوکرا ہے، اس میں سے جانور نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، اور درخواست کی کہ ہمیں ان دونوں خوابوں کی تعبیر بتلایئے۔

حضرت یوسف عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ سے خوابوں کی تعبیر دریافت کی جاتی ہے، مگر وہ پیغمبرانہ انداز پر اس سوال کے جواب سے پہلے تبلیغ ودعوت ایمان کا کام شروع فرماتے ہیں، اور اصول دعوت کے ماتحت حکمت ودانش مندی سے کام لے کر سب سے پہلے ان لوگوں کے قلوب میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لیے اپنے اس معجزے کا ذکر کیا کہ تمہارے لیے جو کھانا تمہارے گھروں سے یا کسی دوسری جگہ سے آتا ہے اس کے آنے سے پہلے ہی میں بتلا دیتا ہوں کہ کس قسم کا کھانا اور کیسا اور کتنا اور کس وقت آئے گا۔ اور وہ ٹھیک اسی طرح نکلتا ہے ﴿ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي﴾[1] اور یہ کوئی رمل، جفر کا فن یا کہانت وغیرہ کا شعبدہ نہیں، بل کہ میرا رب بذریعہ وحی مجھے بتلا دیتا ہے، میں اس کی اطلاع دیتا ہوں۔ اور یہ ایک کھلا معجزہ تھا جو دلیل نبوت اور اعتماد کا بہت بڑا سبب ہے۔

اس کے بعد اول کفر کی برائی اور ملت کفر سے اپنی بے زاری بیان کی، اور پھر یہ

[1] یوسف: ۳۷

بھی جتلا دیا کہ میں خاندان نبوت ہی کا ایک فرد اور ان ہی کی ملت حق کا پابند ہوں۔ میرے آباء و اجداد ابراہیم و اسحٰق و یعقوب (علیہم الصلوٰۃ والسلام) ہیں، یہ خاندانی شرافت بھی عادۃً انسان کا اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد بتلایا کہ ہمارے لیے کسی طرح جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو اس کی خدائی صفات میں شریک سمجھیں۔ پھر فرمایا کہ یہ دین حق کی توفیق ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے سلامت فہم عطا فرما کر قبول حق ہمارے لیے آسان کر دیا۔ مگر بہت سے لوگ اس نعمت کی قدر اور شکر نہیں کرتے۔

پھر ان ہی قیدیوں سے سوال کیا کہ اچھا تم ہی بتلاؤ کہ انسان بہت سے پروردگاروں کا پرستار ہو یہ بہتر ہے یا یہ کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کا بندہ بنے، جس کا قہر وقوت سب پر غالب ہے؟

پھر بت پرستی کی برائی ایک دوسرے طریقے سے یہ بتلائی کہ تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے کچھ بتوں کو اپنا پروردگار سمجھا ہوا ہے۔ یہ تو صرف نام ہی نام کے ہیں جو تم نے گھڑ لیے ہیں۔ نہ ان میں ذاتی صفات اس قابل ہیں کہ ان کو کسی ادنیٰ قوت وطاقت کا مالک سمجھا جائے؛ کیوں کہ وہ سب بے حس وحرکت ہیں، یہ بات تو آنکھوں سے مشاہدہ کی ہے۔

دوسرا راستہ ان کے معبود حق ہونے کا یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پرستش کے لیے احکام نازل فرمائے تو اگرچہ مشاہدہ اور ظاہر عقل ان کی خدائی کو تسلیم نہ کرتے، مگر حکم خداوندی کی وجہ سے ہم اپنے مشاہدہ کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرتے، مگر یہاں وہ بھی نہیں؛ کیوں کہ حق تعالیٰ نے ان کی عبادت کے لیے کوئی حجت ودلیل نازل نہیں فرمائی؛ بل کہ اس نے یہی بتلایا کہ حکم اور حکومت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا حق نہیں اور حکم یہ دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی وہ دین قیم ہے جو میرے آباء واجداد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا، مگر اکثر

لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی تبلیغ ودعوت کے بعد ان لوگوں کے خوابوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم میں سے ایک تو رہا ہو جائے گا اور پھر اپنی ملازمت پر بھی برقرار رہ کر بادشاہ کو شراب پلائے گا۔ اور دوسرے پر جرم ثابت ہو کر اس کو سولی دی جائے گی اور جانور اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگرچہ ان دونوں کے خواب الگ الگ تھے اور ہر ایک کی تعبیر متعین تھی اور یہ بھی متعین تھا کہ شاہی ساقی بری ہو کر اپنی ملازمت پر پھر فائز ہوگا، اور باورچی کو سولی دی جائے گی؛ مگر پیغمبرانہ شفقت ورافت کی وجہ سے متعین کر کے نہیں بتلایا کہ تم میں سے فلاں کو سولی دی جائے گی تاکہ وہ ابھی سے غم میں نہ گھلے؛ بل کہ اجمالی طور پر یوں فرمایا کہ تم میں سے ایک رہا ہو جائے گا، اور دوسرے کو سولی دی جائے گی۔[1]

آخر میں فرمایا کہ میں نے تمہارے خوابوں کی تعبیر جو دی ہے محض اٹکل اور تخمینہ سے نہیں؛ بل کہ یہ خدائی فیصلہ ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ جن حضرات مفسرین نے ان لوگوں کے خوابوں کو غلط اور بناوٹی کہا ہے انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خوابوں کی تعبیر بتلائی تو یہ دونوں بول اٹھے کہ ہم نے تو کوئی خواب دیکھا نہیں محض بات بنائی تھی۔ اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا ﴿قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ﴾[2] چاہے تم نے یہ خواب دیکھا یا نہیں دیکھا اب واقعہ یوں ہی ہوگا، جو بیان کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جھوٹا خواب بنانے کے گناہ کا جو ارتکاب تم نے کیا تھا اب اس کی سزا یہی ہے جو تعبیر خواب میں بیان ہوئی۔[3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۶۸۶، یوسف: ۴۰ [2] یوسف: ۴۱

[3] معارف القرآن: ۵/۶۸ تا ۷۰، یوسف: ۳۶ تا ۴۲

احکام ومسائل

آیاتِ مذکورہ سے، بہت سے احکام ومسائل اور فوائد وہدایات حاصل ہوتے ہیں، ان میں غور کیجیے:

پہلا مسئلہ: یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں بھیجے گئے جو مجرموں اور بدمعاشوں کی بستی ہوتی ہے؛ مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ بھی حسنِ اخلاق، حسنِ معاشرت کا وہ معاملہ کیا، جس سے یہ سب گرویدہ ہوگئے۔ جس سے معلوم ہوا کہ مصلحین (ائمہ کرام) کے لیے لازم ہے کہ مجرموں خطاکاروں سے شفقت وہمدردی کا معاملہ کرکے ان کو اپنے سے مانوس ومربوط کریں۔ کسی قدم پر منافرت کا اظہار نہ ہونے دیں۔ (ہم جس مسجد کے امام ہیں، اُس کے آس پاس رہنے والے لوگوں میں ایسے لوگ ہوں جو دین سے دور ہوں، برے کاموں میں مبتلا ہوں تو ان پر بھی شفقت ہمدردی کرتے ہوئے ان کو دین دار بنانے کی فکر کرنی چاہیے۔ راقم)

دوسرا مسئلہ: آیت کے جملے ﴿إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾[1] سے یہ معلوم ہوا کہ تعبیر خواب ایسے ہی لوگوں سے دریافت کرنا چاہیے جن کے نیک، صالح اور ہمدرد ہونے پر اعتماد ہو۔

تیسرا مسئلہ: یہ معلوم ہوا کہ حق کی دعوت دینے والوں اور اصلاحِ خلق کی خدمت کرنے والوں کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ پہلے اپنے حسنِ اخلاق اور علمی وعملی کمالات کے ذریعہ خلق اللہ پر اپنا اعتماد قائم کریں۔ خواہ اس میں ان کو کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی کرنا پڑے۔ جیسا حضرت یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر اپنا معجزہ بھی ذکر کیا اور اپنا خاندانِ نبوت کا ایک فرد ہونا بھی ظاہر کیا۔ یہ اظہارِ کمال اگر اصلاحِ خلق کی

[1] یوسف: ٣٦

نیت سے ہو اپنی ذاتی بڑائی ثابت کرنے کے لیے نہ ہو تو یہ وہ تزکیہ نفس نہیں جس کی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے، "فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ" یعنی اپنی پاک نفسی کا اظہار نہ کرو۔[1]

چوتھا مسئلہ: تبلیغ وارشاد کا ایک اہم اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ داعی اور مصلح کا فرض ہے کہ ہر وقت ہر حال میں اپنے وظیفۂ دعوت وتبلیغ کو سب کاموں سے مقدم رکھے۔ کوئی اس کے پاس کسی کام کے لیے آئے وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھولے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس یہ قیدی تعبیر خواب دریافت کرنے کے لیے آئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر خواب کے جواب سے پہلے دعوت وتبلیغ کے ذریعہ ان کو رشد وہدایت کا تحفہ عطا فرمایا۔ یہ نہ سمجھے کہ دعوت وتبلیغ کسی جلسہ، کسی منبر یا اسٹیج ہی پر ہوا کرتی ہے۔ شخصی ملاقاتوں...... اور نجی مذاکروں کے...... ذریعہ یہ کام اس سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ ہم ائمہ کرام کے پاس جو شخص ملنے آئے، چاہے وہ شخص کسی مقصد کے لیے بھی ہو یا ہماری مسجد میں رنگ کرنے والے لوگ آتے ہیں تعمیراتی کام کرنے والے لوگ آتے ہیں، ان سب کو بھی دین دار پانچ وقت کا نمازی بنانے کی کوشش کرنی چاہیے، مثلاً ان تعمیراتی کام کرنے والوں کو چائے پر بلا لیا، کچھ چائے وغیرہ بھی پلائی اور نماز پڑھنا بھی سکھا دیا، اور یہ عزم کروالیا کہ اب سے نماز نہیں چھوڑیں گے۔

دراصل یہ مزدور طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ نماز پڑھنا بہت مشکل ہے، کہتے ہیں ہم ناپاک ہیں ہمارے کپڑے ناپاک ہیں، ان کو سمجھا دیا جائے کہ نماز تو بہت آسان ہے، نماز پڑھنے میں یہ یہ فوائد حاصل ہوں گے، وغیرہ وغیرہ...... تو آپ یقین رکھیے کتنے بے دین لوگ دین دار بن جائیں۔

[1] تفسیر مظہری: ٥/١٦٣؛ یوسف: ٣٨

محلے میں کسی کا انتقال ہوا، اب لوگ امام صاحب کے پاس مسائل پوچھنے یا مسجد میں قرآن مجید کے پارے لینے آتے ہیں، ان کو بھی بٹھا کر کچھ اکرام کرکے ان کو دین دار بنانے کی فکر کی جائے، راقم۔

پانچواں مسئلہ: بھی اسی ارشاد و اصلاح سے متعلق ہے کہ حکمت کے ساتھ وہ بات کہی جائے جو مخاطب کے دل نشین ہوسکے۔ جیسا حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو یہ دکھلایا کہ مجھے جو کوئی کمال حاصل ہوا، وہ اس کا نتیجہ ہے کہ میں نے ملتِ کفر کو چھوڑ کر ملتِ اسلام کو اختیار کیا، اور پھر کفر و شرک کی خرابیاں دل نشین انداز میں بیان فرمائیں۔

چھٹا مسئلہ: اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو معاملہ مخاطب کے لیے تکلیف دہ اور ناگوار ہو اور اس کا اظہار ضروری ہو تو مخاطب کے سامنے جہاں تک ممکن ہو ایسے انداز سے ذکر کیا جائے کہ اس کو تکلیف کم سے کم پہنچے۔ جیسے تعبیر خواب میں ایک شخص کی ہلاکت متعین تھی، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کو مبہم رکھا۔ یہ متعین کرکے نہیں کہا کہ تم سولی چڑھائے جاؤ گے۔[1]

ساتواں مسئلہ: یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی کے لیے اس قیدی سے کہا کہ جب بادشاہ کے پاس جاؤ تو میرا بھی ذکر کرنا، کہ وہ بے قصور جیل میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی مصیبت سے خلاصی کے لیے کسی شخص کو کوشش کا واسطہ بنانا توکل کے خلاف نہیں۔

آٹھواں مسئلہ: یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کو اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے لیے ہر جائز کوشش بھی پسند نہیں، کہ کسی انسان کو اپنی خلاصی کا ذریعہ بنائیں۔ ان کے اور حق تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہونا ہی انبیاء کا اصلی مقام ہے۔ شاید اسی لیے یہ قیدی حضرت یوسف علیہ السلام کے اس کہنے کو بھول گیا اور ان کو مزید کئی سال جیل میں

[1] تفسیر ابن کثیر: ۶۸۶ یوسف: ۴۱

رہنا پڑا۔ ایک حدیث میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔[1]

یہ ہے پیغمبرانہ شفقت کی عجیب مثال، ہم وارثینِ انبیاء کو چاہیے کہ ہم بھی اس رحمت و شفقت کو اپنائیں۔

تاکہ حضرت یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق ہم بھی ہو جائیں، چناں چہ ان کا ارشاد ہے:

"اَلْعُلَمَاءُ أَرْحَمُ بِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأُمَّهَاتِهِمْ. قِيلَ لَهُ: وَكَيْفَ ذٰلِكَ؟
قَالَ: لِأَنَّ آبَاءَهُمْ وَأُمَّهَاتِهِمْ يَحْفَظُونَهُمْ مِنْ نَارِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْفَظُونَهُمْ مِنْ نَارِ الْآخِرَةِ."[2]

ترجمہ: "علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر ان کے باپوں اور ماؤں سے بھی زیادہ شفقت کرنے والے ہیں" ان سے پوچھا گیا کہ "وہ کیسے؟" فرمایا: "اس لیے کہ ان کے باپ اور مائیں تو ان کو دنیا کی آگ سے بچاتے ہیں اور علماء ان کو آخرت کی آگ سے بچاتے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا اصل کام شفقت و رحمت اور ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبے سے انسانوں کو دین اسلام کی طرف دعوت دینا ہے۔

حضرت سہیل بن عمرو نہایت پرجوش خطیب تھے، حالتِ کفر میں وہ اسلام کی مخالفت میں تقریر کیا کرتے تھے، ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "اِنْزِعْ ثَنِيَّتَيْهِ السُّفْلَيَيْنِ حَتّٰى يَدْلَعَ لِسَانُهُ فَلَا يَقُومُ عَلَيْكَ خَطِيبًا أَبَدًا" کہ "ان کے نیچے کے اگلے دو دانت تڑوا دیجیے کہ تقریر کرنے میں زبان نہ چلنے پائے۔" آپ نے فرمایا میں "مثلہ کرنا نہیں چاہتا، ممکن ہے کہ ان کی

[1] معارف القرآن: ۵/۷۰، ۷۱ [2] احیاء علوم الدین، العلم فضیلۃ التعلیم: ۱/۲۴

تقریر سے بھی اسلام کو فائدہ پہنچے۔"[1]

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارثین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے دلوں میں انسانوں کے لیے شفقت پیدا کریں۔ ہر انسان کی ہمدردی ان کے دل میں ہو۔

مسلمان کو دیکھتے ہی اس کو اسلام میں ترقی اور سچا پکا مسلمان بننے اور اسلام پھیلانے کی محنت کرنے والا بن جانے کی تمنا کرے، اور دعا کرے اور اس کے لیے کوشش کرے، کافر کو دیکھتے ہی سچے دل سے اس کو اسلام میں داخل کروانے کی محنت اور دعا کرے، یہی جذبہ ہمیں انبیاء علیہم السلام کی طرف سے ورثہ میں ملا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾[2]

ترجَمہ: "تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہیں گراں گزرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں، ایمان داروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔ پھر اگر روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ میرے لیے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہ بڑے عرش کا مالک ہے۔"

حضرت محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یہ سورۂ توبہ کی آخری آیتیں ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پوری خلق خدا پر خصوصاً مسلمانوں پر بے حد مہربان اور شفیق و ہمدرد ہونا بیان فرمایا ہے اور آخری

[1] البیان والتبیین للجاحظ: ۱/۱۹۰ [2] التوبۃ: ۱۲۸، ۱۲۹

آیت میں آپ کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ آپ کی ساری کوششوں کے باوجود اگر پھر بھی کچھ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ صبر کریں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں۔

سورۂ توبہ کے آخر میں یہ مضمون اس لیے لانا مناسب ہوا کہ اس پوری سورت میں کفار سے براءت قطع تعلق، قتال و جہاد کا ذکر تھا جو دعوت الی اللہ کی آخری صورت ہے، جب کہ زبانی دعوت و تبلیغ سے اصلاح کی توقع نہ رہے۔

لیکن اصل کام انبیاء علیہم السلام کا یہی ہے کہ شفقت و رحمت اور ہمدردی و خیر خواہی کے جذبے سے خلق خدا کو خدا کی طرف آنے کی دعوت دے دیں، اور ان کی طرف سے اعتراض یا کوئی تکلیف پیش آئے تو اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں اس پر توکل کریں کیوں کہ وہ رب العرش العظیم ہے۔ یہاں عرش عظیم کا رب کہہ کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ کل کائنات عالم پر محیط ہے۔

آخری دو آیتیں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کے مطابق قرآن کی آخری آیتیں ہیں، ان کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے۔[1]

یہ قرآن کریم کی دو آیتیں ہیں، جو پیغام دے رہی ہیں، اس پر ہمیں خوب اچھی طرح غور کرنا چاہیے، آیت مبارکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ نائب رسول...... وارث الانبیاء...... کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ان صفات سے متصف کرنے کی کوشش کرے، نائب رسول جب ہی کہلائے گا اور اصل کی صفات میں سے بھی ہر ہر صفت سے حصہ لے گا۔

ایک صفت ذکر فرمائی "حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ" لغت کے اندر جب کوئی شے اپنی حد سے نکل جائے تو اس کا نام بدل جاتا ہے، کسی چیز کی دل میں خواہش ہو تو اسے طلب کہا جائے گا، اگر طلب شدت اختیار کر جائے تو طمع اور طمع بھی شدت اختیار کر

[1] معارف القرآن: ۴/۴۹۵، ۴۹۶، التوبۃ: ۱۲۸، ۱۲۹

جائے تو حرص کہا جائے گا۔

نبی کے بارے میں فرمایا "حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ" وہ تمہاری ہدایت کے لیے حریص ہیں، ایک جگہ فرمایا ﴿اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰهُمْ﴾[1] ایک جگہ فرمایا ﴿وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾[2]

اسی طرح نائب نبی کو بھی چاہیے کہ اپنے دل میں لوگوں کی ہدایت کی حرص پیدا کرے، اور جس چیز کی دل میں حرص ہو آدمی اس کے لیے محنت کرتا ہے تو لوگوں کی ہدایت کے لیے محنت بھی کرے، ایک ایک مقتدی کو سمجھائیں اور ایک ایک مقتدی کو ہدایت کا ذریعہ بنائیں۔

بے دینی دیکھ کر روئیں، فکر کریں کہ اگر اس شخص کی اسی حالت میں موت آگئی تو اس کا کیا ہوگا؟

حضرت ابوعمران جونی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک راہب کے پاس سے گزر ہوا۔ آپ وہاں کھڑے ہوگئے۔ لوگوں نے راہب کو پکار کر کہا: یہ امیر المؤمنین ہیں۔ اس نے جھانک کر دیکھا تو اس پر تکالیف اٹھانے اور مجاہدہ کرنے اور ترک دنیا کے آثار نمایاں تھے۔ (یعنی مجاہدوں کی کثرت کی وجہ سے بہت خستہ حال اور کمزور ہو رہا تھا) اسے دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو دیے تو ان سے کسی نے کہا (آپ مت روئیں) یہ تو نصرانی ہے۔ (مسلمان نہیں ہے) تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ مجھے معلوم ہے، لیکن مجھے اس پر ترس آرہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آرہا ہے:

﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝﴾[3]

تَرجَمَہ: "(بہت سے لوگ) محنت کرنے والے تھکے ہوئے، گزریں گے دہکتی ہوئی آگ میں۔"

---

[1] النحل: ٣٧ [2] یوسف: ١٠٣ [3] الغاشیہ: ٣، ٤

یعنی کافر لوگ جو دنیا میں بڑی بڑی ریاضت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے دنیا کی مشقتیں اٹھانے کے باوجود دوزخ میں جائیں گے۔ مجھے اس بات پر ترس آیا کہ دنیا میں تھکا دینے والی محنت کر رہا ہے اور اتنے مجاہدے برداشت کر رہا ہے، لیکن مر کر پھر بھی دوزخ میں جائے گا۔[1]

ائمہ کرام خود دین کی دعوت دینے کا اہتمام فرمائیں

امام خود بھی داعی ہو اور اپنے مقتدیوں کو بھی داعی بنائے، اور دعوت کے لیے گھر کو چھوڑ کر باہر گاؤں، دیہاتوں میں جانا پڑے تو ضرور جائے، گھر میں بیٹھے رہنے کی عادت سفر سے مانع نہ بن جائے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا انتظار نہیں فرماتے تھے کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خود حاضر ہوں، بل کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے داعی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم لوگوں تک خود پہنچتے تھے اور حق کی دعوت دیتے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی لوگوں کے گھروں تک خود پہنچ جاتے تھے، اور کلمۂ حق کی دعوت پیش فرماتے تھے۔ مکہ معظمہ سے سفر کر کے طائف تشریف لے گئے اور وہاں عبد یالیل رئیسوں کے گھروں پر جا کر تبلیغ کا فرض ادا فرمایا۔ حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس تشریف لے جاتے اور ان کو حق کا پیغام پہنچاتے، اور ان کے ترش و تند جوابوں کی پروا نہ فرماتے تھے، آخر اسی تلاش میں یثرب کے وہ سعادت مند ملے جن کے ہاتھوں سے ایمان و اسلام کی دولت مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو منتقل ہوئی۔

امت کو دین پر لانے کا غم ...... اور جہنم سے بچانے کی فکر ...... نے ان کو لوگوں کے گھروں پر اور جھگیوں پر جانے کے لیے مجبور کیا۔ اسی طرح مالی اعتبار سے کمزور طبقے کو بھی انہوں نے دین پر لانے کی فکر فرمائی۔ تاریخ کے صفحات اس سے بھرے

---

[1] مستدرک للحاکم، التفسیر، تفسیر سورۃ الغاشیۃ: ٢/٦١٣، رقم: ٣٩٨٣

ہوئے ہیں کہ کس طرح انہوں نے سردیوں میں اور گرمیوں میں راحت و آرام کا خیال کیے بغیر لوگوں کے گھروں میں جا کر دین پہنچایا۔

بعض مساجد ایسی جگہ واقع ہوتی ہیں، جہاں کوئی ہسپتال...... اسکول...... کالج...... سفارت خانہ...... حکومت کا کوئی اہم دفتر...... واقع ہوتا ہے۔

ایسی مساجد کے ائمہ کرام کے لیے آخرت کے اجر و ثواب کمانے کا بہترین موقع ہوتا ہے۔ ائمہ کرام ان سے تعلق پیدا کر کے ان کو دین پر لانے کی فکر فرمائیں تو کئی گھرانوں میں دینی ماحول پیدا ہو سکتا ہے اور بہت جلد معاشرے میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ صرف جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں آتے ہیں، ان کے دفاتر میں جا کر اگر ان سے مل لیا جائے، ان سے تعلق پیدا کیا جائے، ان کو دین پر لانے کی کوشش کی جائے تو اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکامات زندہ ہو جائیں۔ اور گناہوں والی زندگی سے لوگ بچ جائیں۔

ہم ائمہ کی جماعت کو اس ذمہ داری کا احساس ہو جائے، اور ہم سنجیدگی سے اس معاملہ پر غور کریں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ بے دینی کا ماحول مغلوب ہو جائے گا اور دین داری غالب آتی جائے گی۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اعداءِ اسلام اپنے اپنے مراکز سے دن رات بے دینی پھیلانے کی محنت کرنے میں مصروف و مشغول ہوں۔ اور ہمارے مراکز یعنی مساجد صرف نمازوں کے وقت کھلیں، اور ان مراکز کے ذمہ دار حضرات ائمہ، علماء کرام اور قراء ان مراکز کو ۲۴ گھنٹے آباد کرنے کی فکر فرمائیں۔

اسی کو عرب کے ایک جید عالم شیخ صالح بن غانم السدلان اپنی کتاب "المسجد ودوره في التربية والتوجيه وعلاقته بالمؤسسات الدعوية في المجتمع" میں لکھتے ہیں۔

امام یہ بے قراری و بے چینی پیدا کرے کہ کم و بیش ڈھائی ہزار افراد پر مشتمل

میرے محلے کی آبادی ہے اور نمازی صرف ڈھائی سو ہیں، اتنے بے نمازیوں کو نمازی کس طرح بنائیں، رات کو رو رو کر اللہ تعالیٰ سے مانگے، دن کو لوگوں کے پیر پکڑ پکڑ کر ان کو مسجد میں لانے کی فکر کریں۔

حدیث کے امیر المؤمنین امام سفیان ثوری رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ فرماتے ہیں:

"وَاللّٰهِ لَوْ لَمْ يَأْتُوْنِيْ لَأَتَيْتُهُمْ فِيْ بُيُوْتِهِمْ"[1]

تَرْجَمَہ: "اللہ کی قسم! (یہ میرے مقتدی شاگرد) اگر میرے پاس حدیث سیکھنے نہ آتے تو میں (حدیث سکھانے کے واسطے) ان کے گھروں میں جاتا۔"

امام شافعی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ اپنے شاگرد ربیع کو فرماتے تھے:

"(يَا رَبِيْعُ) لَوْ قَدَرْتُ أَنْ أُطْعِمَكَ الْعِلْمَ لَأَطْعَمْتُكَ"[2]

تَرْجَمَہ: "اے ربیع! اگر میں اس بات کی طاقت رکھتا کہ علم کو کھانا بنا کر تمہیں کھلا دوں تو اس علم کو (حلوہ بنا کر) تمہیں کھلا دیتا۔"

ایسی طلب جب امام کے اندر ہوگی تو مقتدیوں کو ضرور فائدہ ہوگا، امام اپنے اندر اب غم اور فکر پیدا کرے کہ اس کے آس پاس رہنے والے سب گھروں کے اندر دین داری پیدا ہو جائے، ہر مقتدی دین سیکھنے اور سکھانے والا ہو، لیکن یہ تب ہوگا جب ہم ائمہ مساجد خود ان میں سے ایک ایک کے پاس جا کر دین سکھائیں، اور یہی انبیاء عَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ کا مبارک طریقہ ہے، اسی کے بارے میں شیخ صالح بن غانم السدلان اپنی کتاب "المسجد ودوره في التربية والتوجيه وعلاقته بالمؤسسات الدعوية في المجتمع" میں تحریر فرماتے ہیں:

يَجِبُ أَنْ يَعْلَمَ الدُّعَاةُ إِلَى اللهِ أَنَّ النَّاسَ لَا يَأْتُوْنَ إِلَيْهِمْ بَلْ أَنْ

[1] كتاب العلم لابن عبد البر: ۱۲۲/۱

[2] حلية الأولياء، ذكر تابعي التابعين: ۱۳۶/۹، رقم: ۱۳۳٤۱

منهج رسل الله جميعًا صلوات الله وسلامه عليهم في إبلاغ الدعوة هو الذهاب إلى من يريدون هدايتهم إلى الحق يدقون أبوابهم ويوقظونهم من سباتهم.

ولنا في رسول الله صلى الله عليه وسلم أسوة حسنة فقد لبث عشر سنين يتتبع حجاج في منازلهم في المواسم ويغبر قدميه الشريفتين في التردد على أسواق العرب الموسمية وأماكن تجمعاتهم في سبيل إيصال كلمة الحق وإبلاغ دعوة الله تعالى.

وكان رسل الله الكرام في جميع الأزمنة والأمكنة يبلغون الدعوة إلى الناس بالحركة المستمرة والتشمير الدائم وليس بالجلوس في البيوت أو في المساجد والزوايا وبهذا إنتشرت الدعوة الإسلامية في أرجاء الدنيا بالتحرك المتواصل حتى رويت الأرض بقطرات عرق جبينهم ورويت القلوب المتعطشة بدعوتهم المباركة.

وكان الصحابة رضي الله تعالى عنهم مثالا يحتذى في إيصال كلمة الحق وبذل الجهد قدر المستطاع دون توفير وقت أو خوف على متاع الدنيا وزخرفها.

فعلى الدعاة خاصة بأئمة المساجد (من الحجاج) أن يتحركوا بسرعة ويوسعوا دائرة تحركهم شيئًا فشيئًا واضعين في إعتبارهم أساسًا هامًا وركيزة ركينة هي التعدد والتنوع والإمتداد والتوسع فلا تقصر الدعوة على المساجد والتجمعات الإسلامية بل ينبغي أن تنطلق من المسجد إلى الأندية الرياضية والثقافية والمعسكرات والمخيمات وأماكن العمل والسواقي والمزارع

وغيرها من الأماكن التي تعود الناس الإجتماع.

وهناك حقيقة هامة في هذا المجال هي: أن القاعدة العريضة من أفراد الشعوب في العالم الإسلامي عمال وأصحاب حرف وهم من الكثرة بمكان فإذا أعطى هؤلاء العمال حظهم من العناية والرعاية والتوجيه الإسلامي فإنهم مكسب كبير للإسلام ورصيد هائل للعامل الإسلامي لا ينبغي للدعاة أن يفرطوا فيه بحال.

إن إمام المسجد يستطيع أن يغشى هذه الأماكن وأن يقوم بجهود طيبة مع العمال فيحببهم في الدين والتدين ويفقههم ويرشد هم إلى قيم الإسلام وأخلاقه وآدابه عن طريق المحاضرات والندوات وغيرها ويعرفهم بحقوقهم وواجباتهم من جهة نظر إسلامية ويبصر هم بواجباتهم نحو أوطانهم والعالم الإسلامي كله ويحثهم على إتقان العمل ووفرة الإنتاج لتحقيق الإكتفاء الذاتي من الإنتاج وتحقيق القدرة على وجود فائض للتصدير والمنافسة وتنمية الإقتصاد الإسلامي وفقًا لشريعة الإسلام ومصالح المسلمين ..... الخ.[1]

اگر ہم چاہتے ہیں دین دنیا بھر میں زندہ ہوجائے، ہر شعبہ اور ہر ملک کے رہنے والے دین دار بن جائیں، سارے مردوں وعورتوں، جاہلوں، پڑھے لکھوں، شہروں اور دیہاتوں میں دین عام ہو جائے تو ہمیں خود بھی داعی بننا ہوگا، اور ہر مسلمان چاہے مرد ہو یا عورت ان کو بھی داعی بنانا ہوگا۔

لہٰذا ائمہ حضرات دین کی دعوت دینے کا اہتمام فرمائیں نماز پڑھا کر گھر میں بیٹھ جانا اور لوگوں کے ساتھ نمازوں کی حد تک تعلق رکھنا، یہ صرف نامناسب ہی نہیں

[1] المسجد ودوره في التربية والتوجيه وعلاقته بالمؤسسات الدعوية في المجتمع ٩٠ تا ٩٢

نل کہ منصب نبوت کے بھی خلاف ہے اور طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو عیب قرار دیا ہے۔ جیسا کہ طبقات ابن سعد میں روایت ہے:

وَلِذٰلِكَ كَانَ الصَّحَابَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ يُنْكِرُوْنَ أَشَدَّ الْإِنْكَارِ عَلٰى مُؤْمِنٍ يَتَوَارٰى فِيْ بَيْتِهٖ وَقَالَ طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ إِنَّ أَقَلَّ الْعَيْبِ عَلَى الْمَرْءِ أَنْ يَّجْلِسَ فِيْ دَارِهٖ.[1]

يَقُوْلُ الْغَزَالِيُّ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ: "اِعْلَمْ أَنَّ كُلَّ قَاعِدٍ فِيْ بَيْتِهٖ أَيْنَمَا كَانَ فَلَيْسَ خَالِيًا فِيْ هٰذَا الزَّمَانِ عَنْ مُنْكَرٍ، مِنْ حَيْثُ التَّقَاعُدِ عَنْ إِرْشَادِ النَّاسِ وَتَعْلِيْمِهِمْ وَحَمْلِهِمْ عَلَى الْمَعْرُوْفِ فَأَكْثَرُ النَّاسِ جَاهِلُوْنَ بِالشَّرْعِ فِيْ شُرُوْطِ الصَّلَاةِ فِي الْبِلَادِ، فَكَيْفَ فِي الْقُرٰى وَالْبَوَادِيْ وَمِنْهُمُ الْأَعْرَابُ وَالْأَكْرَادُ وَالتُّرْكُمَانِيَّةُ وَسَائِرُ أَصْنَافِ الْخَلْقِ".[2]

اَلدَّاعِيَةُ رَحَّالَةٌ كَانَ الدُّعَاةُ إِلَى اللّٰهِ يَسِيْحُوْنَ لِنَشْرِ الدَّعْوَةِ وَتَبْلِيْغِهَا، وَيُنَادُوْنَ النَّاسَ بِالْكَلَامِ وَيَحْتَكُّوْنَ بِهِمْ اِحْتِكَاكًا هَادِفًا، وَلَا يَنْتَظِرُوْنَ مَجِيْءَ النَّاسِ لَهُمْ لِيَسْأَلُوْهُمْ هٰكَذَا كَانَ شَأْنُ الدُّعَاةِ دَوْمًا.

أَلَا تَرٰى أَنَّ الْأَعْرَابِيَّ يَقُوْلُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "يَا مُحَمَّدُ أَتَانَا رَسُوْلُكَ فَزَعَمَ لَنَا أَنَّكَ تَزْعَمُ أَنَّ اللّٰهَ أَرْسَلَكَ؟"[3]

أَتَاهُمْ رَسُوْلُهٗ دَاعِيًا وَكَذٰلِكَ النَّاسُ تُؤْتٰى وَمَنِ انْتَظَرَ أَنْ يَّأْتِيَهُ النَّاسُ فَلَيْسَ بِدَاعِيَةٍ.

لَا بُدَّ مِنْ تَحَرُّكٍ وَمُبَادَأَةٍ وَغُدُوٍّ وَرَوَاحٍ وَتَكَلُّمٍ وَزَعْمٍ، لَيْسَ

[1] طبقات ابن سعد، طبقات البدريين من المهاجرين: ۲/۱۹۸، رقم: ۴۷
[2] علو الهمة: ۲٦٤　　[3] مسلم، الايمان، باب السؤال عن اركان الاسلام، رقم: ۱۲

الْقُعُوْدُ وَالتَّمَنِّيْ مِنَ الطُّرُقِ الْمُوْصِلَةِ فَاقْفُهْ سِيْرَةَ سَلَفِكَ وَقَلِّدْهُمْ تَصِلْ، وَإِلَّا، فَرَاوِحْ فِيْ مَكَانِكَ فَإِنَّكَ لَنْ تَبْرَحَهٗ......[1]

نَحْنُ فِيْ ذِي الْحَيَاةِ رَكْبٌ سِفَارٌ ❁ يَصِلُ اللَّاحِقِيْنَ بِالْمَاضِيْنَا
قَدْهَدَانَا السَّبِيْلَ مَنْ سَبَقُوْنَا ❁ وَعَلَيْنَا هِدَايَةُ الْآتِيْنَا

نَعَمْ تَبِعُوْا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ حَتّٰى أَوْصَلُوْا عَقِيْدَةَ التَّوْحِيْدِ لَنَا، وَرَبَّوْنَا، وَهَذَّبُوْنَا وَانْتَشَلُوْنَا، مِنْ مَخَاطِرَ مُتَلَفَّةٍ وَعَلَيْنَا أَنْ نَكُوْنَ أَوْفٰى لَهُمْ نَنْقُدُ عَهْدَنَا حِيْنَ أَخَذُوْا عَلَيْنَا مِثْلَ الَّذِيْ عَمِلُوْا.[2]

تَرجَمہ: "اسی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسے مؤمن کو بڑی سختی سے منع کرتے تھے، جو اپنے گھر میں چھپ کر بیٹھتا تھا، اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بندہ میں کم سے کم عیب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں جا کر بیٹھ جائے (یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے، اس کو ہم عیب شمار کرتے ہیں)۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جان لو کہ اس زمانے میں آدمی کا گھر میں بیٹھ جانا، چاہے کوئی بھی ہو گناہ سے خالی نہیں ہے، جب کہ اس کا بیٹھنا لوگوں کو دین نہ سکھانے، راست روی کی طرف راہنمائی نہ کرنے اور ان کو بھلائی پر آمادہ نہ کرنے کی وجہ سے ہو، حالاں کہ شہروں میں اکثر لوگوں کا دین سے ناواقفیت کا یہ حال ہے کہ ان کو نماز کی شرائط تک کا علم نہیں تو پھر گاؤں اور دیہات کے لوگوں کا کیا حال ہوگا کہ جن میں کچھ تو بدوی ہیں، بعض کردی (عراق و ایران میں بسنے والی قوم) اور بعض ترکمانی (ترکی قوم) اور تمام قسم کے لوگ ہیں۔

(لہٰذا ہر حال میں دین کی دعوت دینی چاہیے) اور اللہ کی طرف دعوت دینے

[1] علو الهمة: ۲٦۸، ۲٦۹　　[2] المثاني لعزام: ۱۹۹، علو الهمة: ۲٦٤
[3] صلاح الأمة: ۲/۸۵

والے تو کثیر الاسفار ہوا کرتے ہیں جو اللہ کے دین کی نشر و اشاعت اور دعوت و تبلیغ ہی کے لیے سیاحت اور سفر کرتے ہیں، لوگوں سے گفتگو کرنے میں پہل کرتے ہیں اور ان کی طرف چھوٹے اور تیز قدموں سے چلتے ہیں، چناں چہ وہ اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ لوگ خود ان کے پاس (دین سیکھنے اور مسائل) پوچھنے آئیں اور داعیین کا ہمیشہ یہی طریقہ کار رہا ہے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک بدوی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "اے محمد! (ﷺ) ہمارے پاس آپ کا قاصد آیا تھا، جو ہمیں یہ باور کرا رہا تھا کہ آپ (ﷺ) کا یہ خیال ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے" (یعنی آپ اللہ کے رسول ہیں)۔

تو اسی طرح دین کی دعوت دینے کے لیے لوگ دوسروں کے پاس جایا کرتے تھے جس طرح یہ قاصد بدوی کے پاس گیا، اور جس نے لوگوں کے آنے کا انتظار کیا کہ لوگ خود چل کر اس کے پاس دین سیکھنے آئیں تو وہ داعی کامل نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کے دین پھیلانے کے لیے نقل و حرکت، آمد و رفت اور اس بارے میں لوگوں سے میل جول اور بات چیت ہو چناں چہ صرف تنہائی میں جا کر بیٹھنا اور یہ آرزو کرنا کہ ہر جگہ دین پھیل جائے، کامیابی تک پہنچانے والا راستہ نہیں ہے، سوائے بزرگوں کے طریقہ کار کو سمجھ لو اور ان کی پیروی کرو تو صحیح راستے تک پہنچ جاؤ گے۔

(ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے) کہ "ہم اس دنیا کی زندگی میں سوار مسافر ہیں اور ملنے والے ہمارے گزشتہ لوگوں سے ملتے ہیں، ہمارے اگلوں نے ہماری سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کی اور ہم پر اپنے پچھلوں کی راہنمائی لازم ہے۔"

جی ہاں ان حضرات رحمہم اللہ تعالیٰ نے حرکت کی یہاں تک کہ ہمیں توحید کا عقیدہ پہنچایا، ہماری تربیت کی، ہمیں تہذیب سکھائی اور ہمیں لپٹے ہوئے خیالات و

تصورات سے بڑی عجلت کے ساتھ نکال باہر کیا، اب ہم پر بھی لازم ہے کہ اس عہد کو پورا کریں جو انہوں نے ہم سے لیا تھا کہ ہم بھی ان کی طرح عمل کریں گے۔"

امام لوگوں میں سیکھنے کا جذبہ پیدا کرے

امام کو چاہیے کہ وہ لوگوں میں دین سیکھنے کا جذبہ اور حرص پیدا کرے اور ایسا جذبہ اور حرص پیدا کرے جیسے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن میں ہوتا تھا۔

چناں چہ اسی بارے میں صاحب صلاح الامۃ فرماتے ہیں:

وَكَانَ مِنْ شِدَّةِ حِرْصِهِمْ عَلَى تَلَقِّي الْعِلْمِ أَنَّهُ إِذَا تَغَيَّبَ أَحَدُهُمْ لِظَرْفٍ عَنْ دَرْسِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُ صَاحِبَهٗ عَنْ خَبَرِ ذٰلِكَ الْمَجْلِسِ كَمَا كَانَ يَفْعَلُهٗ عُمَرُ مَعَ جَارِهِ الْأَنْصَارِيِّ.

وَلَقَدْ شَمِلَتْ هِمَّةُ طَلَبِ الْعِلْمِ وَتَحْصِيْلُهٗ جَمِيْعَ أَفْرَادِ الْمُجْتَمَعِ تَقْرِيْبًا كَمَا جَاءَ فِي الْحَدِيْثِ "كَانَتِ الْوُفُوْدُ تَأْتِيْ مِنْ أَقْصَى الْجَزِيْرَةِ الْعَرَبِيَّةِ لِتَأْخُذَ الْعِلْمَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا حَدَثَ لِوَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ وَغَيْرِهِمْ."

وَلَمْ يَقْتَصِرِ الْأَمْرُ عَلَى الرِّجَالِ بَلِ النِّسَاءُ اهْتَمَمْنَ بِالْعِلْمِ غَايَةَ الْاِهْتِمَامِ فَعَلَى الرَّغْمِ مِنْ حُضُوْرِهِنَّ مَجَالِسَ الْعِلْمِ، كَمَا ذَكَرْنَا سَابِقًا، وَتَخْصِيْصِ الرَّسُوْلِ لَهُنَّ وَقْتًا فَقَدْ كَانَ بَعْضُ النِّسْوَةِ يَذْهَبْنَ إِلٰى بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَسْأَلْنَهٗ وَيَسْأَلْنَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا حَتّٰى قَالَتْ: "نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ لَمْ يَمْنَعْهُنَّ الْحَيَاءُ مِنْ أَنْ يَتَفَقَّهْنَ فِي الدِّيْنِ."

ترجمہ: "حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم علم دین حاصل کرنے میں

اتنے حریص ہوا کرتے تھے کہ اگر ان میں سے کوئی کسی ضروری کام کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کے درس سے غیر حاضر ہوتا تو وہ بعد میں اپنے ساتھی سے اس درس کے متعلق پوچھتا (کہ رسول اللہ ﷺ نے کل کیا ارشاد فرمایا تھا) جیسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے انصاری پڑوسی سے پوچھ لیا کرتے تھے۔

اور اس علم دین کی طلب کرنے اور حاصل کرنے میں سارے لوگ شامل تھے جیسا احادیث میں آتا ہے کہ عرب کے دور دراز جزیروں سے علم دین حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں وفود آیا کرتے تھے اور آپ ﷺ سے دین سیکھتے تھے۔

چناں چہ یہ علم دین حاصل کرنا صرف مرد حضرات تک منحصر نہیں تھا، بل کہ عورتیں بھی علم دین حاصل کرنے کا انتہائی اہتمام کیا کرتی تھیں، باوجود اس کے کہ وہ علمی مجالس میں حاضر نہیں ہوسکتی تھیں۔ چناں چہ آپ ﷺ نے ان کے لیے ایک وقت متعین فرمایا تھا، جس میں وہ خواتین دین سیکھتی تھیں اور بعض صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن ایسی بھی تھیں کہ وہ حضور ﷺ کے گھر جاتی تھیں، آپ ﷺ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دین کے متعلق پوچھا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ: ''کیا ہی نیک ہیں انصار کی عورتیں کہ ان کو دین سیکھنے میں حیا مانع نہیں ہوتی۔''

لہٰذا ائمہ کرام کو چاہیے کہ اسی طرح لوگوں میں دین سیکھنے کا جذبہ پیدا کریں جیسے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں دین سیکھنے کا جذبہ تھا۔

ائمہ کرام ہر آنے والے کو دین کی دعوت دیں

ہر آنے والے مہمان کا میزبان پر حق ہوتا ہے۔ آپ کے پاس جو بھی مہمان

آئے اس کا ظاہری اکرام بھی کیجیے جو کچھ ہو سکے جتنا کچھ ہو سکے اس کی خاطر مدارت کیجیے۔ عربی کا ایک جملہ ہے:

"مَنْ زَارَ أَحَدًا وَلَمْ يَذُقْ عِنْدَهُ شَيْئًا فَكَأَنَّمَا زَارَ مَيِّتًا"

ترجمہ: ''جو شخص کسی سے ملاقات کے لیے گیا اور اس کے پاس کچھ کھایا پیا نہیں تو گویا ایسا ہے کہ کسی میت کی زیارت کے لیے گیا۔''

لہٰذا کم از کم ٹھنڈے پانی سے، مسکراتے ہوئے چہرے سے یا تکیہ پیش کرنے سے اس کے دل میں سرور پیدا کیجیے اور اس کا اکرام کیجیے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس مہمان کا جو بڑا حق بنتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو دین کی دعوت دیجیے۔ نماز کا وقت ہو جائے تو اپنے ساتھ مسجد لے جائیں، باجماعت نماز پڑھنے کے فضائل سنائیں اور بغیر کسی عذر شرعی کے نماز نہ پڑھنے پر یا گھر میں پڑھنے پر وعیدیں سنائیں بغیر اس سے کسی دنیاوی نفع لینے کے، محض اس نیت سے کہ اس کی آخرت بن جائے اس کے گھر والوں اور خاندان کی آخرت بن جائے اور اس کے ذریعے سے ہزاروں لوگوں کی آخرت بن جائے۔ اس جذبے سے جب دعوت دی جائے گی تو ضرور اس کا اثر ہوگا اور پھر اس دعوت کے بعد جس کو دعوت دی گئی ہے اس کے لیے دعا بھی ہوگی تو ان شاء اللہ العزیز ضرور بالضرور آپ کے نامۂ اعمال میں ہزاروں لوگوں کے اعمال درج ہوں گے اور ہماری موت کے بعد کئی لوگ ہمارے لیے صدقہ جاریہ ہوں گے۔ موقع مناسبت دیکھتے ہوئے مثبت انداز میں دعا مانگ کر ضرور دعوت دیں۔

ہمارا تو مقصد ہی یہ ہونا چاہیے کہ جس قدر ہمیں دنیا میں محات وساعات ملے ہیں وہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے صرف ہو جائیں، اسی کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"يَكُوْنُ الْغَرَضُ الْوَحِيْدُ مِنَ الْمُتَخَرِّجِيْنَ فِي الْمَدَارِسِ

النَّاجِحِیْنَ فِیْ عُلُوْمِهَا أَنْ یَّكُوْنُوْا صَالِحِیْنَ فِیْ أَنْفُسِهِمْ وَأَخْلَاقِهِمْ وَآدَابِهِمْ، مُصْلِحِیْنَ لِغَیْرِهِمْ، رَاشِدِیْنَ مُرْشِدِیْنَ، مُهْتَمِّیْنَ بِتَرْبِیَةِ الْأُمَّةِ."[1]

تَرْجَمَہ: "حاملین قرآن وحدیث کی ایک ہی غرض ہونی چاہیے وہ یہ کہ خود بھی نیک ہوں اور اپنے اچھے اخلاق وآداب کے ذریعے سے دوسرے لوگوں کی بھی اصلاح کرنے والے ہوں اور امت کو دینی تربیت اور دین کی طرف لانے میں راہنمائی کرنے والے ہوں۔"

دعوت دیتے ہوئے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر اس بھائی کی ہدایت کے لیے اور اس کے ذریعے سے لوگوں کے دین پر آنے کے لیے دعا کرتا رہے۔ ہمارے اکابر رَحِمَہُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی کو کس طرح دعوت کی لگن اور امت کی فکر تھی، اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے ہزاروں لوگوں کو ہدایت نصیب فرمائی۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی لکھتے ہیں۔

"حضرت والد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی عملی زندگی کے بیشتر شعبے دین کی دعوت وتبلیغ اور نشر واشاعت ہی سے متعلق تھے، جس میں عوام وخواص دونوں کو تبلیغ حق کے کام شامل تھے اور تبلیغ ودعوت کے اصولوں کے بارے میں آپ کا ایک سوچا سمجھا نظریہ تھا جسے آپ اکثر اہل علم کی مجلسوں میں بیان فرمایا کرتے تھے۔

اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعوت وتذکیر کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اس سے فائدہ ضرور پہنچتا ہے، چناں چہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾[2]

تَرْجَمَہ: "اور آپ نصیحت کیجیے، اس لیے کہ نصیحت مسلمانوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔"

---

[1] وجوب التعاون بین المسلمین: ۲۰۰/۱ [2] الذّٰریٰت: ۵۵

لیکن اگر ہم لوگوں کو اپنی دعوت وتبلیغ کا کوئی کام بے اثر یا غیر مفید معلوم ہوتا ہے تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہم نے دعوت کے پیغمبرانہ اسلوب کو چھوڑ دیا ہے۔ دعوت درحقیقت انبیاء عَلَیْہِمُ السَّلَام کا کام ہے اور جب تک اسے ان ہی طریقوں کے مطابق انجام نہیں دیا جائے گا جس طرح انبیاء عَلَیْہِمُ السَّلَام نے انجام دیا، اس وقت تک مؤثر نہیں ہوسکتا۔"[1]

گھر والوں کو نماز پڑھوانے کی فکر

ائمہ کرام اپنے رشتہ دار، بیوی بچے، بہن، بھائی پڑوسی اور دیگر متعلقین کو نماز کا عادی بنانے کی فکر کریں، کوشش کریں، اس کے متعلق بات کریں اور ترغیب دیں۔ اسلام نے پوری امت کی ذمہ داری حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے بعد، علماء کرام اور پھر ہر امتی پر ڈالی ہے۔ خود آں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا﴾[2]

تَرْجَمَہ: "اپنے اہل کو نماز کا حکم دیجیے اور خود اس پر جمے رہیے۔"

اسی طرح ارشاد ربانی ہے:

﴿یٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾[3]

تَرْجَمَہ: "اے ایمان والو! خود کو اور اپنے متعلقین کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔"

اس لیے ائمہ کرام ہر مسلمان کو اس ذمہ داری کا احساس دلائیں کہ جب آپ فجر کی نماز کے لیے اٹھتے ہیں یا کسی دوسری نماز کے لیے مسجد کی طرف چلتے ہیں تو گھر میں ضرور اپنی بیوی، بہن اور والدہ کو فجر کی نماز کے لیے اٹھا کر چلیں اور بھائیوں اور بیٹوں کو تو اپنے ساتھ لے جائیں کیوں کہ آپ کا ذمہ صرف خود نماز پڑھنے سے فارغ

---

[1] میرے والد میرے شیخ ان کا مزاج و مذاق: ۱۰۴

[2] طٰہٰ: ۱۳۲ [3] التحریم: ۶

نہیں ہوگا بل کہ روزِ محشر آپ سے اپنی رعیت اور ماتحتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ۔"[1]

ترجمہ: "تم میں ہر ایک نگہبان (اور محافظ ہے) اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔"

اللہ تعالیٰ پوری امت کو خاص طور سے ہم کو اس ذمہ داری کے احساس کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اس زمانے میں دعوت واصلاح کا کام پوری طرح مؤثر نہ ہونے کے دو سبب ہیں۔

ایک تو یہ کہ فسادِ زمانہ اور حرام چیزوں کی کثرت کے سبب عام طور پر لوگوں کے قلوب سخت اور آخرت سے غافل ہوگئے ہیں اور قبولِ حق کی توفیق کم ہوگئی ہے اور بعض تو اس قہر میں مبتلا ہیں جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی تھی کہ آخر زمانے میں بہت سے لوگوں کے قلوب اوندھے ہوجائیں گے، بھلے برے کی پہچان اور جائز و ناجائز کا امتیاز ان کے دل سے اٹھ جائے گا۔

اور دوسرا سبب یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوتِ حق کے فرائض سے غفلت عام ہوگئی ہے، عوام کا تو کیا ذکر خواص علماء وصلحاء میں اس ضرورت کا احساس بہت کم ہے، یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اپنے اعمال درست کر لیے جائیں تو یہ کافی ہے خواہ ان کی اولاد...... بیوی...... بھائی...... دوست...... احباب...... کیسے ہی گناہوں میں مبتلا رہیں ان کی اصلاح کی فکر گویا ان کے ذمہ ہی نہیں، حالاں کہ قرآن وحدیث کی نصوصِ صریحہ ہر شخص کے ذمہ اپنے اہل وعیال اور متعلقین کی

[1] بخاری: الاحکام، باب قول اللہ اطیعو اللہ: ۲/۱۰۵۷

اصلاح کو فرض قرار دے رہی ہیں ﴿قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾[1]

اور پھر اگر کچھ لوگ دعوت واصلاح کے فریضہ کی طرف توجہ دیتے بھی ہیں تو وہ قرآنی تعلیمات اور دعوت پیغمبرانہ کے اصول وآداب سے ناآشنا ہیں، بے سوچے سمجھے جس کو جس وقت جو چاہا کہہ ڈالا، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے، حالاں کہ یہ طرزِ عمل سنتِ انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دین اور احکامِ دین پر عمل کرنے سے اور زیادہ دور پھینک دیتا ہے۔

خصوصاً جہاں کسی دوسرے پر تنقید کی نوبت آئے تو تنقید کا نام لے کر تنقیص اور استہزاء وتمسخر تک پہنچ جاتے ہیں۔

آج کل تو ایک دوسرے کے عیوب کو اخباروں، اشتہاروں کے ذریعے منظرِ عام پر لانے کو دین کی خدمت سمجھ لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین اور اس کی دعوت کی صحیح بصیرت اور آداب کے مطابق اس کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)۔[2]

[1] التحریم: ۶

[2] معارف القرآن: ۵/۲۳۰ تا ۲۳۲، النحل: ۱۲۵

مکتب کی ضرورت

پسِ منظر:

برصغیر پاک و ہند بلکہ پوری دنیا میں مسلمان جہاں گئے وہاں اپنے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے مکاتب کا نظام مرتب کیا۔ مکتب کی ضرورت ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے، جس سے کوئی مسلمان بچہ مستغنی نہیں ہوسکتا۔ چاہے وہ مستقبل میں دینی تعلیم جاری رکھنے کا ارادہ کرے یا اسکول و کالج کی طرف متوجہ ہو۔ کیوں کہ والدین کی شرعاً یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی اولاد کو بہترین دینی طرز کی تعلیم و تربیت دینے کا اہتمام کریں۔

مکتب گویا کہ ہر مسلمان بچے کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اور اُسے ایک باعمل مسلمان بنانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جس بچے کا تعلق مکتب سے رہا ہوگا وہ چاہے کسی بھی شعبہ میں چلا جائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے دین کے دشمنوں کا آلۂ کار نہیں بنے گا۔ اس کی دین اور اہل دین سے محبت باقی رہے گی۔ قرآن کریم سے تعلق اور بنیادی ضروری دینی مسائل سے واقفیت رہے گی جو کہ دین و دنیا میں کامیابی کے لیے نہایت ضروری ہے۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

"ان شاء اللہ مکتب میں پڑھنے والا بچہ کبھی بے دین نہیں ہوگا۔"

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

"بچوں کا ذہن صاف ستھرا ہوتا ہے اس لیے ان کی جیسی ذہنی تربیت کی جائے گی اس کے مطابق بچوں کے ذہن میں وہ باتیں جمتی جائیں گی۔ اگر اسلامی انداز پر

تربیت کی گئی تو ان شاء اللہ وہ بڑا ہو کر بھی اسی انداز پر رہے گا۔"[1]

حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

"ماں باپ پر اولاد کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ ان کو اسلامی تعلیمات سے خوب اچھے طریقے سے واقف کریں...... یہ ان کا ماں باپ پر بہت بڑا حق ہے، جسے پورا کرنا اور اس پر پوری توجہ دینا ہمارا دینی و ملی فریضہ ہے۔ اس کے بغیر ہم اپنے فریضے سے سبک دوش نہیں ہوسکتے۔"[2]

مکاتب کا نظام:

الحمد للہ! ساری دنیا میں مکاتب کا نظام چل رہا ہے خصوصاً جنوبی افریقہ، انگلستان، ملاوی، موزمبیق، متحدہ عرب امارات، اور پاکستان کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں بھی علمائے کرام اور ائمہ مساجد نے ایسی محنت فرمائی ہے کہ تقریباً ہر مسجد میں ایک مکتب قائم کیا ہے اور مقامی عام مسلمانوں پر ایسی محنت فرمائی ہے کہ کوئی بھی بچہ اپنی ابتدائی عمر میں مکتب میں جانے سے نہ رہے۔ لہٰذا آپ کو کوئی ایسا مسلمان مشکل سے ملے گا جو دینی علوم سے واقفیت اور دین سے محبت نہ رکھتا ہو۔

فوائد:

بحمداللہ ان مکاتب میں اساتذہ کرام ناظرہ قرآن کے ساتھ ساتھ اچھی تجوید بھی پڑھاتے ہیں اور ان بچوں اور بچیوں میں دینی رجحان، عملی اور اخلاقی رنگ اور تقویٰ و پرہیزگاری...... طہارت و پاکیزگی...... نماز و تلاوت کا اہتمام، صدق و سچائی...... توکل...... قناعت شعاری...... صبر وشکر...... معاملات میں درستگی اور خیرخواہی جیسی

[1] فتاویٰ رحیمیہ: ۳/۱۷۸ [2] فتاویٰ رحیمیہ: ۳/۱۶۹

قیمتی صفات کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔

ان تعلیمات کی برکت سے غیر محسوس طور پر بچوں میں اخوت و بھائی چارگی ...... ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی...... اسلامی تعلیمات کی محبت پیدا ہوتی ہے اس لیے کہ آج کے بچے کل کے معمارِ اُمت ہیں اور بچوں کے ان کے معصوم دل آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہوتے ہیں ابھی تک یہ تختی بالکل صاف ہے لہٰذا پہلا نقش جو بھی دیکھیں گے ہمہ تن توجہ اور دھیان سے إن شاء الله اس طرف راغب ہوں گے اور جو کچھ سیکھیں گے وہ پتھر کی لکیر بن جائے گی۔

مکتب کا تعارف:

مساجد اور مکاتب قرآنیہ کے اساتذہ کرام اور ائمہ مساجد اگر دو ڈھائی گھنٹوں میں سے روزانہ آدھا یا پونا گھنٹہ بچوں کی دینی و اخلاقی تربیت کے لیے دیں اور اس آدھا پونا گھنٹہ میں ایک ایسا تعلیمی اور تربیتی نصاب پڑھائیں جس میں ایمانیات...... عبادات...... تجوید...... احادیث مبارکہ...... اخلاق و آداب...... روز مرہ کی مسنون دعاؤں اور سیرت النبی ﷺ کا تذکرہ موجود ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ ان بچوں میں مندرجہ ذیل اعلیٰ ایمانی صفات پیدا ہوں گی۔

❶ دین پر چلنے کا شوق

❷ نمازوں کا اہتمام

❸ والدین اور اساتذہ کا ادب

❹ پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی

❺ روز مرہ کی دعائیں

❻ عملی زندگی کے آداب

❼ اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی سچی محبت و اتباع

❽ دین پھیلانے کا جذبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! کراچی کی بعض مساجد و مدارس میں کچھ علماء کرام نے مختلف ناموں سے "تعلیم القرآن کے چھوٹے بڑے مکاتب کا کام شروع فرمایا ہے جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل و کرم سے مذکورہ بالا مقاصد حاصل ہو رہے ہیں۔ اسی جذبہ خدمت کے تحت ایک کتاب "تربیتی نصاب" کے نام سے شائع کی گئی ہے جو کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ مندرجہ بالا خوبیوں پر مشتمل ہے۔

گزارش:

ائمہ کرام سے انتہائی ادب سے گزارش کی جاتی ہے کہ اگر وہ بھی اپنی اپنی مساجد میں بچوں کی دینی و اخلاقی تربیت کے لیے "مکاتب قرآنیہ" میں تربیت کا اہتمام فرمائیں تو إن شاء الله وہ وقت دور نہیں کہ مسلمان قوم کا بچہ بچہ اپنے دین کا صحیح سمجھنے والا اور داعی اسلام بنے گا اور ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنے گا۔ نیز یہ کہ مکاتب قرآنیہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ ہماری اخروی مشکلات کو بھی آسان فرمادے گا۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

"شرح احیاء میں ان لوگوں کی فہرست میں جو قیامت کے ہولناک دن میں عرش کے سایہ کے نیچے رہیں گے ان لوگوں کو بھی شمار کیا ہے جو مسلمانوں کے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے ہیں۔"[1]

قرآن کریم کی خدمت تعلیم و تعلم اور نشر و اشاعت کے بہت سارے فضائل ہیں۔ علماء حضرات نے ان فضائل میں سے ایک بڑی فضیلت یہ بھی بتلائی ہے کہ قرآن کریم کے سیکھنے سکھانے والے کو اور اس کام کو اپنا مقصد زندگی بنانے والے کو اللہ تبارک وتعالیٰ حضور نبی کریم ﷺ سے خاص الخاص نسبت بھی عطا فرمائیں

[1] فضائل اعمال: ۲۱۲

گے۔

چناں چہ مولانا منظور احمد نعمانی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اہم پیغمبرانہ وظیفہ وحی کے ذریعے قرآن مجید کو اللہ تبارک وتعالیٰ سے لینا، اس کی حکمت کو سمجھنا اور دوسروں تک اس کو پہنچانا اور اس کو سکھانا تھا۔ اس لیے اب قیامت تک جو بندہ قرآن کریم کے سیکھنے سکھانے کو اپنا شغل اور وظیفہ بنائے گا وہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص مشن کا علمبردار اور خادم ہوگا اور اس کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص الخاص نسبت حاصل ہوگی۔"[1]

مکاتبِ قرآنیہ کا قیام قوم کے سربراہ، ذمہ دار افراد اور علمائے کرام کی ذمہ داریوں میں سے ہے نیز یہ کہ مکاتبِ قرآنیہ کی افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر ہمارے اکابر ہر دور میں اس کی ترغیب دیتے چلے آئے ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"ایسی ابتدائی تعلیم کی ضرورت ہے جس سے عوام المسلمین کے تمام بچے مستفید ہوسکیں اور ضروریاتِ دین کا علم ہر مسلم گھرانے میں پہنچ جائے۔"

اس مسئلے کا حل ابتدائی مکاتب ہیں جو ہر ہر محلہ کی مسجدوں میں قائم ہوں اور ان کا تعلق محلوں ہی میں ہوں بل کہ دیہات میں بھی جا بجا قائم ہونے ضروری ہیں۔ باحیثیت مسلمان اپنے اثرات سے دیہات کی تمام مساجد میں ایسے مکاتب قائم کردیں۔[2]

حضرت سید مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ تعالیٰ مکاتبِ قرآنیہ کے قیام کی اپیل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"قوم کے سربراہ اور قائدین پر لازم ہے کہ جگہ جگہ اپنے علاقوں، اپنی بستی،

[1] معارف الحدیث: ۷۰/۵ [2] خطبات حکیم الاسلام: ۱۵۶/۸

اپنے محلوں میں بھی مدارسِ اسلامیہ اور مکاتبِ قرآنیہ قائم کریں اور مسلمانوں کے بچوں اور بچیوں کے لیے دینی تعلیم کا بہتر سے بہتر انتظام کریں۔"[1]

اخیر میں ایک مرتبہ پھر آئمہ کرام سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اکابر کے مندرجہ بالا ارشادات کو پڑھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش فرمائیں اور اپنے زیرِ اثر علاقے میں مکاتبِ قرآنیہ کا قیام عمل میں لائیں۔

تَمَّتْ

بِعَوْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَنَصْرِهٖ وَفَضْلِهٖ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

[1] فتاویٰ رحیمیہ: ۱۶۹/۲

مراجع ومصادر

کتابوں کے نام	مصنفین کے نام	مطبع
ابو داؤد	(حافظ سلیمان بن الاشعث)	(ایچ. ایم. سعید کمپنی کراچی)
ابن ماجه	(حافظ ابو عبداللّٰہ محمد ابن ماجه)	(مکتبه رشیدیه دهلی هند)
ابن حبان	ترتیب امیر علاء الدین	مکتبة التجاریة، مکة المکرمة
الترغیب والترهیب	(حافظ زکی الدین بن عبدالعظیم)	(دار الکتب العلمیة بیروت)
المعجم الکبیر	(حافظ ابو القاسم سلیمان الطبرانی)	(ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة)
احکام القرآن	(ابوبکر جصاص)	(سهیل اکیڈمی لاهور)
اسماء الحسنیٰ	(الشیخ قشیری)	(ریاض، سعودی)
البدایه والنهایه	(حافظ ابن کثیر)	(مکتب التحقیق)
الاعلام	(خیر الدین زرکلی)	(دار العلم للملایین بیروت)
البلاغ	(ترجمان دار العلوم کراچی)	(مکتبه البلاغ دار العلوم کراچی)
اتحاف السادة المتقین	(الشیخ زبیدی)	(تصویر بیروت)
التاج المکلل	(نواب صدیق حسن خان)	(لبنان بیروت)
الافاضات الیومیه	(مولانا اشرف علی تهانوی)	(ادارة تالیفات اشرفیه ملتان)
اخلاق العلماء	(شیخ آجری)	(لبنان بیروت)
احیاء علوم الدین	امام غزالی	مکتبه رشیدیه کوئٹه
ابن حبان	(حافظ محمد بن حبان ابو حاتم)	(دار الکتب العلمیة بیروت)
اصلاحی خطبات	(مفتی محمد تقی عثمانی)	(میمن اسلامک پبلشرز کراچی)
احسن الفتاویٰ	(مفتی رشید احمد لدھیانوی)	(ایچ. ایم سعید کمپنی کراچی)
العبر فی خبر من غبر	(حافظ ذهبی)	(کویت)
الجرح والتعدیل	(ابن ابی حاتم رازی)	(دار الفکر بیروت)
الاصابه	(حافظ ابن حجر عسقلانی)	(دار الکتب العلمیة بیروت)
الفقیه والمتفقه	(خطیب بغدادی)	(مطابع القصیم بالریاض)
المبسوط	(امام ابوبکر محمد بن احمد سرخسی)	(دار الکتب العلمیة بیروت)
اصلاح دل	(مولانا حاجی محمد شریف)	(ادارہ تالیفات اشرفیه ملتان)
اصلاح انقلاب امت	(مولانا اشرف علی تهانوی)	(مکتبه سید احمد شهید لاهور)

دعائیہ کلمات

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب

رئیس جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

ائمہ حضرات کے لئے علمائے شعبہ تصنیف بیت العلم ٹرسٹ نے بزرگوں کی ہدایت "تحفۃ الائمہ" کے نام سے تیار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور ائمہ کرام کے لئے مشعل راہ بنائے۔ آمین
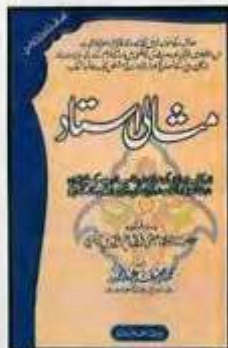
الحمد للہ مکتبہ بیت العلم کی شائع کردہ کتابیں اچھے اور نیک دوست کا کردار ادا کرتی ہیں، یہ کتابیں ایک خاندان کے ہر فرد کی اصلاح و تربیت میں بہترین معاون و مددگار ہیں۔ ان کتابوں کا موضوع اصلاح ذات اور شخصیت کی تعمیر و ترقی ہے جن کی ذریعہ معاشرے میں رہنے کا طریقہ سکھانے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان کتابوں میں قرآن کریم کی تفسیر ...... حدیث کی تشریح کی روشنی میں ...... معاشرتی مسائل ...... اصلاح کی دعوت...... نیک اعمال کا ذوق اور گناہوں سے دل میں نفرت بٹھانے والے مضامین...... بیان کئے گئے ہیں۔

ان کتابوں کو ھدیہ وغیرہ میں تقسیم کر کے آپ بھی علم پھیلانے میں اپنا حصہ شامل کر سکتے ہیں۔